عبدالمجید سالک

مسلم ثقافت ہندوستان میں

مُسلم ثقافت

ہندوستان میں

عبدالمجید سالک

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

نام کتاب: مسلم ثقافت، ہندوستان میں

مصنف: عبدالمجید سالک

اشاعت سوم: 2011ء

تعداد: 500

ناشر: قاضی جاوید
ناظم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

طابع: طیب اقبال پریس، لاہور

قیمت: -/800 روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اور محکمہ اطلاعات و ثقافت
حکومتِ پنجاب کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

فهرس

التماسِ مؤلف

اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند کو گزشتہ ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔ مقصود کسی قومی فخر و نازش کا اظہار نہیں کیونکہ تہذیب وتمدن کی رفتار میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ بعض پس ماندہ اقوام کسی بہتر قوم سے رابطہ مہیا ہونے کی وجہ سے نئے اسلوبِ زندگی سے بہرہ ور ہوگئیں۔ پھر امتدادِ زمانہ سے ان میں بھی انحطاط پیدا ہوا تو کسی اور بہتر قوم سے سابقہ پڑنے کی وجہ سے مزید اضافے ہوئے اور یہ چکر برابر چلتا رہا۔

اس کتاب کی تحریر سے یہ واضح کرنا منظور ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بے شمار تہذیبی و ثقافتی اقدار مشترک ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہزار سالہ رابطے سے پیدا ہوئی ہیں۔ آج کل بھارت کے بعض ذی اقتدار عناصر ان مشترک اقدار کو بدل دینے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کا یہ عزم و اقدام ثقافتی خودکشی کے مترادف ہے جس سے وہ اپنی قوم کی ان بےشمار خوبیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جو انھیں گزشتہ دور میں حاصل ہوئیں۔ مثال کے طور پر صرف اُردو ہی کو لیجیے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ربط و تعلق سے پیدا ہوئی۔ دونوں نے مل کر اس کو پروان چڑھایا اور ہندوستان کی بہترین علمی و ادبی زبان بنا دیا۔ آج بھارت اُردو کو ترک کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند سال کے اندر دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے سے عاری رہ جائیں گے۔ اتحاد کے امکانات کم اور اختلاف کی خلیج وسیع تر ہو جائے گی۔ یہ صورتِ حال ان لوگوں کے لیے بےحد دردناک اور مایوس کن ہوگی جو بہرحال ان دونوں ہمسایہ ملکوں کے درمیان حسنِ تعلقات کے حامی ہیں۔

اس کتاب کے آغاز میں ہندو مؤرخین و علما کی کتابوں سے اس قدیم ہندوستان کا

سیاسی، مذہبی اخلاقی، معاشرتی و ادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے جس میں آج سے بارہ سو سال پیشتر مسلمانوں نے قدم رکھا۔ اس کے بعد قرآن حکیم کی بعض آیات درج کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جو ثقافت ہندوستان میں داخل ہو رہی تھی، اس کی بنیادیں کن اصول و عقائد اور کن اقدار و معیارات پر رکھی گئی تھیں۔ اور ان میں قدیم ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کی کتنی استعداد و صلاحیت موجود تھی۔

محمد بن قاسم کے آنے سے بہت پہلے جنوبی ہند میں عرب تاجروں اور جہاز رانوں کی آمد جاری تھی اور ان علاقوں میں اسلام محض اپنی دلآویزی کے باعث بے تیغ و شمشیر، روز بروز قلوب کو فتح کر رہا تھا اور عرب آبادی کے بے شمار مراکز قائم ہو گئے تھے جن میں مدارس و مساجد کا اہتمام بھی ہو گیا تھا۔ پھر محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ کے فتح ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے، اور عرب حکومت کی بے تعصبی و رواداری واضح ہو گئی ہے۔

تین سو سال بعد سلطان محمود غزنوی کو شمال میں ہندو راجاؤں سے جو لڑائیاں لڑنی پڑیں، ان کا مختصر حال لکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس محمود غزنوی کو بعض غیر مسلم مورخین نے محض از راہِ تعصب بدنام کرنے کی کوشش کی ہے وہ کس قدر مہربان، رواداراور شریف فاتح تھا۔ بعض غیر متعصب یورپین بلکہ ہندو مؤرخین بھی اس کے کردارِ بلند کے شاہد ہیں۔

شہاب الدین غوری کی آمد اور پرتھی راج سے اس کی فیصلہ کن جنگ کا حال لکھا ہے جس کے بعد قطب الدین ایبک، غوری کے نائب السلطنت کی حیثیت سے دہلی میں مسند نشین ہوا۔ پھر شہنشاہ بن کر ہندوستان میں مسلم حکومت کا پہلا حکمران اور ایک خاندانِ شاہی کا بانی قرار پایا۔ اس کے بعد باہر سے آنے والا جو فاتح اور حکمران ہندوستان پر مسلط ہوا، وہ ظہیر الدین بابر تھا جس نے لودھیوں کی کمزور سلطنت کا خاتمہ کر کے اور راجپوت راجاؤں کے عظیم الشان لشکروں کو شکست دے کر خاندانِ مغلیہ کی بنیاد رکھی جو سولھویں صدی کے آغاز سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان پر حکمران رہا۔ اور بہادر شاہ ظفر کے حسرت ناک انجام پر ختم ہوا۔

تیسرے باب کی پہلی فصل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں اس قدر فوقیت کیوں حاصل تھی اور اُن کی پیہم فتوحات کا باعث کیا تھا۔ اس سلسلے میں بڑی بڑی جنگوں کا مختصر حال لکھا ہے۔ سلاطین و پادشاہانِ ہند کی حیثیت، قصرِ شاہی کے عہدے اور کارخانے اور علم وفن کی شاہانہ سرپرستی کا ذکر کرنے کے بعد مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے نظم و نسق کی

تفصیل لکھی ہے اور سلاطین کے نظامِ حکومت اور مغلوں کے محکموں کا فرق واضح کیا ہے۔ حکومت کے فوجی اور غیر فوجی صیغوں کی تفصیل دیہات کے پٹواریوں سے لے کر وزیر اعظم تک۔ اس کے علاوہ مغلوں کے نظامِ منصبداری کی تفصیل بھی واضح کی گئی ہے۔

ہندوستان میں مختلف مسلم حکومتوں نے علم و تعلیم کی سرپرستی میں جس دریا دلی اور ہمہ گیری کا ثبوت دیا، اس کو واضح کرنے کے لیے ایک طویل باب قلمبند کیا گیا ہے جس میں ہندوستان بھر کے حکومتی اور غیر حکومتی مدارس کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ہر بادشاہ کے عہد کی تعلیمی سرگرمیوں اور فیاضیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے بزرگ ترین صوفیہ و مبلغین، علمائے دین، مؤرخین، اطبا اور شعرائے فارسی کے ضروری تذکرے سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں وقائع نگاری، اخبار نویسی اور برید کے جو انتظامات تھے، اُن کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ''فنونِ لطیفہ'' کے عنوان کے تحت مغل بادشاہوں کے باغات، فنِ تعمیر اور معمار، مصوری و خطاطی، موسیقی اور موسیقار پر مفصل باب باندھے گئے ہیں جن میں اس ملک کے ماہرین فنون کے کمالات اور سلاطین و امرا کی طرف سے ان کی امداد و سرپرستی کو واضح کیا گیا ہے۔ نیز مسلمانوں نے اس ملک کے طعام و لباس اور رہنے سہنے کے طریقوں پر اثر ڈالا۔ حیوانات کی پرورش اور مردانہ کھیلوں کو جو رواج دیا اس کا نہایت دلچسپ ذکر کئی فصلوں پر پھیلا ہوا ہے۔

''مذاہب ہنود اور مسلمان'' کے عنوان سے جو باب لکھا گیا ہے، اس میں مسلمانوں کی رواداری کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں میں ایسے مصلحین پیدا کر دیے جنھوں نے ہندو مذہب میں بھگتی کی تحریک کو رواج دیا جس کا گہرا تعلق تصوف سے تھا۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں پر فارسی نے جو اثر ڈالا، اس کو کشمیری، پشتو، پنجابی، ہندی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی میں مروّج فارسی الفاظ و تراکیب اور اندازِ بیان سے واضح کیا گیا ہے۔ اُردو زبان ہندوستان کے لیے مسلمانوں کا بہترین ''ثقافتی تحفہ'' ہے۔ اس کی مختصر تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ فارسی کے ہندو شعراء و مصنفین اور اُردو کے ہندو شعرا کا معتدبہ تذکرہ بھی لکھا گیا ہے۔

''تجدید و اصلاح کے دور'' میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے کارناموں اور سر سید احمد خاں اور اُن کے رفقائے کار کی خدمات کا تذکرہ حسبِ ضرورت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ پھر مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا حال قائداعظم محمد علی جناح اور قیامِ پاکستان تک مختصراً قلمبند کیا گیا ہے۔

دسویں باب میں بعنوان ''تمدن'' یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلم حکومت کے زمانے میں عوامی زندگی کی کیفیت کیا تھی اور عام لوگوں کی معیشت کے متعلق کیا کیا انتظامات کیے گئے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عوام علی العموم خوشحال اور مطمئن تھے۔ اس سلسلے میں سلاطین و امرا کی بخشش، عام خیرات، عطیات و جاگیرات، معیارِ زندگی، سستے کی قیمت، اہلِ حرفہ کی خوشحالی ہر چیز کا ذکر آ گیا ہے۔

آخر میں اہلِ علم کی خدمت میں گزارش ہے کہ میں ایک نہایت کم علم صحافی ہوں۔ مورخ و محقق ہونے کا دعویدار نہیں ہوں، لیکن اس کتاب کی تالیف میں میں نے بہترین مآخذ تاریخی سے استفادہ کیا ہے اور بے شمار حوالے حاشیوں پر دے دیے ہیں، جن سے پیشِ نظر موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب ایک مستند ''دائرۃ المعارف'' کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس ناچیز تالیف میں بے انتہا نقائص اور فروگزاشتیں ہوں گی، جن کے لیے اہلِ علم سے معافی خواہ اور اصلاح کا طالب ہوں۔

مسلم ٹاؤن، لاہور، یکم اگست ۱۹۵۷ء

عبدالمجید سالک

پہلا باب

مسلمانوں کے وُرود سے قبل ہندوستان کی حالت

پہلی فصل: ملک کی ظاہری صورت

ہندوستان پر مسلم ثقافت کے اثرات کا جائزہ لینے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ورود سے قبل جغرافیائی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے جو حالات موجود تھے، اُن پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، تاکہ وہ ابتدائی خاکہ سامنے آ جائے جس میں آگے چل کر مسلم ثقافت اپنا رنگ بھرنے والی تھی۔ یہ کام اس اعتبار سے کسی قدر دشوار ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو داخلہ تاریخ کے کسی ایک دور میں نہیں ہوا۔ بلکہ یہ عمل صدہا سال تک جاری رہا ہے۔ لیکن ہم کوشش کریں گے کہ حتی الامکان ہندوستان کا ایک عمومی خاکہ پیش کر دیں۔

افغانستان

مسلمانوں کے آنے سے پہلے موجودہ افغانستان بھی ہندوستان ہی میں شامل تھا۔ اس کے دو حصے تھے کابل اور زابل یعنی شمالی حصہ جس کا صدر مقام کابل تھا۔ اور جنوبی حصہ جس کا پایۂ تخت زابل تھا۔ اور جسے آج کل کے غزنی کے قریب سمجھنا چاہیے۔ کابل میں ایک برہمن خاندان حکمران تھا۔ جس کا بانی لگیہ شاہ بتایا جاتا ہے۔ اور جنوبی حصہ میں بھٹی راجپوتوں کی حکومت تھی۔ نصر بن احمد سامانی کے عہد میں یعقوب لیث نے کابل اور زابل دونوں کو فتح کر کے برہمن اور بھٹی دونوں خاندانوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔ جس کو آج کل افغانستان کہتے ہیں۔[۱]
(۹۱۲ء)

کشمیر

کشمیر ہندوستان میں شامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ مہاراجہ ہرش کے زمانے میں بھی اس کے راجاؤں نے ہندوستان کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ اس سلطنت کا بانی دُرلبھ تھا۔ جس کا ذکر ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ۷۲۵ء سے ۷۵۲ء تک کشمیر للتادت کے زیرِ حکومت بہت طاقتور ہو گیا۔ اہلِ تبت اور ترکوں کے خلاف جنگ ہوئی تو کشمیر نے فتح پائی، چین کے ساتھ اس نے سفارتی تعلقات قائم کیے اور اپنے اقتدار کو پنجاب تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد اُتپل خاندان نے للتادت کے خاندان کو بے دخل کر کے اپنا علَم بلند کیا۔ اس خاندان میں دو بڑے بڑے راجا ہوئے۔ اَونتی ورمن اور شنکر ورمن۔ آخر الذکر کی حکومت ۸۸۳ء سے ۹۰۲ء تک رہی۔ یہ بہت بہادر سپاہی تھا۔ لیکن اس نے مالگذاری کا ایک نظام قائم کیا جس سے لوگوں کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔[۲] ۱۳۳۹ء میں کشمیر پر ایک مسلمان خاندان کی حکومت ہو گئی۔ البیرونی کا بیان ہے کہ کشمیر کا جنوب مشرقی حصہ ہندوؤں کا ہے۔ مغربی حصہ مختلف راجاؤں کے قبضے میں ہے۔ مثلاً بولڑ شاہ، شگنان شاہ، اور زیادہ دور دست علاقہ سرحد بدخشاں تک واکہان شاہ کی حکمرانی میں ہے۔ شمالی خطہ اور کچھ مشرقی حصہ ختن اور تبت کے ترکوں کے پاس ہے۔[۳]

سندھ

شاہی شاہی دوائج کے لڑکے رائے سہرس کو بادشاہ نیمروز کی اس فوج نے جو فارس کی طرف سے کرمان میں داخل ہوئی تھی، شکست دے کر قتل کر دیا۔ رائے ساہ سی اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بعد چند بڑے بڑے راجا ہوئے جن کے بعد رائے ساہ سی دوم برسرِ حکومت آیا۔ ان تمام راجاؤں کا صدر مقام اَلُور تھا۔ رائے ساہ سی دوم کے وزیر بدھیمان نے ایک برہمن چچ کو ہونہار دیکھ کر راجا کی خدمت میں پیش کیا۔ چچ نے راجا بلکہ رانی کے دل پر بھی قابو پا لیا۔ رائے ساہ سی کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔ اور تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا۔ اس نے پینتیس برس حکومت کی۔ اُسی زمانے میں مغیرہ نے دیبل پر حملہ کیا۔ رائے داہر جس کو محمد بن قاسم نے قتل کیا۔ اسی چچ کا بیٹا تھا۔ سندھ کی حکومت ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس ملک میں جابجا بدھیوں کے مٹھ تھے۔ دیبل اور ملتان میں سب سے بڑے مندر تھے، جن کو بلاذری ''بُد'' لکھتا ہے۔[۴] اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے حملے کے وقت سندھ میں بدھ مت کا زور تھا۔ اگرچہ چچ اور اس

کے جانشین برہمن تھے لیکن اُنھوں نے بودھیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔[۵]

راجپوت

افغانستان، سندھ اور کشمیر کے سوا باقی ہندوستان راجپوت حکمران خاندانوں میں بٹا ہوا تھا۔ راجپوتوں کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ ویدک زمانے کے سورج بنسی اور چندر بنسی چھتریوں کی نسل سے ہیں۔ بعض اس کو نہیں مانتے۔ اور کہتے ہیں کہ ہَن اور سِتھین حملہ آوروں میں سے بعض راجپوتانہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اور بعض گونڈوں اور بھاروں نے برہمنی مذہب قبول کر کے فوجی طاقت حاصل کر لی۔[۶] اور جب بدھ مت کے اثر سے ہندوؤں میں جنگی روح ختم ہوگئی تو راجپوتوں نے موقع پا کر ملک کے مختلف حصوں میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ پرتھی راج راسا کے مصنف چندر بروائے نے راجپوتوں کو سورج بنسی اور چندر بنسی ثابت کرنے سے عاجز آ کر ایک نئے نظریے کے ماتحت ان کو ''اگنی کُل'' قرار دیا۔ یعنی وہ آگ کے خاندان سے ہیں۔ اور وِششٹ نے جو قربانی کی آگ روشن کی تھی، اس میں سے راجپوتوں کا مورثِ اعلیٰ پیدا ہوا تھا۔[۷] لیکن اب بعض فاضل ہندوؤں نے اس شاعرانہ افسانے کی صحت سے انکار کیا ہے۔ اور زیادہ تر حضرات کی رائے یہی ہے کہ راجپوت قوم کی رگوں میں غیر ملکی خون ہے۔ ٹاڈ نے اپنی مشہور کتاب راجستان میں اسی نظریے کی تائید کی ہے۔ اور راجپوتوں کو وسط ایشیا کے سِتھین قبائل کا قریبی قرار دیا ہے۔

ہرش بودھ مذہب کا آخری مہاراجا تھا (متوفی ۶۴۸ء) اس نے بودھ مت کو بڑی تقویت دی۔ اور اپنی قابلیت اور رواداری سے بودھ اور غیر بودھ ہندوؤں کو مطمئن رکھ کر اپنی قلمرو بے حد وسیع کر لی۔ لیکن اس کے آنکھ بند کرتے ہی یہ طلسمِ اتحاد ٹوٹ گیا۔ اور ہندوستان بے شمار چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گیا۔

قنوج کے پرتی ہار

اُس زمانے کے ہندوستان میں سب سے بڑی حکومت کا صدر مقام قنوج تھا۔ البیرونی نے لکھا ہے کہ قنوج کے گرداگرد کا علاقہ ہندوستان کے درمیان میں واقع ہے۔ اور اسی لیے اس کو مدھیہ دیش (خطۂ وسطیٰ) کہتے ہیں۔ بنگال کی سرحد سے لے کر گجرات کاٹھیاواڑ تک قنوج ہی کا عَلَم لہراتا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ علاقہ سمندروں اور پہاڑوں سے یکساں فاصلے پر ہے۔ اور سرد و

گرم صوبوں اور ہندوستان کی مشرقی اور مغربی سرحدوں کے بھی درمیان ہے۔ لیکن یہ سیاسی مرکز بھی ہے۔ کیونکہ پرانے زمانے میں بڑے بڑے مشہور راجاؤں اور بہادروں کا مسکن رہا ہے۔[۸] قنوج کا ایک راجا یشو ورمن بہت مشہور تھا۔ جس کے سفارتی تعلقات بیرونی ملکوں سے بھی تھے۔ اور وہ علم وفن کا بھی سرپرست تھا۔ اُس زمانے میں کشمیر کی قوت کا یہ حال تھا کہ اس کے راجا للتادت نے راجا یشو ورمن کو تخت سے اُتار دیا۔ (۷۴۲ء) ''مالتی مادھو'' اور ''اُتر رام چرت'' ڈراموں کا مصنف بھوبھوتی اسی کا درباری شاعر تھا۔[۹] یشو ورمن کے بعد کچھ کمزور راجا تخت نشین ہوتے رہے۔ پھر راجا میہر بھوج کے زمانے میں (۸۴۰ء-۸۹۰ء) فتوحات کے باعث پنجاب کے مشرقی اضلاع یو پی کا زیادہ حصہ اور گوالیار کا علاقہ قنوج کے زیرِ نگین ہو گیا۔ اس کے بعد مدتِ دراز تک قنوج مختلف راجاؤں کے ماتحت نشیب و فراز کے تجربے کرتا رہا۔ بالآخر بسال دیو چوہان نے قنوج کے ساتھ دہلی فتح کی۔ پرتھی راج اسی بسال دیو کا بھانجا تھا۔[۱۰]

چنڈیلے اور کلاچوری

جیجک بھگتی کے چنڈیلے اور چیدی کے کلاچوری اُس علاقے پر قابض تھے جو آج کل بندیل کھنڈ اور مدھیہ پردیش (سی۔پی) کہلاتا ہے۔ چیدی کے راجا اپنے آپ کو ''کالنجر اُدھی پتی'' بھی کہتے تھے۔ کیونکہ کالنجر بھی انہی کے قبضے میں تھا۔ چنڈیلوں میں راجا یشو ورمن ہوا۔ جس نے بڑی سلطنت قائم کی۔ جس کی سرحدیں شمال میں جمنا تک، جنوب میں چیدی قلمرو تک، مشرق میں کالنجر تک اور مغرب میں گوالیار اور بھیلسہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سبکتگین کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے جے پال نے جن راجاؤں سے امداد حاصل کی تھی۔ اُن میں یشو ورمن بھی تھا۔[۱۱]

مالوہ کے پرمار

مالوہ کے پرمار راجپوت اپنی جنگ جوئی اور علم دوستی دونوں کے لیے مشہور تھے۔ اُن کی سلطنت مالوہ پر تھی۔ لیکن اس کی جنوبی حدود دریائے نربدا تک پہنچتی تھیں۔ چونکہ اُن کے گرد بڑی بڑی حریص حکومتیں قائم تھیں۔ اس لیے اُنھیں مہوبہ کے چنڈیلوں، چیدی کے کلاچوریوں، گجرات کے سولنکیوں اور دکن کے چالوکیہ راجاؤں کے ساتھ مسلسل جنگ و پیکار میں مصروف رہنا پڑا۔ اسی خاندان کے ایک راجا سیاک نے جسے شری ہرش بھی کہتے ہیں۔ ہن قوم کے حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دی تھی۔ اسی خاندان میں راجہ بھوج ہوا ہے جو اپنی بہادری اور ادب کی

سرپرستی کے لیے نامور ہے۔علوم وفنون اور تعمیر میں بھی اس کا نام بہت اونچا ہے۔ مالوہ کہیں اکبر کے زمانے میں جا کر مسلم سلطنت میں شامل کیا جا سکا۔

بہار اور بنگال

مہاراجہ ہرش کے زمانے میں تو بہار اور بنگال بلکہ کامروپ (آسام) تک مہاراجا ہی کے زیرِ نگین تھے۔لیکن اس کے بعد پال اور سین خاندان بنگال، بہار، اُڑیسہ بلکہ مشرقی علاقوں پر بھی حکومت کرنے لگے۔ گوپال، دھرمپال، دیوپال اور چند اَور راجاؤں نے مملکت کو وسیع کیا۔ مِتھلا دیس جس میں چمپارن اور دربھنگہ بھی شامل تھے راما پال نے فتح کیا۔اس خاندان کے کمزور ہو جانے سے دکن کے ایک راجا سامنت سین نے حملہ کر دیا۔اور پال راجاؤں کی خاصی قلمرو کو ہتھیا لیا۔ اس کے پوتے بلال سین نے بڑا نام پیدا کیا۔ یہ علوم وفنون کا سرپرست اور خود بھی مصنف تھا۔ اس نے گنگا اور جمنا کے سنگم میں کود کر خودکشی کر لی۔ اور اس کی بعض تصانیف کو ایک راجا لکشمن سین نے مکمل کیا۔[۱۲] یہ وہی لکشمن سین ہے جو محمد بن بختیار خلجی اور اس کے اٹھارہ ساتھیوں کے حملے سے گھبرا کر بھاگ گیا۔اور بنگال مسلمانوں کے حوالے کر گیا۔ (۱۱۹۹ء)

دکن

چھٹی صدی عیسوی میں دکن کے وسیع علاقہ پر ستکارنی راجاؤں کا راج تھا۔لیکن انہی دنوں راجپوتوں کی ایک قوم چالوکیہ نے دکن پر حملہ کر کے ستکارنیوں کو ختم کر دیا۔ اور اپنی فتوحات کا سلسلہ گجرات، راجپوتانہ، مالوہ اور کونکن تک وسیع کر دیا۔ ایک چالوکیہ راجا نے اپنی ایک الگ سلطنت قائم کی، جس کو مشرقی چالوکیہ کہتے تھے۔ اور جو بالآخر چول قلمرو میں شامل ہو گئی۔قنوج کے مشہور مہاراجا ہرش کو ایک حریف کا عروج گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے خود اس کے خلاف فوج کشی کی۔ لیکن شکستِ فاش کھا کر واپس آیا۔ یہ واقعہ ۶۲۰ء کا ہے اور اُس راجا کا نام پلاک سین تھا۔ ہیون سانگ ۶۴۵ء میں دکن گیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں اس راجا کی بہت تعریف کی ہے۔لیکن پلاک سین کی جنگوں نے سلطنت کو کمزور کر دیا۔ اور پلّب قوم نے دکن کے زیادہ حصے پر قابو پالیا۔ آخر میں راشٹر کوٹ راجپوتوں نے چالوکیہ کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ راشٹر کوٹوں میں ایک بہت بڑا راجا دانتی درگا ہوا ہے جس کے جانشین کرشن اول نے اس تمام علاقے پر اپنا علَمِ اقتدار لہرایا جو چالوکیہ خاندان کے قبضے میں تھا۔ اور اپنے شاندار عہدِ حکومت کی یادگار کے طور پر

ایلورا کے مندر تیار کرائے۔ جن میں ایک ہی چٹان کو تراش تراش کر سنگ تراشی کے ایسے لازوال کمالات کا اظہار کیا گیا ہے جو اب تک دُنیا کے سیاحوں اور نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ مہاراشٹر بھی راشٹرکوٹوں ہی کا قائم کیا ہوا خطہ ہے۔ اس خاندان کے راجاؤں کے تعلقات عربوں سے ہمیشہ خوش گوار رہے۔[۱۳]

راجپوتوں کے حکمران خاندان ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے۔ کیونکہ ہرش کے بعد ہندوستان میں کوئی ایسا راجا پیدا نہ ہوا جو بہت سے علاقوں کو جمع کر کے ملک کو متحد کر سکتا۔ کھوکھر اور چوہان، تمارے اور راٹھور، چنڈیلے اور چیدی کے راجا، پال اور سین، چالوکیہ اور راشٹر کوٹ، چولے اور پانڈے سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے۔ اور اُن کی اسی خانہ جنگی نے ان کو بیرونی حملہ آوروں کے موثر مقابلے سے عاجز رکھا۔

دوسری فصل: سیاست اور نظمِ حکومت

مسٹر سی۔ وی ویدیا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک ہندوستان کی معمولی سیاسی کیفیت ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ اس میں مختلف حکومتیں برسرِ اقتدار رہیں۔ اشوک اور ہرش کے عہد کی طرح کبھی بھی کسی بڑی قلمرو کا معرضِ وجود میں آ جانا اس ملک میں غیر معمولی کیفیت کا مظہر ہے۔ زبان، آب و ہوا، روایات اور صوبائی خصوصیات کے اختلاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس ملک میں مختلف سلطنتیں قائم ہوں۔ اگرچہ ہندوستان میں بحیثیتِ مجموعی مختلف علاقوں کی قدرتی سرحدیں بالکل واضح ہیں۔ لیکن اس کی مختلف سلطنتوں کی سرحدیں واضح نہیں ہیں۔ بہرحال قدرتی سرحدوں کا وجود کسی مملکت کے لیے ضروری بھی نہیں۔ جرمنی اور فرانس کے ساتھ بلجیم اور ہالینڈ کی سرحدیں ہرگز قدرتی نہیں ہیں۔ لیکن ان بڑے ملکوں کے پیہم حملوں کے باوجود دونوں چھوٹے ملکوں نے ہزار سال سے اپنی آزادی کو قائم اور برقرار رکھا ہے۔ ہندوستان میں سندھ، پنجاب، یوپی اور بنگال کی سرحدیں واضح یا مستحکم نہیں ہیں۔ لیکن عہدِ وسطیٰ میں ان کی انفرادی شان برابر قائم رہی۔ اور وہ قائم رہتی اگر اس ملک کے لوگ قومیت پرستی کے جذبے کی پرورش کرتے۔''[۱۴]

قومیت پرستی کا فقدان

لیکن قومیت پرستی کے جذبے کی پرورش دو ہی طریقوں سے ممکن ہے۔ حُبِّ وطن یا وحدتِ مذہبی سے۔ مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کے پورے ملک کو کبھی کسی نے اپنا وطن نہیں سمجھا۔ ویدک آریاؤں کے زمانے میں بلاشبہ وسطِ ہند یعنی گنگا کے میدان کو بھارت ورش یا آریہ ورت تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن شمال کے لوگ ملیچھ کہلاتے تھے اور دندھیاچل کے جنوبی علاقے کو دراوڑوں کا علاقہ قرار دے کر نشانۂ نفرت بنایا جاتا تھا۔ پھر منوسمرتی کے احکام کی وجہ سے آبادی کی اکثریت شہری حقوق ہی سے محروم تھی۔ اس کو وطن یا مذہب کے نام پر اپیل کرنا کیونکر ممکن تھا؟ مسیح سے چند سو سال پیشتر بدھ مت یا جَین مت نمودار ہوئے۔ جنھوں نے ویدک آریاؤں کی برہمنیت کو نابود کرنے کی کوشش کی۔ پہلے اشوک نے، پھر ہرش نے کچھ مذہب کی بنا پر اور کچھ زبردستی اپنی قلمرو کو وسیع کیا۔ لیکن ہرش کے مرتے ہی وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ اور نہ بدھ مت رہا۔ نہ بودھوں کی حکومت رہی۔ بلکہ قلمرو پارہ پارہ ہو کر راجپوت سرداروں میں بٹ گئی۔ یہ لوگ اپنے اپنے علاقوں کے خودمختار بادشاہ تھے۔ اگرچہ سب کے سب برہمنی مذہب کا دم بھرتے تھے۔ لیکن اتنی توفیق کسی کو نہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جمع کر کے کوئی بڑی سلطنت قائم کر لیتے۔ ساڑھے پانسو سال تک یہی حالت رہی۔ دن رات لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ محمد غوری آیا۔ اور اس نے ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے متحد کرنے کا کام شروع کیا۔

راجپوت راجاؤں کی سیاست کا یہ حال تھا کہ ہر وقت ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے پر اُدھار کھائے بیٹھے رہے۔ اور جس خاندان کو ایک دو سال حکومت کرنے کا موقع مل گیا، اُس نے اپنے اہلِ قبیلہ (بھائی بند) کی مدد سے من مانی بادشاہی کی۔ عوام کو خوش رکھنے کے لیے برہمنوں کی خاطر مدارات کرتے رہے۔ حکومت میں عوام کا کوئی حصہ نہ تھا۔ البتہ وہ ٹیکس ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ جس سے حکومت کا خزانہ معمور ہوتا تھا۔ ''کابل'' [۱۵] سے کامروپ تک اور کشمیر سے کوکن تک تمام سلطنتیں راجپوتوں کی تھیں۔ جن کے چھتیس شاہی خاندان راج کر رہے تھے۔ چندر بردے نے اس تعداد کو پہلے پہل بیان کیا۔ اور جب ۱۱۴۸ء میں پنڈت کلھن نے راج ترنگنی تصنیف کی تو اس نے بھی اسی تعداد کی تصدیق کی۔''

جہاں تک ان سلطنتوں کے قوانین کا تعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ راجا کا ملاً مطلق

العنان نہ تھے۔ مذہب کی گرفت اس برعظیم کے لوگوں کے قلوب پر ہمیشہ سے رہی ہے۔ منوسمرتی مذہباً قانون وشریعت کی مستند کتاب سمجھی جاتی تھی اور راجا اس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ خلاف ورزی کی صورت میں برہمن بگڑ بیٹھتے۔ اور ان کو غیر مطمئن راجپوتوں اور عام لوگوں کی حمایت حاصل ہو جاتی۔ منوسمرتی کے اصول وقوانین کتنے ہی قابلِ اعتراض کیوں نہ ہوں۔ بہرحال وہ کتاب شاہ وگدا پر حاوی تھی۔ اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ لیکن تاہم راجاؤں اور درباریوں کی حرکات وسکنات پر حسبِ معمول کوئی پابندی نہ تھی۔ اور وہ من مانی عیاشیاں کرتے تھے۔

ڈپلومیسی

سلسلۃ التواریخ یا سفرنامہ سلیمان تاجر (ابو زید)، کتاب المسالک والممالک (ابن خورداذبہ)، مروج الذہب (مسعودی)، نزہتہ المشتاق (ادریسی)، فتوح البلدان (بلاذری) اور دوسرے مؤرخین کی کتابیں اس پر متفق ہیں کہ ہندوستان کا بہت بڑا راجا بلہرا ہے۔ جس کی سلطنت چین کی سرحد سے سمندر کے ساحل تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور بلہرا اس کا نام نہیں بلکہ شاہی لقب ہے۔ اس کا ایک حریف راجا "جُزر" ہے۔ (یہ گجرات کا بگاڑ ہے)۔ بلہرا عربوں کا ہمدرد ہے۔ اور اُن کی مدد سے اپنے حریف کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ جزر کا راجا مسلمانوں کا جانی دشمن ہے۔[۱۶] اس کے علاوہ راشٹرکوٹ راجپوتوں نے بھی عربوں سے محض اس لیے اچھے تعلقات قائم رکھے کہ وہ قنوج کے پرتی ہاروں کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ اس بیان سے ہمارا مطلب یہ ثابت کرنا ہے کہ منوسمرتی کے باوجود راجپوت راجا ڈپلومیسی میں مسلمانوں کو بھائی بنا لیا کرتے تھے۔ حالانکہ مذہبی اعتبار سے مسلمان شودروں سے بھی ادنیٰ درجہ رکھتے تھے۔

شہنشاہی کی وُسعت

قنوج کے پرتی ہار مہاراجاؤں میں ایک مہی پال تھا، جس کے درباری شاعر راج شیکھر نے ایک کتاب کوی میمانسا لکھی، جس میں شاعری کے علاوہ ہندوستان کا جغرافیہ بھی لکھا۔ مہی پال کا عہد ۹۱۰ء سے ۹۳۰ تک ہے۔ اس جغرافیہ میں ایک فقرہ ہے:

جو راجا بھارت کھنڈ کو ہمالیہ سے جنوبی سمندر تک فتح کرلے۔ وہ سمراٹ کہلاتا ہے۔ اور جو کماری پور (راس کماری) سے جھیل بند وسر تک کے علاقے کو زیرِ نگیں کرلے۔ اس کو

چکرورتی کہتے ہیں۔"[۱۷]

اشوک اور چندر گپت اور ہرش نے تو شاید کسی اعتبار سے ہمالیہ اور سمندر تک اپنی قلمرو بڑھالی ہو۔ اور سمراٹ کہلائے ہوں۔ لیکن جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، ہندوستان میں چکرورتی مہاراجا آج تک کوئی نہیں ہوا۔ پھر خدا جانے یہ اصطلاح کیونکر پیدا ہوگئی اور بعض چھوٹے راجاؤں نے چکرورتی کہلانا کیوں شروع کر دیا۔

نظمِ حکومت

بعض ہندو مؤرخین نے پرانے کتبوں اور فرمانوں سے یہ پتہ چلایا ہے کہ راجپوتوں کے ہندوستان میں صوبے، ضلعے اور تحصیلیں بھی تھیں، جن کو بھوکتی، منڈل، ویشیاما اور منڈل کہتے تھے۔ راجا سول اور ملٹری کے مختلف شعبوں کے لیے اپنے وزراء بھی مقرر کرتے تھے۔ مالیہ اراضی پیداوار کا ۱/۶ حصہ اور دکانداروں اور تاجروں کے منافع کا ۱/۵۰ حصہ ٹیکس کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ اور راجا کے قریبی عزیزوں اور دوسرے وفادار خادموں کو جاگیریں اور معافیاں بھی دی جاتی تھیں۔[۱۸] لیکن ہندو مؤرخین ہی میں سے بعض اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس دور میں نظمِ حکومت کی حالت بے حد خراب تھی۔ مثلاً ایشوری پرشاد کا قول ملاحظہ ہو:

"دہلی، قنوج اور دوسرے راجپوت پایۂ تخت قابل برہمن وزراء کی خدمات سے بالکل محروم تھے۔ راجپوت نے جنگ کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ اور حکومت اور نظم ونسق کے بلند اور شریفانہ فرائض سے غافل ہوگیا تھا۔ جن کی بجا آوری نے تاریخِ ہند میں اشوک اور ہرش کو غیر فانی بنا رکھا ہے۔ کوئی تحریری شہادت موجود نہیں۔ جس سے نظم ونسقِ حکومت کے دائرے میں راجپوتوں کے کارناموں کا اظہار ہو، اور اُن کی پوری تاریخ قبائلی جنگ و پیکار کا ایک طویل سلسلہ ہے۔"[۱۹]

فوج

محکمۂ فوج کے متعلق بعض مسلمان اور ہندو مؤرخین نے یہ بتایا ہے کہ قنوج اور بنگال کے راجاؤں کے سوا کسی راجپوت راجا کو مستقل فوج ملازم رکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بعض تو ضرورت کے وقت فوج بھرتی کر لیا کرتے تھے۔ اور بعض اپنے جاگیرداروں سے ان کے متوسلین کو طلب کر کے میدانِ جنگ میں لے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام کو تو حکومتوں کو چلانے یا ان کے قائم رکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف حکمران خاندان اپنے ہم قبیلہ بھائی بندوں کو ساتھ

ہے، حریف سے بھڑ جاتا تھا۔ فتح پائی تو ٹھیک، شکست کھائی تو ملک حریف کے حوالے کر دیا۔ عوام کو راج پلٹ جانے کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ قنوج کے پرتی ہار، اور دکن اور مہاراشٹر کے راشٹر کوٹ چونکہ خود جنگی قبیلے تھے، اس لیے ان کی فوج میں بیرونی عنصر شامل نہ تھا۔ البتہ بنگال کے پال اور سین راجاؤں نے مالوہ، جنوبی گجرات، کرناٹک وغیرہ کے بعض لوگوں کو بھرتی کر رکھا تھا۔ کیونکہ بنگال میں راجپوت قبیلوں کی تعداد کافی نہ تھی۔ اور بنگالی اس زمانے میں بھی جنگی قوم نہ سمجھے جاتے تھے۔ باقی ملک بھر کے راجپوت راجاؤں کے ہاں مستقل فوج کا کوئی وجود نہ تھا۔'' [۲۰]

راجا ہی ''حکومت'' تھا

بارود کی ایجاد سے پہلے فوج کے تین حصے ہوا کرتے تھے۔ پیادہ فوج، گھڑ سوار، اور فیل سوار۔ ان تینوں کے پاس تیر کمان، تلوار اور برچھے ہوتے تھے۔ مہا بھارت اور اس کے بعد کے زمانے میں جنگی رتھوں کا بھی رواج تھا۔ لیکن رتھیں ناموزوں سمجھ کر ترک کر دی گئیں تھیں۔ عام طور پر میدانِ جنگ میں فوج کی قیادت راجا بہ نفسِ نفیس کرتا تھا۔ اس لیے کہ لڑنے والوں میں قوم پرستی، وطن پرستی یا مذہب پرستی کا جذبہ مفقود ہوتا تھا۔ بلکہ وہ صرف راجا سے ذاتی وفاداری کی بنا پر لڑتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی راجا یا کوئی مہا سینا پتی (سپہ سالار) میدانِ جنگ میں مارا جاتا۔ بڑی سے بڑی فوج بھی گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوتی۔ اور بعض اوقات اچھی خاصی فتح شکست فاش میں بدل جاتی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ فوج میں عہدہ داروں اور افسروں کی کوئی باقاعدہ ترتیب و تدریج نہ تھی جس کی بنا پر فوج کی تنظیم اور اس کے حوصلے کو قائم رکھنا ممکن ہوتا۔ اور دوسری وجہ وہی جو اوپر بیان کی جا چکی ہے کہ لڑنے والے جنگ کے نتیجے کی طرف سے بالکل بے پروا ہوتے تھے۔ بلکہ محض ایک مشین کے پرزوں کی حیثیت سے لڑتے تھے، جس کا انجن راجا تھا۔ ان کی منطق کچھ اس قسم کی تھی کہ حکومت راجا کی ہے۔ ہم راجا کے لیے لڑ رہے ہیں، جب راجا ہی مر گیا تو ہم کاہے کے لیے لڑتے رہیں۔ حکومت ہمیں تو ملنے سے رہی۔ [۲۱]

عام کیفیت

ان حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ راجپوتوں کے دور میں ہندوستان کا نظم و نسق

سخت ابتری کی حالت میں تھا۔ راجپوتوں کی بہادری، اولوالعزمی، جاں فروشی اور غیرت میں کوئی کلام نہیں۔ گو اُن کی یہ خوبیاں بھی وحشت و بربریت کے رنگ میں غرق تھیں۔ ستی اور جوہر کی رسمیں اس کی شاہد عادل ہیں۔ لیکن زمانے کے حالات اور راجپوتی روایات کے اعتبار سے ان محاسن کا اہم ہونا مسلّم ہے۔ وہ اپنے راجا یا سردار کی زندگی اور حکومت کی خاطر انتہائی ایثار کرنے کے اہل تھے۔ لیکن ذاتی اور انفرادی قربانی اور شے ہے۔ اور ملک داری شئے دیگر ہے۔ تفصیلاتِ تاریخی سے اُن کے نظمِ حکومت کی کیفیت کچھ اس قسم کی معلوم ہوتی ہے کہ دیہات میں جھگڑوں کا فیصلہ کرنے اور مجرموں کو سزا دینے کا کام تمام تر دیہات کے پنچایتوں کے سپرد تھا جن کے کام میں حکومت عام طور پر مداخلت نہ کرتی تھی۔ شہروں میں راجا اور اس کے کارکن حکومت کا کام انجام دیتے تھے۔ عدالتیں بھی انہی کی تھیں۔ اور وزیر زیادہ تر راجا کی مصاحبت کرتے تھے۔ باقاعدہ دفاترِ سرکاری کا نام نشان نہ تھا۔ اگر کچھ تھا تو چند چترے اور چند کتبے تھے۔ جن پر فرامین اور یادداشتیں لکھی رہتی تھیں۔ مالیہ اراضی بصورت جنس وصول کیا جاتا تھا اور تجارتی ٹیکس بصورت نقد۔ لیکن نقد کا مطلب یہ نہیں کہ ہر سلطنت میں کوئی سکہ رائج تھا۔ صرف دو تین سلطنتیں بہت تھوڑی مقدار میں سکّے مضروب کرتی تھیں۔ باقی ملک میں تمام کاروبار تبادلۂ اجناس کے اصول پر ہوتا تھا اور بعض مسلمان مؤرخین نے تو بتایا ہے کہ کہیں کہیں سونے اور چاندی کا سفوف وزن کر کے بطور سکہ استعمال کیا جاتا تھا۔

راجا کے کچھ بھائی بند، کچھ لگے بندھے اور کچھ ملازم پولیس کا کام انجام دیتے تھے۔ لیکن اس پولیس کا دائرۂ عمل صرف شہر تک محدود ہوتا تھا۔ دیہاتی علاقے میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کو آزادی حاصل تھی۔ اور یہ طبعی بات بھی ہے کہ جب راجا اور اس کے اہلِ قبیلہ میدانِ جنگ میں دادِ کشور کشائی دے رہے ہوں، شہروں اور گاؤوں کا امن محض عوام کی سکون پسندی اور بے نیازی کا مرہونِ منت ہو۔ اور شدید جرائم کرنے والوں کی سرکوبی کا کوئی انتظام نہ ہو تو قزاقی کا دَور دَورہ یقینی ہے۔ اور یہ کیفیت صرف کسی ایک علاقے کی نہ تھی۔ بلکہ ہمالیہ سے راس کماری تک یہی حال تھا۔ بلاشبہ اس میں بعض مستثنیات بھی تھیں۔ مثلاً قنوج اور گجرات کے بعض حصوں کے امن و امان کے متعلق مسلمان مؤرخین کی شہادت موجود ہے۔ لیکن یہ امن معمول نہ تھا، بلکہ خلافِ معمول تھا۔

تیسری فصل: مذہبی کیفیت

یہ امر اب بطور کلیہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ دُنیا کے بڑے بڑے مذاہب کی ابتدا الہام الٰہی ہی سے ہوئی۔ اور توحید ان سب کا بنیادی عقیدہ تھا۔ لیکن ابتدائی دور گزر جانے کے بعد رہنمایانِ مذہب کی پریشان خیالی اور عوام کی جہالت کے باعث مذاہب کی اصلی صورت مسخ ہو گئی اور ان میں ایسے عقائد و رسوم راہ پا گئے جو ان کے مقدس بانیوں کی تعلیمات سے دُور کا بھی تعلق نہ رکھتے تھے۔ ہندو دھرم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ویدوں کے زمانے میں آریا ہندو عقیدۂ توحید کے پابند تھے۔ اور ایک ایشور کی عبادت کیا کرتے تھے۔ البیرونی نے اپنی مشہور کتاب میں لکھا ہے کہ ''خدا کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ واحد و اَحد ہے۔ غیر فانی ہے، نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ وہ مختارِ مطلق، قادرِ مطلق، حکیم مطلق ہے، حی اور محی، احکم الحاکمین اور ربّ ہے۔ وہ اپنی خسروی و سلطانی میں لاثانی ہے۔ نہ وہ کسی سے مشابہ ہے، نہ کوئی اس کے مشابہ ہے۔'' [۲۲]

اس کے بعد البیرونی نے پتنجلی کی کتاب سے استاد اور شاگرد کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔ اور بھگوت گیتا کا ایک اقتباس بھی دیا ہے۔ اُن سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوؤں کا ابتدائی عقیدہ خدا کی ذات و صفات اور توحید کے متعلق کسی طرح اسلام کے عقائد سے مختلف نہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہندوؤں کے پرانے صحائف میں ہے وہ زیادہ تر مفسرین کی سہگل انگاریوں اور فلسفیوں کی موشگافیوں کا کرشمہ ہے۔ اصلی دھرم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ''ویدوں سے بتوں کا رواج اور پرستش کی چیزوں کے ظاہری نشان اور علامتیں قائم کرنے کا رجحان ثابت نہیں ہوتا۔'' [۲۳]

لیکن کچھ مدت بعد اپنشدوں کے فلسفہ اور منوسمرتی کی تقسیمات وغیرہ سے گوناگوں عقائد کا رواج شروع ہوا۔ ویدوں کو معرضِ تحریر میں لانے کا خیال کسی کو نہ آیا۔ بلکہ فضلائے مذہب اس کے مخالف تھے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ ویدوں کی اشاعت رُک گئی۔ اور مہا بھارت کی جنگ نے تو جہالت عام کر دی۔ ''انسانوں کی عقل میں فتور آ گیا۔ جس کے دل میں جیسا خیال آیا، ویسا اس نے مذہب چلایا۔ جب بڑے بڑے عالم، راجا، رشی، مہا رشی، مہا بھارت کی جنگ میں مارے گئے اور کچھ یوں مر گئے تو ویدوں کے علم اور آریا دھرم کی اشاعت بند ہو گئی۔ مذہب

خاص لوگوں کے قبضے میں آ گیا۔ جو من گھڑت عقیدوں کی تبلیغ کرنے لگے۔ برہمنوں نے اپنی روزی کا بندوبست کرنے کے لیے کھشتری اور دوسری قوموں کو یہ اپدیش دیا کہ ہم ہی تمہارے معبود ہیں۔ ہماری خدمت کے بغیر تم کو مکتی حاصل نہیں ہوگی۔'' [۲۴] منوسمرتی کے دوسرے ادھیائے میں بھی ویدوں کی دُور از کار تفسیر کی مذمت و ممانعت کی گئی ہے۔ اور اس حرکت کے مرتکبین کو ناستک (یعنی کافر) کہا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منو سے بھی پہلے ویدوں کو غلط معنی پہنانے والے موجود تھے۔

اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر ایک ایسا مذہب پیدا ہوگیا تھا جو صرف خواہشاتِ نفسانی پر مبنی تھا۔ اور جس میں شراب کی پوجا کی جاتی اور ایک برہنہ مرد کے ہاتھ میں تلوار دے کر اس کو مہادیو کہہ کر اور ایک ننگی عورت کو دیوی قرار دے کر اِن مرد اور عورت کی پوجا کی جاتی۔ [۲۵] غرض مذہب اس قسم کی اخلاق سوز رسوم کا شکار ہو رہا تھا۔

اس وقت اپنشدوں اور منوسمرتی کے رواج کی وجہ سے ہندو دھرم سات عقیدوں پر مشتمل تھا۔ اوّل ویدوں کا الہامی ہونا۔ دوم ویدک دیوتاؤں اندرا، ورونا، اور بعدِ وید پیدا ہونے وِشنو اور شو کی پرستش۔ سوم ویدک دیوتاؤں کے حضور میں قربانی۔ چہارم چار ورنوں کا قیام۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ پنجم چار آشرم یعنی انسانی زندگی کے حصے۔ برہمچر یہ آشرم، گرہست، آشرم وان پرست آشرم اور سنیاس آشرم۔ نجاتِ کُلّی صرف سنیاس آشرم پر موقوف ہے۔ برہمن یہ کہتے تھے کہ آخری دو آشرم صرف برہمنوں کے لیے مخصوص ہیں۔ برہمن یہ کہتے تھے کہ آخری دو آشرم صرف برہمنوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ششم آتما (روح) اور پرماتما (روحِ اعلیٰ) کا نظریہ۔ ہفتم کرم کا عقیدہ اور روح کے آواگون کا نظریہ (تناسخ)۔ [۲۶]

۱۰۰۰ قبل مسیح میں یہ عقائد عام تھے اور ویدک مذہب کے ماننے والوں میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، ان میں برابر اضافہ ہو رہا تھا کہ ان حالات کے تقاضے نے دو عظیم پیشوایانِ مذہب کو پیدا کیا۔ جینیوں کے مہاویر اور بودھیوں کے مہاتما بدھ جنھوں نے مندرجۂ بالا عقائد میں سے پہلے پانچ کو بالکل رد کر دیا۔ اس کے علاوہ بُدھ نہ آتما کو مانتے تھے نہ پرماتما کو۔ کم از کم اتنی بات ضرور ہے کہ وہ اپنے پیرووں کو ان دونوں کے متعلق غور کرنے سے منع کرتے تھے۔ اُنھوں نے ویدک دیوتاؤں کو ختم کر دیا۔ قربانی ممنوع قرار دی۔ ذات پات کے امتیاز کو مٹا دیا۔ برہمنوں کے اقتدار کو خاک میں ملا دیا اور سنسکرت کے بجائے عوام کو اُن کی مادری زبانوں میں تعلیم دی۔

شروع کی۔ ایک طرف تو عوام برہمنوں اور کھشتریوں کے مظالم سے تنگ آ رہے تھے اور ہزاروں دیوتاؤں کی پرستش نے ان کے دماغوں کو مختل کر رکھا تھا۔ دوسری طرف بُدھ مت کو اشوک جیسے عالی ہمت مہاراجا کا تعاون حاصل ہو گیا۔ جس نے اپنی سلطنت بنگال سے کابل تک وسیع کر لی تھی۔ الناس علی دین ملوکھم۔ اشوک اور کنشک اور ہرش کی عظمت نے بدھ مت کو ملک بھر میں مقبول بنا دیا۔ اور بودھیوں اور جینیوں نے مل ملا کر ویدوں کو ملک سے تقریباً نابود کر دیا۔

ہرش (۶۷۸ء) کے زمانے میں مشہور چینی سیاح ہیون سانگ ہندوستان آیا۔ وہ کم و بیش پندرہ سال یہاں رہا۔ وہ بدھ مت کا پیرو تھا۔ اُس وقت ہندوستانیوں کی اکثریت بدھ مت اختیار کر چکی تھی۔ لیکن جا بجا پرانے برہمنی مذہب کی ماننے والے بھی آباد تھے۔ اور بدھ مہاراجاؤں کی رواداری حکمتِ عملی نے ان کو کبھی دُکھ نہ دیا تھا۔ ہیون سانگ کا بیان ہے کہ اس وقت کابل، بدخشاں، بلخ میں بدھ مت اور بودھیوں کی حکومت تھی۔ قندھار اور بلوچستان میں آتش پرستوں کا دَور دورہ تھا۔ غالباً یہ ایران کے قرب کی وجہ سے ہوگا۔ کشمیر، پنجاب، سندھ، گجرات، مالوہ، متھرا، تھانیسر، قنوج، بنارس، پٹنہ، بنگال، کامروپ (آسام)، اڑیسہ، کالنگا (مدارس)، اندھرا، مہاکوشل (سی پی)، مہاراشٹر، کوکن، مدورا (ٹراونکور)۔ غرض جہاں کہیں ہیون سانگ گیا، اس کو بودھیوں کی حکومت اور بدھ مت ہی کا چرچا نظر آیا۔ نالندا کے وِہار (خانقاہ) میں اسے صد ہا دیارتھی اور پاٹھک ملے۔ جن کی تعلیم و تدریس میں تبرکاً وہ بھی شامل ہوا۔ وہ بے شمار بودھ مندروں اور مدرسوں میں گیا۔ غرض اس کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوائے چند جنوبی علاقوں کے جہاں جَین مت کے آثار تھے۔ اُسے ہندوستان بھر میں بدھ مت ہی کا اقتدار نظر آیا۔ اور ہر جگہ اس کی انتہائی خاطر مدارات ہوئی۔ [۲۷]

ہندوستان کا یہ مذہبی نقشہ ہرش کے زمانے میں تھا۔ یعنی محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ سے صرف اَسّی نوے برس پہلے یہ کیفیت تھی۔ ہرش کے آنکھ بند کرتے ہی خدا جانے کیا انقلاب آیا کہ ایک دم ملک کے تمام حصوں میں راجپوتوں کی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ اور بدھ مت اور جَین مت کی خاک اُڑ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ برہمن اس بُدھ گردی کے زمانے میں سر لپیٹے پڑے رہے۔ لیکن غافل نہیں رہے۔ ہرش کے اقتدار کی وجہ سے انھیں کسی عام تحریک کی جرأت تو نہ ہوئی۔ لیکن وہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتے رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ سے خود بدھ مت میں بھی فرقہ بندی، اوہام پسندی اور بت پرستی کی خرابیاں بدرجۂ اتم پیدا ہو چکی تھیں۔ اہنسا

کے عقیدے نے بودھیوں کو قوتِ دفاع سے بالکل ہی عاری کر دیا تھا۔ اور راجپوت بڑے بہادر اور جنگ جُو تھے۔ اُنھوں نے برہموں کو ساتھ ملا کر ہندو دھرم کو از سرِ نو زندہ کیا اور بودھوں کو تہس نہس کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدھ مت اپنے مؤلد یعنی ہندوستان میں ناپید ہو گیا۔ اور صرف چین و ماچین کا مذہب بن کر رہ گیا۔ بُدھ مت نے جن اوہام و امتیازات سے ملک کو نجات دلائی تھی، وہ سب عَود کر آئے۔ برہمن نے اقتدار کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی کھشتری، ویش، شودر کو بدستور غلام بنا لیا۔ اور ادنیٰ درجے کی ذاتوں کے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ علاوہ بریں وہی شِو، وشنو، گنیش، بھیروں، کرتک (عشق کا دیوتا)، یم (موت کا دیوتا)، آسمان، پانی، آگ، سانپوں اور بھتوں کی پرستش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔[۲۸]

یہ سلسلہ روز افزوں ہوتا رہا۔ اور ملک میں بے شمار مورتیاں مندروں میں نصب کر دی گئیں۔ ملتان میں سورج کا مندر آدتیہ، تھانیسر میں چکر سوامی، کشمیر میں شاردا، سومناتھ میں مہادیو کے لِنگ (عضوِ تناسل) اور بے شمار دوسرے بتوں کی زور شور سے پوجا ہونے لگی۔ اور چار چار اور آٹھ آٹھ ہاتھوں کے دیوتا ہر جگہ نظر آنے لگے۔ پھر جتنے بت تھے، اُن سے زیادہ فرقے اور مت تھے۔ غرض بُدھ اور جین مت نے ہزار بارہ سو برس کی مدت میں بت پرستی اور اوہام پسندی کا جو قلع قمع کیا تھا، وہ بالکل بے کار ہو گیا۔ اور ہندوستان کے لوگ عقیدے کے اعتبار سے الآن کما کان ہو کر رہ گئے۔

ادریسی نے بارہویں صدی عیسوی میں اپنی کتاب نزہۃ المشتاق لکھی۔ اُس وقت بھی ہندوستان کے مذاہب کی کثرت کا یہ حال تھا کہ:

ہندوستان کی بڑی بڑی قوموں میں ۴۲ فرقے ہیں۔ بعض ایک خالقِ کائنات کے وجود کو مانتے ہیں۔ لیکن پیغمبروں سے منکر ہیں۔ بعض دونوں ہی سے انکار کرتے ہیں۔ بعض فرقے پتھر کے بتوں کی شفاعت کے قائل ہیں۔ اور بعض ایسے پتھروں کو پوجتے ہیں جو مکھن اور تیل سے چپڑے جاتے ہیں۔ بعض آگ کے پجاری ہیں۔ اور اپنے آپ کو آگ میں ڈال دینے سے بھی باز نہیں رہتے۔ بعض آفتاب کی عبادت کرتے ہیں اور اس کو کائنات کا خالق و ہادی تصور کرتے ہیں۔ بعض درختوں کے آگے جھکتے ہیں۔ بعض سانپوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اور ان کو اپنے گھروں میں رکھ کر کھانا پلانا موجبِ ثواب جانتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے بھی ہیں جو ہر عقیدے کے منکر ہیں اور کسی ہستی کی عبادت نہیں کرتے۔[۲۹]

جہاں اتنے مَت اور فرقے ہوں۔ وہاں رسوم کی افراط، معاشری پیچیدگیاں اور اخلاقی خرابیاں لازمی و لابدی ہیں۔ آئندہ فصلوں میں ہم بتائیں گے کہ اس صورتِ حالات کا اثر ہندوؤں کی عام زندگی پر کیا تھا۔ اور وہ کن کن گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا تھے۔

چوتھی فصل: نظامِ معاشرت

اگرچہ بدھ مت نے ذات پات یعنی ورن آشرم کے نظام کو توڑ تاڑ کر تمام ہندوؤں کو مساواتِ انسانی کی تعلیم دی تھی۔ اور صدیوں تک بودھ مہاراجاؤں نے اس مساوات کو عملی صورت دینے کی کوشش جاری رکھی۔ لیکن ویدک دھرم اس قدر سخت جان ثابت ہوا کہ جونہی اقتدارِ خسروی بودھوں کے ہاتھ سے نکلا، ویدک دھرم کی تمام خصوصیات پھر فعال ہوگئیں۔ ورن آشرم پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نمودار ہوگیا۔ اور پوری ہندو قوم ذاتوں، ذیلی ذاتوں اور گوتوں میں بٹ کر پارہ پارہ ہوگئی۔

ہندوؤں کے سات طبقے

ابنِ خورداذبہ نے اپنی کتاب نویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی تھی۔ اس میں وہ لکھتا ہے۔ ”ہندوؤں میں سات طبقے ہیں۔ اوّل: شاکثریہ (اونچے کھشتری) جن میں اونچی ذات کے لوگ شامل ہیں۔ اور انہی میں سے راجا منتخب کیے جاتے ہیں۔ دوسرے چھ طبقوں کے لوگ صرف اسی طبقہ اُولےٰ کے آگے سرِ اطاعت خم کرتے ہیں۔ دوم: برہمن جو ہر قسم کی شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ سوم: کتاریہ (کھشتری) جو شراب کے تین پیالوں سے زیادہ نہیں پیتے۔ برہمنوں کی بیٹیاں اس طبقے کے لوگوں کو نہیں دی جاتیں۔ البتہ برہمن اُن کی بیٹیوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ چہارم: شودریہ۔ جن کا پیشہ کاشتکاری ہے۔ پنجم: بیسوریہ (ویش) جو اہلِ حرفہ اور ملازم پیشہ ہیں۔ ششم: سندالیہ (چنڈال) جو ادنیٰ درجے کی خدمات بجا لاتے ہیں۔ ہفتم: لاہوڑ (بازی گر وغیرہ) ان کی عورتیں ہار سنگار کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ اور مرد تفریحات اور کھیلوں کے شائق ہوتے ہیں۔ ہند میں بیالیس مذہبی فرقے ہیں۔ بعض خالقِ کائنات اور پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ بعض پیغمبر کی ضرورت کے منکر ہیں اور بعض دہریے ہیں۔[۳۰]

ادریسی نے نزہتہ المشتاق میں ابنِ خورداذبہ کے بیان کی تائید کی ہے۔ اور وہ بھی

کھانے پینے کی پابندیاں

مسلمان اور ہندو مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ برہمن شراب سے پرہیز کرتے تھے۔ البتہ بعض جانوروں کا گوشت کھاتے تھے۔ ہندوؤں کی گوشت خوری کا قصہ یہ ہے کہ شمال میں پنجاب، کشمیر، کابل وغیرہ کے ہندو ہمیشہ گوشت کھاتے رہے۔ باقی ملک کے ہندو بدھ اور جَین مت سے پہلے گوشت کھاتے تھے۔ لیکن ان مذاہب کے زیرِ اثر مجتنب ہو گئے۔ کھشتری عام طور پر گوشت خور تھے۔ بدھ مت اور جَین مت کے کمزور ہو جانے کے بعد بھی ہندوؤں کی خاصی آبادی گوشت خوری سے پرہیز کرتی رہی۔ قدیم ہندو تو گائے کا گوشت بھی کھا لیتے تھے۔ اور سوختنی قربانیوں کا رواج عام تھا۔ جن میں گائے اور دوسرے جانوروں کا گوشت دیوتاؤں کی نذر کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ قربانیاں ختم ہو گئیں۔ البیرونی کے بیان کے مطابق بھیڑ، بکری، ہرن، خرگوش، گینڈا، بھینس، مچھلی اور بعض پرندے ہندوؤں کے لیے حلال تھے۔ البتہ گائے، گھوڑا، خچر، گدھا، اونٹ، ہاتھی، خانگی مرغیاں، کوّا، طوطا، بلبل اور ہر قسم کے انڈے ممنوع تھے۔ شراب پینے کی اجازت شودروں کو دے دی گئی تھی۔ لیکن انہیں شراب اور گوشت بیچنے کی اجازت نہ تھی۔ اگلے زمانے میں بعض علاقوں کے برہمن اور کھشتری اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ لیکن جب ذاتوں کی تقسیم انتہا کو پہنچ گئی اور مناکحت ترک کر دی گئی تو مواکلت بھی ختم ہو گئی۔ بڑی ذاتوں کے لوگ صرف اپنی ذات کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ دوسری جاتیوں کے ساتھ کھان پان ناقابلِ تصور تھا۔ البیرونی لکھتا ہے کہ ہندو کھانا کھانے سے پہلے شراب پیتے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوہ اس زمانے میں صرف کھشتریوں تک مخصوص تھا۔ اور شودر اور چنڈال وغیرہ تو ان پابندیوں سے بالکل ہی آزاد تھے۔ ان کی شراب خوری پر کوئی معترض نہ ہوتا تھا۔

گائے کا گوشت تمام ہندوؤں پر حرام ہو جانے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ جَین مت اور بدھ مت نے اہنسا کی تعلیم دی تھی۔ اس کے علاوہ ممکن ہے گائے اور بیل کے اقتصادی فوائد کے پیشِ نظر ہندو قوم کے رہنماؤں نے ان کے تحفظ کی یہ تدبیر کی ہو۔

قانون و سزا

ہندوؤں کی عدالتوں میں سماعتِ مقدمہ کا انداز وہی تھا جو اُس زمانے میں دُنیا بھر میں

رائج تھا۔ مدعی یا مستغیث تحریری دعویٰ پیش کر کے اس کے ثبوت مہیا کرتا۔ اور گواہ اس کی تائید کرتے۔ اسی طرح فریقِ ثانی کے بیان اور شہادت کو سُن کر حاکمِ عدالت فیصلہ صادر کرتا لیکن قسموں اور آزمائشوں کا رواج بہت زیادہ تھا۔ مثلاً مدعی اگر اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکتا تو مدعا علیہ کو قسم کھانی پڑتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مدعی سے بھی حلف کا مطالبہ کرتا اور کہتا کہ اگر تم اپنے دعوے کی صداقت پر قسم کھا لو تو میں تمہارے دعوے کے مطابق رقم ادا کر دوں گا۔ اگر مدعی اس بات پر رضامند ہو جاتا کہ مدعا علیہ حلف اُٹھا لے تو وہ پانچ فاضل برہموں کے سامنے قسم کھاتا۔

آزمائشوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔ ملزم یا مدعا علیہ سے کہا جاتا کہ فلاں زہر پی لو۔ اگر تمہارا بیان سچ ہوگا تو وہ زہر تم کو ہلاک نہ کرے گا۔

ایک اور آزمائش یہ تھی کہ وہ شخص گہرے اور بہتے ہوئے دریا کے کنارے یا کسی عمیق کنوئیں پر لایا جاتا۔ پھر وہ اُس پانی سے مخاطب ہو کر کہتا کہ ”تو چونکہ پوتر دیوتاؤں کی ملکیت ہے اور ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ اس لیے اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھے ہلاک کر دے۔ اور اگر سچا ہوں تو میری حفاظت کر۔“ اس کے بعد پانچ آدمی اس کو گھیر کر پانی میں پھینک دیتے۔ عقیدہ یہ تھا کہ اگر اس کا بیان سچ ہے تو وہ نہیں مرے گا۔

ایک اور طریقہ یہ تھا کہ جج مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو اس علاقے کے سب سے بڑے اور مقدس مندر میں بھیج دیتا۔ وہاں مدعا علیہ ایک دن کا برت رکھتا اور دوسرے دن صاف ستھرے کپڑے پہن کر مدعی کے ساتھ اس مندر میں کھڑا ہو جاتا۔ پجاری مندر کی مورتی پر پانی ڈالتے اور مورتی کا غسالہ اس کو پلاتے۔ اگر وہ جھوٹا ہوتا تو وہ فی الفور خون کی قے کر دیتا۔

ایک اور آزمائش یہ تھی کہ مدعا علیہ ایک ترازو میں تولا جاتا۔ پھر وہ آسمانی ہستیوں، دیوتاؤں اور اوتاروں کو ایک ایک کر کے اپنی صداقت پر گواہ کرتا۔ اور کاغذ کے ایک پرچے پر اُن سب کے نام لکھ دیتا۔ وہ کاغذ کا پرچہ اس کے سر سے باندھ دیا جاتا۔ اور اس کے بعد وہ دوبارہ ترازو میں تولا جاتا۔ اگر وہ سچا ہوتا تو اس دفعہ اُس کے وزن میں اضافہ ہو جاتا۔

ایک طریقہ یہ تھا کہ مکھن اور تِلوں کا تیل ہم وزن مہیا کرتے۔ اس کو ایک دیگچی میں ڈال کر جوش دیتے اور اس میں ایک پتا ڈال کر دیکھتے۔ اگر وہ پتا گرم تیل اور مکھن میں پڑ کر جل جاتا تو سمجھ لیتے کہ اب جوش مکمل ہو چکا ہے۔ پھر سونے کی ایک اشرفی اس میں ڈال دیتے اور

مدعا علیہ سے کہتے کہ اس میں ہاتھ ڈال کر اشرفی نکال لے۔ اگر وہ سچا ہوتا تو اشرفی نکالنے میں کامیاب ہو جاتا۔

سب سے بڑی آزمائش یہ تھی کہ مدعا علیہ کے ہاتھ پر پہلے چاول کے دھان بکھیرتے۔ پھر اس پر کسی درخت کا چوڑا سا پتا رکھ دیتے۔ اس کے بعد لوہے کا ایک ٹکڑا جو آگ پر تپا کر سرخ کیا جاتا تھا، اس پتے پر رکھ دیتے اور مدعا علیہ سے کہتے کہ اس ٹکڑے کو ہتھیلی پر اُٹھائے سات قدم چلو۔ اور پھر پھینک دو۔ اگر اس کی ہتھیلی کو کوئی نقصان نہ پہنچتا تو وہ سچا سمجھا جاتا۔[۴۱]

قتل اور چوری

اگر کوئی برہمن کسی دوسری ذات کے آدمی کو قتل کر دیتا تو اُس کو صرف برت، پرارتھنا اور دان پُن کرنا پڑتا۔ اس کے سوا اُسے کوئی سزا نہ دی جاتی۔ اگر کوئی برہمن دوسرے برہمن کو ہلاک کر ڈالتا تو کہا جاتا کہ وہ اپنے جرم کی جواب دہی اگلے جہان میں کرے گا۔ کیوں کہ کوئی پرائشچت (کفارہ) برہمن کے قتل کے جرم کو دھو نہیں سکتا۔ دوسرے جرائم یہ تھے۔ گؤ ہتھیا، شراب خواری، زنا کاری (خاص کر اپنے باپ کی بیوی یا گرو کی استری کے ساتھ) لیکن کوئی راجا ان جرائم کی وجہ سے کسی برہمن یا کھشتری کو سزائے موت نہ دیتا تھا بلکہ اس کی جائداد ضبط کر کے اسے ملک بدر کر دیتا تھا۔ اگر ویش اور شودر اپنی ذات کے کسی شخص کو قتل کر دیتے تو انھیں بھی پرائشچت کرنا پڑتا۔ لیکن راجا بھی ان کو سزا دیتے تا کہ وجہِ عبرت ہو۔ چوری کی سزا چوری کے مال کی مالیت کے پیشِ نظر کم و بیش ہوتی تھی۔ اگر مالیت بہت زیادہ ہوتی تو راجا برہمن چور کو اندھا کر دیتا اور اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں کاٹ دیتا۔ کھشتری چور صرف اندھا نہیں کیا جاتا تھا۔ باقی پوری سزا اسے دی جاتی تھی۔ بدکار عورت کو خاوند کے گھر سے نکال کر ملک بدر کر دیتے۔[۴۲]

عمومی شعار

البیرونی ایک ایسا مسلمان مصنف ہے جو ہندو مؤرخین کے نزدیک معتبر ترین ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے بلا کم و کاست نہایت دیانت سے لکھ دیتا ہے۔ اور اس نے اپنی کتاب کے ذریعے سے ہندوؤں کی تاریخ اور اُن کے علوم کو دُنیا بھر سے متعارف کرایا ہے۔ وہ

سالہا سال تک ہندوستان میں رہا۔ سنسکرت کی تحصیل میں محنتِ شاقہ برداشت کی اور ملک کی سیاحت کر کے ہندوؤں کے حالات فراہم کیے۔ اب سنیے کہ وہ عام ہندوؤں کے اسلوبِ زندگی کے متعلق کیا لکھتا ہے:

''یہ لوگ اپنے جسم کے کسی حصے کے بال نہیں تراشتے۔ ابتدا میں گرمی کی شدت کے باعث بالکل ننگے رہتے تھے اور سر کے بال اس لیے نہ تراشتے تھے کہ لُو لگنے سے محفوظ رہیں۔ وہ اپنی مونچھوں کو ایک ایک لٹ میں تقسیم کرتے ہیں تا کہ وہ محفوظ اور برقرار رہیں۔ موئے زہار دُور نہ کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کو مونڈنے سے شہوت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ناخنوں کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتے بلکہ مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ان ناخنوں سے اپنے سروں کو کھجاتے ہیں اور بالوں سے جوئیں نکالتے ہیں۔

ہندو الگ الگ کھانا کھاتے ہیں۔ چوکا گوبر سے لیپتے ہیں۔ بچا کھچا کھانا کوئی نہیں کھاتا۔ اگر مٹی کی رکابیوں میں کھانا کھائیں تو کھانے کے بعد انھیں پھینک دیتے ہیں۔ ان کے دانت مسلسل پان کھانے کی وجہ سے سرخ رہتے ہیں۔ وہ خالی معدے پر شراب پیتے ہیں اور اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ گائے کا پیشاب پی لیتے ہیں لیکن اس کا گوشت نہیں کھاتے۔

ہندو پاجامے کی جگہ پگڑی استعمال کرتے ہیں۔ (یعنی دھوتی باندھتے ہیں)۔ ان میں سے جو لوگ قلیل لباس پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں، وہ دو انگلی کی ایک دھجی آگے رکھ کر اپنی کمر سے دو ڈورے باندھ لیتے ہیں (یعنی لنگوٹی)۔ اور جو زیادہ لباس کے قائل ہیں وہ ایسے پاجامے پہنتے ہیں جن میں بے اندازہ روئی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ ان پاجاموں کا کوئی حصہ کھلا نہیں دکھائی دیتا۔ اور یہ اتنے بڑے ہوتے کہ ان میں پاؤں بھی چھپ جاتے ہیں۔ ان پاجاموں کا ازار بند پُشت کی طرف ہوتا ہے۔

ان کا ایک کپڑا شیدار کہلاتا ہے۔ جو سر، چھاتی اور گردن کے بالائی حصے کو ڈھانپتا ہے۔ اس کی شکل بھی پاجامے ہی کی سی ہوتی ہے اور اس کے بوتام بھی پشت کی طرف ہوتے ہیں۔''[۴۳]

ہندوؤں کے بہت سے فحش شعاروں کا بیان کرنے کے بعد البیرونی لکھتا ہے کہ ہندو جب مصافحہ کرتے ہیں تو آدمی کے ہاتھ کو اُلٹی طرف سے پکڑتے ہیں۔ وہ کسی مکان میں داخل ہوتے وقت اجازت طلب نہیں کرتے لیکن وہاں سے جاتے وقت اجازت مانگتے ہیں۔ اپنے

جلسوں میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بزرگوں کے سامنے بے تکلف تھوکتے اور ناک صاف کرتے ہیں اور جوئیں نکال نکال کر مارتے رہتے ہیں۔ وہ صدور ریخ کو فالِ نیک اور چھینک کو فالِ بد سمجھتے ہیں۔[۴۴] وغیرہ

فاحشہ عورتیں

البیرونی کا بیان ہے کہ ہندو فاحشہ عورتوں کے پیشے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور ہندوستان میں فحش کاری کی کوئی سزا نہیں۔ مسٹر ویدیا اس کی تائید کرتے ہیں۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ "اس میں شک نہیں تمام مندروں میں پیشہ ور عورتیں ناچنے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کیے ہوئے تھیں۔ خاص کر شِو جی کے مندروں میں یہ رسم عام تھی۔ اور راجا ان مندروں سے خاصی آمدنی حاصل کرتے تھے۔" البیرونی کا بیان ہے کہ اس معاملے میں قصور قوم کا نہیں، بلکہ راجاؤں کا ہے۔ اگر راجاؤں کے حکم کی مجبوری نہ ہوتی تو کوئی برہمن یا پجاری اس کو گوارا نہ کرتا کہ اس کے مندر میں فاحشہ عورتیں ناچیں اور گائیں۔ راجا ان عورتوں کو محض اس لیے روا رکھتے ہیں کہ ان کی رعایا تفریح کی غرض سے جوق در جوق مندروں میں جائے اور حکومت کے لیے مالی منافع کا باعث ہو۔ اس کاروبار میں جرمانوں اور ٹیکسوں سے جتنی رقم وصول ہوتی ہے، راجا اسے اپنے فوجی مصارف کے لیے کام میں لاتے ہیں۔[۴۵]

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندو قوم کی معاشرتی حالت کیا تھی۔ اور ذات پات، شادیوں، قانون کی بوالعجبیوں اور رہنے سہنے کے اسالیب میں وہ عام تہذیب و شائستگی سے کتنے دُور تھے۔

پانچویں فصل: اخلاقی حالت

برہمن کی برتری

زمانۂ قدیم کے ہندو بزرگوں نے بلاشبہ اخلاقِ عالیہ کی تعلیم دی جس کا سراغ ویدوں اور سمرتیوں میں ملتا ہے۔ اور اس زمانے کے لوگ بھی نیکی اور سعادت سے بہرہ ور تھے۔ لیکن جب منوسمرتی نے انسانوں کی تدریجی تقسیم کا ناپاک اصول رائج کر دیا۔ اور برہمن، کھشتری، ویش، شودر کے علاوہ ملیچھ اور چنڈال وغیرہ کے علیحدہ گروہ بھی قائم کر دیئے تو بے تکلف کہا جا سکتا

ہے کہ اسی دن سے ہندو مذہب اور ہندو اخلاق کی تباہی کی بنیاد پڑ گئی۔ برہمنوں کو بالکل دیوتاؤں کا ہم پلہ قرار دے دیا گیا اور دوسری ذاتوں کو ان کے مقابلے میں پست اور ذلیل بنا دیا گیا۔ منوجی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دُنیا میں برہمن سے زیادہ برتر کوئی نہیں ہے۔ وہ دھرم کی مورت، نجات کا حقدار اور دھرم کے خزانے کا محافظ ہے۔ اور دُنیا میں جو کچھ ہے سب برہمن کے لیے ہے۔[۴۶] برہمن، کھشتری، ویش تینوں میں سے کوئی اگر برہمن کو مار ڈالنے کی نیت سے ہاتھ اُٹھائے اور مارے نہیں۔ جب بھی سو برس تک نرک (دوزخ) میں رہے گا۔ اور اگر غصہ کر کے ایک تنکے سے بھی برہمن کو مارے تو اکیس جنم تک کتے اور گدھے کی جُون میں پیدا ہوتا ہے۔ ہتھیار وغیرہ کا زخم لگنے سے برہمن کے بدن سے جو خون نکل کر زمین پر بہتا ہے، اس خون سے جتنے ذرّے آلودہ ہوتے ہیں، اتنے برس تک وہ خون بہانے والا اگلے جہان میں کتے اور گیدڑ سے بھوجن کرتا ہے۔[۴۷] زنا بالجبر کی سزا قطعِ عضوِ تناسل ہے۔ لیکن برہمن کو یہ سزا بھی نہ دی جائے۔ کیونکہ اس کو سزائے جسمانی دینا قطعاً ممنوع ہے۔[۴۸] راجاؤں کو بیسیوں احکام دیے گئے ہیں، جن میں برہمن کی انتہائی خدمت و مدارات کی تاکید کی گئی ہے۔ عام ہندوؤں کو ہدایت کی گئی ہے کہ برہمنوں کو خوب کھلائیں پلائیں۔ برہمن کو حق حاصل ہے کہ وہ غلام شودر کے پاس کوئی دولت پائے تو بلا تامل چھین لے، کیونکہ وہ دولت شودر کی ملکیت نہیں ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام رعایات صرف اُن برہمنوں ہی کے لیے نہیں جو علم و فضل کے مالک ہیں، بلکہ جاہل اور مورکھ برہمن بھی ان کا مستحق ہے۔

شودر کی شامت

کھشتری اور ویش بہرحال برہمنوں سے ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن شودر کی ذلت تو کوئی انتہا نہیں رکھتی۔ شودر برہمن کا پس خوردہ کھائے۔ شودر مہینے میں صرف ایک دفعہ حجامت بنوائے۔ شودر کسی برہمن کو چور کہے تو اس کے جسم کا کوئی عضو کاٹ دینا چاہیے۔ شودر کسی برہمن، کھشتری اور ویش کے ساتھ سخت کلامی کرے تو اس کی زبان میں سوراخ کر دیا جائے۔ اگر شودر کسی برہمن کا نام لے کر کہے کہ تو فلاں برہمن سے نیچ ہے تو اس شودر کے منہ میں بارہ انگل کی آہنی میخ آگ میں سرخ کر کے ڈالی جائے۔ اگر چھوٹی ذات کا آدمی بڑی ذات کے آدمی کے ساتھ ایک آسن پر بیٹھے تو اس کا چوتڑ کاٹ ڈالنا چاہیے۔ اس طرح کہ وہ مرے نہیں۔ شودر کسی

برہمن کے بال یا پاؤں یا ڈاڑھی پکڑے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ شودر کو کوئی صلاح و مشورہ نہ دو۔ دھرم اور برت کی تلقین بھی نہ کرو۔ جو شودر دھرم کی تلقین کرتا ہے، وہ بدترین دوزخ میں جاتا ہے۔[۴۹]

بُدھ مت اور جَین مت

یہ اور اس قسم کے بے شمار احکام منوسمرتی میں موجود ہیں۔ صدہا سال تک اُن پر عمل ہوتا رہا۔ بلکہ برہمن کو وہ وہ رعایتیں دی گئیں اور شودر کو ایسی ایسی ذلتوں اور اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا کہ ان کا سراغ سمرتیوں میں بھی نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دھرم کے اس ظالمانہ نظام کے خلاف عام بغاوت ہوگئی۔ اور بدھ مت اور جَین مت پیدا ہو گئے جنھوں نے ویدک دھرم، ورن آشرم، ظلم و تشدد اور اوہام پرستی کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔ اور اہلِ ہند کو مساوات کا پیغام دیا۔ بعض بڑے راجاؤں نے بدھ مت قبول کر کے پھیلانا شروع کر دیا۔ ہندو مندروں کو نابود کر دیا۔ اور صدہا سال تک برہمن کو اُٹھنے نہ دیا۔ لیکن برہمن اور اس کا دھرم ایسا سخت جان نکلا کہ جوں ہی بدھ مت والے بھی مورتی پوجا اور دوسری بے اعتدالیوں کا شکار ہونے لگے۔ برہمن نے کروٹ لی اور ازسرِ نو برہمنی دھرم کو زندہ کر لیا۔ ہرش کے انتقال کے ساتھ ہی برہمن نے راجپوتوں کی پیٹھ ٹھونکی اور راجپوتوں نے پھر برہمن دیوتا کو اپنا گورو بنا لیا۔ غرض ہندوستان ایک دفعہ اور اسی گڑھے میں گر گیا جس سے مہاتما بدھ اور مہاویر نے اس کو نکالا تھا۔

اخلاق کی بربادی

سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں لکھا ہے کہ حقیقت میں ہندوؤں کی خرابی کے آثار مہابھارت کی جنگ سے ایک ہزار سال پیشتر ہی رونما ہو چکے تھے۔ اور اس جنگ نے تو اس ملک کو ایسا دھکا دیا کہ یہ اب تک اپنی اصلی صورت پر نہیں آیا۔ جب بڑے بڑے عالم، رشی، مہارشی، راجا مہاراجا اس جنگ میں مارے گئے۔ اور کچھ یوں مر گئے تو وید اور دھرم کی اشاعت بند ہونے لگی۔ اس کے بعد ہندوستان کی اخلاقی حالت کو بھی صدمہ پہنچا اور اس میں بداخلاقی، بدچلنی اور عیاشی کا دَور شروع ہو گیا۔

مہابھارت کی جنگ کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں بغض و حسد اور عداوت و منافرت عام تھی۔ جعل سازی اور دغابازی کا بازار گرم تھا۔ جوا دھڑلے سے کھیلا

جاتا تھا جس میں بیویاں اور سلطنتیں تک داؤ پر لگا دی جاتی تھیں۔ اچھی خاصی عالی خاندان عورتیں بیک وقت پانچ پانچ خاوند کر لیتی تھیں۔ ہندوستان کے تمام وہ لوگ جن کو عوام کے لیے نمونہ بننا چاہیے تھا، یعنی عالم و فاضل برہمن اور جاں باز کھشتری، سب کے سب نہایت بے دردی سے ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بقول سوامی دیانند اس زمانے کے حریص وطماع مذہبی پیشوا یعنی برہمن اپنے چیلوں کو گمراہ کرنے لگے۔ یہ ''پوپ'' اپنے پاؤں کی پوجا کرانے لگے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ جب یہ لوگ نفس پرستی میں غرق ہو کر اور جھوٹے گرو بن کر چیلے پھنسانے لگے تو علم، طاقت، عقل، بہادری وغیرہ نیک اوصاف سب برباد ہوتے چلے گئے۔

جنسی آزادی اور مذہب

اب ان خود غرض لوگوں نے ایسے باطل مذہبوں کی تلقین شروع کی جس سے کوئی بداخلاقی گناہ نہ رہی۔ زنا کاری کی نہ صرف عام اجازت دے دی گئی بلکہ ایک خاص موقع ''بھیرویں چکر'' پر شراب خوری اور زنا کاری مذہبا فرض قرار دی گئی۔ اس موقع پر مرد عورت سب ایک جگہ جمع ہوتے۔ مرد ایک عورت کو مادر زاد برہنہ کر کے پوجا کرتے اور عورتیں کسی مرد کو ننگا کر کے پوجتیں۔ اس موقع پر شراب پی جاتی۔ اور بدمست ہو کر کوئی کسی کی عورت کو، کوئی اپنی یا کسی دوسرے کی لڑکی کو، کوئی کسی اور کی یا اپنی ماں، بہن، بہو وغیرہ کو (جو وہاں موجود ہوتی) پکڑ لیتا اور جس کے ساتھ چاہتا بدفعلی کر سکتا تھا۔ اس مذہبی تقریب کے علاوہ عام طور پر زنا کاری کے لیے ایک خاص فقرہ مقرر کیا گیا تھا جس کو پڑھ کر ہر مرد عورت ''سماگم'' (ہم بستری) کر سکتے تھے۔ اور ایسی بدکاری میں کسی رشتے کے لحاظ کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ شراب خوری تو جائز تھی ہی۔ لیکن ایک خاص تیوہار کے روز اتنی شراب پینا کہ آدمی بے ہوش ہو کر گر جائے، نجات کا باعث سمجھا جاتا تھا۔[۵۰]

نفرت انگیز جنسیت

مسلمانوں کے ورود کے وقت ہندوؤں کے عام اخلاق کی یہ کیفیت تھی کہ شِو جی کے ماننے والے جابجا اُن کے لِنگ (عضوِ مخصوص) کی پوجا کر رہے تھے۔ خود سومناتھ کے مندر میں بھی ''لِنگ'' ہی نصب تھا اور اب تک نصب ہے۔ تمام مندروں میں ہزاروں دیوداسیاں رقص و

سرود میں مصروف رہتیں اور وہ سب مندر نقش کاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ البیرونی نے اس ادارے کی ذمہ داری راجاؤں پر ڈالی ہے۔ ممکن ہے یہی صحیح ہو لیکن حقیقت میں اس کے بڑے ذمہ دار برہمن تھے۔ جو مطمئن تھے کہ اس دل فریبی کی وجہ سے عام لوگ کشاں کشاں مندروں میں آ جاتے ہیں اور برہمن کا الّو سیدھا ہو رہا ہے۔ عام طور پر زنا کاری جرم نہ سمجھی جاتی تھی۔ گو بعض راجا زیادہ شدید نوعیت کے جرائم سیاہ کاری کی کسی قدر سزا دے دیا کرتے تھے۔ ادریسی نے لکھا ہے کہ بلہرا کے ملک میں (جس سے بنگال سے لے کر گجرات تک کا پورا ملک مراد ہے)۔ بیاہی ہوئی عورتوں کے سوا سب سے عارضی تمتع کی اجازت ہے۔ گویا ہر شخص کو اپنی بیٹی، اپنی بہن اور اپنی خالاؤں اور پھپھیوں سے مجامعت کرنے کا اختیار ہے، بشرطیکہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔[۵۱]

سود، قمار، شراب

سوامی دیانند ''ستیارتھ پرکاش'' میں بار بار ذکر کرتے ہیں کہ ہندوؤں میں قمار بازی اور سود خوری عام تھی۔ یہ یقیناً صحیح ہوگا، اس لیے کہ قمار بازی کا ذکر تو مہا بھارت میں بھی موجود ہے۔ اور سود خوری کے احکام منوسمرتی میں مندرج ہیں۔ مثلاً سود کی شرح سوا روپیہ فی صدی ماہانہ مقرر کرنی چاہیے۔ فی صدی دو روپیہ ماہانہ لینا بھی گناہ نہیں۔ برہمن سے دو روپیہ فی صدی ماہانہ، کھشتری سے تین روپیہ، ویش سے چار روپیہ اور شودر سے پانچ روپیہ فی صدی ماہانہ سود لینا چاہیے۔ ویش کا کام کھیتی کرنا، سود لینا اور چار پایوں کی پرورش کرنا ہے۔[۵۲] ہندوؤں نے منوسمرتی کے دوسرے احکام پر شاید کم و بیش عمل کیا ہو، لیکن اس حکم کی تعمیل تو بدرجۂ اتم کی اور مسلمان خود اس کے شاہد ہیں۔

البیرونی نے ''الہند'' میں اور مسعودی نے ''مروج الذہب'' میں لکھا ہے کہ برہمن شراب نہیں پیتے۔ ممکن ہے وہ برہمن نہ پیتے ہوں جو ان مؤرخین کے علم میں آئے۔ اور اگر حقیقتاً نہ بھی پیتے ہوں تو تعجب کا مقام نہیں۔ ہمارے ہاں علماء نہیں پیتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی مسلمان بھی نہیں پیتا۔ ہندوستان کے تمام راجپوت راجاؤں کے ہاں آبکاری کے محکمے قائم تھے۔ اور ہندوؤں کی کثیر تعداد شراب پی کر حکومتوں کے لیے آمدنی کا باعث ہوتی تھی۔ خود البیرونی ہی نے لکھا ہے کہ ہندو خالی معدے پر شراب پیتے ہیں اور اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ اور سب

سے بڑی شہادت سوامی دیانند کی ہے جو مے خوری اور سیہ کاری کو برہمنی مذہب کا لازمہ قرار دیتے ہیں اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

ہمیں مطالعہ سے جو کچھ معلوم ہوا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود سے پیشتر برہمن پروہتائی اور پجاری پن کرتے تھے۔ اور مذہب کے پردے میں بعض فحش کاریاں ان سے بھی سرزد ہوتی تھیں۔ علاوہ بریں وہ ویشوں اور شودروں کو اپنی مذہبی و نسلی برتری سے مرعوب رکھتے تھے۔ کھشتری چونکہ راجا اور ان کے برادرانِ قبیلہ تھے، اس لیے ان کی بداخلاقی، عیش پرستی اور جنسی آزادی کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ برہمن ان کے دست نگر اور محتاج تھے، اس لیے تعرض نہ کرتے تھے۔ ویش بلاشبہ تاجر اور اہلِ حرفہ تھے لیکن سود خوری میں غرق تھے۔ شودر کاشتکار اور برہموں کے خادم تھے۔ اور باقی کروڑوں "بے ذات" لوگوں کی وہی حالت تھی جو آج کل بھی ہندوستان میں ہے۔ اور جن میں بھنگی، چمار، ڈوم، بھان متی، بازیگر، ٹوکری باف، اور خانہ بدوش چنڈال شامل ہیں۔

چھٹی فصل: علم و ادب

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں سب سے اونچا مرتبہ ویدوں کو حاصل ہے، اُن کے نزدیک یہ کتابیں الہامی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں اربابِ علم و فضل ان کو پڑھتے تھے اور ان کے احکام پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن امتدادِ زمانہ سے یہ حالت ہوگئی کہ برہمن ان کو سمجھے بغیر اُن کی تلاوت کیا کرتے۔ اور نسلاً بعد نسلٍ ایک دوسرے سے سن کر ان کو حفظ بھی کیا کرتے۔ لیکن ایسے برہمن الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے تھے جو وید منتروں کی تشریح و تفسیر کر سکیں اور ان کے مطالب پر اس قدر حاوی ہوں کہ اُن کی بنا پر کوئی مذہبی بحث کر سکیں۔ برہمن صرف کھشتریوں کو وید کی تعلیم دینے کے مجاز تھے۔ لیکن کھشتریوں کو حکم تھا کہ وہ کسی دوسرے کو خواہ وہ برہمن ہی ہو، وید کی تعلیم نہ دیں۔ ویشوں اور شودروں کو وید پڑھنا تو درکنار، اس کو سننے کی بھی اجازت نہ تھی۔ بلکہ اگر اُن میں سے کسی سے ایسے جرم کا ارتکاب ہو جاتا تو برہمن اسے گھسیٹ کر حاکم کے سامنے لے جاتے جو اس کی زبان کاٹ دینے کا حکم دے دیتا۔[۵۳]

ویدوں میں کچھ اوامر و نواہی بھی ہیں۔ سزا و جزا کی تفصیلات بھی ہیں لیکن اس کے زیادہ تر منتر حمد و ثنا پر مشتمل ہیں۔ اور آتشی قربانیاں دینے کے متعلق اس قدر احکام و ہدایات ہیں

جن کا شمار تک دُشوار ہے۔

ویدوں کو معرضِ تحریر میں لانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ اُن کی تلاوت بعض مخصوص لہجوں اور قرأتوں سے کی جاتی تھی جن کو تحریر میں لانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ برہمن اس اندیشے سے کہ کہیں ویدوں کے متن میں خرابی راہ نہ پا جائے اور اس کے مطالب و معانی نہ بدل جائیں، ان کو لکھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وید بارہا غائب اور فراموش ہو گئے۔ اور انہیں بڑی مشکل سے دوبارہ مدوّن کیا گیا۔ اور یہ امر ہرگز یقینی نہیں کہ موجودہ ویدوں کا متن وہی ہے جو زمانۂ قدیم میں برھما پر نازل ہوا تھا۔[۵۴]

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، یعنی مسلمانوں کے ورود کے لگ بھگ کشمیر کے ایک مشہور برہمن ویسُوکر نے بطور خود ویدوں کی تحریر و تفسیر کا کام شروع کر دیا۔ کام بہت مشکل تھا، لیکن اس نے اس کو تکمیل تک پہنچایا۔ اس کا خیال تھا کہ مبادا وید بالکل ہی فراموش ہو جائیں اور انسانوں کا حافظہ اسے محفوظ نہ رکھ سکے۔ کیونکہ لوگوں کا کردار روز بروز بدتر ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ نیکوکاری اور ادائے فرض سے غافل ہو رہے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ ویاس نے وید کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ رِگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھرون وید۔ ویسوکر نے بھی یہی ترتیب مدِنظر رکھ کر وید کی تسوید کی۔ اُپ نشد رشیوں کی تصنیف بتائے جاتے ہیں جن میں تصوف اور فلسفہ کے مضامین پر بحث کی گئی ہے۔

ویدوں کے بعد پُرانوں کا درجہ ہے۔ یہ بھی رشیوں کی تصنیف ہیں۔ اور الہامی تسلیم نہیں کیے جاتے۔ ان میں زیادہ تر جانوروں کے نام سے موسوم ہیں، جن سے بعض سوالات کیے گئے اور اُنھوں نے جوابات دیے۔ پرانوں کی تعداد اٹھارہ ہے، پھر سمرتیاں ہیں۔ یہ گویا شریعت کی کتابیں یعنی دھرم شاشتر ہیں، جن میں تمام احکامِ فقہی مندرج ہیں اور راجا اور پرجا کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے۔ سمرتیوں کی تعداد بیس ہے۔ ان میں سے بعض (مثلاً منوسمرتی) تو قدیم ہیں لیکن بعض بعد کی پیداوار ہیں۔ بلکہ ہندو مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ پُران اور بہت سی سمرتیاں آٹھویں نویں صدی عیسوی کی پیداوار ہیں جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہو چکے تھے۔ فلسفے میں ہندوؤں کے چھ ورشن یا شاستر مشہور ہیں۔ اور ''اتہاس'' کی طویل نظمیں رامائن اور مہابھارت کے نام سے اب تک ہندوؤں کے تخیل پر مسلط چلی آتی ہیں۔ اس کے علاوہ پرانے ہندوؤں نے صرف ونحو، عروض، ہیئت، ریاضی، تخلیقِ کائنات اور جغرافیۂ طبعی پر بے شمار کتابیں

تصنیف کیں۔ چنانچہ البیرونی کی کتاب ''الہند'' زیادہ تر انہی علوم کی تصریح و تشریح پر مشتمل ہے۔ اگر چہ ان علوم کا غالب حصہ مشاہدہ و استخراج کی وجہ سے بے کار ہو چکا ہے، لیکن بہرحال اس سے ہندوؤں کے ذوقِ علم اور شوقِ تجسس کا ثبوت ملتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے ورود سے پہلے اور اس کے دوران میں بھی ملک کے بعض حصوں میں ہندو مصنّفین و اُدباء نے سنسکرت میں بعض عالی پایہ کتابیں لکھیں کیونکہ راجپوتوں کے دربار بے شمار تھے اور جہاں کوئی ذی علم شخص اپنی معاش سے بے فکر ہوکر لکھنے پڑھنے کا موقع پاتا، وہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو جاتا۔ نویں دسویں صدی عیسوی میں علم و تصنیف کے بڑے بڑے مرکز کشمیر و بنارس، ندیا (بنگال)، تنجور (جنوبی ہند)، کلیان (مہاراشٹر) اور قنوج و اُجین تھے۔ جن میں النکار (ادب و شعر)، فلسفہ، دھرم شاستر، منطق، صرف و نحو، نجوم و ہیئت، طب اور موسیقی پر کتابیں لکھی گئیں۔ بھاسکر کی سدِّھانت شرومنی جو علم ہیئت کی مشہور کتاب سمجھی جاتی ہے، اسی دَور میں مرتب ہوئی۔ طب میں بھداور (نزد متھرا) کے مقام پر ایک مصنف دلھن نامور ہوا ہے۔ بنگال کے راجا نیاپال کے درباری طبیب چکرپانی نے ''چرک'' کی شرح لکھی۔ مالوہ کا راجا بھوج علم و ادب کا سرپرست ہونے کے علاوہ خود بھی تحریر و تصنیف کا ذوق رکھتا تھا۔ مارکو پولو (سیّاح) لکھتا ہے کہ کیرالا میں ہیئت اور طب کے بڑے بڑے عالم موجود تھے۔ مشرقی اور مغربی ساحلوں پر کدمبا اور چولا راجاؤں کے ماتحت موسیقی پر بڑی محنت کی گئی۔ خصوصاً رقص کے فن کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا۔[۵۵]

بدھ مت اور جین مت کے پیروؤں نے اپنی کتابیں زیادہ تر مقامی زبانوں میں لکھی تاکہ عوام آسانی سے ان کا مطلب سمجھ سکیں۔ ان دونوں مذہبوں کے علماء نے سنسکرت میں بہت کم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جب ان کا اقتدار رخصت ہو گیا اور برہمن کو از سرِ نو فتح حاصل ہوئی تو مختلف مذاہب اور مسالک کے درمیان بحث و نزاع کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ اور مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف کثرت سے معرضِ شہود پر آئیں۔ شنکر نے اُپ نشدوں، بھگوت گیتا اور برہم سوتر کی تفسیریں لکھیں۔ علاوہ بریں یوگ شاستر، ویشیشک شاستر اور نیائے شاستر کی تشریحات پر کتابیں تصنیف کی گئیں۔ کشمیر میں کھیم اندر اور بلھن جیسے مصنف اور کلھن جیسے مؤرخ پیدا ہوئے۔ کلھن کی راج ترنگنی مشہور کتاب ہے۔

شعر اور ڈراما میں اگرچہ اس عہد کے ہندوؤں نے کچھ زیادہ کمال کا اظہار نہیں کیا لیکن

مالتی مادھو اور اُتر رام چرتر جیسے ڈراموں کا مصنف بھوبھوتی قابلِ ذکر ہے۔ مُدرا راکشش (ڈراما) کا مصنف ویشک دت بھی معمولی تمثیل نگار نہ تھا۔ ماگھ، پدم گپت اور شری ہرش کلاسیکل انداز کے نامور شعراء تھے اور بنگالی کا غنائی شاعر جے دیو جس نے گیتا گووندا لکھی۔ اب تک ہندو شعراء کا سرتاج مانا جاتا ہے۔[۵۶]

مسلمانوں کی فتح سندھ کے بعد کم و بیش تین صدیاں ہندوستان کو ایسی مل گئیں جن میں اس پر کوئی بیرونی حملہ نہیں ہوا، تا آنکہ ۱۰۰۰ء میں سلطان محمود غزنوی نے اس ملک کی طرف توجہ کی۔ ہندو مؤرخین ان تین صدیوں کو ہندوستان کی مسرت و خوش حالی کا دَور بتاتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دَور میں راجپوتوں کے ۳۶ حکمران خاندان ملک کے مختلف حصوں پر قابض و مسلط تھے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ وہ آئے دن ایک دوسرے کے خلاف حملے اور یورشیں کرتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ ہندو معاشرہ ایک خاص سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، یعنی برہمن امن و امان سے اپنے مذہبی فرائض میں مصروف رہتے تھے۔ ویشوں اور شودروں کو لڑائی بھڑائی سے کوئی سروکار نہ تھا اور جنگ و پیکار کا بوجھ زیادہ تر راجپوتوں کے قبائل اور کھشتریوں کے جنگی طبقے پر پڑتا تھا۔ لہٰذا حکمران اپنے لگے بندھوں کو ساتھ لے کر خون ریزی میں مصروف رہتے تھے اور عام آدمی چپ چاپ اپنے اپنے روزمرہ مشاغل میں منہمک رہتی تھی۔ بلاشبہ حکمرانوں کی جنگی مصروفیتوں کی وجہ سے ڈاکوؤں اور رہزنوں کی کثرت تھی۔ لیکن عام لوگ کسی نہ کسی طرح اپنی حفاظت کر لیا کرتے تھے۔ ان حالات میں جہاں کسی خطے کو کچھ مدت کے لیے جنگ سے نجات مل جاتی تھی وہاں برہمنوں اور کھشتریوں کا پُرامن طبقہ علمی و ادبی مشاغل کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ اور بعض راجا اپنی علم دوستی اور روشن خیالی کی وجہ سے اُن مشاغل کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔

لیکن جہاں تک اُس دور کی علمی، مذہبی، ادبی اور فنی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اُس دور کے ہندو اہلِ علم یا تو بے کار اور دُور از کار مذہبی مباحث پر مغز زنی کرتے تھے یا فلکیات کے پرانے تصورات کو زندہ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یا ایسے شعر و ادب اور رقص و سرود کی وادیوں میں آوارہ گردی کرتے تھے جو حیات افروزی کے بجائے عیش، بے عملی اور ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ بلاشبہ بعض اوقات چندر بردے بھاٹ جیسے لوگ ''پرتھی راج راسا'' مرتب کر دیتے تھے جس میں ہندوؤں کی جنگی اہلیتوں کو اُبھارنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن ایسی کتابیں تعداد میں اتنی بھی نہیں تھیں، جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکے۔

حواشی

[۱] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، XV، حصہ اوّل۔

[۲] سٹین کی راج ترنگنی، ص ۱۲۸ - ۲۲۷۔

[۳] ابوریحان البیرونی، الہند، سخاؤ، ص ۲۰۶۔

[۴] تاریخِ سندھ محمد معصوم اور چچ نامہ۔

[۵] ایلیٹ کی تاریخِ ہند، ص ۵۰۵۔

[۶] میڈیول انڈیا، ایشوری پرشاد، ص ۲۔

[۷] مسٹر وی سی ویدیا، ہسٹری آف میڈیول انڈیا۔

[۸] الہند، البیرونی، (سخاؤ)، ص ۱۹۸۔

[۹] سٹین، راج ترنگنی، ص ۱۳۴۔

[۱۰] ایشوری پرشاد، ص ۵۔

[۱۱] ایشوری پرشاد، ص ۱۰۔

[۱۲] جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال I، ص ۴۱۔

[۱۳] ایشوری پرشاد، ص ۲۹-۳۳۔

[۱۴] ہسٹری آف میڈیول انڈیا، سی وی ویدیا، ص ۲۲۶۔

[۱۵] مسٹر ویدیا کی ہسٹری، ص ۲۲۸۔

[۱۶] اقتباسات از ایلیٹ، ہسٹری، جلد اوّل۔

[۱۷] کوی میمانسا، باب ۱۷، ترجمہ از مسٹر ویدیا۔

[۱۸] سی وی ویدیا کی ہسٹری، ''باب نظمِ حکومت''۔

[۱۹] دیباچہ تاریخ ایشوری پرشاد، ص ۳۱۔

[۲۰] مسٹر ویدیا کی ہسٹری، جلد دوم، ص ۲۴۲۔

[۲۱] سی وی ویدیا کی ہسٹری، جلد دوم، ص ۲۴۶۔ ایشوری پرشاد، ص ۲۴۔

[۲۲] البیرونی، سخاؤ، جلد اوّل، ص ۲۷۔

[۲۳] الفنسٹن کی تاریخ، باب توحید۔

[۲۴] ستیارتھ پرکاش سوامی دیانند، گیارھواں سمولاس۔

[۲۵] ستیارتھ پرکاش، گیارھواں سمولاس، ص ۳۷۸ اور الفنسٹن کی تاریخِ ہند، حصہ اوّل۔

[۲۶] سی وی ویدیا کی تاریخ، حصہ ۲، ص ۴۰۴ و ۴۰۵۔

[۲۷] بیل کی سوانح ہیون سانگ۔

[۲۸] دیباچہ تاریخ الشوری پرشاد، ص ۳۲۔

[۲۹] سی وی ویدیا کی تاریخ، جلد دوم، ص ۱۹۶۔

[۳۰] کتاب المسالک والممالک ابن خوردازبہ، ایلیٹ، ص ۱۶۔

[۳۱] الہند، البیرونی، سخاؤ، ص ۱۰۰ تا ۱۰۳۔

[۳۲] سی وی ویدیا کی ہسٹری، حصہ سوم، ص ۳۷۸۔

[۳۳] اقتباس از سفرنامہ مارکوپولو، ویدیا، حصہ سوم، ص ۳۸۲۔

[۳۴] سی وی ویدیا کی ہسٹری، حصہ سوم، ص ۳۹۱ تا ۳۹۴۔

[۳۵] البیرونی، سخاؤ، جلد اوّل، ص ۱۰۷۔

[۳۶] البیرونی، سخاؤ، جلد اوّل، ص ۱۰۸۔

[۳۷] سی وی ویدیا کی ہسٹری، جلد دوم، ص ۳۹۷۔

[۳۸] سی وی ویدیا کی ہسٹری، جلد دوم، ص ۳۹۵۔

[۳۹] البیرونی، سخاؤ، جلد دوم، ص ۱۷۰۔

[۴۰] سلسلۃ التواریخ ابوزید ونزہۃ المشتاق ادریسی، ایلیٹ، اوّل، ص ۶، ۸۹۔

[۴۱] البیرونی، سخاؤ، جلد دوم، ص ۱۵۹ و ۱۶۰۔

[۴۲] البیرونی، سخاؤ، جلد دوم، ص ۱۶۲۔

[۴۳] البیرونی، جلد اوّل، ص ۱۸۰۔

[۴۴] البیرونی، سخاؤ، جلد اوّل، ص ۱۸۱ و ۱۸۲۔

[۴۵] البیرونی، جلد دوم، ص ۱۵۷۔ اور ویدیا کی تاریخ، جلد دوم، ص ۳۹۰۔

[۴۶] منوسمرتی، پہلا ادھیائے، منتر ۹۲ تا ۱۰۱۔

[۴۷] منوسمرتی، چوتھا ادھیائے، منتر ۱۶۵ سے ۱۶۹ تک۔

[۴۸] منوسمرتی، آٹھواں ادھیائے، منتر ۳۶۴۔

[۴۹] منوسمرتی، چوتھا، آٹھواں اور دسواں ادھیائے۔

[۵۰] ان تمام تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ستیارتھ پرکاش سوامی دیانند، گیارھواں سمولاس۔

[۵۱] نزہۃ المشتاق ادریسی، ایلیٹ، جلد اوّل، ص ۸۹۔

[۵۲]　منوسمرتی، آٹھواں ادھیائے، منتر ۱۴۰ تا ۱۴۲۔

[۵۳ و ۵۴]　البیرونی، سخاؤ، جلد اوّل، ص ۱۲۵ تا ۱۲۷۔

[۵۵]　ویدیا کی ہسٹری، جلد دوم، ص ۲۴۲، ۴۷۳-۴۷۴۔

[۵۶]　ایشوری پرشاد، ص ۲۵ و ۵۴۸۔

ہندوؤں کے سات طبقات کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اس تقسیم میں ایک عجیب بات ہے کہ طبقۂ اولیٰ کو برہمنوں سے بھی بالاتر رکھا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں چونکہ کھشتری دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ اُن کا ایک گروہ تو ملک گیری اور ملک داری میں مصروف تھا۔ اور دوسرا غیر فوجی مشاغل میں منہمک رہتا تھا۔ اس لیے ابنِ خورداذبہ اور ادریسی نے مقتدر کھشتریوں کو طبقہ اولیٰ میں رکھا۔ جس کی قوت و اہمیت کی وجہ سے برہمنوں کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔ اور غیر مقتدر کھشتریوں کو طبقۂ سوم میں شامل کر دیا۔ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ اس تقسیم میں ویشوں کو شودروں سے نیچا رکھا ہے۔ اور شودروں کا پیشہ کاشتکاری بتایا ہے۔

ورن آشرم

ان الجھنوں کو البیرونی نے سلجھا دیا ہے۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ ابنِ خورداذبہ اور ادریسی کے مقابلہ میں البیرونی یقیناً زیادہ معتبر اور مستند ہے۔ جس نے سالہا سال ہندوستان میں رہ کر یہاں کے احوال اور علوم کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''ہندو اپنی ذاتوں کو ورن (یعنی رنگ) کہتے ہیں۔ اور نسب کے نقطۂ نگاہ سے انہیں جاتک (یعنی جنم) سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ ذاتیں ابتدا ہی سے چار چلی آتی ہیں۔ بلند ترین ذات برہمن ہے، جن کے متعلق ہندوؤں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ برہما کے سر سے پیدا ہوئے تھے۔ اور چونکہ برہما اس قوت کا نام ہے جسے ''فطرت'' کہتے ہیں۔ اور سر جسم حیوانی میں بلند ترین حصہ ہے۔ اس لیے برہمن پوری نسلِ انسانی کا خلاصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اُنھیں اشرف انسانیت سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد کھشتریوں کی ذات کا درجہ ہے، جو ہندوؤں کے نزدیک برہما کے کندھوں اور ہاتھوں سے پیدا کیے گئے تھے۔ ان کا مرتبہ برہمنوں سے کچھ زیادہ ادنیٰ نہیں ہے۔ تیسرا درجہ ویشوں کو حاصل ہے جو برہما کی رانوں سے پیدا ہوئے تھے۔ اور چوتھے شودر ہیں، جن کی تخلیق برہما کے پاؤں سے ہوئی تھی۔

آخر الذکر دو طبقوں میں زیادہ فصل نہیں ہے۔ کیونکہ اپنے حالات کے اختلاف کے باوجود یہ ایک ہی قصبے یا گاؤں میں بلکہ اکثر ایک ہی گھر میں بھی سکونت رکھتے ہیں۔

ذات باہر لوگ

البیرونی کا خیال یہ ہے کہ جن طبقوں پر ذات کی اصطلاح عاید ہوتی ہے، وہ تو صرف یہی چار ہیں۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ''انتیج'' کہلاتے ہیں۔ جن میں دھوبی، موچی، چمار، بھان

متی، ٹوکریاں اور ڈھالیں بنانے والے، ملاح، مچھیرے، شکاری اور جلاہے شامل ہیں۔ چار ورنوں کے لوگ ''انتیجوں'' کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ ان کے قبیلے چار ورنوں کے قصبات و دیہات کے قریب تو رہتے ہیں۔ لیکن ان کے ڈیرے ہمیشہ حدودِ آبادی کے باہر ہوتے ہیں۔ ان کے بعد البیرونی کچھ اور گروہوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ مثلاً ہاڑی، ڈوم، چنڈال، اور بدھاتو۔ یہ لوگ بہت ادنیٰ خدمات بجا لاتے ہیں۔ اور صفائی کا کام انہی کے سپرد ہے۔ پہلے تین گروہ تو معلوم و مشہور ہیں۔ لیکن بدھا تو سمجھ میں نہیں آیا۔ البیرونی نے بیان کیا ہے کہ ہاڑی گروہ کی تعریف کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہر قسم کی نجاست اور پلیدی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ڈوم بانسری بجاتے اور گاتے ہیں۔ چنڈال جلاّد وغیرہ کے فرائض انجام دیتے ہیں اور ان میں بدترین بدھاتو ہیں جو نہ صرف مردار جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں بلکہ کتوں اور دوسرے جانوروں کا گوشت بھی کھا جاتے ہیں۔[۳۱]

چار ورنوں کے اوصاف

اس کے بعد البیرونی نے چار ذاتوں کے درمیان کھانے پینے کی پابندیوں کا ذکر کیا ہے جو خاصی سخت ہیں۔ جب ارجن نے ان چار ورنوں کی نوعیت اور ان کے اوصافِ اخلاقی کے متعلق سوال کیا تو واسدیو نے جواب دیا کہ برہمنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقل و خرد، سکونِ قلب، صدقِ مقال اور صبر و تحمل سے مالا مال ہوں، اپنے حواس قابو رکھتے ہوں، انصاف پسند ہوں، نیکوکار ہوں اور عابد اور پابندِ مذہب ہوں۔ کھشتریوں کو ایسا ہونا چاہیے کہ قلوب پر اُن کی ہیبت و دہشت طاری رہے۔ وہ بہادر اور عالی حوصلہ ہوں۔ زبان کے فصیح اور ہاتھ کے سخی ہوں۔ خطرات کی پرواہ نہ کرتے ہوں۔ اور اپنے فرائض کو بوجہٗ احسن انجام دیتے ہوں۔ ویشوں کا فرض ہے کہ زراعت میں مصروف رہیں۔ مویشی پالیں اور تجارت کریں۔ شودروں کا فرض یہ ہے کہ باقی تین ذاتوں کی خدمت و مدارت میں مصروف رہیں تاکہ اُن کی نظروں میں مقبول ہو جائیں۔

یعنی اصلاً زراعت و تجارت کا کام ویشوں کے سپرد تھا اور عام طور پر مشہور بھی یہی ہے۔ لیکن مسٹر وید کا بیان ہے کہ بدھ مت کے زمانے میں چونکہ ویش زیادہ تر بودھ ہو گئے تھے۔ اور زراعت میں کیڑوں کو مارنا پڑتا تھا جو اہنسا کے خلاف تھا۔ للہٰذا اُنھوں نے زراعت ترک کر دی اور شودروں نے اختیار کر لی۔ گویا ابنِ خورداذبہ اور ادریسی بھی صحیح کہتے ہیں۔ اُنھوں نے شودروں

ہی کو کھیتی باڑی کرتے دیکھا ہوگا۔

برہمنوں کی تقسیم

اگر تقسیم یہیں تک رہتی تو چنداں مذائقہ نہ تھا۔ لیکن جب ذاتوں میں تقسیم در تقسیم کا ہنگامہ برپا ہوا تو صدہا طبقے پیدا ہو گئے۔ مسٹر سی۔ وی ویدیا نے بتایا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی تک تو پہلے تین ورنوں میں کوئی تقسیم موجود نہ تھی، لیکن دسویں صدی تک یہ کیفیت باقی نہ رہی۔ کتبوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمن، کھشتری اور ویش تینوں صدہا ذیلی ذاتوں میں تقسیم ہو گئے۔ بظاہر اس کی وجوہ یہ تھیں: اوّل خوراک میں فرق یعنی بعض لوگ گوشت کھاتے تھے اور بعض پر اب تک بدھ مت کے اہنسا کا اثر تھا۔ دوم۔ نسلی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے اوہام۔ سوم، ملک کے مختلف حصوں میں معاشرت کے رسوم و عوائد کا اختلاف۔ وجوہ کچھ بھی ہوں۔ بہرحال کیفیت یہ ہوئی کہ برہمن اپنے اپنے مقاماتِ سکونت کے اعتبار سے بھی کوئی ستائیس گروہوں میں بٹ گئے۔ مثلاً کشمیری، نگر کوٹیے، موہیال (پنجاب میں) سارسوت، نارنولی، قنوجیے، چھنجوییے، تیواری، بشکرن، سندھی، ناگر، گجراتی، مالوی، بنگالی، اوڑیا، کرناٹکی، اندھرا، تامل، نمودری، وغیرہم۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ ان ذیلی تقسیمات کی مزید تقسیمات بھی ہوئیں۔ کچھ صوبوں اور ضلعوں کی سکونت کی بنا پر، اور کچھ عقائدِ مذہبی کے اختلافات کی وجہ سے ملک میں سینکڑوں قسم کے برہمن نظر آنے لگے۔ جو اپنے اپنے شاکھا (ویدک رسوم) اور گوتر سے موسوم ہو رہے تھے۔[۳۲]

ان کے علاوہ بے شمار برہمنوں نے جوگی اور سنیاسی یا سادھو کی صورت اختیار کر لی۔ مشہور سیاح مارکو پولو لکھتا ہے۔ ''بعض دوسرے برہمن جوگی کہلاتے ہیں۔ ان کی عمریں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ یہ ڈیڑھ دو سو برس تک زندہ رہتے ہیں۔ بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور صرف دودھ چاول کھاتے ہیں۔ یہ لوگ دن میں دو دفعہ گندھک اور پارے کا ایک مرکب پیتے ہیں، جو اُن کی طویل العمری کا باعث ہے۔ ان میں سے بعض سادھو بالکل برہنہ گھومتے پھرتے ہیں۔ یہ سونے کا ایک چھوٹا سا بیل اپنے ماتھے پر لٹکائے رہتے ہیں۔ گائے کے گوبر کی خاکستر اپنے جسموں پر ملتے ہیں۔ اگر اُن سے کوئی شخص نیک سلوک کرے تو وہ اس راکھ سے اس کی پیشانی پر تلک لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ بہشتی پھل (غالباً کیلا) کے سوکھے پتوں پر کھانا رکھ کر کھاتے ہیں۔ یہ کسی جاندار کی

جان نہیں لیتے۔ خواہ وہ مکھی اور مچھر ہی کیوں نہ ہو۔ کئی کئی دن تک برت رکھتے ہیں، جس میں صرف پانی پیتے ہیں۔ زمین پر سوتے ہیں۔ اور اس کے باوجود اُن کی عمریں لمبی ہوتی ہیں۔ یہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔[۳۳]

راجپوتوں کی تقسیم

راجپوتوں نے اپنے مختلف اور بے شار جغرافیائی مساکن، متفرق شاکھاؤں اور گوتوں کی بنا پر اتنی شاخیں نکالیں کہ ان کا شمار محال ہو گیا۔ ایک تو وہ اپنے خاندانوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں سے بعض کا ذکر سابقہ فصل میں آ چکا ہے۔ علاوہ بریں اُن خاندانوں کے چھوٹے چھوٹے کنبے بھی اپنے آپ کو مستقل گروہ قرار دینے لگے۔ بڑے خاندانوں اور قبیلوں کی تعداد تو پرتھی راج راسا میں بھی، اور پنڈت کلھن کی راج ترنگنی میں بھی چھتیس بتائی گئی ہے۔ اور راسا میں ان کی پوری فہرست موجود ہے۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ چھتیس خاندان وہ تھے جن کے سروں پر طرّہ حکمرانی لہرا رہا تھا۔ ان کے علاوہ جو راجپوت تھے وہ سینکڑوں نہیں، ہزاروں چھوٹے گروہوں میں بٹ رہے تھے۔

کائستھ اور ویش

کائستھ اپنے آپ کو کھشتری کہتے ہیں۔ گو سمرتیوں کی رُو سے انھیں ایک ''درمیانی ذات'' قرار دیا گیا ہے، لیکن کتبوں میں یہ اکثر کھشتری ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان کا پیشہ مدتوں سے تحریر و کتابت چلا آ رہا ہے۔ لہٰذا کتبے لکھنے کا کام بھی انہی کے سپرد ہوتا تھا۔ ان میں تقسیمات زیادہ نہیں ہوئیں۔ لیکن پھر بھی سکونت کے لحاظ سے ان کے بھی بعض گروہ تھے مثلاً ایک کتبے پر ''گوڑ کائستھ'' لکھا ہوا دیکھا گیا۔ اور آج کل کے کائستھوں میں بھی فرقے اور طبقے پائے جاتے ہیں۔

ویش طبقے میں بھی بے شار ذیلی ذاتیں پیدا ہوئیں۔ اگرچہ پرانی تحریروں میں ان کا ذکر نہیں لیکن آج کل کے زمانے میں صرف شمالی ہند کے ویشوں کی ذاتیں چوراسی بتائی جاتی ہیں۔ برہمنوں اور راجپوتوں کی طرح ان کی تقسیم بھی نہ صرف خاندانوں، قبیلوں اور مسکنوں کے اعتبار سے بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی ہوئی۔ شمال و جنوب میں اکثر ویش جینی تھے۔ بعض شِو کے پجاری تھے۔ کانگڑہ کے مندر بیجاناتھ کا کتبہ مظہر ہے کہ یہ مندر دو ویش بھائیوں نے بنایا تھا۔

جنوب کے لنگایت ویش ویر شوا کے پجاری مشہور ہیں۔

دراوڑ نسل کے بدنصیب انسانوں کی تقسیم

شودروں اور اچھوتوں میں بھی دو قسم کی تقسیمیں ہوئیں۔ ایک مسکنوں کے اختلاف کی بنا پر۔ دوسری پیشوں اور خدمتوں کے لحاظ سے۔ شودر اور انیچ اور دوسری ادنیٰ ذاتوں کے لوگ سب کے سب دراوڑ نسل سے ہیں۔ ان کو آرین نسل سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان میں بھنگی، چمار، ڈوم، ہاڑی، چنڈال، مچھیرے، ٹوکری باف، نٹ، بازیگر، بھان متی سبھی شامل ہیں۔ اور پھر ان کی ذیلی ذاتیں ہیں۔[۳۴]

ذرا ان ہندو ذاتوں اور ذیلی ذاتوں بے شمار کا اندازہ لگائیے۔ اور پھر یہ حقیقت بھی مدِنظر رکھیے کہ ہندو قوم شادی بیاہ کے متعلق ذاتوں اور گوتوں کی چھان بین میں نظیر نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال میں معاشرتی دقتوں اور پیچیدگیوں کا کیا عالم ہوگا۔ اور جب مسلمان ترک و عرب اور سیّد و مغل وغیرہ کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر ایک ہی نعرۂ توحید لگاتے ہوئے اس ملک میں داخل ہوئے ہوں گے تو دونوں معاشروں کا یہ واضح فرق اہلِ ہند کے لیے کتنے شدید احساسِ کمتری کا باعث ہوا ہوگا۔

شادیاں

شادی، نکاح اور تعینِ اولاد کے متعلق قدیم ہندوؤں کے عقائد اور رسوم عجیب تھے جو بچہ کسی شخص کی جائز بیوی سے پیدا ہوتا تھا وہ تو اپنے باپ کا بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ جیسے ہر معاشرے میں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر شادی کے وقت عورت یہ شرط منوا لیتی تھی کہ اس کی اولاد اس کے باپ کی اولاد سمجھی جائے گی، شوہر سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا تو اس کے بچے اپنے نانا کی اولاد سمجھے جاتے تھے۔ اصلی باپ سے منسوب نہ ہوتے تھے۔ اگر کوئی اجنبی شخص کسی عورت کے شوہر کی رضامندی سے اس عورت کے ساتھ مجامعت کرتا اور اس سے کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ بچہ شوہر کا تسلیم کیا جاتا تھا۔ کیونکہ عورت زمین ہے اور اس زمین کا مالک اس کا شوہر ہے۔ زمین میں بیج کوئی بھی ڈالے پیداوار پر حق تو مالک ہی کا ہوگا۔[۳۵] اس سے ظاہر ہے کہ بعض شوہر اجنبیوں کو بھی اپنی بیوی سے جماع کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ آج کل کے زمانے میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند نے نیوگ کا مسئلہ ہندوؤں کی انہی قدیم رسوم سے اخذ کر کے ستیارتھ پرکاش میں

درج کیا ہے۔

ویاس اور پانڈو

البیرونی نے اس سلسلے میں دو دلچسپ واقعات ہندوؤں کی کتبِ قدیم سے نقل کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ مشہور سادھو پراشر ایک دن ایک کشتی میں سفر کر رہا تھا۔ ملاح کی ایک بیٹی بھی بیٹھی تھی۔ پراشر اس کو دیکھ کر لٹو ہو گیا اور اس کو قابو میں لانے کا جتن کرنے لگا۔ آخر وہ مان گئی۔ لیکن دریا کے کنارے پر کوئی تخلیہ نہ تھا جس سے وہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ کر کوئی کام روائی کر سکتے۔ لیکن دفعتہً ایک درخت زمین سے اُگ آیا۔ جس نے گوشۂ خلوت مہیا کر دیا۔ چنانچہ پراشر نے اُس لڑکی سے جماع کیا۔ وہ حاملہ ہوئی اور ویاس جیسا لائق فرزند پیدا ہوا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ شانتنو کے بیٹے پانڈو کو کسی سادھو نے سراپ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ از کار رفتہ ہو گیا۔ اور اپنی بیویوں سے متمتع ہونے کے قابل نہ رہا۔ وہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ پریشان رہتا تھا کہ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ آخر اس نے ویاس کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس کی خاطر اس کی بیویوں سے جماع کر کے اولاد پیدا کرے۔ جب پانڈو نے اپنی ایک بیوی کو ویاس کے پاس بھیجا اور ویاس نے اس سے جماع کیا تو وہ اس رشی سے بے حد مرعوب ہوئی اور کانپنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زرد رُو اور مریل سا بچہ پیدا ہوا۔ پھر پانڈو نے اپنی دوسری بیوی کو بھیجا تو اس نے ویاس کے احترام کی وجہ سے حالتِ جماع میں اپنے چہرے کو نقاب سے پوشیدہ کر لیا۔ اس جماع سے دھرت راشٹر پیدا ہوا جو اندھا تھا۔ اور اس کی صحت بھی اچھی نہ تھی۔ آخر پانڈو نے اپنی تیسری بیوی کو بھیجا اور اس کو نصیحت کی کہ تم ویاس سے بالکل خوف نہ کھانا، نہ اس کا احترام کرنا۔ چنانچہ وہ ہنستی کھیلتی ویاس سے ہم بستر ہوئی۔ اور ایک چاند سا بیٹا جنا جو جرأت اور عیاری میں تمام اہلِ عالم پر سبقت لے گیا۔[۳۶]

یہ زمانۂ قدیم کے ہندو بزرگوں کے قصے تھے۔ لیکن البیرونی کے زمانے میں جو ہندو معاشرہ موجود تھا، وہ کچھ اسی قسم کا تھا، جیسے آج کل ہے۔ ہندو بچپن کی شادیوں کے حامی تھے۔ رسومِ نکاح برہمن ادا کرتے تھے۔ طلاق ہندوؤں میں قطعاً ممنوع تھی۔ میاں بیوی کو صرف موت ہی جدا جدا کر سکتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُن کا عہدِ نکاح موت سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ بیوہ کی شادی بھی ہندوؤں کے نزدیک مہاپاپ تھی۔ بیوہ کے لیے دو ہی راستے تھے۔ شوہر کی نعش کے

ساتھ ستی ہو جانا یا ایک بیوہ کی مصیبت ناک زندگی بسر کرنا۔ صرف بعض اوقات ایسی بیواؤں کو ستی نہ ہو جانے کی رعایت دی جاتی تھی جو زیادہ عمر کی ہوں۔ اور اُن کی اولادِ نرینہ موجود ہو۔ البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندوؤں میں زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔ اگر اُن میں سے کوئی مر جائے تو اس کی جگہ وہ ایک اور بیوی کر سکتا ہے۔ بعض ہندوؤں کا خیال یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد ذات اور ورن پر موقوف ہے۔ مثلاً برہمن کو چار، کھشتری کو تین، ویش کو دو اور شودر کو ایک بیوی کرنے کا حق ہے۔ لیکن ہندو مؤرخین کا بیان ہے کہ ان کے مآخذ سے البیرونی کے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ مسٹر ویدیا لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی قانونی کتابوں یا روایات میں بیویوں کی اس تعداد کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ راجا عام طور پر جتنی رانیاں چاہتے تھے، اپنے محلوں میں جمع کر لیتے تھے۔ چنانچہ سری کرشن جی کی ایک سو آٹھ بیویاں تھیں اور پرتھی راج راسا میں صاف لکھا ہے کہ پرتھی راج کی آٹھ رانیاں تھیں۔ [۴۷]

انتر جاتی شادیاں

مختلف ذاتوں کے مابین شادیاں ہوتی تھیں۔ لیکن برہمن کھشتری کو بیٹی نہ دیتا تھا۔ اور اس کی بیٹی سے شادی کر لیتا تھا۔ اسی طرح کھشتری ویش کی لڑکی لے لیتا تھا، لیکن دیتا نہیں تھا۔ بہرحال یہ رسم بھی بعد میں ترک کر دی گئی۔ البیرونی کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں برہمن صرف برہمن ہی کے ساتھ رشتہ کر سکتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ معاملہ برہمنوں ہی تک محدود نہ رہا۔ بلکہ کسی ذات یا ذیلی ذات کا آدمی اپنی ذات سے باہر رشتہ نہیں کرتا تھا۔ اس رجعت کی وجہ جو مسٹر ویدیا نے بتائی ہے وہ ہمارے نزدیک معقول معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سابقہ مخلوط شادیوں میں بقول البیرونی یہ قرار دیا گیا تھا کہ ایسی شادیوں سے جو اولاد ہوگی وہ ماں کی ذات میں شمار کی جائے گی۔ یعنی برہمن مرد اور کھشتری عورت کے بچے کھشتری سمجھے جائیں گے وعلیٰ ہذا۔ منوسمرتی کا حکم یہ تھا کہ ایسے تمام بچے برہمن سمجھے جائیں۔ یا ایک درمیانی ذات میں شامل کیے جائیں جو ماں کی ذات سے بلند تر سمجھی جائے۔ لیکن اس پر عمل نہ کیا گیا اور مخلوط خاندان پیدا ہو گئے۔ کسی خاندان میں باپ برہمن اور اس کے بچے کھشتری اور ویش تھے۔ اور کسی کنبے میں باپ کھشتری تھا اور اس کی اولاد ویش کہلاتی تھی۔ اس صورتِ حال نے بعض معاشرتی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ برہمنوں اور کھشتریوں کے درمیان کھانے پینے میں بھی تفاوت

تھا۔ وسطِ ہند اور جنوبی ہند کے برہمن اور ویش گوشت نہ کھاتے تھے۔ کھشتری گوشت کھاتے تھے۔ لہٰذا مخلوط خاندانوں میں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شادیاں ذاتوں اور ذیلی ذاتوں میں محدود ہو کر رہ گئیں۔[۳۸]

خودکشی کی اجازت

البیرونی نے بتایا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں بعض حالات میں خودکشی کی بھی اجازت ہے۔ بیوہ اپنے شوہر کی چتا پرستی ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی سے تنگ آ چکے ہوں، بوڑھے ہوں، اپاہج ہوں، کسی ناقابلِ علاج بیماری یا نقصِ اعضاء میں مبتلا ہوں۔ انھیں بھی اجازت ہے کہ چتا میں بیٹھ کر جل مریں۔ لیکن اونچی ذات کے ہندو ایسا نہیں کرتے۔ صرف ویش اور شودر آگ سے خودکشی کرتے ہیں۔ اگر برہمن اور کھشتری اپنی جان دینا چاہیں تو انھیں حکم ہے کہ کسوف یا خسوف کے وقت کسی طریقے سے خودکشی کر لیں۔ یا کسی شخص سے کہہ کر اپنے آپ کو گنگا میں غرق کرا لیں۔ گنگا اور جمنا کے سنگم پر بڑ کا ایک درخت ہے جس کو پریاگ کہتے ہیں۔ برہمن اور کھشتری عام طور پر اس درخت پر چڑھ جاتے ہیں اور وہاں سے گنگا میں کود کر جان دے دیتے ہیں۔[۳۹]

موت کی رسوم

موت پر وہی رسوم ادا کی جاتی تھیں جو آج کل ہندوؤں میں رائج ہیں۔ یعنی غسل، کفن، خوشبو کے بعد نعش کو جلا دیا جاتا۔ لیکن راجا کی موت پر ایک خاص رسم کا ذکر ابوزید نے سلسلۃ التواریخ میں اور الادریسی نے نزہۃ المشتاق میں کیا ہے۔ ابوزید تو اس کو جزیرہ سراندیپ (لنکا) کے راجا سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن الادریسی نے اس کو عام ہندو راجاؤں سے متعلق بتایا ہے۔ رسم یہ ہے کہ جب راجا مر جاتا ہے تو اس کی نعش کو ایک گاڑی پر رکھ دیتے ہیں اور اس کے ننگے سر کو اس قدر نیچا رکھتے ہیں کہ اس کے بال زمین کی مٹی پر گھسٹتے جاتے ہیں اور خاک آلود ہو جاتے ہیں۔ ایک عورت ہاتھ میں جھاڑو لیے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مٹی کو راجا کے سر پر ڈالتی جاتی ہے اور پکار پکار کر کہتی ہے "لوگو! دیکھو، یہ کل تمہارا راجا تھا۔ آج اس کی یہ حالت ہے۔ یہ دُنیا کو چھوڑ گیا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کی روح کو نکال کر لے گیا۔ اس کی زندگی کا یہ انجام ہے۔ دیکھنا گمراہ نہ ہونا اور زندگی کی لذتوں میں نہ پڑ جانا۔"[۴۰]

دوسرا باب

اسلام ہندوستان میں

پہلی فصل: اسلام کا ظہور اور اس کی تعلیمات

جب عالمِ انسانی پر ایسا دور آ جاتا ہے کہ دین و اخلاق کی ازلی و ابدی قدریں برباد ہو جاتی ہیں، انسان خدائے واحد کی عبادت ترک کر کے بے شمار جھوٹے معبودوں کو اپنا قبلۂ مقصود بنا لیتے ہیں۔ نیکی اور پرہیز گاری کے اکرام کی جگہ مال و نسب کی وسعت و عظمت کا اعتبار قائم ہو جاتا ہے۔ بعض انسان ظلم و جبر یا ابلہ فریبی و عیاری سے کام لے کر بے علم اور ضعیف انسانوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر ذلیل کر دیتے ہیں۔ ظلم و عدوان کا رواجِ عام ہو جاتا ہے۔ شعوب و قبائل کے امتیازات اور انسانی گروہوں کی اونچ نیچ سے نسلِ انسانی کے اتحاد اور انسانیت کے شرف کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔ فحش و ربا اور شراب و قمار شیرِ مادر کی طرح حلال سمجھ لیے جاتے ہیں۔ غرض جب سچائی کی کھیتیاں اُجڑ جاتی ہیں اور جھوٹ کی فصلیں لہلہانے لگتی ہیں تو سنتِ الٰہی ہے کہ ایسے حالات میں غیرتِ حق کو حرکت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو از سرِ نو راہِ راست پر لانے کے لیے اپنے پیغمبر کو مبعوث کر دیتا ہے جو نہایت معجزانہ طور پر اعمالِ انسانی میں ایک عام انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔

گزشتہ باب میں ہندوستان کی جو حالت پڑھ چکے ہیں، بعینہٖ یہی حالت عرب کی تھی۔ اور عرب ہی پر کیا موقوف ہے، مصر، ایران، روما اور یورپ کے بڑے بڑے ملک بھی اسی قسم کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے، تو خدا نے اپنے آخری پیغام کے لیے عرب کو چنا۔ جو تہذیب و شائستگی کے ادنیٰ ترین مدارج پر تھا اور اس میں بھی شرک، افتراق، انسان پرستی، بت پرستی، اوہام پرستی، نفس پرستی، مے پرستی، قمار پرستی اور فحش پرستی کا ہنگامہ برپا تھا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض توفیقِ الٰہی سے مسلح ہو کر تنہائی اور بے سروسامانی

کی حالت میں اپنے گرد و پیش کی پوری دُنیا کو چیلنج دیا۔ آپؐ نے عیسائیوں سے کہا کہ تم ایک انسان کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ اور تثلیث و کفارہ کے باطل عقائد کے پابند ہو، اس لیے گمراہ ہو۔ یہودیوں کو للکارا، کہ عزیر خدا کا بیٹا نہ تھا۔ تم نے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو ترک کر دیا۔ تم نے عیسیٰؑ کی نبوت سے انکار کیا۔ لہٰذا تم بھی گمراہ ہو۔ مشرکین کو ڈانٹا کہ تم خالق کائنات اور معبودِ حقیقی کے ساتھ بتوں کو شریک کرتے ہو۔ گویا خدا کی خدائی سے منکر ہو، اس لیے تمہاری گمراہی میں کوئی شبہ نہیں۔ مصر، ایران، روما کی تہذیبوں کو پکار پکار کر بتا دیا کہ تمہاری تمام مزعومہ عظمتیں باطل ہیں۔ تم نے انسانوں کو خدا بنا رکھا ہے اور بندگانِ خدا کو ظلم و جور کا نشانہ بنا رہے ہو۔ غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چیلنج دُنیا بھر کے نام تھا۔ کیونکہ وہ اللہ کے فرستادہ تھے۔ اور اللہ کسی گمراہی کو روا نہیں رکھ سکتا۔ خواہ وہ کتنی ہی شوکت و اہمیت کی سرمایہ دار ہو۔

توحید

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول تھے۔ خدا نے اُن کو ہدایت پر مامور کیا تھا۔ خدا اُن سے کلام کرتا تھا۔ اس کلام کا نام قرآن ہے جس سے بڑی ہدایت کی کتاب آج تک نسلِ انسانی کو نصیب نہیں ہو سکی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی بنیاد ''توحید'' پر ہے۔ توحید صرف خدا کے واحد ہونے کا نام نہیں۔ توحید کے معنی ہیں ''ایک کرنا'' یعنی تمام انسانوں کو مختلف و متفرق قبلہ ہائے مقصود سے ہٹا کر صرف ایک ذات کے ساتھ وابستہ کرنا۔ تا کہ وہ اللہ کی بندگی کی وجہ سے ایک کنبے کے افراد کی طرح بھائی بھائی بن جائیں۔ **الخلق عیال اللہ**. اسلام نے اعلان کر دیا کہ **وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ**. (بنی اسرائیل: ۲۳) اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم لوگ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے۔ اور بتا دیا کہ دینِ قیّم یہی ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ. (یوسف: ۴۰)

حکومت تو بس ایک اللہ ہی کی ہے۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی پرستش کرو۔ یہی دینِ قیم ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

شرک کی مذمت

قرآن نے بتا دیا کہ معبودِ حقیقی صرف اللہ ہے۔ اس کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو، وہ نہ تمہیں کچھ نفع دے سکتی ہے، نہ ضرر پہنچا سکتی ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ، لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (القصص: ۹)

اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ بنا۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا سب چیزیں فانی ہیں۔ حکومت اسی کی ہے۔ اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔

وَ لَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. (یونس: رکوع ۲)

مشرک لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نہ ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ نفع۔ اور کہتے ہیں کہ وہ (باطل معبود) اللہ کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ کیا تم اللہ کو ایسی خبر سنانا چاہتے ہو جس کو وہ نہ آسمان میں پاتا ہے نہ زمین میں۔ اللہ ان لوگوں کے شرک سے پاک اور بالاتر ہے۔

پھر یہ بھی بتا دیا کہ اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دے گا لیکن شرک کو کسی حالت میں معاف نہ کرے گا۔ کیونکہ جو شخص اللہ کا کوئی شریک ٹھہراتا ہے، وہ جھوٹ کہتا ہے اور بہتان باندھتا ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا. (النساء: رکوع ۷)

اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرا دیا جائے، ہرگز نہ بخشے گا۔ اس شرک کے سوا جس گناہ کو چاہے گا، بخش دے گا اور جس شخص نے خدا کے ساتھ دوسرے کو شریک بنایا تو اس نے بہت بڑے گناہ کا طوفان باندھا۔

بشریتِ رسولؐ

چونکہ مختلف مذاہب کے مقدس بانیوں اور دوسرے بڑے بڑے مصلحوں کو لوگوں نے اپنی جہالت کے باعث خدائی کارخانے کا مالک تصور کر رکھا تھا اور بعض ہادیوں کو بعض قوموں اور گروہوں نے صرف اپنی عصبیت ہی کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اللہ کی

وحدت اور معبودیت کے مرتبے کو قائم کرنے کے بعد رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیثیت بھی واضح کر دی جائے۔ تاکہ انسان پرستی کی عادی دُنیا کہیں ان کو بھی معبود نہ بنا لے۔ چنانچہ پہلے تو یہ واضح کیا گیا کہ یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی قبیلے یا کسی قوم یا کسی ملک کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ اس کا پیغام پورے عالمِ انسانی کے لیے ہے۔ اور پھر یہ وضاحت کر دی گئی کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہی ہے جس کو ہم نے صرف پیغام رسانی کے لیے چُن لیا ہے۔ یہ اپنے آپ کو کوئی نفع وضرر پہنچانے پر قادر نہیں ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ! اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا. (الاعراف: ۲۰)

اے رسولؐ! کہہ دے کہ اے لوگو! یقیناً مَیں تم سب کی طرف پیغام لے جانے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. (السبا: ۳)

اور ہم نے تجھ کو تمام لوگوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَىَّ. اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ. (الکہف: ۱۲)

اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہہ دو کہ مَیں بھی تم ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ مجھ میں اور تم میں صرف اتنا فرق ہے کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود ہی اکیلا معبود ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (الاعراف: رکوع ۲۳)

اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہہ دے کہ مَیں اپنی ذات کے لیے بھی نفع ونقصان کا کوئی خاص اختیار نہیں رکھتا مگر وہی جو اللہ چاہے اور اگر میں غائب سے واقف ہوتا تو بہت سا منافع حاصل کر لیتا۔ اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ مَیں تو ایمان لانے والوں کے لیے صرف نذیر وبشیر ہوں۔

مظاہرِ قدرت کی تسخیر

ہندوستان اور عرب اور دوسرے ملکوں میں سورج، چاند، پہاڑ، دریا، ہوا، پانی، آگ

اور ستاروں کی پرستش عام تھی۔ اسلام نے بتایا کہ یہ انسانیت کی بہت بڑی ذلت ہے کہ اس کو مظاہرِ قدرت کے آگے جھکایا جائے۔ حالانکہ وہ تمام مظاہر انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور انسان کے مسخر قرار دیے گئے ہیں۔ گویا انسانوں کو ترغیب دی کہ تمہارے سوا جتنی مخلوقات ہیں، اس کے ممکنات پر غور کرو اور اس سے کام لو۔ یہ آسمان و زمین، مہر و ماہ، انجم و کہکشاں، حیوانات، نباتات، جمادات، تمام تمہارے خدام ہیں۔ اُن کے آگے جھکنا کیا معنی، اُن پر قبضہ کرو۔

وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ. (بنی اسرائیل:۷)

ہم نے بنی آدم کو بندگی دی ہے۔

وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ. (الجاشیہ:۲)

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اور یقیناً اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. (آلِ عمران:۲۰)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے یاد رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں، وہ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے کار و بے نتیجہ پیدا نہیں کیا۔

قرآن نے بتایا کہ قبیلوں کی عظمت پر فخر کرنا اور حسب نسب پر اترانا بالکل بے کار ہے۔ کوئی برہمن ہوا تو کیا اور کھشتری ہوا تو کیا۔ یہ نام تو صرف تمہاری پہچان کے لیے رکھے گئے ہیں۔ ورنہ اصلی عزت تو اسی کی ہے جو نیک اور پرہیزگار ہے۔ خواہ وہ شودر اور چنڈال ہی ہو۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ. (حجرات)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک نر و مادہ سے پیدا کیا اور تم کو مختلف اقوام و قبائل بنا دیا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ خدا کے نزدیک تم سب میں بزرگ اور مکرم وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

صاف صاف کہہ دیا کہ زمین پر حکومت و سلطنت کرنا کسی خاص بادشاہ یا راجا کی اولاد یا قوم کا حق نہیں۔ وراثتِ ارضی صرف صالح لوگوں کا حق ہے، یعنی اُن کا جو اس ذمہ داری کے تحمل کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِالذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ. (الانبیاء:۷)

اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت کو صالح بندے ہی حاصل کریں گے۔

باپ دادا کی اندھی تقلید

رسوم پرستی اور آبا پرستی نے انسانی آبادیوں کو اکثر گمراہ کیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسان محض اس لیے غیراللہ کو پوج رہے ہیں کہ اُن کے باپ دادا بھی انہی کو پوجتے تھے۔ ورنہ حقیقت میں وہ جانتے ہیں کہ اُن کے معبود اُن کا کچھ بنا یا بگاڑ نہیں سکتے۔ کئی فحش کاریاں محض اس لیے رائج ہیں کہ لوگوں کے بڑے اُن کو جائز رکھتے تھے۔ اسلام نے اس قدامت پرستی اور تقلیدِ آبا کے خلاف آواز بلند کی۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْتَدْعُوْنَ اَوْيَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَ نَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ. (الشعراء:۵)

(ابراہیم علیہ السلام نے کافروں سے) کہا کہ آیا جب تم ان بتوں کو پکارتے ہو تو یہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں۔ یا تم کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ تو نہیں۔ لیکن ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَاتَعْلَمُوْنَ. (الاعراف:۳)

اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی

طریق پر کاربند دیکھا ہے۔ اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔ اُن سے کہہ دو کہ اللہ بے حیائی کے کام کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم لوگ بے سوچے سمجھے خدا پر جھوٹ بولتے ہو؟

ہر قوم میں ہادی آئے

پھر دوسرے مذاہب کے بانیوں کا ابطال نہیں کیا۔ کسی کو برا نہیں کہا۔ بلکہ سب کی تصدیق کی کہ وہ خدا ہی کی طرف سے آئے تھے۔

وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡر۔ (فاطر: ۳)

کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا (ہادیِ برحق) نہ گزرا ہو۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ۔

ہم نے جب کبھی کوئی رسول بھیجا تو اسی کی قومی زبان میں بھیجا تا کہ ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھا سکے۔

اس کے علاوہ کسی خدا پرست اور نیک آدمی کے اجرِ اخروی سے انکار نہیں کیا بلکہ اس کو خوف و حزن سے نجات کی بشارت دی۔

بَلٰى مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَّ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ۔ (البقرة: ۱۳)

حقیقت یہ ہے کہ جس نے خدا کے آگے سرِ خم کر دیا اور وہ نیکوکار بھی ہوا، اس کا اجر اس کے پروردگار کے ہاں موجود ہے اور ایسے لوگوں پر کوئی خوف اور کوئی حزن طاری نہ ہوگا۔

تبلیغ کے آداب

مذہب کی تبلیغ میں جبر و اکراہ کی شدید ممانعت کی تبلیغ کے سلسلے میں مفاہمت کی ایک ایسی بنیاد پیدا کر دی ہے جس سے توحیدِ الٰہی کا منشا پورا ہو جائے۔ اس کے علاوہ تبلیغ و ہدایت کے آداب بتائے۔ اور خوش بیانی اور حسنِ سلوک کی تلقین کی۔ چونکہ اہلِ کتاب اللہ کو مانتے تھے، اس لیے ان کو یہ پیش کش کی:

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔ (آل عمران: ۷)

اے رسولؐ! کہہ دے کہ اے اہلِ کتاب! آؤ اُس ایک کلمہ پر جمع ہو جائیں جو ہمارے

تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی چیز کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ اللہ کے سوا ہم سے کوئی کسی کو پروردگار ٹھہرائے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. (النحل:۱۶)

اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے دعوت دے اور ان سے بحث بھی کر لیکن نہایت اچھے طریق پر۔

وَ قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوْا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. (بنی اسرائیل:۶)

تو میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ جب بات کریں۔ بہت اچھے طریق پر کریں۔

اَللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ. (البقرة:۲۵)

اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ. (بقرہ:رکوع ۳۴)

دین میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں۔ نیکی اور سرکشی کے راستے جدا جدا واضح ہو چکے ہیں۔

سود خوری کی ممانعت

ناجائز طور پر مال فراہم کرنے کے خلاف آواز بلند کی۔ سود خوری کی سخت مذمت فرمائی۔

وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَابَ اَکْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا. (الفجر)

اور تم مردوں کا ترکہ سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو۔ مگر تم کو عبرت نہیں ہوتی اور تم مال و دولت کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً واتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (آلِ عمران:۱۴)

اے مسلمانو! سود نہ کھاؤ کہ دُگنا چوگنا ہوتا جائے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ فلاح پاؤ۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُ الشَّیْطٰنُ مِنَ

الْمَسِّ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا. (البقرة:۳۸)

جو لوگ سود کھاتے ہیں، قیامت کے دن کھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر اس شخص کی طرح جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ یہ اُن کے اس قول کی سزا ہے کہ تجارت بھی سود ہی کے مانند ہے۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔

جہاد کے لیے شروط

جہاد و قتال کے حدود معیّن کر دیے اور بتا دیا کہ مومنوں کے لیے جارحانہ جنگ ناجائز ہے۔ مدافعانہ جنگ ہی کو جہاد کہنا چاہیے۔ جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اُن سے لڑو۔ لیکن دیکھنا تجاوز نہ کرنا۔ جو لوگ عہد کر کے پھر جائیں، اُن کے ساتھ بھی جنگ کی اجازت ہے۔

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ. (البقرة: رکوع ۲۴)

مسلمانو! جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کے راستے میں اُن سے لڑو، اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا، وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرٌ. (حج: رکوع ۶)

اجازت دی جاتی ہے اُن لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے کہ وہ بھی جنگ کریں، اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں۔ اور یاد رکھیں کہ اللہ اُن کی نصرت پر قادر ہے۔

اَلَا یُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَکَثُوْا اَیْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَؤُاکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ. (توبہ: رکوع ۲)

تم اُن لوگوں سے جنگ کیوں نہیں کرتے جنھوں نے عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیا اور رسول کے نکال دینے کا پختہ ارادہ کر لیا اور انھی لوگوں نے پہلی دفعہ تم سے جنگ کرنے میں ابتدا کی۔

اگر اسلام کے دشمن مشرکین میں سے کوئی شخص کسی وقت مسلمانوں سے پناہ طلب کرے تو حکم یہ ہے کہ اس کو پناہ دے دو اور اسے اللہ کا کلام سناؤ۔ اس کے بعد اس کو ایسی جگہ

پہنچا دو جو اس کے لیے مقام امن ہو۔

و اِنْ اَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعُ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَ مَنَهُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمًا لَّايَعْلَمُوْنَ. (توبہ: رکوع ۱)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ طلب کرے تو اس کو پناہ دے دو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کی جائے امن تک پہنچا دو۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو نہیں جانتے۔

انصاف کا حکم

قرآن بے انصافی اور حق ناری کا سخت مخالف ہے۔ وہ کسی کے ساتھ عداوت کی حالت میں بھی بے انصافی کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ شہادت کی صداقت کو اس قدر اہم قرار دیتا ہے کہ اگر کسی شخص کی اپنی جان اور اس کے والدین اور اعزہ کی جانیں بھی خطرے میں پڑتی ہوں تو اسے ہر حال میں سچ بولنے پر قائم رہنا چاہیے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا. اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى. وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. (المائدہ: ۲)

مسلمانو! خدا کا خوف کرتے ہوئے انصاف کے ساتھ گواہی دیا کرو۔ لوگوں کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل و انصاف سے باز رہو۔ تم ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی طریقہ پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔ اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے فعل و عمل سے باخبر ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ. (النساء: ۲۰)

اے مسلمانو! خدا کا خوف کرتے ہوئے انصاف کے ساتھ گواہی دیا کرو۔ خواہ وہ گواہی تمہاری جانوں، تمہارے والدین اور تمہارے اقربا کے خلاف ہی جاتی ہو۔

جزیہ کے بعد قتال موقوف

جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں قرار دیتے، ان سے قتال کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ جزیہ دے دیں، اور ماتحت حیثیت قبول کر

لیں تو قتال موقوف کر دیا جائے۔

قَاتِلُوْا لِلَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَدٍ وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ۔ (توبہ: رکوع ۴)

وہ اہلِ کتاب جو نہ خدا کو مانتے ہیں، نہ یومِ آخرت کو، نہ خدا اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ نہ دیانت اور سچائی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں۔ اُن سے تم لڑو۔ یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

چونکہ اخلاق کے سوا کسی مذہب، کسی تہذیب اور کسی ثقافت کی بنیادیں استوار نہیں کی جا سکتیں۔ اس لیے اسلام نے اخلاقِ عالیہ پر بے حد زور دیا۔ قرآن کا کوئی صفحہ بھی تعلیمِ اخلاق سے خالی نہیں۔ نمونے کے طور پر چند آیات درج کی جاتی ہیں۔

پورا تولو

اَوْفُوا الْکَیْلَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَ ھُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۔ (الشعراء: رکوع ۱۰)

ناپتے وقت پیمانہ بھر دیا کرو۔ اور لوگوں کو نقصان پہنچانے والے نہ بنو۔ تولتے وقت ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم سے نہ دیا کرو۔ اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

عدل و احسان

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔ (النحل: ۱۳)

اللہ تم کو عدل و احسان کرنے اور قرابت داروں کو مالی امداد دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے منع کرتا ہے اور تم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم اس کا خیال رکھو۔

امانت میں خیانت نہ کرو، انصاف سے فیصلہ کرو

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ

تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ يَعِظُكُمْ بِهٖ. اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا. (النساء:٨)

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت رکھنے والوں کی امانتیں جب وہ مانگیں اُن کے حوالے کر دیا کرو۔ اور جب لوگوں کے جھگڑے فیصل کرنے بیٹھو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ اللہ تم کو یہ اچھی نصیحت کرتا ہے۔ اور وہ بلاشبہ سب کی سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے۔

شہادت کو مت چھپاؤ

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ. (البقرہ:٣٩)

اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ جو شہادت کو چھپاتا ہے وہ دل کا کھوٹا ہے۔

اپنے عہد کو پورا کرو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ. (المائدہ:١)

اے مسلمانو! اپنے معاہدوں کو پورا کرو۔

صبر کا درجہ

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ. اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (الشوریٰ:٤)

اور جو شخص صبر کرے اور دوسرے کی خطا بخش دے تو یہ بے شک بڑی ہمت کے کام ہیں۔

شیخی اور ڈینگ کی ممانعت

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا. (النساء:٦)

یقیناً اللہ شیخی خورے گھمنڈ کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

غصے کو پی جاؤ

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (آل عمران:١٤)

(وہ لوگ اچھے ہیں) جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

عجز، انکسار، متانت

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا. (الفرقان:٦)

اور اللہ کے بندے زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں۔ اور جب جاہل اُن کو مخاطب کرتے ہیں، وہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔

نیکی میں تعاون کا حکم

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰه. (المائدہ: ۱)

نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہو جایا کرو۔ گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور اللہ سے ڈرو۔

اتحاد کی نصیحت

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَاتَفَرَّقُوا. (آلِ عمران: ۱۱)

اور سب مل کر مضبوطی سے اللہ کے دین کی رسی کو پکڑے رہو۔ اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

یتیموں کا مال کھا جانا

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا. (النساء: ۱)

جو لوگ از راہِ ظلم یتیموں کے مال کو خورد بُرد کرتے ہیں۔ وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں۔

شراب اور جوئے کی ممانعت

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. (البقرۃ:۲۷)

اے رسولؐ! تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اُن سے کہہ دو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر اُن کے فائدے سے اُن کا گناہ بہت زیادہ ہے۔

زنا کی مذمت

لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا. اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا. (بنی اسرائیل: رکوع ۴)

اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ کیوں کہ یہ بے حیائی ہے اور بہت بُرا چلن ہے۔

اکڑفوں کی ممانعت

لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا. اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا.

(بنی اسرائیل: رکوع ۴)

زمین پر اکڑ کے نہ چل۔ کیونکہ تُو زمین کو تو پھاڑ نہ سکے گا۔ نہ تن کر چلنے سے پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔

ظن، تجسّس اور غیبت

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَاتَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا. (الحجرات: ۲)

مسلمانو! زیادہ بدگمانی کرنے سے پرہیز کرو۔ کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔ کسی کی جاسوسی کے درپے نہ رہا کرو۔ اور نہ ایک دوسرے کے پیچھے غیبت کیا کرو۔

خیرات کر کے احسان جتانا

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ لِلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. (البقرہ: رکوع ۳۶)

مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتانے اور رسائل کو ایذا پہنچانے سے ضائع نہ کرو۔ وہ شخص جو اپنا مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اس کا مال اکارت جاتا ہے اور وہ شخص اللہ اور یومِ آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔

مقروض غریب ہو تو تقاضا ملتوی کرو

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ.
(البقرۃ:۳۸)

اگر تمہارا کوئی قرض دار تنگی میں ہو تو اُسے فراخی تک مہلت دو۔ اور اگر قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔

عورتوں کے متعلق

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ. (النساء: رکوع ٦)

مرد عورتوں کے ذمہ دار اور سر دھرے ہیں۔ اس لیے کہ خدا نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور لیے بھی کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔

عورتیں ورثے میں حصہ دار ہیں

وَلِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا. (النساء: رکوع ١)

ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں تھوڑا ہو یا بہت، مردوں کا حصہ ہے۔ اور اسی طرح ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ اور یہ ہمارا ٹھہرایا ہوا ہے۔

غرض سارا قرآن اخلاقی تعلیمات سے لبریز ہے۔ اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق نیکی، پرہیز گاری، دیانت داری، رواداری کے احکام اس کتاب میں موجود نہ ہوں۔ اللہ اور رسول اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ بلند اخلاق انسانوں کا ایک معاشرہ مرتب کیا جائے جو اپنی زندگی کے نمونے اور اپنی تلقین سے دینِ حق کو دُنیا بھر میں پھیلا دے۔ چنانچہ وہ معاشرہ ظہور میں آ گیا۔ اور اس نے مشرق و مغرب کو نور سے بھر دیا۔ تاریکیاں کافور ہو گئیں اور جہاں جہاں مسلمان گئے، وہاں ذات پات، عدم مساوات، معبودانِ باطل، فحش کاری، عدم دیانت، ناشائستگی، شراب و قمار اور دوسرے رذائل کا استیصال ہو گیا۔ انسان کو اوہامِ باطلہ اور خداوندانِ باطل سے نجات مل گئی اور اس نے پہلی دفعہ کامل آزادی کی فضا میں سانس لیا۔

اس فصل کی تحریر کا مدّعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہندوؤں کو جو انتہائی ذلّت اور مصیبت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور جن کے دین دھرم اور اخلاق کو دیمک لگ گئی تھی۔ عنقریب جن لوگوں سے سابقہ پڑنے والا تھا، وہ کس پاکیزہ دین اور بلند مقامِ اخلاق کے حامل تھے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مسلمان سلاطین و اُمرا اس مذہب مقدس کے دعوے دار ہونے کے باوجود اس کے معیاروں پر پورے نہ اُترے اور اسلام کے لیے ننگ و رسوائی کے موجب ہوئے لیکن مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اپنے دین کے احکام پر کاربند رہ کر اہلِ ہند کے سامنے اسلام اور قرآن کی صحیح تعلیم کا نمونہ پیش کرتی رہی جس سے ہندو قوم نے کافی فائدہ اُٹھایا۔ گو اس فائدے سے پوری طرح بہرہ یاب نہ ہو سکی۔

دوسری فصل: عرب ہندوستان میں
جنوبی ہند میں مسلمانوں کے مراکز

ہزارہا سال قبل

یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان پر عربوں کے فوجی حملوں سے پیشتر صدہا سال سے نہیں بلکہ ہزارہا سال سے اس ملک میں عربوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے دو ہزار سال قبل بھی جو عرب تاجر مصر کو جاتے تھے، ان کے سامان تجارت میں آب دار فولاد، تیز پات اور مسالے شامل ہوتے تھے۔ جو ہندوستان کے سوا اور کسی ملک سے دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ (حزقیل نبی کی کتاب ۲۷:۱۹) الفنسٹن کی تاریخ ہند کے دسویں باب میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو ہی نسل بعد حضرت یوسفؑ کے زمانے میں ہم عربوں کے اس تجارتی قافلے کو اسی راستے سے گزرتا ہوا پاتے ہیں اور یہ وہی کارواں ہے جو حضرت یوسفؑ کو مصر پہنچاتا ہے (پیدائش ۳۷:۲۵) اس راستے کا ذکر یونانی مؤرخین نے بھی کیا ہے۔ غرض حضرت یوسفؑ کے عہد سے لے کر مارکوپولو اور واسکوڈی گاما کے زمانے تک ہندوستان کی تجارت کے مالک عرب ہی رہے۔ (الفنسٹن)

عرب جہاز رانوں کا راستہ

مولانا سید سلیمان ندوی اپنی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' میں لکھتے ہیں:

عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار اور پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعے سے یورپ تک پہنچاتے تھے۔ اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔

عربوں کا راستہ یہ تھا کہ وہ مصر و شام کے شہروں سے چل کر خشکی کی راہ بحر احمر کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک پہنچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ کو چلے جاتے تھے اور کچھ وہیں سے سمندر کے کنارے کنارے حضر موت، عمان، بحرین اور عراق کے کناروں کو طے کر کے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ تیز میں اتر پڑتے تھے اور پھر اور آگے بڑھ کر سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) میں چلے آتے تھے۔ اور پھر اور آگے بڑھ کر گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ تھانہ (بمبئی) کھمبایت چلے جاتے تھے۔ پھر آگے بڑھتے تھے اور سمندر سمندر کالی کٹ اور راس کماری پہنچتے تھے۔ اور پھر کبھی مدراس کے کنارے پر ٹھہرتے تھے۔ اور کبھی سراندیپ (لنکا) انڈمان ہو کر خلیج بنگال میں داخل ہو جاتے تھے۔ اور بنگال کی ایک دو بندرگاہوں کو دیکھتے ہوئے برہما اور سیام ہو کر چین چلے جاتے اور پھر اسی راستے سے لوٹ آتے تھے۔

مولانا سید سلیمان نے اپنی اس فاضلانہ کتاب میں عرب و ہند کے تجارتی تعلقات کی قدامت اور اس کے تسلسل کے متعلق نہایت بیش بہا مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس موضوع کے تفصیلی مطالعہ کے لیے اس کتاب کو پڑھنا چاہیے۔

اشیائے برآمد و درآمد

ہندوستان سے عرب کون کون سا مال برآمد کرتے تھے۔ ابوزید سیرانی کے اس بیان سے معلوم ہوگا۔ ''ہندوستان کے سمندروں میں موتی اور عنبر ملتا ہے۔ اس کے پہاڑوں میں جواہرات اور سونے کی کانیں ہیں۔ اس کے ہاتھیوں کے منہ میں ہاتھی دانت ہے۔ اس کی پیداوار میں آبنوس، بید، عود، کافور، لونگ، جائفل، بقم، صندل اور ہر قسم کی خوشبو کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کے پرندوں میں طوطے اور مور ہیں۔ اور اس کی زمین کا فضلہ مشک اور زباد ہے۔'' (زباد ایک جانور کا پسینہ ہے)[۱]

اس کے علاوہ دوسرے عرب سیاحوں نے ہندوستان کی اشیائے برآمد کا جو حال لکھا

ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صندل، کافور، لونگ، جائفل، کباب، چینی، ناریل، سن کے کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی؛ سراندیپ سے یاقوت، موتی، بلور اور سنباذج جس سے جواہرات درست کیے جاتے ہیں؛ ملیبار سے سیاہ مرچ؛ گجرات سے سیسہ؛ دکن سے بکم؛ سندھ سے کٹھ بانس اور بید۔[۲] کارومنڈل اور ملیبار کے بیچ میں ایک راس پھیلی ہے، اس سے الائچی برآمد ہوتی تھی۔ اور غالباً ہیلا بچی کہلاتی ہوگی جس طرح عُود کا نام جو کارومنڈل سے جاتا تھا، عربوں نے مندل رکھ دیا۔[۳]

اسی طرح مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اشیاء کے علاوہ نارنگی، لیموں، ریوند چینی، جاوتری، کیلے، دارچینی، تُوتیا، ساگوان کی لکڑی، تلواریں، کافور، سونٹھ، چھالیہ، ہلیلہ، بلیلہ، بھلانوہ، نیل، باریک کپڑا، گینڈے کی کھال اور بے شمار دوسری چیزیں ہندوستان سے برآمد ہوتی تھیں۔ اس کے بدلے میں ہندوستان مصر سے زمرد کی انگوٹھیاں، مرجان، دہنج (ایک قیمتی پتھر)، شراب؛ روم سے ریشمی کپڑے، سمور، پوستین اور تلواریں؛ فارس سے گلاب کا عرق؛ بصرہ سے کھجوریں اور عرب سے گھوڑے منگواتا تھا۔ سفر نامہ سلیمان، ابوزید، ابن حوقل، ابن خورداذبہ اور تقویم البلدان (ابوالفدا) میں یہ تمام تفصیلات درج ہیں۔

مسلمان عربوں کا وُرود

ظہورِ اسلام کے بعد جو عرب جہاز رانی اور تجارت کے سلسلے میں ہندوستان میں آئے، وہ قدرتی طور پر مسلمان تھے۔ اور اپنے جدید مذہب کی تبلیغ کے شوق سے سرشار۔ اس کے علاوہ ان کے اخلاق و اطوار پہلے سے بہت سلجھ چکے تھے۔ وہ عبادت، دیانت اور امانت کے پیکر بن چکے تھے۔ انھوں نے جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر اپنی نو آبادیاں بنالیں اور یہاں کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنا شروع کردیا۔ سراندیپ (لنکا) کے ایک پہاڑ پر ایک نقشِ قدم زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے جس کو ہندو شِوجی کا نقشِ قدم سمجھتے ہیں، بودھ اسے ساکیامُنی گوتم سے منسوب کرتے ہیں اور سامی قوموں کا عقیدہ ہے کہ آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر اتارے گئے تھے تو سب سے پہلے زمین کے جس حصے نے ان کے قدم چومے وہ یہی لنکا کی پہاڑی تھی۔ اور یہ نقشِ قدم انھی کا ہے۔ چنانچہ ظہور اسلام کے بعد بے شمار درویش اور سیاح اس نقشِ قدم کی زیارت کے لیے بھی سراندیپ آنے لگے اور آہستہ آہستہ ان جنوبی علاقوں میں جابجا مسلمانوں کی آبادیاں ہونے

لگیں۔

ہندوستان کی دولت میں اضافہ

اسلامی عہد میں اس تجارت کی وجہ سے عرب اور جنوبی ہند دونوں کی دولت میں بڑا اضافہ ہوا۔ ولبھ رائے کا پایہ تخت مہانگر ''سونے کا شہر'' کہلاتا تھا۔ جزیرہ جاوا کے پائے تخت کے بازار میں دکانوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ صرف صرافے کی دکانیں آٹھ سو تھیں۔ عمان میں موتیوں کا ایک تاجر تھا جس نے ایک دفعہ دو نادر روزگار موتی پائے جس کی قیمت بغداد کے خلیفہ نے ایک لاکھ درم ادا کی۔[۴] ایک ناخدا کہتا ہے کہ ۳۱۷ھ میں وہ ہندوستان سے سامان تجارت لے کر عمان گیا تو اس کے جہاز پر اتنا مال تھا کہ حاکم عمان نے اس پر چھ لاکھ دینار ٹیکس وصول کیا۔ یہ اس ایک لاکھ دینار کے علاوہ تھا جو اس نے از راہ کرم معاف کر دیا۔ اسی سال سراندیپ سے ایک اور جہاز آیا۔ اس نے بھی چھ لاکھ دینار ٹیکس ادا کیا۔ عجائب الہند میں اس قسم کی متعدد مثالیں درج ہیں۔ (صفحہ ۱۰۸، ۱۳۰، ۱۵۸) اسی طرح کالی کٹ اور کارومنڈل کے راجا اس بحری تجارت کی بدولت لاتعداد دولت کے مالک تھے۔ کارومنڈل کے ایک راجا کے مرنے پر اس کے ایک مسلمان کارکن کو جو سونا اور جواہرات ہاتھ آئے اس کے اٹھانے کے لیے سات ہزار بیلوں کی ضرورت پڑی۔[۵] اسی کارومنڈل کو جب علاؤ الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے فتح کیا تو اس کو خزانۂ حکومت سے دوسری چیزوں کے علاوہ چھیانوے ہزار من سونا، پانسو من موتی، اور جواہرات ہاتھ آئے۔ علاؤ الدین کے زمانے میں من تیرہ چودہ سیر کا ہوتا تھا۔ یعنی انگریزی حساب سے ۲۸ پاؤنڈ کے برابر۔ اس لحاظ سے صرف اس سونے کا حساب ۲۶ لاکھ ۸۸ ہزار پاؤنڈ ہوتا ہے۔[۶] جواہرات اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی مالیت کا کچھ اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا یہ سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان جو اس زمانے میں سونے کی کان اور بہت بڑا دولتمند ملک سمجھا جاتا تھا تو اس دولت اور شہرت کے لیے وہ زیادہ تر عرب تاجروں کا شرمندۂ احسان تھا۔ اگر عرب اس کے مال کو بیرونی ملکوں تک نہ پہنچاتے تو ہندو اس کام سے عاجز رہتے۔ کیونکہ ایک تو سوائے چند جزیرہ نشینوں کے ان میں جہاز رانی کا ذوق نہ تھا۔ دوسرے ہندو دھرم نے سُمدّر یاترا (بحری سفر) ممنوع کر دیا تھا۔

سراندیپ میں اسلام

جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت کے متعلق عرب اور ایرانی سیاحوں نے بہت کچھ لکھا

ہے۔ مثلاً بزرگ بن شہریار ناخدا جو سراندیپ، لکادیپ، مالدیپ اور دوسرے جزائر کا جہاز راں تھا، سراندیپ کے سادھوؤں اور جوگیوں کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں۔ اور ان سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ یہ لوگ ضرور بودھ ہوں گے۔ اور دوسرے عرب سیاحوں کے بیانات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ناخدا نے بتایا ہے کہ اسلام کا پہلا مرکز سراندیپ ہی ہوا۔

سراندیپ اور اس کے نواحی علاقوں کو جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنا ایک فہیم و زیرک قاصد تحقیقِ حال کے لیے عرب بھیجا۔ لیکن جب وہ مدینہ پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی وفات پا چکے تھے اور حضرت عمرؓ کا عہد تھا۔ یہ قاصد ان سے ملا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دریافت کیے۔ حضرت عمرؓ نے تفصیلاً تمام حالات بتائے۔ جب یہ قاصد واپس آرہا تھا تو مکران میں فوت ہوگیا۔ اس کا ایک ہندو نوکر سراندیپ واپس پہنچا جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ کے حالات بیان کیے اور ان کے درویشانہ اسلوبِ زندگی کا ذکر کرکے ان کی تواضع اور خاکساری کی تعریف کی۔[۷]

مالدیپ

جزیرہ مالدیپ میں مسلمانوں کا دوسرا مرکز قائم ہوا۔ ابن بطوطہ کے زمانے میں یہاں یمن وغیرہ کے بہت سے علماء اور جہاز راں موجود تھے۔ ان کی زبانی ابن بطوطہ نے مالدیپ کے لوگوں کے مسلمان ہونے کی یہ کیفیت درج کی ہے کہ یہ لوگ پہلے بت پرست تھے۔ یہاں ہر ماہ سمندر سے ایک عفریت برآمد ہوتا تھا۔ جب لوگ اس کو دیکھتے تو ایک دوشیزہ کو آراستہ پیراستہ کرکے سمندر کے کنارے ایک مندر میں چھوڑ آتے۔ لیکن مراکش سے ایک عرب شیخ ابو البرکات بربری اتفاق سے یہاں آنکلے۔ ان کی دعا سے یہ عفریت غائب ہوگیا اور لوگوں کے سر سے بلا ٹل گئی۔ مالدیپ کا راجا شنورازہ اور تمام رعایا حضرت شیخ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی۔ اس وقت سے آج تک یہ جزائر مسلمان ہیں اور ان کی آبادی کی اکثریت مخلوط النسل عربوں کی ہے۔

ملیبار

ملیبار بھی اسلام کا ایک بڑا مرکز قرار پایا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں

عرب و عجم کے کچھ مسلمان درویش حضرت آدم علیہ السلام کے نقشِ قدم کی زیارت کے لیے سراندیپ (لنکا) جارہے تھے کہ بادِ مخالف کی وجہ سے ان کا جہاز بھٹک گیا اور ملیبار کے شہر کدنگانور کے کنارے آن لگا۔ شہر کے راجا زیمورن (سامری) نے ان کی بہت خاطر تواضع کی اور دورانِ گفتگو میں پوچھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے تو میں نے تمھارے پیغمبر اور دین کا حال بہت سنا ہے لیکن آج تم خود سناؤ۔ جب ان درویشوں نے اسلام کی حقیقت مؤثر انداز میں بیان کی تو راجا دینِ حق پر فریفتہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ آپ لوگ زیارت سے فارغ ہوکر واپسی پر یہاں ضرور آئیں۔ جب وہ آئے تو راجا زیمورن نے امراء کو بلا کر کہا کہ میں اب یادِ الٰہی میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ مملکت کا انتظام کرو۔ یہ کہہ کر ملک اپنے افسروں میں تقسیم کردیا۔ اور خود چھپ چھپا کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہوگیا۔ اس نے عربوں کو ملیبار کے ساتھ تجارت اور آمدورفت کی تلقین کی اور اپنے امراء کے نام ایک وصیت لکھی کہ "ان غیر ملکی تاجروں کو تمام سہولتیں بہم پہنچاؤ، ان کو مسجدیں بنانے کی اجازت دو اور اگر یہ ملیبار کو اپنا وطن بنانا چاہیں تو شوق سے بنائیں۔"

چنانچہ اس وقت سے ہندوستان کے مغربی ساحل کی بندرگاہوں میں مسلمان جوق در جوق آنے لگے۔ اگرچہ ان کی آبادی دس فیصدی سے زیادہ نہیں لیکن ملک کے سردار اور فوجی افسر اُن سے حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں۔[۸] یہی مسلمان عرب تاجر ہیں جو برابر ملیبار میں مقیم ہیں اور ماپلا اور نائت کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں ملیبار کے اصلی باشندے بھی ہیں۔ جو گزشتہ صدیوں میں مشرف باسلام ہوتے رہے۔

مَعْبر (کارومنڈل)

ان علاقوں کے مسلمان چونکہ اپنے غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت نہایت آزادی اور عزت و حرمت کی زندگی بسر کررہے تھے اس لیے ان پر جان بھی چھڑکتے تھے۔ چنانچہ ۷۱۰ھ میں جب علاء الدین خلجی کی فوج گجرات سے روانہ ہوکر کارومنڈل میں پہنچی۔ تو یہاں کے مسلمانوں نے جو عرب اور عراقی تھے ترکوں کا جان توڑ مقابلہ کیا لیکن اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ سپہ سالار ملک کافور نے ملک پر قبضہ کرلیا۔[۹] اور معبر (کارومنڈل) میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ جہاں حسن کیتھلی اور اس کے جانشینوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک کوئی چالیس برس

حکومت کی۔ لیکن اس صدی کے آخر میں وجیانگر کے راجا نے اس اسلامی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا پایۂ تخت شہر مدورا تھا۔

گجرات اور دکن میں عرب

عرب مؤرخین اور سیاحوں میں اکثر نے یہ لکھا ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا راجا بلہرا ہے (جو اصل میں ولبھ رائے ہے) اس کی حکومت بہت وسیع تھی اور گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ اور کوکن جو عربوں کے تجارتی مرکز تھے، اسی راجا کے ماتحت تھے۔ یہ راجا عربوں سے بے حد محبت رکھتا تھا اور اس کی رعایا کا عقیدہ تھا کہ ان کے راجاؤں کی عمریں صرف اس لیے لمبی ہوتی ہیں کہ وہ عربوں کے ساتھ مدارات سے پیش آتے ہیں۔ اسی طرح طاقن کے راجا (یعنی حکمرانِ دکن) کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ عربوں کے ساتھ بلہرا ہی کی طرح محبت رکھتا ہے۔ لیکن ''جُوز'' یا گوجر راجاؤں کی نسبت عام رائے یہ ہے کہ وہ عربوں کے دشمن ہیں۔[۱۰] مسعودی نے بھی مروج الذہب میں بلہرا راجاؤں کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے راج میں بہت سی مسجدیں اور جامع مسجدیں تعمیر ہوئیں جو ہر طرح آباد ہیں۔ تھانہ اور کھمبایت میں بھی عربوں کی آبادیاں تھیں اور یہ بھی بلہرا ہی کی حکومت میں شامل تھے۔

دوسرے بے شمار مراکز

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں بے شمار مقامات کا ذکر کیا ہے جن میں عرب بہت عزت و اقتدار کے ساتھ آباد تھے۔ یہ سیاح محمد تغلق کے زمانے میں آیا۔ اور اس بادشاہ کی طرف سے ایک جوابی سفارت لے کر چین جا رہا تھا۔ یہ دہلی سے کھمبایت اور وہاں سے کارومنڈل گیا کہ چین کو جانے کا یہی راستہ تھا۔ چنانچہ اس کے کھمبایت، گاوی، گندھار، بیرم، گوگہ، چنداپور، ہنور، ملیبار، ابی سرور، پاکنو، منگلور، ہیلی، جرپٹن، دہ پٹن، بُدھ پٹن، پنڈارانی، کالی کٹ، کولم، چالیات، مالدیپ، سیلون، گالی، معبر، دوار سمندر اور وجیانگر کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا ہے۔ ابنِ بطوطہ کو ان تمام مقامات پر مسلمان تاجروں، مسلمان ناخداؤں اور مسلمان بزرگان دین سے ملاقات کا موقع ملا۔ ہر جگہ مسجدیں آباد نظر آئیں۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام پسند آیا۔ اور بعض مقامات پر راجاؤں کی فوجوں میں ہزاروں مسلمان سپاہی بھی شامل نظر آئے۔ غرض جنوبی ہند کے جزائر اور مالابار اور کارومنڈل کے ساحل صدہا سال سے عربوں کے تجارتی اور جہاز رانی کے

مرکز بن چکے تھے۔

محمد بن قاسم کے حملے کے بعد عربوں کا سب سے بڑا مرکز جاہ و جلال سندھ قرار پایا جس کا ذکر آئندہ فصل میں آئے گا۔ موجودہ فصل میں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ عرب تاجروں اور ناخداؤں کی اولوالعزمی اور دیانت و امانت اور تبلیغ دین کی وجہ سے اسلام جمالی رنگ میں مدت دراز سے ہندوستان میں قدم جما چکا تھا۔ اور یہ لوگ دنیا پر ثابت کر چکے تھے کہ دین حق اپنی مقبولیت کے لیے تیر و شمشیر کا محتاج نہیں ہوتا۔

تیسری فصل: محمد بن قاسم کا سندھ میں ورُود

سندھ اور ایران ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں اور ہمسایہ ملکوں کے درمیان صلح و جنگ دونوں صورتیں پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں۔ چنانچہ اسلام سے پہلے کبھی ایرانی لشکر دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کر لیتے۔ اور کبھی سندھ کے راجا مکران کے پہاڑوں تک بڑھ جاتے۔ ظہور اسلام کے بعد ایران کے ایک صوبے کا گورنر ہرمز اپنے جنگی جہازوں کی مدد سے بار بار سندھ کے ساحل پر حملہ آور ہوا۔ اور یہاں سے بے شمار آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گیا جو سب کے سب جاٹ تھے۔ کیونکہ سندھی فوج زیادہ تر جاٹوں پر مشتمل تھی۔ جب ایران پر عربوں کا حملہ ہوا تو ایرانیوں نے سندھیوں سے صلح کر لی اور ہرمز نے اپنے ہاں کے جاٹ اسیرانِ جنگ کو موردِ عنایات کر کے ایرانی فوج میں بھرتی کر لیا۔ عہدِ صدیقی (رضی اللہ عنہ) میں ایک جنگ ذات السلاسل کے نام سے مشہور ہے جس میں سندھی پاؤں میں زنجیریں باندھ کر ایرانیوں کی فوج میں شریک ہوئے تھے۔ اس جنگ میں خالد بن ولید نے ہرمز کو قتل کر دیا۔ اور ہزاروں جاٹ عربوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد وہ برضا و رغبت مسلمان ہو کر عراق میں زندگی بسر کرنے لگے۔ عرب ان کو زط کہتے تھے۔

جنگ ذات السلاسل کے دو سال بعد ۱۴ ہجری میں قادسیہ کی مشہور جنگ ہوئی۔ یزدجرد شاہ ایران نے اس موقع پر حلیف ملکوں سے بھی امداد طلب کی۔ چنانچہ سندھ میں بھی سفارت بھیجی۔ جس کے جواب میں سندھ کے راجا نے صرف اپنی فوج ہی نہ بھیجی۔ بلکہ سامان جنگ اور جنگی ہاتھی بھی بھیجے۔ بلکہ اپنی خاص سواری کا سفید ہاتھی بھی روانہ کیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک طرف چچ نامہ میں لکھا ہے کہ سندھ کے راجا کی خاص سواری کا ہاتھی سفید ہوتا تھا۔ اور دوسری

طرف جنگ قادسیہ کے ذکر میں یہ آ ہی چکا ہے کہ جنگ کے تیسرے دن فیلِ سفید جو تمام ہاتھیوں کا سردار سمجھا جاتا تھا، عربوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور پھر باقی ہاتھیوں کو بھگانا اور سپہ سالار رستم کو ہلاک کرنا مسلمانوں کے لیے آسان ہوگیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مکران تک مسلمانوں کا علم لہرا چکا تھا۔ اور فتح مکران کے موقع پر بھی سندھیوں نے عساکرِ اسلامی کا مقابلہ کیا تھا۔ چونکہ سندھی سالہا سال سے مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ اس لیے انصاف کے تقاضے سے مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو چکا تھا کہ ایران کی فتح سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سندھ پر حملہ آور ہوں۔ لیکن اس کے باوجود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ انتقام کی خاطر ایک نئی جنگ چھیڑ دیں۔ ۱۵ ہجری میں عثمان بن ابوالعاص ثقفی بحرین اور عمان کا حاکم مقرر ہوا۔ تو اس نے اپنے بھائی حَکَم کو بحرین بھیجا اور خود عمان چلا گیا۔ وہاں سے ایک فوج تھانہ بھیجی (جہاں آج کل بمبئی واقع ہے) اور پھر اپنی اس مہم کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی۔ آپ ناراض ہوئے اور لکھا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر سواحلِ ہند پر فوج بھیجی۔ اگر ہمارے آدمی وہاں مارے جاتے تو واللہ میں تمھارے قبیلے کے اتنے ہی آدمی قتل کر ڈالتا۔ حکم نے ایک فوج بروص (بھڑوچ) بھیجی اور اپنے بھائی مغیرہ کو خلیج دیبل میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا جو فتحیاب واپس آیا۔[۱۱]

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے عبداللہ بن عامر کو عراق کا والی مقرر کیا اور حکم نامہ بھیجا کہ کسی شخص کو ہندوستان بھیج کر وہاں کے حالات وکوائف کی معلومات بہم پہنچاؤ۔ عبداللہ نے ایک شخص حکیم بن جبلہ العبدی کو بھیجا۔ جب وہ واپس آ کر حسب الحکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت کے استفسار پر اس نے بیان کیا کہ ''وہاں پانی کمیاب ہے۔ پھل لذیذ نہیں ہیں۔ ڈاکو بہت دلیر ہیں۔ اگر کم تعداد فوج بھیجی گئی تو ہلاک ہوجائے گی۔ اور زیادہ لشکر بھیجا گیا تو بھوکوں مر جائے گا۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ تم حقیقت بیان کررہے ہو یا محض قافیہ پیمائی ہے؟ حکیم نے کہا کہ میں حقیقت عرض کررہا ہوں۔ اس پر خلیفہ ثالث نے ہندوستان کو مہم بھیجنے کا ارادہ ترک کردیا؟[۱۲]

پھر ۳۹ ہجری کا ذکر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہدِ خلافت میں حارث بن مرہ العبدی کو سرحد کی ایک کشمکش مٹانے کے لیے بھیجا۔ پہلے تو اسے کامیابی ہوئی۔ لیکن تین

سال بعد قیقان کے مقام پر وہ اور اس کے بہت سے ساتھی شہید ہو گئے۔ یہ قیقان سندھ میں ہے اور خراسان کی سرحد پر واقع ہے۔

اس کے دو سال بعد جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت تھا۔ مشہور سپہ سالار مہلّب بن ابی صفرہ نے اسی سرحد پر حملہ کیا اور الّاہور (لاہور) تک بڑھ گیا جو کابل و ملتان کے درمیان واقع ہے۔ اسی عہد میں خلیفہ نے ایک اور شخص عبداللہ کو ہندوستان بھیجا۔ یہ قیقان میں لڑا۔ اور کچھ مال غنیمت لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے امیر معاویہ کی خدمت میں قیقان کے گھوڑے پیش کیے اور کچھ مدت ان کی خدمت میں رہ کر قیقان گیا۔ جہاں ترکوں نے یورش کر کے اسے قتل کر دیا۔[۱۳]

ظاہر ہے کہ یہ حملے نہ تھے بلکہ محض سرحدی جھڑپیں تھیں جو سندھ اور مکران کی درمیانی سرحد کو سندھیوں کی داروگیر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہوتی تھیں۔ تاریخوں میں ان کے علاوہ اور مہموں کا بھی ذکر ہے جو سندھی راجاؤں کی شرارتوں کا انسداد کرنے کے لیے سرحد پر بھیجی گئیں۔ کیونکہ سندھی مسلسل مسلمانوں کے ساتھ بغض و عداوت کا ثبوت دے رہے تھے۔

جب عبدالملک بن مروان (اموی خلیفۂ دمشق) نے حجاج بن یوسف ثقفی کو اسلام کے ممالک مشرقیہ کا والی مقرر کیا۔ اور حجاج نے کوفہ و بصرہ و مکران کے بعض شرپسند عناصر کی سرکوبی کی تو دو بھائیوں محمد علافی و معاویہ علافی نے بے حد سرکشی اختیار کی۔ پانچ سال کی کشمکش کے بعد معاویہ تو قتل ہو گیا۔ لیکن محمد بن حارث علافی پانسو عرب سپاہیوں کو ساتھ لے کر مکران سے سندھ میں داخل ہو گیا۔ راجا داہر نے جو مکران، افغانستان اور شمالی بلوچستان میں مسلمانوں کی خانہ جنگی کو دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا، محمد بن حارث علافی اور اس کے آدمیوں کو نوکر رکھ لیا اور ان کی تالیف قلوب میں خاص اہتمام کرنے لگا۔ اس پر حجاج نے خلیفہ عبدالملک کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ سندھ کے راجا کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے۔ اب وہ سلطنتِ اسلامی کے باغیوں اور غداروں کو پناہ دے کر ان کی خاطر مدارات کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے سندھ پر فوج کشی کی اجازت دی جائے۔ خلیفہ عبدالملک نے بھی حملے کی اجازت دینے میں تامل کیا۔ اور ابھی یہ درخواست زیرِ غور ہی تھی کہ عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔

ادھر جب راجا داہر نے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ شادی کر کے اپنے بھائی بندوں اور دوسرے رؤسائے سندھ کو سخت صدمہ پہنچایا اور وہ اس کے خلاف صف آرا ہو گئے تو اسے مسلسل

لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ یہاں تک کہ رمل کا راجا ایک لشکرِ جرار لے کر اس کے خلاف قلعہ راور پر آیا۔ اور اس کو فتح کر کے سندھ کے پائے تخت الور پہنچ گیا تو وزیر نے راجا داہر کو مشورہ دیا کہ محمد بن حارث علافی سے بات چیت کرو۔ عرب جنگ و پیکار کے مردِ میدان ہیں، اُن کی مدد سے یہ معرکہ سَر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ داہر نے مسلمانوں کے اس باغی سے جو اس کے پاس پناہ گزیں تھا، مدد چاہی۔ اس نے اپنے پانسو عرب ساتھیوں اور سندھی لشکر کو ساتھ لے کر ایسی جنگ کی کہ داہر کو فتح حاصل ہوگئی۔ جب دوسرے دن اسیرانِ جنگ اس کے سامنے لائے گئے اور اس نے ان کے قتل کا حکم دیا تو محمد بن حارث علافی نے جو باغی ہونے کے باوجود مسلمان تھا۔ اس کو اس قتل سے روکا اور کہا کہ صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہزیمت خوردہ اکابر و اعیان کی جان بخشی کر دی جائے۔ چنانچہ قیدی رہا کر دیے گئے۔ اس کے بعد داہر نے علافی سے کہا کہ تم اپنی خدمت کا صلہ کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میرے کوئی بیٹا نہیں جس سے دنیا میں نام چلے۔ آپ یہ حکم دے دیں کہ آئندہ آپ کی سلطنت میں جو سکّے مضروب ہوں، ان پر ایک طرف میرا نام ہو اور دوسری طرف آپ کا تا کہ ہندو سندھ میں میرا نام ہمیشہ یادگار رہے۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا۔[۱۴]

یہ واقعات اس لیے قلمبند کیے گئے ہیں کہ سندھ پر مسلمانوں کے حملے کا پس منظر واضح ہوجائے اور پڑھنے والوں کو معلوم ہو کہ سندھیوں کی طرف سے سالہا سال کی متواتر و مسلسل دشمنی کے باوجود مسلمانوں نے صبر سے کام لیا۔ سندھیوں نے ایرانیوں کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں سے جنگ کی۔ انھوں نے مکران کی سرحد پر ہمیشہ فتنہ انگیزی کی۔ انھوں نے سلطنتِ اسلامی کے غداروں کو پناہ دی۔ لیکن خلفائے اسلام نے اپنے عاملوں اور جرنیلوں کو سندھ پر فوج کشی کی اجازت دینے میں ہمیشہ تامل کیا لیکن آج مسلمانوں کا جامِ شکیب لبریز ہوگیا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

گزشتہ فصل میں بیان کیا جاچکا ہے کہ جزائر سراندیپ۔ لکادیپ۔ مالدیپ اور ملیبار میں ہزار ہا مسلمان آباد تھے۔ سراندیپ (لنکا) کے راجا کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ نہایت شفیقانہ تھا۔ کیونکہ ایک تو اس کا ذاتی میلان اسلام کی طرف تھا۔ دوسرے سلطنتِ اسلامی دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن چکی تھی۔ تیسرے سراندیپ کی روز افزوں ثروت عرب تاجروں کی مرہونِ احسان تھی۔ اس راجا نے آٹھ جہازوں کا ایک بیڑا مرتب کیا۔ سراندیپ کے بیش بہا تحائف خلیفہ اسلام کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ان جہازوں پر بار کیے۔ سراندیپ کے

رہنے والے بہت سے مسلمانوں کو ان جہازوں میں سوار کیا۔ تاکہ وہ اپنے وطن میں پہنچ کر حج بیت اللہ سے مشرف ہو آئیں۔ اور ان کے ساتھ بعض مرحوم عرب سوداگروں کی بیواؤں اور یتیموں کو بھی سوار کرا دیا تاکہ عرب پہنچ جائیں۔ جب یہ بیش قیمت بیڑا بحر عمان میں داخل ہونے لگا تو باد مخالف کے تھپیڑوں نے اسے بے قابو کر کے بندرگاہ دیبل پر پہنچا دیا۔ یہ سندھ کا بہت اہم شہر اور تجارتی مرکز تھا۔ راجا کی طرف سے ایک والی اور ایک سپہ سالار یہاں رہتے تھے۔ سندھی مسلمانوں کے دشمن تو تھے ہی، انھوں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ اس ہنگامۂ رستخیز میں ایک شخص کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اس نے حجاج بن یوسف کے پاس پہنچ کر ساری داستان سنائی۔ اور کہا کہ جب ایک بیوہ عرب عورت پر سختی کی گئی تو اس نے پکار کر کہا یَا حَجَّاج اَغِثْنِی (اے حجاج ہماری فریاد کو پہنچ)۔

حجاج جس قسم کا ضابطہ پسند اور سخت گیر انسان تھا، تاریخ پڑھنے والے خوب جانتے ہیں۔ یہ داستان سن کر اسے سخت صدمہ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے نہایت نرمی سے راجا داہر کو خط لکھا کہ ''آپ کے سرداروں نے بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا ہے اور تحائف اور اموال لوٹ لیے ہیں۔ آپ جہاز مع سامان ہمارے پاس بھجوا دیجیے۔ قیدیوں کو رہا کر دیجیے۔ اور اپنے سرداروں کو سزا دیجیے۔'' اس کے جواب میں داہر نے نہایت بے پروایانہ لکھا کہ ''جہازوں کو لوٹنے والوں پر خود ہمارا بھی بس نہیں چلتا۔ تم خود آ کر اپنے قیدی چھڑا لو۔ اور اپنے تحائف و اموال واپس لے لو۔'' حالانکہ یہ تمام مسلمان قیدی اس وقت الُور کے سرکاری قید خانے میں پہنچ چکے تھے اور سراندیپ کے جہاز سندھ کے سرکاری بیڑے میں شامل کیے جا چکے تھے۔ اور یہ انکشاف اس وقت ہوا جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا۔

حجاج بن یوسف نے خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک سے سندھ پر جہاد کرنے کی اجازت طلب کی۔ خلیفہ نے اجازت دے دی۔ حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم ثقفی کو جو سترہ سال کی عمر کا ایک صالح اور بہادر نوجوان تھا، اس مہم کا سردار نامزد کیا۔ چھ ہزار شامی اور چھ ہزار عراقی مجاہدین اور تین ہزار باربرداری کے اونٹ اس کے سپرد کیے۔ بصرہ سے جہازوں کا ایک بیڑا بھی دیبل کو روانہ کیا۔ جس میں منجنیقیں بھی تھیں۔ [۱۵]

بندرگاہِ دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نیرون گیا۔ جہاں امراء نے لڑے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ بہروج پہنچا۔ یہاں داہر کے بھتیجے نے سات روز مقابلہ کرنے کے بعد راہِ فرار اختیار

کی ۔ سیوستان بھی بغیر لڑے فتح ہوا۔ بجے رائے نے قلعہ سیسم پر مقابلہ کیا لیکن مارا گیا۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف کا خط پہنچا کہ اب دریائے سندھ کو عبور کر کے راجا داہر سے فیصلہ کن جنگ کرو۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے دریا پر کشتیوں کا ایک پل باندھ کر اپنی پوری فوج مع سازوسامان پار اتار دی۔ ادھر داہر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مدمقابل ہوا۔ تین دن نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ آخر ۱۰ رمضان ۹۳ ہجری بروز پنجشنبہ داہر میدانِ جنگ میں مارا گیا۔

اس کے بعد محمد بن قاسم نے رواڑ، برہمن آباد، لوہانہ اور الور کو فتح کیا۔ لیکن ان مقامات پر کوئی خاص جنگ پیش نہیں آئی ۔ کیونکہ عربوں کی شجاعت اور ظفرمندی کے باعث لڑنے والوں کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے اور محمد بن قاسم کی رواداری اور شفقت کی وجہ سے عوام میں اسے حد درجہ ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی تھی ۔ اب سندھ کے مشہور اور مرکزی مقامات میں سے صرف ملتان کو فتح کرنا باقی تھا۔ محمد بن قاسم نے ستلج کو عبور کر کے سات روز کی لڑائی میں قلعہ اسکلندہ، سترہ روز میں قلعہ سکہ کو فتح کیا۔ ان قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد ملتان کا محاصرہ شروع کیا۔ یہاں داہر کا چچیرا بھائی حاکم تھا۔ اس نے دو مہینے محصور رہ کر لشکرِ اسلام کا مقابلہ کیا۔ لیکن بالآخر بھاگ گیا اور مسلمانوں نے بزورِ شمشیر ملتان کو فتح کر کے امنِ عام کا اعلان کر دیا۔ اہلِ شہر کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا اور ہر شخص کو معافی دے دی گئی۔ فتح ملتان کے بعد گویا پورا سندھ خلافتِ اسلامی کے زیرِ نگیں ہوگیا۔

مزید تاریخی تفصیلات اور جنگی حالات سے ہمیں بحث نہیں۔ جن اُمور کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ جو تُرک، افغان اور مغل قومیں فتح سندھ سے تین سو برس بعد ملک ہندوستان میں داخل ہونے والی تھیں، وہ اس وقت تک ابھی مسلمان بھی نہ ہوئی تھیں، اس لیے ان کے اسالیبِ جنگ اور طریقہ ہائے ملک داری میں پورا اسلامی رنگ نہیں پایا جاتا۔ ان کے مقابلے میں عرب فاتح جو ایک ہی صدی کے اندر اندر سپین سے لے کر سندھ تک اسلام کا جھنڈا گاڑ چکے تھے، اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کے پیکر تھے اور ان میں بے شمار صحابہ و تابعین تک شامل تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ رسول اللہ کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا۔

۲۔ سندھ میں عرب فاتحین اور عرب حکمرانوں نے جو طریقے اختیار کیے وہ احکام اسلامی کی پابندی کے مظہر تھے۔ انھیں حجاج بن یوسف اور خلفاء کی طرف سے برابر ہدایات پہنچتی

رہتی تھیں کہ خدا سے ڈرو، دین محمدی کے اصول سے انحراف نہ کرو اور بندگانِ خدا کی حفاظت و پرورش میں مصروف رہو۔ دیبل کے محاصرے کے وقت محمد بن قاسم نے اہل قلعہ کو شہر کا دروازہ کھولنے پر مجبور کرنے کے لیے سب سے بڑے بت خانے کے بلند مینار پر جہاں ایک بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا، منجنیق سے پتھر مارے۔ جب وہ جھنڈا گر گیا تو اہل قلعہ نے اپنے معبود کی یہ بے بسی دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن عربوں نے اس بت خانے پر کوئی دست درازی نہیں کی۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری تک یہ عمارت بدستور موجود تھی۔ (خلیفہ معتصم کے زمانے میں اس عمارت کے ایک حصے میں قید خانہ بنایا گیا تھا۔) محمد بن قاسم نے اس شہر میں اپنی مسجد الگ بنائی۔[۱۶] اسی طرح نیرون فتح ہوا۔ جب بھی مندر کے سامنے عربوں نے اپنی مسجد الگ تعمیر کی۔[۱۷]

۳۔ ملتان کے بُت خانے کی کیفیت بھی یہی ہے۔ وہ بھی عربوں کی تین سو برس کی حکومت میں بدستور قائم رہا۔ بشاری ۳۷۵ھ میں اسے دیکھ کر گیا ہے۔ سندھ و ہند کے بے شمار لوگ اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ عرب حکمران اس رقم کو خزانۂ سرکاری میں داخل کر دیتے اور اس سے مندر کے تمام مصارف اور پجاریوں کی تنخواہیں ادا کی جاتیں۔[۱۸] البیرونی ۴۰۰ھ کے بعد یہاں آیا تو یہ مندر نابود تھا اور اس کی جگہ ایک جامع مسجد کھڑی تھی۔ لیکن یہ مسلمانوں کا کام نہ تھا۔ بلکہ جب شیعوں کے ایک گمراہ فرقے یعنی قرامطہ کو یہاں اقتدار نصیب ہوا تو ان کے سردار جلم بن شیبان نے اس کو توڑ دیا اور پجاریوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کی جگہ ایک جامع مسجد بنالی۔ اور محمد بن قاسم والی جامع مسجد کو قفل لگا دیا۔ پھر جب قرامطہ کا استیصال محمود غزنوی نے کر دیا تو جامع مسجد محمد بن قاسم پھر کھلوا دی گئی اور قرامطہ کی مسجد کی جگہ اب میدان ہے۔[۱۹]

۴۔ محمد بن قاسم نے براہمنوں کا یہ مطالبہ منظور کر لیا کہ ان کا درجہ چونکہ ہندو معاشرے میں دوسری ذاتوں سے اونچا ہے اس لیے انھیں معزز رکھا جائے۔ چنانچہ براہمنوں نے گاؤں گاؤں پھر کر اس کے گن گائے۔ جب یہ مطالبہ کیا گیا کہ ان کے بت خانوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ تو محمد بن قاسم نے کہا کہ ہندو خانہ بت خانہ بھی مسیحیوں اور یہودیوں کے عبادت خانوں اور آتش پرستوں کے آتشکدوں کی طرح ہے۔[۲۰] اور برہمن آباد کے لوگوں کو اجازت دی کہ وہ سندھ کی اسلامی سلطنت میں اسی حیثیت سے رہیں جس حیثیت میں عراق اور شام کے یہودی اور عیسائی اور پارسی رہتے ہیں۔[۲۱]

۵۔ سندھ میں عربوں نے ہندوؤں سے جزیہ اور خراج کے سوا اور کوئی محصول وصول نہ

کیا۔ محمد بن قاسم نے اعلان کر دیا کہ جو مسلمان ہو جائے، وہ ہمارا بھائی ہوگا اور جو چاہے جزیہ ادا کر دے اور اپنے مذہب پر قائم رہے۔ بعض مسلمان ہوگئے اور بعض جزیہ دینے لگے۔ جزیہ دولت مندوں سے سالانہ ۴۸ درم (قریباً بارہ روپے) متوسط لوگوں سے ۲۴ درم (چھ روپے) اور نچلے طبقے سے بارہ درم (تین روپے) وصول کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی زمینیں اور جائیدادیں ان سے نہیں لی گئیں، بلکہ انھیں کے قبضے میں رہنے دی گئیں۔[۲۲]

۶۔ محمد بن قاسم ۹۳ھ میں سندھ پہنچا اور صرف ساڑھے تین برس کی مدت میں ملتان سے کچھ تک اور دوسری طرف مالوہ کی سرحد تک قبضہ کر کے نہایت عدل و انصاف کی حکومت قائم کر دی۔ ۹۶ھ میں خلیفہ ولید کا انتقال ہوگیا اور سلیمان تخت پر بیٹھا۔ جس کو حجاج اور اس کے اعزہ و متوسلین سے عداوت تھی۔ بصرہ کا حاکم صالح بن عبدالرحمٰن بھی حجاج اور محمد بن قاسم کے خاندان کا دشمن تھا۔ اس نے واسط کی جیل میں محمد بن قاسم کو قید کر دیا۔ وہیں اسے صالح نے اذیتیں دے دے کر قتل کرا دیا۔ جب محمد بن قاسم سندھ سے واپس ہوا تو سندھ کی ہندو رعایا اپنے اس عادل، نیک اور بلند اخلاق فاتح کی جدائی میں اشکبار ہوئی۔ بلکہ اس کی یادگار کے طور پر اس کا مجسمہ بنا کر نصب کیا۔[۲۳]

۷۔ ۱۳۳ھ تک اُمویوں کی خلافت رہی۔ اس کے بعد عباسی آگئے۔ یعنی سندھ کی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کا مرکز دمشق سے بغداد پہنچ گیا۔ ۲۲۸ھ تک عباسی خلافت مضبوط رہی۔ اس کے بعد اس کا تعلق سندھ سے منقطع ہوگیا۔ کچھ مدت تک یہاں عرب سردار خود مختار رہے۔ پھر ہندو راجاؤں نے دوبارہ اقتدار حاصل کرلیا۔ اور صرف دو عرب ریاستیں باقی رہ گئیں۔ ایک کا مرکز ملتان اور دوسری کا منصورہ میں تھا۔

چوتھی فصل: سلطان محمود غزنوی

سلاطین غزنی اور قرامطہ:

جس زمانے میں امیر ناصر الدین سبکتگین نے غزنی کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت پنجاب کا راجا جے پال تھا۔ اس کے پیشرو تو کابل کے حکمران بھی رہ چکے تھے لیکن جب کابل و غزنی پر سلطنت سامانی قائم ہوگئی تو راجاؤں کی حکومت صرف پنجاب تک تا بہ لمغان جو جلال آباد سے ذرا آگے ہے محدود رہ گئی۔ جے پال بہت صاحب عزم اور چالاک آدمی تھا اور

مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو توڑنے کی غرض سے برابر جوڑ توڑ میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے ملتان سے قریشی سلطنت کا خاتمہ کرنے کے لیے حمید خاں لودھی کو مؤثر امداد پہنچائی اور کوہ سلیمان کے قبائل میں قرامطہ کی حوصلہ افزائی کر کے سبکتگین کے لیے خاصا دردِ سر مہیا کر دیا۔ یہ قرامطہ یوں تو مسلمان ہی کہلاتے تھے لیکن ان کو اسلام کے عقائد سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ شیعہ کے فرقہ اسماعیلیہ کی ایک شاخ تھی لیکن شیعہ بھی انھیں کافر و ملحد سمجھتے تھے۔ یہ عبادات اسلامی کے پابند نہ تھے اور خفیہ و علانیہ قائم شدہ اسلامی حکومتوں کی بدخواہی میں سرگرم تھے۔ سبکتگین کو غزنی کی سلطنت پر قابض ہونے کے بعد جہاں بخارا کے قضیوں، دیلمیوں کی مخالفت اور اندرونی بغاوتوں کے خدشے سے واسطہ پڑا، وہاں قرامطہ کے استیصال کا دشوار مرحلہ بھی درپیش تھا۔ چنانچہ وہ اور اس کا فرزند دونوں ان کاموں میں مصروف تھے۔ اور ہندوستان کی طرف انھیں متوجہ ہونے کی فرصت نہ تھی، نہ ہی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

جے پال کا پہلا حملہ اور معافی:

لیکن جب جے پال نے دیکھا کہ غزنی والے اپنی مصیبتوں میں الجھے ہوئے ہیں اور انھیں زیر کرنے اور پنجاب کی حکومت کو افغانستان تک بڑھانے کا بہت اچھا موقع ہے تو اس نے ایک لشکر جرار جمع کر کے درۂ خیبر کو عبور کیا اور غزنی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ جب سبکتگین نے فتح طوس سے فارغ ہونے کے بعد جے پال کی اس حرکت کا حال سنا تو جھٹ پٹ اپنی فوج ساتھ لے کر غزنی کی طرف چلا۔ خلاصۃ التواریخ میں منشی سجان رائے نے لکھا ہے کہ:

راجا جے پال بابسیارے لشکر و فیلانِ صفدر برسرِ غزنی رفت۔ سلطان بہ دریافت ایں خبر بالشکر بسیار و مبارزانِ جرار در حدودِ ولایت خویش رسیدہ آمادۂ پیکار گردید۔ [۲۴]

لمغان کی پہاڑیوں میں جنگ ہوئی۔ لیکن ہندی فوج شدت سرما و برفباری کا مقابلہ نہ کر سکی اور راجا جے پال بہت بڑی طاقت و جمعیت کے باوجود عاجز و مجبور ہوگیا۔ اس نے سبکتگین کے پاس ایک درخواست بھیجی۔ جس میں اپنی اس خطا پر معافی مانگی اور لکھا کہ میں آیندہ ہمیشہ تابع فرمان رہوں گا۔ آپ میرے ہمراہ اپنے آدمی بھیج دیجیے۔ پنجاب پہنچ کر بہت سا خزانہ، بیش بہا تحفے اور پچاس ہاتھی خدمت والا میں ارسال کر دوں گا۔ سبکتگین نے اپنے سرداروں کی مخالفت کے باوجود راجا جے پال کو معاف کر دیا۔ اپنے چند معتمد اس کے ساتھ کر دیے اور اسے پنجاب واپس

جانے کی اجازت دے دی۔

جے پال کی بدعہدی:

لیکن راجا جے پال نے دریائے سندھ عبور کرتے ہی ہندوستان کے تمام راجاؤں کو چٹھیاں لکھ دیں کہ سبکتگین کے ساتھ مقابلہ درپیش ہے۔ اگر اس نے پنجاب پر قابو پالیا تو تم کو بھی نہ چھوڑے گا۔ اس لیے سب متحد ہوکر اپنی فوجیں بھیجو۔ تاکہ سلطنتِ غزنی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اجمیر وقنوج بلکہ ایک طرف گجرات اور دوسری طرف کالنجر تک کے راجاؤں نے اپنی فوجیں روانہ کردیں۔ جے پال نے لاہور پہنچ کر سبکتگین کے معتمدین کو گرفتار کرلیا۔ اور خراجِ موعودہ بھیجنے سے انکار کردیا۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ راجاؤں کے درباروں میں دائیں ہاتھ برہمن اور بائیں ہاتھ کھتری بیٹھتے تھے۔ اور جب کوئی مسئلہ پیش آتا، اپنی رائے دیتے۔ جب جے پال کے درباریوں نے دیکھا کہ راجا ایسی ناشائستہ حرکت کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے عرض کیا کہ عہد شکنی حزم و احتیاط اور عاقبت اندیشی کے خلاف ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس تُرک سے جنگ نہ کیجیے اور مقررہ رقوم ارسال کرکے دنیا کو امن و امان سے بہرہ ور رکھیے۔ لیکن جے پال نے ان کی عرضداشت کو قبول نہ کیا۔ منشی سجان رائے نے خلاصۃ التواریخ میں صرف یہ لکھا کہ:

پس از رسیدن بہ مسکن خود از قرار داد برگشتہ کسانِ سلطان را کہ برائے سپردن فیل و مال ہمراہ آوردہ بود بمبادلۂ مردم خود کہ نزدِ سلطان گزاشتہ آمدہ گرو بندی کرد۔

ہندوؤں کا متحدہ حملہ:

جب سبکتگین کو اس بدعہدی کی خبر ملی۔ تو اسے بڑی مشکل سے اس پر یقین آیا۔ اور جب دوسرے راجاؤں کی فوجیں لاہور پہنچ گئیں، اور جے پال نے نہایت سُرعت سے کام لے کر دریائے سندھ کو عبور کرکے غزنی کا رُخ کیا تو ادھر سے سبکتگین بھی لشکر لے کر چلا اور لمغان کے میدان میں پہنچ کر دیکھا کہ راجا جے پال کے ساتھ بے اندازہ لشکر ہے جس کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوج بہت کم ہے۔ لیکن اس نے اللہ کا نام لے کر ایسے جانسوز حملے کیے کہ جے پال اور اس کے حامی راجاؤں کی فوجیں شکستِ فاش کھا کر بھاگیں۔ سبکتگین نے دریائے سندھ کے کنارے تک تعاقب کیا اور دس ہزار لشکر کے ساتھ ایک سردار کو پشاور میں متعین کردیا۔ کہ سرحد کی

حفاظت کرتا رہے ہندوستان کی متحدہ فوجی قوت کو یہ ایسی ذلّت آمیز شکست ہوئی کہ اس کا اثر پورے ملک پر پڑا۔ اور سبکتگین کی قابلیت سپہ سالاری کا سکّہ جم گیا۔[۲۵]

اس کے بعد انصاف کی رُو سے سبکتگین کو حق پہنچتا تھا کہ جے پال پر جوابی حملہ کر کے اسے پابندیٔ عہد پر مجبور کرتا لیکن اس نے اپنی فتح ہی کو غنیمت سمجھا اور اس کے بعد فوراً ہی سامانی سلطنت کے قضیوں کو سلجھانے کے لیے چلا گیا۔ ابھی واپس غزنی نہیں آنے پایا تھا کہ ۳۸۷ھ میں بلخ کے قریب فوت ہو گیا۔

محمود غزنوی اور قرامطہ:

سبکتگین کے انتقال کے بعد سرداروں نے اس کے چھوٹے بیٹے اسماعیل کو تخت نشین کر دیا۔ محمود (بڑا بیٹا) نیشاپور میں تھا۔ بھائیوں میں کشمکش ہوئی۔ آخر فیصلہ محمود کے حق میں ہوا۔ اور وہ غزنی کا حکمران بن گیا۔ چھ مہینے اس قضیے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد تین سال کا عرصہ محمود کو بخارا کے جھگڑوں اور قرمطیوں کی بیخ کنی میں صرف کرنا پڑا۔ اور اسے جے پال سے لڑنے کا خیال بھی نہ آیا۔ ان جھگڑوں سے فراغت پانے کے بعد محمود نے بغداد کے خلیفہ قادر باللہ عباسی کی خدمت میں اقرار اطاعت کیا۔ خلیفہ نے محمود کو ایک گراں بہا خلعت اور امین الدولہ یمین الملّت کا خطاب عطا فرمایا۔

ہندوؤں کا تیسرا حملہ

محرم ۳۹۱ھ کا ذکر ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے پاس عامل پشاور کی طرف سے اطلاع پہنچی کہ پنجاب کا راجا جے پال بہت بڑے لشکر کی فراہمی میں مصروف ہے۔ اور سلطنت غزنی پر حملہ کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ محمود نے تحقیقِ حال کرنے کے بعد معلوم کیا کہ یہ اطلاع درست ہے اور جے پال دریائے سندھ کے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ محمود غزنی سے روانہ ہو کر پشاور پہنچ گیا۔ بڑے زور شور کی لڑائی ہوئی۔ جے پال کی فوج کو شکست فاش کھا کر اور پانچ ہزار نعشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ خود جے پال اور اس کے پندرہ سردار محمودی فوج کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔

جے پال کا خاتمہ:

سلطان محمود ان اسیروں کو ساتھ لے کر واپس غزنی پہنچا۔ اس نے جے پال سے پوچھا

کہ تم لوگ بار بار کیوں تنگ کرتے ہو؟ جے پال نے پھر معافی مانگی اور کہا کہ اس دفعہ آپ میری خطاؤں سے درگزر فرمائیں۔ آیندہ مدت العمر فرماں بردار رہوں گا۔ پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ کر آپ کی طرف سے حکومت کروں گا اور خراج بے حیل و حجت بھیجتا رہوں گا۔ سلطان محمود نے باپ کی طرح جے پال کی استدعا کو قبول کر کے اسے معاف کر دیا۔ اور آٹھ ماہ اسے اپنے پاس رکھ کر لاہور واپس بھیج دیا۔ یہاں اس کا لڑکا انند پال ملک کا بندوبست کرتا رہا۔ جب باپ واپس آیا اور بیٹے نے اس کے لیے تخت خالی کرنا چاہا تو اس نے راجا بننے سے انکار کیا اور کہا کہ تم آیندہ سلطان محمود کی مخالفت نہ کرنا اور اس کو خراج باقاعدہ بھیجتے رہنا۔ یہ وصیت کرنے کے بعد جے پال نے ایک چتا تیار کرائی اور اس میں بیٹھ کر جل مرا۔

انند پال اور قرامطہ:

انند پال اپنے باپ کی وصیت کے ایک حصے پر تو عامل رہا یعنی محمود کو مقررہ خراج بھیجتا رہا لیکن دوسرے حصے کی خلاف ورزی پر کمربستہ رہا۔ یعنی ہندوستان کے راجاؤں اور براہمنوں سے امداد طلب کرتا رہا۔ تاکہ باپ کا انتقام لے سکے۔ اس دوران ہندوستان کے اندر قرامطہ نے اچھی خاصی جمعیت پیدا کر لی تھی اور سبکتگین اور محمود کی مخالفت کے باعث یہ بدبخت لوگ ہندو راجاؤں سے معاہدے کر رہے تھے۔ جب محمود سیستان میں قرامطہ کی سرکوبی کر چکا تو اسے معلوم ہوا کہ قرامطہ نے بحرین سے کچھ جہازوں میں اپنی ایک جمعیت کو دیبل اور ٹھٹھہ کی طرف بھیجا ہے۔ اس زمانے میں جے پال اور انند پال کے پروپیگنڈے کی وجہ سے سندھ و ہند کے تمام ہندو راجا محمود کے خلاف زہر کھائے بیٹھے تھے۔ قرامطہ نے سندھ میں پہنچ کر ہندو راجاؤں کی امداد کا وعدہ کیا۔ ملتان کا حکمران حمید خاں لودھی کا پوتا داؤد بن نصر تھا۔ وہ بھی قرامطہ اور انند پال کے ساتھ معاہدے میں شامل ہو گیا اور ملتان قرامطہ کی قوت و جمعیت کا گڑھ بن گیا۔ اس کے علاوہ سندھ میں ایک ہندو ریاست تھی۔ جس کو فرشتہ بھاطنہ لکھتا ہے۔ اس کے حکمران کا نام بجے رائے تھا۔ یہ ریاست قرامطہ کے لیے سب سے بڑی جائے پناہ تھی۔ ایک تو محمود کو ان فتنہ پردازوں سے سخت دشمنی تھی۔ اور وہ ان کے استیصال کو جزوِ ایمان سمجھتا تھا۔ دوسرے یہ لوگ بھی ہندو راجاؤں سے مل کر محمود ہی کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ اس لیے محمود نے بجے رائے کو لکھا کہ تم ہمارے دشمن قرامطہ کو اپنے ہاں پناہ دے رہے ہو۔ ان کو نکال دو۔ ورنہ ہمارے تمھارے درمیان جنگ

ہو جائے گی۔ بجے رائے نے اس کا جواب سختی سے دیا۔ محمود نے حملہ کر دیا۔ بجے رائے نے قرامطہ کی امداد سے خوب مقابلہ کیا۔ لیکن تین دن کی جنگ کے بعد شکست کھا کر بھاگا۔ اور گرفتار ہونے کے بعد خودکشی کر کے مر گیا۔ اس لڑائی میں بہت سے قرامطہ مارے گئے۔ اور بقیۃ السیف بھاگ کر ملتان پہنچ گئے۔

ملتان میں قرامطہ کی سرکوبی:

محمود غزنوی یہاں سے واپس غزنی چلا گیا۔ لیکن اس کے دماغ میں یہ ارادہ پختہ تھا کہ اب کے ملتان پر ایسا حملہ کیا جائے گا کہ کوئی قرمطی بچ کر نہ نکل سکے۔ چنانچہ اگلے سال ۳۹۶ھ میں اس نے عزمِ ملتان کیا۔ لیکن اس کے لیے درۂ خیبر کا راستہ اختیار کر لیا۔ منشی سبحان رائے نے خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے کہ محمود نے خیبر کا راستہ اس مصلحت سے اختیار کیا کہ وہاں کے حاکم داؤد بن نصر کو بے خبری ہی میں جا لے۔ اور ناگہاں وہاں پہنچ کر فتنے کی سرکوبی کے تقاضے کو پورا کرے۔ خلاصۃ التواریخ اور فرشتہ دونوں نے بیان کیا ہے کہ محمود کی توقع کے خلاف اس راستے میں اس کو راجا انند پال نے روکا لیکن شکست کھا کر کشمیر کو بھاگ گیا۔ گویا انند پال نے اپنے حلیف داؤد بن نصر کو مدد دینے کے لیے سلطان محمود کی فوجوں کا مقابلہ کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن جب داؤد بن نصر کو انند پال کی ذلت آمیز شکست اور فرار کا حال معلوم ہوا تو اس کے حوصلوں نے جواب دے دیا۔ اس نے اپنا خزانہ اور قیمتی اسباب فراہم کیا۔ اور دکن کی طرف فرار ہونے کی تیاری کر لی۔ لیکن عین اس وقت محمود کی فوج آن پہنچی۔ داؤد نے مجبوراً محصور ہو کر مقابلہ شروع کیا۔ سات ہی روز کے محاصرے کے بعد گھٹنے ٹیک دیے اور کہا کہ میں مذہب قرامطہ سے توبہ کر کے سچے دل سے مسلمان ہوتا ہوں۔ آئندہ ان سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ اور بیس ہزار درم سالانہ خراج غزنی کو بھیجتا رہوں گا۔

نواسا شاہ:

محمود نے داؤد کی توبہ کو قبول کر لیا۔ اور سکھپال یا سیوک پال (نواسا شاہ) کو اپنا قائم مقام بنا کا داؤد کی نگرانی پر مامور کر دیا۔ یہ سکھپال راجا جے پال کا نواسا تھا۔ اور ان پندرہ سرداروں میں سے تھا جو جے پال کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے۔ لیکن یہ قبولِ اسلام کر کے غزنی ہی میں رہ گیا تھا۔ اس کو "نواسا شاہ" کہتے تھے۔ جب محمود نے بجے رائے پر حملہ کیا تو اس کی خودکشی کے بعد

نواسا شاہ کو ریاست بھاطنہ کا والی بنا دیا۔ اور اب ملتان کی نگرانی بھی اسی کے سپرد کردی۔ جب محمود بعض دوسرے کاموں میں مصروف رہنے کے بعد ۳۹۸ھ میں واپس غزنی آیا تو اس کو اطلاع ملی کہ سکھپال نواسا شاہ اپنے ماموں انند پال کی ترغیب پر غدار ہوگیا ہے اور داؤد کی نگرانی کے بجائے خود قرامطہ کا سرپرست بن گیا ہے۔ یہ سن کر محمود بجلی کی سی تیزی سے سکھپال کے سر پر پہنچ گیا اور اس کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا۔

ہندوستانی راجاؤں کی متحدہ صف آرائی:

انند پال نے محمود سے مار کھانے کے بعد کشمیر کو راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔ لیکن اپنی سرکشی کی وجہ سے اس کو اندیشہ تھا کہ محمود بغرضِ انتقام ضرور پنجاب پر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان بھر کے راجاؤں کے پاس اپنے سفیر اور خطوط بھیجے۔ اور برہمنوں کے ذریعے سے بھی پروپیگنڈا کرایا۔ چنانچہ اس پروپیگنڈے کا سلسلہ جے پال ہی کے وقت سے جاری تھا۔ اس لیے انند پال کو کوئی خاص اہتمام نہ کرنا پڑا۔ اور تھوڑی ہی مدت میں پورا ہندوستان اس امر پر متحد ہوگیا کہ محمود غزنوی اور اس کی سلطنت کو ختم کردیا جائے۔ تاریخ کی مختلف کتابوں میں ان راجاؤں کے نام لکھے ہیں جنھوں نے انند پال کی دعوت پر فوجیں اور خزانے بھیجے۔ نندونہ کا راجا، نڈر بھیم، انہلواڑہ کا راجا پرم دیو، ڈیرہ دون کا راجا رام دیو، سونی پت کا راجا دیپال ہری، برن کا راجا ہردت، مہابن اور متھرا کا راجا گل چندر، اسونی (ضلع فتح پور) کا راجا چنڈیل بھور، شردا (بندھیل کھنڈ) کا راجا چندر رائے، سرسواگڑھ کا راجا بھیم پال، قنوج کا راجہ کنور رائے، کالنجر کا راجا نندا، مالورا کا راجا منج، میرٹھ کا راجا دھرم دتا اور ان کے علاوہ اجین، گوالیار، اجمیر، دہلی، تھانیسر، نگرکوٹ اور کشمیر کے راجا۔ غرض ان تمام حکمرانوں نے اپنی اپنی فوجیں لاہور کی طرف روانہ کردیں اور بعض نے گراں قدر خزانے بھی بھیجے۔ غرض پورا ملک ایک سرے سے دوسرے سرے تک محمود غزنوی کے خلاف ہوگیا۔ یہ جوش و خروش صرف راجاؤں تک محدود نہ رہا بلکہ عوام بھی اس میں شامل تھے۔ ماؤں نے اپنے بیٹوں اور بیویوں نے اپنے شوہروں کو لڑائی میں جانے کی ترغیب دی۔ دولتمند گھروں کی عورتوں نے اپنے سونے چاندی کے زیور مصارفِ جنگ کے لیے پیش کردیے۔ اور غریب عورتوں اور بیواؤں نے سوت کات کات کر پیسے جمع کیے اور جنگی خزانے میں داخل کردیے۔ ان حالات کے لیے کسی خاص حوالے کی ضرورت نہیں کیونکہ تمام مسلمان، ہندو اور انگریز مؤرخین

نے اُس دَور کی تاریخ میں یہ حالات مِن وعن بیان کیے ہیں۔

شکستِ فاش:

تمام ہندوستان کے راجاؤں کا یہ عظیم لشکر انند پالؒ کی قیادت میں لاہور سے چل کر پشاور کے میدان میں پہنچا۔ جب محمود کو یہ خبر ملی تو یہ سمجھ کر کہ یہ بھی جے پال کے حملوں ہی کی قسم کا اقدام ہوگا، دارالسلطنت کی فوج لے کر پشاور پہنچ گیا۔ یہاں آ کر جو دیکھتا ہے کہ تاحدِ نظر فوجیں ہی فوجیں ہیں تو حملہ کرنے میں تامل کیا۔ اور دفاعی انتظامات میں مصروف رہا۔ چالیس دن تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل میں خیمہ زن رہے۔ آخر جنگ شروع ہوئی۔[۲۶] اس کی تفصیلات لکھنا ہمارے لیے ضروری نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن کے اندر ہندوؤں کے اس بحرِ مؤاج کو نہایت فیصلہ کن شکست ہوئی۔ اور سلطان محمود غزنوی کی شجاعت اور سپہ سالار کا غلغلہ دنیا بھر میں بلند ہوا۔

نگرکوٹ:

سلطان نے صرف دو دن اپنی فوج کو ستانے کے لیے دیے اور اس کے بعد فراریوں کا تعاقب شروع ہوا۔ راجا انند پال بھاگ کر لاہور کو نہیں گیا بلکہ تعاقب کی خبر سن کر قلعہ بھیم[۲۷] کے راجا کے ساتھ نگرکوٹ پہنچا۔ کیونکہ وہ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے مضبوط و محفوظ تھا۔ محمود بھی نگرکوٹ پہنچا۔ اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس دوران میں انند پال وہاں سے بھی بھاگ کر پہاڑوں کے اندر چلا گیا۔ قلعہ کی فوج نے محاصرہ سے عاجز آ کر ہتھیار ڈال دیے۔ ابھی محمود نگرکوٹ ہی میں تھا کہ راجہ انند پال نے پہاڑوں کے اندر سے درخواست بھیجی کہ آپ نے اس سے قبل میرے باپ کی اور میری گستاخی کو معاف کیا ہے اب ایک دفعہ اور عفو و کرم سے کام لیجیے۔ میں برابر فرماں بردار اور خراج گزار رہوں گا۔ نگرکوٹ کے راجا نے بھی عفوِ تقصیرات کی عرضی بھیجی۔ سلطان نے بلا تامل ان درخواستوں کو منظور کرلیا۔ اور اس کے ساتھ ہی از راہ مصلحت اندیشی یہ بھی لکھ دیا کہ جو ہندو ہماری فوج میں بھرتی ہونا چاہے وہ شوق سے آ جائے ہم اس کو مسلمانوں کی برابر حقوق عطا کریں گے۔

دس ہزار ہندوؤں کی بھرتی:

چنانچہ دریائے سندھ عبور کرنے سے پہلے پہلے دس ہزار ہندو محمودی فوج میں بھرتی

ہو گئے۔ اور اس کوشش میں راجا بھی شامل تھے۔ بقول جامع التواریخ: ملوک ہند اطاعت وخراج قبول ساختہ دہ ہزار سوار ملازم سلطان گردانیدند۔

سلطان کا مدعا اس سے یہ تھا کہ ہندوؤں کے دلوں میں جو نفرت اس کے اور سلطنت غزنی کے خلاف جاگزیں ہو چکی ہے اس کو دور کر دیا جائے۔ اور ظاہر کیا جائے کہ تمھاری اس تمام ہنگامہ آرائی کے باوجود ہم تم پر بخوبی اعتماد کر سکتے ہیں۔ اس ہندو فوج کا سپہ سالار بھی ہندو ہی مقرر کیا گیا اور یہ فوج غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک کے زمانے تک افواجِ غزنویہ کا ایک حصہ رہی۔

قرامطہ کا استیصال:

قرامطہ نے مرکزِ خلافت کے قریب خوفناک ظلم وستم جاری کر رکھے تھے۔ ابو طاہر قرمطی کا واقعہ سب کو معلوم ہے کہ وہ ایک مرتبہ حج کے موقع پر مکہ معظمہ پہنچا۔ بیس ہزار حاجیوں کو شہید کر کے ان کی نعشیں زمزم میں ڈال دیں اور حجر اسود کو اکھیڑ کر لے گیا۔ یہ مقدس پتھر ۲۲ برس تک کعبۃ اللہ سے الگ رہا۔ مسلمان حاکموں کے لیے دربارِ خلافت میں اعتماد حاصل کرنے کی بھی یہ ایک شکل یہ تھی کہ وہ قرمطیوں کا قلع قمع کرتے۔ سبکتگین اور محمود ویسے بھی نیک دل مسلمان ہونے کے باعث قرمطیوں کو اپنے پہلو میں بیٹھنے کی اجازت نہ دے سکتے تھے۔ نیز عام مسلمانوں کی نظروں میں بھی اسلام وملت کی یہ ایک بہت بڑی خدمت تھی کہ قرمطیوں کو مٹایا جاتا۔

یوں تو قرامطہ جنگِ پشاور کے دوران میں بھی سندھ اور ملتان کے علاقوں میں فتنہ پردازی کر رہے تھے۔ لیکن اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد محمود کو معلوم ہوا کہ غور و ہرات کا حاکم محمد بن سُوری قرمطی ہو گیا ہے اور اس نے علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔ مصر میں فاطمی خلافتِ عباسی کے حریف تھے۔ اور اگرچہ قرمطی نہ تھے لیکن قرمطیوں کے خیر خواہ ضرور تھے۔ سلطان محمود ان سب کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا۔ دیبل اور ملتان میں قرامطہ کے سفیر پہنچے اور داؤد بن نصر کو محمود کے خلاف صف آرا ہونے کی ترغیب دی۔ محمود نے پہلے غور و ہرات کے قرامطہ کی بغاوت کا قلع قمع کیا اور اس کے بعد ملتان پر فوج کشی کی۔ داؤد بن نصر نے سخت مقابلہ کیا۔ لیکن آخر شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ اس موقع پر قرامطہ کی بیخ کنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ۴۰۱ھ میں ان ہنگاموں سے فراغت حاصل کی۔

تھانیسر:

پنجاب کا راجا انند پال اب بالکل مطیع و منقاد ہو چکا تھا۔ لیکن محمود کو بجا طور سے یہ خدشہ تھا کہ مبادا تھانیسر، قنوج اور مہابن کے راجا دوبارہ سر اٹھائیں۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں نے پشاور کی جنگ میں محمود سے جو مقابلہ کیا تھا، اس کی وجہ سے محمود اور ہندو راجاؤں کے درمیان ایک مستقل حالتِ جنگ قائم ہو چکی تھی۔ انھوں نے بلاوجہ انند پال کے ساتھ ہو کر جنگ کی تھی اور محمود کو ان سے انتقام لینے کا حق حاصل ہو چکا تھا۔ اس لیے محمود نے تھانیسر پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ ممکن ہے موقع پا کر یہ لوگ پھر فتنہ بپا کریں۔ لہٰذا انند پال کو پہلے سے اطلاع دے دی کہ ہم تھانیسر پر حملہ کرنے کے لیے تمھارے علاقے میں سے گزریں گے اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنے معتبر آدمی ہمارے ساتھ کر دو تا کہ وہ ہمیں تمھاری مملکت کے حدود سے بھی آگاہ رکھیں اور سلطانی لشکر سے تمھارے علاقے میں کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ انند پال نے فوراً دو ہزار سواروں کی فوج اپنے بھائی کی سرداری میں پشاور بھیج دی تا کہ ہمرکاب لشکرِ سلطانی رہے اور اپنے ملک کے تاجروں اور بنیوں کو حکم دیا کہ محمودی فوج کے لیے ہر قسم کی اجناس خوردنی مہیا کریں۔[۲۸]

تھانیسر برہمنوں کی سازش کا مرکز تھا۔ یہاں کے راجا نے میرٹھ، مہابن، برن (موجودہ بلند شہر) اور قنوج کے راجاؤں سے استمداد کی۔ ابھی یہ لوگ پہنچے نہ تھے کہ محمود تھانیسر پہنچ گیا۔ راجا شہر چھوڑ کر بھاگ گیا اور محمود نے تمام سازشیوں کو گرفتار کر لیا۔ یہاں کے مندر میں جو بُت تھا اس کی وجہ سے ہندوؤں میں بے حد اوہام پھیل رہے تھے۔ محمود اس کو اکھیڑ کر اپنے ساتھ غزنی لے گیا اور اس کو درگاہِ سلطانی کے سامنے ڈال دیا تا کہ عوام کے قدموں سے پامال ہو۔ اس بت کو ''سوم جگ'' یا ''چکرِ سوم'' کہتے تھے۔

یہ واضح رہے کہ اس دفعہ محمود کا لشکر صرف مسلمانوں پر مشتمل نہ تھا۔ بلکہ اس میں دس ہزار باقاعدہ ہندو سپاہی اور دو ہزار انند پال کے بھیجے ہوئے آدمی بھی شامل تھے۔

نندونہ اور کشمیر:

۴۰۴ھ میں انند پال مر گیا اور اس کا بیٹا جے پال ثانی تخت پر بیٹھا۔ اس نوجوان نے بھی اپنے باپ دادا کی طرح خود مختاری اور سرکشی اختیار کی۔ محمود نے اس کو سزا دینے کے لیے لشکر

کشی کی۔ نندونہ (ضلع جہلم) ایک مضبوط قلعہ تھا۔ وہاں جے پال ثانی نے مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھا کر کشمیر کو بھاگا۔ محمود نے تعاقب کیا تو وہ اندرونِ کشمیر نکل گیا۔ محمود نے دروں کے چند قلعے فتح کیے اور واپس غزنی چلا گیا۔ جے پال ثانی پھر لاہور واپس آ گیا۔ اور اپنے باپ دادا کی طرح سالانہ خراج اور درخواستِ عفو و کرم محمود کو بھیجی۔ اور آیندہ کے لیے اطاعت کا وعدہ کیا۔ سلطان نے اسے معاف کر دیا۔ ایک دو سال کے بعد کشمیر کے راجا کی تادیب کے لیے سلطان محمود نے خاصہ لشکر فراہم کیا۔ اور جب کشمیر کی حدود میں داخل ہوا تو راجا نے جے پال ثانی ہی کی سنت پر عمل کر کے اطاعت و فرماں برداری اختیار کی۔

قنوج اور متھرا:

سلطان نے راجا کشمیر کو طلب کر کے کہا کہ اب ہم قنوج، متھرا، مہابن اور برن پر حملہ کر کے ان مقامات کے سازش خانوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنی مناسب فوج لے کر ہراول دستے کی حیثیت سے ہمارے لشکر کے آگے آگے چلو۔ اور ایسے راستے سے لے چلو کہ قنوج اور متھرا والوں کو آخر تک ہمارے اقدام کا پتہ نہ چلنے پائے۔ راجا نے حسب الحکم ہراول مرتب کیا۔ اور محمود ایک لاکھ سوار اور تیس ہزار پیادہ لشکر کو ساتھ لے کر کٹھن گھاٹیوں، ہیبت ناک دروں، برف پوش پہاڑوں اور آبشاروں اور ندیوں کو عبور کرتا ہوا مردانہ وار بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ نیپال کی مغربی سرحد پر پہنچ گیا۔ اور وہاں سے بجلی کی طرح قنوج پر جا پڑا۔ جب اس طرف سے کسی حملے کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔[۲۹]

قنوج کے راجا کنور رائے مع عیال و اطفال نہایت عاجزانہ ہاتھ باندھے اور گلے میں پٹکا ڈالے سلطان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سلطان نے راجا کی بہت عزت توقیر کی۔ تین روز راجا کا مہمان رہا۔ اور رخصت کے وقت اقرار کیا کہ اگر تم اور تمھارے جانشین ہم سے سرکشی نہ کریں گے تو جب کبھی سلطانی امداد کی ضرورت ہوگی، غزنی سے ضرور حاصل ہوگی۔ راجا قنوج کو ہر طرح تسلی دے کر سلطان متھرا میں داخل ہوا۔[۳۰] سلطان قنوج سے برن (بلند شہر) پھر مہابن اور متھرا اور بعض دوسرے راجاؤں کی "مزاج پرسی" کے لیے روانہ ہوا۔ سب نے مقابلے سے دست بردار ہو کر اطاعت اختیار کی۔

کالنجر کا راجا نندا

اس کے بعد محمود یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کے مرکز میں تمام راجا اطاعت اختیار کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب کسی فتنے کا اندیشہ نہیں۔ لیکن کالنجر کے راجا نندا نے پھر دوسرے راجاؤں کو لعنت ملامت کے خطوط لکھے اور جے پال ثانی کو بھی غیرت دلائی۔ یہاں تک کہ سب کے سب باغی ہوگئے۔ صرف قنوج کا راجا وفاداری میں پکا رہا اور اس نے سلطان کے پاس قاصد بھیج کر امداد طلب کی۔ محمود ۴۱۰ھ میں دوبارہ قنوج کو روانہ ہوا۔ جے پال ثانی نے مقابلہ کیا۔ لیکن سخت ہزیمت اٹھائی۔ محمود قنوج پہنچا۔ تو راجا کنور رائے کالنجر کے راجا نندا کے ہاتھوں مارا جاچکا تھا۔ محمود سیدھا کالنجر میں گھس گیا۔ اگرچہ اس کے پاس بہت کم فوج تھی۔ لیکن کالنجر کے راجا پر اس کی کچھ ایسی ہیبت چھائی کہ راتوں رات اپنا سب سازوسامان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہاں سلطان کو نندا کے پانسو اسّی ہاتھی ہاتھ آئے اور قنوج کا جو خزانہ نندا چھین لایا تھا وہ بھی حاصل ہوا۔ سلطان نے نندا کا تعاقب ضروری نہ سمجھا اور واپس غزنی چلا گیا۔

پنجاب کا الحاق نندا کا خاتمہ:

چونکہ لاہور کے راجا تین نسلوں سے پیہم غداری کر رہے تھے۔ علاوہ بریں ملکی انتظامات کی درستی اور فتنوں کی سرکوبی کے لیے بھی لاہور پر مستقل قبضہ ناگزیر ہوگیا تھا۔ اس لیے ۴۱۲ھ میں محمود نے پنجاب پر قبضہ کرنے کی نیت سے پیش قدمی کی۔ جے پال ثانی بھاگ گیا۔ سلطان نے پنجاب کو باقاعدہ اپنی سلطنت میں شامل کر کے ایاز کو یہاں کا پہلا صوبیدار مقرر کیا۔ اور اپنے نام کا سکّہ جاری کردیا۔ چند ماہ بعد ۴۱۳ھ میں محمود نے نندا کو سزا دینے کے لیے کالنجر کا رُخ کیا۔ اور تین سو ہاتھیوں کا نذرانہ قبول کر کے راجا کو معاف کردیا۔ بلکہ راجا نندا نے ہندی زبان میں ایک بدیع المثال قصیدہ مدحیہ لکھ کر خدمتِ سلطانی میں گزرانا۔ اور سلطان نے اس کو فارسی میں ترجمہ کرا کر سنا تو خوش ہوکر صرف کالنجر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ پندرہ قلعے اپنی طرف سے اضافہ کر کے نندا کو بخش دیے۔ نندا نے بھی بہت سا روپیہ اور بے شمار جواہر سلطان کی نذر کیے۔ اور سلطان واپس غزنی چلا گیا۔[۳۱] اس کے بعد کالنجر کے راجا نے کبھی اطاعتِ سلطانی سے سرتابی نہ کی۔

سومنات:

بعض اندرونی فتنوں کی سرکوبی سے فارغ ہونے کے بعد جب محمود ماوراء النہر سے غزنی واپس آیا تو اس کو یہ اطلاع ملی کہ ہندوستان کی جن مرکزی ریاستوں کو اس نے مغلوب کیا تھا اس کے برہمنوں نے اب سومنات (گجرات) کو اپنا سازشی مرکز بنا لیا ہے۔ اور گجرات کا راجا ان کی سرپرستی کررہا ہے۔ اس کے علاوہ بچے کھچے قرمطیوں نے بھی اسی جگہ جمع ہوکر فتنہ پردازی شروع کردی ہے۔ برہمنوں نے سومنات کے مندر کو بے حد اہمیت دے رکھی ہے حالانکہ اس سے پہلے تاریخ کی کسی کتاب میں اس مندر کا ذکر موجود نہ تھا۔ اب دُور دُور کے ہندو اس مندر میں پوجا کے لیے آنے لگے۔ یہاں تک کہ ہر روز اس بت کے غسل کے لیے گنگا کا پانی ہردوار سے پہنچایا جاتا تھا۔ محمود نے اس مرکز کو موجب خطر سمجھ کر شعبان ۴۱۵ھ میں غزنی سے باگیں اٹھائیں اور ملتان اور انہلواڑہ[۳۲] ہوتا ہوا سومنات جا پہنچا۔ راجپوت راجاؤں نے سخت مقابلہ کیا۔ لیکن محمودی مجاہدین مندر میں داخل ہوگئے۔ اور عقیدت کا وہ قصر جو برہمنوں نے تعمیر کررکھا تھا، گرزِ محمودی کی ایک ضرب سے پاش پاش ہوگیا۔ محمود نے سومنات کے لوگوں سے استصواب کرکے پجاری دابشلیم کو (جو راجا دابشلیم کا بھائی تھا) سومنات و گجرات کا حکمران مقرر کردیا۔ اور راجا دابشلیم کو گرفتار کرکے غزنی لے گیا۔ دوسرے سال پُجاری دابشلیم مرگیا تو محمود نے راجا دابشلیم کو اس کی جگہ مقرر کردیا۔

محمود کے ڈھائی سال اس مہم میں صرف ہوئے۔ ۴۱۷ھ میں وہ واپس غزنی پہنچا۔ اور طوس ذرے کے قرمطیوں کی بیخ کنی میں مصروف ہوگیا۔ آخر ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ کو محمود غزنوی نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس کی عمر بلا تعطیل و انقطاع کفر و الحاد کے استیصال میں بسر ہوئی۔ اور اُسے غالباً کبھی ایک سال کے لیے بھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس اعتبار سے وہ فاتحینِ عالم میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔

محمود کا کردارِ بلند

محمود غزنوی کے کردار کی تعریف میں ہندو، مسلم اور انگریز مؤرخین اتفاق آرا سے رطب اللّسان ہیں۔ مسٹر سی وی ویدیا نے اپنی مشہور کتاب ''ہسٹری آف میڈیول انڈیا'' جلد سوم میں کئی صفحے محمود غزنوی کی تعریف میں لکھے ہیں اور آخر میں تحریر کیا ہے:

''ہمارے نزدیک گبن نے بالکل درست لکھا ہے کہ محمود دُنیا کے عظیم ترین بادشاہوں میں سے تھا، وہ ایک بے باک سپاہی، ایک باکمال کمانڈر، عدل و انصاف کا حامی، عالم لوگوں کا قدر دان اور سرپرست تھا۔ وہ ایک ایسا حکمران تھا جس نے اپنی قوم کی امنیت و خوشحالی کے لیے سخت محنت کی اور تعلیم و تجارت کو وسعت دی۔ محمود سخت ضابطہ پسند تھا۔ لیکن اپنے مزاج کے اعتبار سے ظالم یا حریص قطعاً نہ تھا۔ بلکہ اعتدال پسند اور فیاض آدمی تھا۔ وہ مذہب کا پابند اور صادق الایمان شخص تھا۔''

مسٹر ایشوری پرشاد اپنی تاریخ کے صفحہ ۷۴ پر لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ محمود بڑا فاتح تھا۔ لیکن وحشی ہرگز نہ تھا۔ خود پڑھا لکھا نہ تھا[۳۴] لیکن فنی تخلیقات کا قدر دان اور مصنّفین کا فیاض سرپرست تھا۔ اس نے اپنی حاتمانہ فیاضیوں سے اعلیٰ درجے کے علما و شعرا کا ایک مجمع اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔ ایشیا کے تمام خطّوں سے عالم فاضل لوگ اس کے دربار میں کھچے چلے آتے تھے اور ان میں مشرق کے بعض مایہ ناز علما و شعرا تھے۔ مثلاً البیرونی جیسے ریاضی دان، فلسفی، ماہر فلکیات اور سنسکرت کے عالم، عُتبی (مؤرخ)، فارابی (فلسفی)، بیہقی (مؤلف تاریخ سبکتگین)۔ یہ شاعری کا دور تھا۔ اور محمود کے دربار میں ایشیا کے بہترین شعرا جمع تھے۔ اسدیؔ، طوسیؔ، عنصریؔ، فرخیؔ اور سب سے بڑا فردوسیؔ (مصنف شاہنامہ)۔''

مسٹر ایشوری پرشاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمود نے غزنی میں ایک یونیورسٹی قائم کی۔ ایک کتب خانہ فراہم کیا۔ اور ایک عجائب خانہ کھولا۔ جس میں جنگ کے ہدایا و تحائف جمع کیے۔ یہ اسی کی دریا دلی کا نتیجہ تھا کہ غزنی میں ایسی خوب صورت عمارتیں بنائی گئیں جن کی وجہ سے یہ شہر مشرق کے بہترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔

مشہور مؤرخ الفنسٹن نے اپنی تاریخ میں صاف لکھا ہے کہ:

''یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ سلطان محمود نے ایک ہندو کو جبراً مسلمان بنایا ہو...... سوائے لڑائی کے اس نے کسی ہندو کو قتل نہیں کیا۔''

یہ اقتباس صرف چند غیر مسلم مؤرخین کی کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ مسلم مؤرخین کے اقتباسات درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ان کی آراء پر جانب داری کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ الفضل ماشهدت به الاعدا۔

چند قابل توجہ نکات:

اب ذرا چند نکات کی طرف توجہ کیجیے:

انگریز مؤرخین نے جن میں مارسڈن، لیتھبرج، ایلن، ملکم اور ہنٹر قابل ذکر ہیں۔ بعض افتراق انگیز سیاسی مصلحتوں کے ماتحت محمود غزنوی کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ ایک مذہبی جنونی تھا۔ ہندوؤں کو بلاوجہ قتل کرتا تھا۔ ان کو زبردستی مسلمان بناتا تھا۔ اور اس نے ہندوستان کی دولت سمیٹ کر غزنی لے جانے کی غرض سے اس ملک پر سترہ حملے کیے۔ حکومتِ انگلشیہ نے ایک معیّن پالیسی کے ماتحت ان کتابوں کو سکولوں اور کالجوں کے نصابِ درس میں شامل کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں مسلمان سلاطین اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلی۔ اور انگریزی راج کو اس نفرت سے تقویت پہنچی۔ ہم نے محمود کے جو حالات مستند تاریخوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہوگیا ہوگا کہ حقیقت بالکل مختلف ہے۔ محمود کو اوّل سے آخر تک جب کبھی ہندوستان کی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ ہمیشہ فتح مند رہا۔ اور بڑے بڑے راجپوت راجاؤں کی متحدہ طاقت بھی اس کو شکست نہ دے سکی۔ اگر وہ چاہتا تو نہایت آسانی سے اس ملک کو اپنی قلمرو میں شامل کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے ہمیشہ درگزر سے کام لیا۔ ہندوؤں نے پے در پے اس پر جارحانہ حملے کیے۔ لیکن محمود نے ہمیشہ ان کے راجاؤں کو معاف کرکے ان کی سلطنتوں کو بحال رکھا۔ جب پنجاب کے راجاؤں کی تین پشتیں بدعہدی، سرکشی اور غداری میں گزر گئیں تو آخر تنگ آکر اس نے پنجاب کا الحاق کرلیا۔ لیکن دوسری راجدھانیوں کو بدستور بحال رکھا۔

محمود کے حالات کو غور سے پڑھنے کے بعد ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس نے متعدد لڑائیاں مجبوراً لڑیں۔ کیونکہ ہندو راجاؤں نے اس کی سلطنت کو ختم کرنے کے لیے جارحانہ اقدامات کیے تھے۔ بعض حملے خالص قرامطہ کی بیخ کنی کے لیے کیے گئے۔ اور جہاں کہیں دیکھا کہ کوئی ہندو راجا سلطنتِ غزنی اور خلافتِ بغداد کو نقصان پہنچانے کے لیے قرمطیوں کی امداد کررہا ہے وہاں اس کے خلاف بھی فوج کشی کی۔ اگر وہ ملتان کا رخ کرتا ہے تو راستے میں کسی قتل و خون یا لوٹ مار کا روادار نہیں ہوتا۔ اگر وہ نگرکوٹ کی تادیب سے فارغ ہوکر غزنی واپس جاتا ہے تو انتہائی زرخیز اور ذی ثروت علاقے میں سے گزرنے کے باوجود ایک جان اور ایک حبہ بھی لینے کا

مرتکب نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اس نے مندروں کی دولت پر قبضہ کیا۔ لیکن یاد رہے کہ اس وقت ہندو راجاؤں اور برہمنوں کی سازش کے مرکز یہی مندر تھے۔ جن میں نہ صرف منصوبے باندھے جاتے تھے بلکہ جنگی خزانے بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ ورنہ مندروں کو زر و جواہرات کی فراہمی سے کیا تعلق ہوسکتا تھا۔ وہ سارے شمالی ہند کے جنگی مرکزوں اور راجدھانیوں میں گیا۔ لیکن اس امر کا کوئی ثبوت کسی تاریخ سے نہیں مل سکتا کہ اس نے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا ہو۔ یا کسی ایک غیر مصافی ہندو کو قتل کیا ہو۔ یا شہروں کو لوٹ کر عام باشندوں کو مبتلائے مصیبت بنایا ہو۔ بلکہ اس نے بطیبِ خاطر دس ہزار ہندوؤں کو اپنی فوج میں بھی بھرتی کرلیا تھا۔ کیا بے تعصبی کا اس سے زیادہ روشن ثبوت بھی درکار ہے؟

چونکہ اب انگریز اور اس کی مصلحتیں ہندوستان سے رخصت ہوچکی ہیں۔ اس لیے برعظیم پاک و ہند کے باشندوں کو چاہیے کہ تاریخ کو اس کی صحیح روشنی میں پڑھیں اور اپنے دماغوں کو پرانی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے جالوں سے بالکل پاک صاف کرلیں۔

پانچویں فصل: شہاب الدین غوری

سلطان محمود غزنوی کے بعد اس کی نسل سے پانچ بادشاہ تختِ غزنی پر متمکن ہوئے۔ لیکن چونکہ ان میں سلطان کے عظیم الشان اوصاف کا ایک شمہ بھی نہ تھا اس لیے غزنی کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ امیر سبکتگین ۳۶۷ھ میں تخت نشین ہوا اور ۵۶۹ھ میں شہاب الدین محمد غوری نے غزنی کو فتح کیا۔ گویا دوسو دو سال میں غزنویوں کا اخترِ اقبال غروب ہوگیا۔

ملتان کے ملاحدہ پر حملہ:

سلطان علاء الدین حسین جہانسوز کا بھتیجا محمد غیاث الدین علاقہ غور کا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے بھائی شہاب الدین محمد غوری کو غزنی پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ چنانچہ اس نے ۵۶۹ھ میں اس کو فتح کرلیا۔ خاندانِ غزنویہ کا آخری بادشاہ خسرو ملک اس کے مقابلے سے عاجز ہوکر لاہور چلا گیا۔ چونکہ غوری اپنے آپ کو غزنویوں کا وارث اور جانشین سمجھتے تھے اس لیے طبعی طور پر تو انھیں یہی چاہیے تھا کہ لاہور پہنچ کر خسرو ملک سے مُلک چھین لیتے۔ لیکن محمد غوری نے یہ ضروری نہ سمجھا کیونکہ اسے خبر مل گئی تھی کہ ملاحدہ الموت نے قرامطہ کی طرح ملتان کو اپنا گڑھ بنا رکھا ہے اور آس پاس کے ہندو راجاؤں سے سازش کررہے ہیں۔ چنانچہ ۵۷۱ھ میں اس نے ملتان پر حملہ

کیا۔ اور ملاحدہ کو شکست فاش دے کر سپہ سالار علی کرماخ کو ملتان کا عامل مقرر کر دیا۔

اُوچ پر حملہ:

ملتان کے بھگوڑے ملاحدہ نے اُوچ میں پناہ لی۔ محمد غوری نے اوچ پر حملہ کر دیا۔ راجا محصور ہو کر مقابلہ کرنے لگا۔ راجا کی بیوی نے محمد غوری کو پیغام بھیجا کہ اگر تم میری جوان اور حسین بیٹی سے نکاح کر لو اور میرے مال و زر کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ تو میں راجا کو قتل کرا دیتی ہوں۔ سلطان محمد غوری نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ رانی نے راجا کو ہلاک کر دیا اور سلطان نے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد راج کماری سے نکاح کر لیا۔ غزنی پہنچنے کے دو سال بعد یہ لڑکی فوت ہوگئی۔

نہر والہ میں شکست:

نہر والا (ملک گجرات) کے راجہ بھیم دیو نے ملاحدہ المُوت سے امداد حاصل کر کے محمد غوری کے عامل ملتان یعنی علی کرماخ سے ملتان چھین لینے کی غرض سے بہت بڑی فوج فراہم کی۔ یہ سن کر محمد غوری ۵۷۲ھ کے اواخر میں ملتان پہنچا۔ اور یہاں سے نہر والہ کی طرف عازم ہوا۔ راستے میں اس کے بہت سے سپاہی پانی نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔ جب نہر والہ پہنچا تو ہندوؤں اور ملحدوں کی متحدہ فوج نے محمد غوری کے تھکے ہوئے سپاہیوں پر حملہ کر کے شکست دے دی۔ ۵۷۴ھ میں سلطان بڑی مصیبتیں اٹھا کر واپس غزنی پہنچ گیا۔

پشاور، لاہور، دیبل:

اس کے بعد ۵۷۵ھ میں سلطان نے پشاور کو فتح کیا۔ اور پنجاب کے مغربی اضلاع میں نظمِ حکومت درست کرنے کے بعد ۵۷۷ھ میں لاہور پر حملہ آور ہوا۔ خسرو ملک نے عاجز آ کر ایک ہاتھی بطور پیشکش اور اپنا ایک بیٹا بطور یرغمال سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سلطان نے محاصرہ اٹھالیا اور غزنی چلا گیا۔ اب پنجاب کی طرف سے تو اطمینان ہو چکا تھا۔ لیکن نہر والہ کے راجا اور ملاحدہ کی سازش کا کانٹا سلطان کے دل میں برابر کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ اس نے غزنی سے دیبل (کراچی) کی طرف لشکر کشی کی۔ اور ساحلِ بحر اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا علاقہ فتح کر لیا۔ مقصد یہ تھا کہ ملاحدۂ المُوت اور حاکمِ گجرات کے درمیان فوجی آمدورفت منقطع ہو جائے۔ یہ مقصد خوش اسلوبی سے حاصل ہو گیا۔

خسرو ملک کا انجام:

لیکن اِدھر خسرو ملک بھی چین سے نہ بیٹھا۔ اُس نے پنجاب کے جنگجو ہندو گکھڑوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر کے مغربی پنجاب کے اضلاع کو غوری سے واپس لینے کی تیاری شروع کردی۔ وہ لاہور میں قلعہ گیر ہوا۔ لیکن محمد غوری نے لاہور کو چھوڑ کر سیالکوٹ کا قلعہ تعمیر کیا۔ اس پر بھی خسرو ملک نے حملہ کیا۔ اس کو فتح تو نہ کر سکا۔ لیکن محمد غوری کے مفتوحہ علاقے پر قبضہ کرلیا۔ آخر ۵۸۲ھ میں سلطان نے پھر لاہور پر حملہ کیا۔ خسرو ملک گرفتار ہوا۔ سلطان نے علی کرماخ کو بلا کر اس کو لاہور و ملتان دونوں صوبوں کی حکومت سپرد کی۔ اور طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کے والد سراج الدین کو لشکرِ ہند کا قاضی و امام مقرر کردیا۔ خسرو ملک کو سلطان نے غزنی پہنچ کر فیروز کوہ (جہاں اس کا بھائی غیاث الدین حکمران تھا) بھیج دیا۔ جہاں پانچ سال کے بعد وہ اور اس کا بیٹا دونوں ہلاک کردیے گئے۔

تراوڑی کے میدان میں شکست:

چونکہ دہلی بھی سلطنتِ غزنی ہی میں شامل تھا اور پرتھی راج نے غزنویوں کے دورِ زوال میں سلطنتِ غزنویہ کے کچھ علاقے دبا لیے تھے۔ جن میں ایک سرہند بھی تھا۔ اس لیے سلطان محمد غوری نے پرتھی راج کو لکھا کہ ''تم ان غصب کردہ علاقوں کو خالی کردو۔ کیونکہ ہم سلطنت غزنویہ کے وارث ہیں۔'' اس خط کا جواب نہایت تلخ انکار کی صورت میں وصول ہوا۔ اس پر سلطان ۵۸۷ھ میں لاہور آیا اور یہاں سے آگے بڑھ کر سرہند کا قلعہ پرتھی راج کے آدمیوں سے خالی کرالیا۔ پھر اطلاع ملی کہ پرتھی راج اور اس کا بھائی کھانڈے رائے دو لاکھ سپاہی اور بہت سے ہاتھی ساتھ لے کر جنگ کی نیت سے آرہے ہیں۔ سلطان اتنی بڑی جمعیت کا مقابلہ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ لیکن چونکہ جنگ سر پر آچکی تھی۔ اس لیے ہمت کرکے تھانیسر کی طرف روانہ ہوا جدھر سے پرتھی راج کا لشکر بڑھا چلا آرہا تھا۔

موضع ترائن جس کو تراوڑی بھی کہتے ہیں۔ دہلی سے چالیس کوس اور تھانیسر سے سات کوس پر واقع ہے۔ یہ مقام دونوں لشکروں کا میدانِ جنگ قرار پایا۔ اگرچہ سلطان کے ساتھ صرف چند ہزار آدمی تھے۔ لیکن وہ ڈٹ گیا اور خاصی لڑائی ہوئی۔ سلطان زخمی ہوگیا۔ جب گھوڑے پر سنبھل نہ سکا تو ایک خلجی جانباز اس کو کسی طرح نکال لے گیا۔ یہ حالت دیکھ کر سلطان کے

ساتھیوں نے بھی میدان چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور سلطان کو ڈولی میں ڈال کر لاہور لے گئے۔

جب زخم اچھے ہوئے تو سلطان غزنی پہنچا اور تراوڑی کے بھاگ جانے والے رفیقوں کو جمع کر کے ان کے منہ پر جَو کے توبڑے چڑھائے اور اُن کی تشہیر و تذلیل کی۔ فرشتہ نے لکھا ہے۔ سلطان کا حکم تھا کہ جو توبڑے میں سے جَو نہ کھائے۔ اس کا سر قلم کردو۔ فراریوں کو اُن کی غداری کی عبرت انگیز سزا دی۔

پرتھی راج کا خاتمہ:

تراوڑی کے واقعہ سے ایک سال چند ماہ بعد سلطان محمد غوری نے اپنے لشکر کو از سرِ نو مرتب کر کے پہلے پرتھی راج پر اتمامِ حجت کیا۔ اور سرکشانہ جواب پا کر عزمِ جنگ کیا۔ اس دفعہ پرتھی راج نے بھی بے شمار راجاؤں کی امداد حاصل کی۔ بقول فرشتہ

"راجاہائے راجپوت کہ یک صد و پنجاہ نفری شدند۔ قشقۂ شجاعت برجبیں کشیدہ بقاعدہ دروش سوگند ہائے غلیظ و شدید یا دنمودند کہ رقمِ ہزیمت از صحیفۂ خاطر محو سازند و تا دفع خصم ننمایند دست از کارزار بر ندارند۔

کھانڈے رائے اس عظیم لشکر کا سپہ سالار تھا اور پرتھی راج ڈیڑھ سو راجاؤں کو ساتھ لیے میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ آخر محمد غوری کو فتح مبین حاصل ہوئی۔ پرتھی راج اور کھانڈے رائے دونوں مارے گئے۔ اور اس جنگ سے شمالی ہند پر مسلمانوں کا تسلط قطعی و واقعی ہوگیا۔ اس کے بعد سرسوتی، سامانہ، کہرام اور ہانسی کی راجپوت ریاستیں آسانی سے فتح کر لی گئیں۔ پھر سلطان نے اجمیر پہنچ کر اس کی حکومت پرتھی راج کے ایک بیٹے کولا کے سپرد کردی۔ اور اپنے وفادار غلام قطب الدین ایبک کو بلادِ ہند کا وائسرائے مقرر کر کے غزنی واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک نے تھوڑے ہی عرصے میں میرٹھ، کول (اب علی گڑھ) اور دہلی کو فتح کرلیا۔ اور دہلی کو اپنا پائے تخت قرار دیا۔

قنوج:

پرتھی راج کی شکست کے دو سال بعد سلطان محمود غوری غزنی سے چل کر قنوج پر حملہ آور ہوا جو راٹھوروں کا مرکز تھا۔ راجہ جے چند نے مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھا کر میدانِ جنگ ہی میں ہلاک ہوا۔ سلطان اس کارنامے کے بعد مالِ غنیمت لے کر غزنی چلا گیا۔

قطب الدین ایبک نے ملک کے باقی حصوں کو فتح کرنے میں حیرت انگیز سُرعت سے کام لیا۔ ایک راجا ہری راج نے اجمیر سے پرتھی راج کے بیٹے کو نکال باہر کیا۔ اس نے قطب الدین سے فریاد کی۔ قطب الدین نے راجا ہری راج پر چڑھائی کر کے اس کو قتل کیا۔ اور کولا پھر اجمیر کا راج بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک مسلمان حاکم بھی مقرر کر دیا گیا۔ گویا یہ ایک قسم کا ریذیڈنٹ تھا۔ اجمیر سے قطب الدین نے نہروالا کے راجا بھیم دیو کے خلاف لشکر کشی کی اور اس کو بھی شکست دی۔ پھر واپس آ کر گوالیار اور بیانہ کو فتح کیا۔

بنگال و بہار:

قطب الدین ایبک کے ماتحت ایک جرنیل محمد بن بختیار خلجی تھا۔ اس نے اپنی دانائی اور شجاعت سے بہار اور بنگال کو بھی فتح کر لیا۔ اور سلطان محمد غوری کے نام کا سکہ خطبہ جاری کیا۔ ۵۹۹ھ میں قطب الدین نے بندھیل کھنڈ کی چندیلہ راجا پر حملہ کر کے کالنجر پر قبضہ کیا۔ پھر کالپی اور بدایوں کے قلعے لے لیے۔ اب گویا ہندوستان کے بڑے بڑے عالی نسب راجپوت راجا یعنی دہلی اور اجمیر کے چوہان، قنوج کے راٹھور، گجرات کے بگھیلے، بندھیل کھنڈ کے چنڈیلے، بہار اور بنگال کے پال اور سین سب کے سب مسلم قوت کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔

گکھڑوں کا قبولِ اسلام:

پنجاب کے ہندو گکھڑوں کی قوم نہایت وحشی و جنگجو تھی۔ اس کا پیشہ رہزنی تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے قتل پر بے حد حریص تھے۔ اور ملاحدہ کو اپنی فتنہ انگیزیوں میں گکھڑوں سے بڑی مدد ملتی تھی۔ ایک دفعہ ایک مسلمان ان لوگوں کے ہاتھ قید ہو گیا۔ جس شخص کے ہاں وہ مسلمان بحالت اسیری رکھا گیا اسے اس کی نیکی، پرہیز گاری اور عبادت پسند آئی۔ قیدی نے بھی موقع پر اسے اسلام کی تبلیغ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قبولِ اسلام پر آمادہ ہو گیا۔ قیدی نے کسی طریقے سے یہ خبر سلطان محمد غوری کو پہنچا دی۔ سلطان خود اس علاقے میں آیا اور اس گکھڑ کو مشرف بہ اسلام کر کے علاقے کا حاکم مقرر کر دیا تاکہ اپنی قوم کو قتل و غارت سے باز رکھے۔ اس نومسلم گکھڑ کی کوشش سے لاکھوں گکھڑ مسلمان ہو کر نیکی اور شائستگی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس وقت سے اب تک یہ قوم مسلمان چلی آتی ہے۔

سلطان کی شہادت مَلاحدہ کے ہاتھوں:

مَلاحدہ الَمُوت اس زمانے میں اضلاع پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اپنی خفیہ کارروائیوں میں مصروف تھے۔ محمد غوری کے لشکر میں حضرت امام فخر الدین رازی امام صلوٰۃ تھے۔ اور روزانہ درس بھی دیا کرتے تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ یہ ملاحدہ بھی حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن ان کی حقیقت کسی کو معلوم نہ تھی۔ جب سلطان نے لاہور سے غزنی کو روانہ ہوتے وقت ضلع جہلم کے موضع دھمیک پر دریا کے کنارے مقام کیا تو اُن ملاحدہ نے جو لشکرِ سلطانی میں موجود تھے۔ اور ان میں سے بعض خدمتِ دربانی پر بھی مقرر تھے۔ سلطان کو قتل کر دینے کی سازش کی۔ رات کے وقت سلطان کے خیمے کو چاک کر کے اندر گھس گئے۔ اور چھرے مار کر سوتے ہوئے سلطان کو شہید کر ڈالا۔ بعض بھاگتے ہوئے پکڑے گئے تو لوگوں نے پہچانا کہ یہ تو امام فخر الدین رازی کے درس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ بعض کو شبہ ہوا کہ شاید امام صاحب کا تعلق بھی ملاحدہ سے ہے اور یہ بھی سلطان کے قتل کی سازش میں شریک ہیں۔ امام صاحب بھی زیرِ حراست لے لیے گئے۔ لیکن بالآخر بری کر دیے گئے۔ سلطان محمد غوری ۳۔ شعبان ۶۰۲ھ کو شہید ہوا۔

ہزاروں بیٹے:

منہاج السراج نے لکھا ہے کہ ''ایک دفعہ محمد غوری کے ایک منظورِ نظر درباری نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ سلطان کا کوئی بیٹا نہیں۔ اس پر سلطان نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا کہ دوسرے بادشاہوں کے ایک یا دو بیٹے ہوں گے۔ میرے ہزاروں بیٹے ہیں۔ یعنی ترکی غلام۔ جو میرے بعد میری قلمرو کے وارث ہوں گے۔ اور سلطنت کے طول و عرض میں میرا نام خطبے میں محفوظ رکھیں گے۔''

اس میں شک نہیں کہ سلطان اپنے ترکی غلاموں کو بیٹوں ہی کی طرح رکھتا تھا اور انکی تعلیم و تربیت میں انتہائی توجہ صرف کرتا تھا۔ انھی میں سے قطب الدین ایبک تھا جو پہلے سلطان کا نائب السلطنت مقرر ہوا اور اس کے انتقال کے بعد ''شہنشاہ ہند'' بن کر ایک حکمران خاندان کا بانی ہوا۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کا بانی:

سلطان محمود غزنوی نے برعظیم ہندوستان میں جتنی لڑائیاں لڑیں، اُن سے مقصود ملک

گیری نہ تھا۔ بلکہ بعض وجوہ و اسباب کی بنا پر اسے یہ اقدامات کرنے پڑے۔ لیکن سلطان محمد غوری نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر اس وقت غزنوی خاندان کے ناکارہ مسند نشینوں کو ہٹا کر ہندوستان کے راجپوت راجاؤں کو نیچا نہ دکھا گیا تو مسلم قوت و سیاست کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور جو مسلمان ہندوستان میں موجود ہیں وہ ملاحدہ و قرامطہ ہو کر دنیا بھر میں مسلم اقتدار کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں ممد و معاون ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھنے کا سہرا محمد غوری ہی کے سر ہے۔ جس نے اپنی زندگی ہی میں سارے شمالی ہند کو سلطنت اسلامی کے زیر نگیں کر دیا اور جس سے کچھ عرصہ بعد جنوبی ہند بھی پرچم اسلام کے سائے تلے آ گیا۔ بعض متعصب مؤرخین محمود غزنوی کے خلاف تو ہزار قسم کی غلط بہتان طرازیاں کرتے ہیں۔ لیکن محمد غوری کے متعلق بجز اس کے اور کچھ نہیں کہتے کہ فلاں موقع پر اس نے ہندوؤں کو قتل کیا۔ مندروں کے انہدام یا بے اندازہ دولت کی فراہمی کا الزام محمد غوری پر عائد ہی نہیں کیا جاسکتا۔

چھٹی فصل: ظہیر الدین بابر

سلطان محمد غوری کے انتقال کے بعد خاندانِ غلاماں، خاندانِ خلجی، خاندانِ تغلق اور خاندانِ لودھی کے سلاطین نے سلطنتِ دہلی پر حکومت کی۔ اور اس ڈھائی سو سال کی مدت میں انھوں نے نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن کو بھی زیر نگیں کرلیا۔ بلکہ دکن میں مقامی مسلمان حکمرانوں کی حکومتیں بھی قائم ہوئیں۔ لیکن جب ابراہیم لودی افغان سرداروں پر سختی کرنے کی وجہ سے غیر ہر دلعزیز ہوگیا اور حکومت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں تو فطرت متقاضی ہوئی کہ اب پھر ہندستان کی مسلم سلطنت کی رگوں میں وسطِ ایشیا کا تازہ اور گرم خون داخل ہو۔ جو اسے ایک دفعہ اور حیاتِ تازہ کے ولولوں سے معمور کر دے۔

وسطِ ایشیا کی ایک چھوٹی سی سلطنت فرغانہ کے نام سے قائم تھی۔ جس پر تیمور کے اخلاف حکمران تھے۔ تیمور کا پڑپوتا عمر شیخ مرزا نویں صدی ہجری کے اواخر میں اس ملک پر حکومت کرتا تھا۔ عیسوی تاریخ کے حساب سے ۲۴ر فروری ۱۴۸۳ء کو اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام ظہیر الدین محمد بابر رکھا گیا۔ بابر کی ماں یونس خاں مغول کی بیٹی تھی جو چنگیز خاں کی اولاد سے تھا۔ گویا بابر باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی طرف سے مغول تھا۔ ہندوستان میں مغل شہنشاہوں کو غلط العام کے طور پر مغل کہتے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں وہ ترک تھے۔ اور واقعہ یہ ہے

کہ بابر مغلوں کے اسلوب زندگی سے نفرت کرتا تھا اور اس نے ہر جگہ ترکوں کو مغلوں سے ممیز کیا ہے۔

بابر ابھی گیارہ سال کا تھا کہ عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوگیا اور فرغانہ کی حکومت کا بار بابر کے نوعمر اور کمزور کندھوں پر آن پڑا۔ فرغانہ کے اردگرد جتنے حکمران تھے۔ وہ بابر کے لیے موجب خطر تھے۔ لیکن اس ترک بچے کا حوصلہ بلند تھا۔ اس کے دل میں یہ آرزو تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے مخالفین کو ختم کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کرے۔ خصوصاً سمرقند کو فتح کر کے تیمور کے تخت پر جلوس فرمائے۔ چنانچہ اس نے بیس پچیس سال کی مدت وسطِ ایشیا ہی کی مختلف حکومتوں کے ساتھ لڑنے بھڑنے میں بسر کی۔ کبھی سمرقند و بخارا پر قبضہ کرلیا۔ کبھی مخالفوں سے شکست کھا کر سب کچھ چھوڑ بھاگا اور پہاڑوں میں ٹکریں مارتا پھرا۔ کبھی کابل و قندھار پر قابض ہوا۔ اور کبھی نکال دیا گیا۔ آخر اس نے مشرق کی طرف رخ کیا اور سرحدِ ہند پر باجوڑ کے قلعہ پر قبضہ کرکے ۱۵۱۹ء میں بھیرہ پر حملہ آور ہوا۔ اور بلا مقابلہ اس پر قابض ہوگیا۔ بعض مشیروں کی صلاح سے اس نے سلطان ابراہیم لودی کے پاس ایک قاصد بھیجا۔ اور مطالبہ کیا کہ جو ممالکِ ہند زمانۂ قدیم سے ترکوں کے مفتوح و مملوک چلے آتے ہیں، وہ ہم کو واپس دے دو۔ لیکن اس قاصد کو پانچ مہینے تک دولت خاں لودی نے لاہور میں روکے رکھا۔ اور وہ ابراہیم لودی سے ملاقات کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

اس کے بعد بابر کابل واپس چلا گیا۔ اور جاتے ہی اس نے بدخشاں کو فتح کر کے ہمایوں کے حوالے کیا۔ اور ارغون حکمرانوں سے قندھار چھین کر اپنے دوسرے بیٹے کامران مرزا کو حاکم مقرر کردیا۔ اس دوران میں ہندوستان کے افغان سردار ابراہیم لودی کی بدسلوکی سے نالاں ہو رہے تھے۔ ابراہیم کے بھائی عالم خاں کو بھی اپنے بھائی سے سخت شکایات تھیں۔ دولت خاں لودی کے بیٹے دلاور خاں سے بھی ابراہیم لودی نے بہت برا سلوک کیا تھا۔ چنانچہ دولت خاں نے بابر کو پیغام بھیجا کہ ہندوستان پر حملہ کرکے انھیں ابراہیم لودی سے نجات دلائے۔ لیکن بعد میں افغانوں نے دولت خاں کو بابر کی امداد کرنے سے روک دیا کہ سلطنت تو مغلوں کو مل جائے گی۔ تمھارے ہاتھ کیا آئے گا۔ پہلی کوشش یہ تھی کہ عالم خاں (علاء الدین برادر ابراہیم لودی) کو تخت دہلی ملے۔ دولت خاں پہلے اس تجویز کو قبول کرتا تھا۔ بعد میں بدل گیا۔

رانا سانگا (سنگرام سنگھ والیٔ میواڑ) نے بھی بابر کو ایک قاصد کی وساطت سے پیغام انس

و مؤدّت دیا اور لکھا کہ اگر آپ ابراہیم لودی کو ختم کرنے کے لیے دہلی پر چڑھائی کریں گے تو میں آگرہ کی طرف سے حملہ آور ہوں گا۔

رانا سانگا کو ابراہیم لودی سے اس لیے دشمنی تھی کہ ابراہیم اسے ایک شکست فاش دے چکا تھا۔ رانا جانتا تھا کہ بابر کو حملے کے لیے اکسانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بابر اور ابراہیم دونوں باہم لڑ کر کمزور ہو جائیں گے۔ بابر مال و دولت لے کر چلا جائے گا۔ ابراہیم مارا جائے گا۔ اور سلطنتِ دہلی راجپوت سنبھال لیں گے۔ لیکن جب بابر خود تخت پر بیٹھ گیا تو رانا سانگا نے ہندو راجاؤں کو اُکسا کر لشکر تیار کیا۔ اور کنواہہ میں جنگ کی۔ یہ صورت حال آئندہ واقعات کے پس منظر کے طور پر بیان کی گئی ہے۔

جب ۱۵۲۴ء میں بابر نے کابل سے روانہ ہو کر ایک افغان فوج کو لڑ کر شکست دی اور لاہور پر قبضہ کیا تو دولت خاں نے بابر کے اس اقدام کو پسند نہ کیا۔ تاہم بابر نے اس کو جالندھر اور سلطان پور کی جاگیر دے دی لیکن جب وہ مخالفانہ سازشوں سے باز نہ آیا اور خود اس کے بیٹے دلاور خاں نے بابر کو اپنے باپ کی حرکتوں سے مطلع کر دیا تو بابر نے باپ کی جاگیر چھین کر بیٹے کو دے دی۔ اور عالم خاں کو دیپال پور سپرد کر کے کابل واپس چلا گیا۔

لیکن چونکہ دولت خاں کے عزائم اور تھے اور وہ چاہتا تھا کہ بابر ابراہیم لودی کو مار پیٹ کر واپس چلا جائے اور میں تخت دہلی پر بیٹھ جاؤں۔ اس لیے اس نے بابر کے واپس جاتے ہی سلطان پور اپنے بیٹے سے اور دیپالپور عالم خاں سے چھین لیا۔ اس پر عالم خاں کابل کو بھاگ گیا اور بابر سے یہ معاہدہ کر کے آیا کہ اگر وہ تختِ دہلی پر متمکن ہو گیا تو اسے لاہور اور اس کے مغربی ملک کا حاکم بنا دے گا۔ لیکن اس کے بعد عالم خاں نے دولت خاں کے سمجھانے بجھانے پر یہ معاہدہ توڑ دیا اور دونوں نے مل کر سلطان ابراہیم لودی کے خلاف لشکر کشی کر دی۔ لیکن سلطان اتنا کمزور نہ تھا کہ ان سے شکست کھا جاتا۔ چنانچہ ان دونوں کی متحدہ فوج کو شکستِ فاش ہوئی۔

ان لوگوں کی بدعہدی کے باعث بابر نے فیصلہ کر لیا کہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کی مہم کی تکمیل کرے گا۔ چنانچہ اس نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ دولت خاں نے عاجز آ کر معافی مانگی۔ بابر نے اس کو معاف تو کر دیا۔ لیکن صرف چند دیہات پر قابض رہنے کی اجازت دی۔ باقی سب کچھ چھین لیا۔ فتح پنجاب کے بعد فتح دہلی کی مہم درپیش تھی۔ بابر جانتا تھا کہ ایک غیر معلوم ملک میں جا کر ایک منظم سلطنت کے خلاف صف آرا ہونا ہنسی کھیل نہیں۔ اور اس کے لیے بڑے

سازوسامان اور ذرائع و وسائل کی ضرورت ہے۔ لیکن اس شیر مرد نے ہمت نہ ہاری۔ چنانچہ لکھتا ہے:

''میں نے رکابِ عزم میں پاؤں اور ایمان باللہ کی عنان پر ہاتھ رکھا۔ اور سلطان ابراہیم بن سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودی افغان کے خلاف یلغار کردی جو اس وقت تختِ دہلی اور مملکتِ ہندوستان پر قابض و مسلط تھا۔'' [۳۴]

رانا سنگرام سنگھ (رانا سانگا) کے متعلق بابر نے لکھا ہے کہ:

''اگرچہ میرے دورانِ قیامِ کابل میں رانا سانگا نے ایک ایلچی میرے پاس بھیج کر پیامِ مودّت دیا تھا۔ اور یہ طے کیا تھا۔ اگر میں ادھر سے نواحِ دہلی کو کوچ کروں گا تو وہ آگرے کی طرف سے دہلی کو بڑھے گا لیکن میں نے ابراہیم کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرلیا۔ اور رانا نے میرے ان اقدامات کے دوران میں کوئی جنبش تک نہ کی۔'' [۳۵]

۱۲۔ اپریل ۱۵۲۶ء کو بابر کا لشکر پانی پت پہنچ گیا اور ادھر سے ابراہیم لودھی بھی ایک لاکھ کی فوج لے کر صف آرا ہوا۔ آٹھ دن تک دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی رہیں۔ آخر بابر نے پورے انتظام کے ساتھ حملہ کیا۔ اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ ابراہیم لودی میدانِ جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور بابر تختِ دہلی پر متمکن ہوگیا۔ گویا ہندوستان کی حکومت افغانوں کے ہاتھ سے نکل کر ترکانِ چغتائی کے قبضے میں چلی گئی۔

بابر نے شہزادہ ہمایوں کو آگرہ فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اور خود افغان سرداروں کی جاگیریں چھین کر اپنے رفیق سرداروں کے سپرد کیں۔ پھر بیانہ، گوالیار، دھول پور، جون پور، غازی پور اور کالپی کو فتح کیا۔ اس کے بعد بابر کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ راجپوتوں کا تھا جن کا لیڈر رانا سانگا تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ نہایت باہمت اور بہادر سردار تھا جس نے میواڑ کو ایک چھوٹی سی ریاست سے بڑھا کر بہت بڑی سلطنت بنا دیا تھا۔ مالوہ، بھیلسہ، سارنگ پور، چندیری، رنتھمبور کو فتح کرکے اپنے آدمیوں کے سپرد کردیا تھا۔ مارواڑ اور انبر کے راجا اس کو اپنا سردار مانتے تھے۔ اور گوالیار، اجمیر، سیکری، رائے سین، کالپی، چندیری، بوندی، گنگراؤں، رامپورہ اور آبو کے راجا اس کو خراج ادا کرتے تھے۔ [۳۶] رانا سانگا کی یہ اہمیت افغان سرداروں کے مابین خانہ جنگی اور سلطنتِ دہلی کی کمزوری کا نتیجہ تھی۔ رانا سانگا خود بے شمار لڑائیوں میں شریک ہوکر ایک آنکھ، ایک بازو اور ایک ٹانگ جنگ و پیکار کی نظر کرچکا تھا۔ میوات کے سردار حسن خاں کا ایک لڑکا پانی پت

کی لڑائی میں گرفتار ہو گیا تھا۔ بابر نے حسن خاں کی منت سماجت پر اُسے رہا کر دیا اور توقع رکھی کہ اس سے حسن خاں ممنون ہو گا۔ لیکن یہ توقع غلط نکلی۔ حسن خاں میواتی رانا سانگا کے ساتھ شامل ہو گیا۔

اب بابر اور اس کے رفیقوں کے سامنے ایک نہایت عظیم الشان مہم تھی۔ کیونکہ رانا سانگا راجپوتوں کو منظم کر چکا تھا اور خونریز جنگ درپیش تھی۔ اس موقع پر بابر نے شراب سے توبہ کی۔ تمام آلاتِ مے نوشی تلف کرا دیئے۔ اور اپنے افراد اور سپاہیوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں بتایا کہ ''ہم سب فانی ہیں اور صرف اللہ کی ذات ہی باقی ہے۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت ہزار درجے بہتر ہے۔ بہت بڑی آزمائش درپیش ہے۔ اگر ہم اس جنگ میں مارے گئے تو شہید ہوں گے۔ اگر زندہ رہے اور فاتح ہوئے تو غازی کہلائیں گے۔ لہٰذا قرآن مجید پر حلف اٹھاؤ کہ جنگ سے کسی حالت میں منہ نہ موڑو گے، اس سے ترکوں میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ان سب نے قرآن مجید پر حلف اٹھائے کہ جو بادشاہ سے پھرے گا وہ خدا سے پھرے گا۔

رانا سانگا کے جھنڈے تلے ہندوستان کے بڑے بڑے راجپوت راجاؤں کی فوجیں جمع ہوئیں۔ بھیلسہ کا راجا سلاہری، میوات کا حسن خاں، سلطان سکندر لودی کا بیٹا محمود لودی جس کو رانا نے شاہِ دہلی تسلیم کر لیا تھا، چندیری کا مدینی راؤ، ڈونگر پور کا راجا راول اُودھے سنگھ ہزارہا جنگجو راجپوتوں کے لشکر لے کر آن پہنچے۔ اور چھوٹے راجاؤں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ ۱۶۔ مارچ ۱۵۲۷ء کو سیکری سے دس میل دور کنواہہ کے مقام پر دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ بابر کے ساتھ چند ہزار جانبازوں سے زیادہ نہ تھے۔ اور راجپوتوں کی جمعیت دو لاکھ سے متجاوز تھی۔ ۹ بجے صبح سے لڑائی شروع ہوئی اور شام تک جاری رہی۔ راجپوتوں کو نہایت شرمناک شکست ہوئی۔ وہ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ہزاروں نعشیں چھوڑ گئے۔ جن میں حسن خاں میواتی، راول اودھے سنگھ (ڈونگر پور) اور بہت سے چھوٹے راجاؤں کی نعشیں بھی شامل تھیں۔ رانا سانگا بھاگ کر اپنے ایک پہاڑی قلعے میں پناہ گزیں ہوا۔

کنواہہ کی جنگ نے ہندوستان میں راجپوتوں کی فوجی قوت کو ہمیشہ کے لیے توڑ کر رکھ دیا اور اقبالِ بابری کا پرچم ہر جگہ لہرانے لگا۔ اس کے بعد چندیری کا قلعہ فتح ہوا اور پھر بہار اور بنگال کا فیصلہ گوگرہ کی لڑائی میں ہو گیا۔

ہمایوں کنواہہ کی جنگ کے بعد کابل گیا اور ازبکوں سے لڑتا رہا۔ بابر اس کی مدد کو جانا

چاہتا تھا لیکن خرابیٔ صحت اور ناموافق آب و ہوا کی وجہ سے لاہور سے آگے نہ جاسکا۔ ہمایوں بعض سازشوں کا قلع قمع کرنے کے بعد اپنی جاگیر سنبھل میں آ گیا۔ جہاں وہ سخت بیمار ہوگیا۔ بابر بیٹے کی بیماری سے سخت پریشان ہوا۔ اور اس پر اپنی جان قربان کرنے کا ارادہ کرلیا۔ امیروں نے کہا کہ جو بیش بہا ہیرا آگرہ سے ہاتھ آیا تھا وہ قربان کردیجیے۔ لیکن بابر نہ مانا۔ ہمایوں کے بستر علالت کے گرد تین دفعہ پھرا اور کہتا گیا کہ ''میں نے اس کی بیماری لے لی۔'' خدا کی قدرت اس کے بعد بابر بیمار ہوگیا اور ہمایوں کی صحت عود کر آئی۔ بابر نے ہمایوں کے حق میں وصیت کی۔ امیروں اور سرداروں سے کہا کہ اس کی اطاعت کریں۔ اور ہمایوں سے کہا کہ میں تم کو، تمھارے بھائیوں کو، اپنے تمام اعزہ کو اور اپنی تمام قوم کو تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ اور تم سب کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ تین دن بعد ۲۶۔ دسمبر ۱۵۳۰ء کو بابر انتقال کرگیا۔ میت پہلے آگرہ کے آرام باغ میں جمنا کے کنارے بطور امانت دفن کی گئی۔ اس کے بعد مرحوم کی وصیت کے مطابق کابل لے جاکر سپردِ خاک کی گئی۔

اگرچہ بابر صرف گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور اس کے بعد اسے کبھی فراغت کا وقت نصیب نہیں ہوا۔ جس میں وہ تحصیل علم وفن کی طرف متوجہ ہوسکتا۔ لیکن اس کے باوجود مؤرخین اس پر حیران ہیں کہ وہ کیسی ابتدائی تعلیم و تربیت تھی جس نے اس کو ترکی و فارسی کا عالی پایہ ادیب اور شاعر بنا دیا۔ شعر میں اس کا ایک بلند پایہ دیوان موجود ہے۔ اور ترکی زبان میں اس نے اپنی جو تزک لکھی وہ بے تکلف اور شگفتہ انشا پردازی کا شاہکار تسلیم کی جاتی ہے۔ وہ سیر وشکار کا بے حد شوقین تھا۔ مناظر قدرت کا عاشق اور شائستہ اوضاع و اطوار کا قدر دان تھا۔ ہندوستان میں پہنچ کر اس نے ہندوؤں کی معاشرت کو دیکھا تو بے حد متنفر ہوا۔ چنانچہ تزک میں لکھتا ہے:

''ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں کوئی خوبی و خوشنمائی نہیں۔ یہاں کے لوگ وجیہہ وشکیل نہیں۔ ان کو دوستانہ میل ملاپ، گرم جوشی اور بے تکلفی کا کوئی سلیقہ نہیں۔ ان میں کوئی خاص ذہانت نہیں۔ ذہنی اور دماغی وسعت نہیں۔ شائستگی اطوار نہیں۔ باہم رفق و مدارا کا جذبہ نہیں۔ اپنی صنعت وحرفت میں نئی ایجادوں کا مادہ نہیں۔ صناعی اور تعمیر کا علم و ہنر حاصل نہیں۔ نہ ان کے پاس اچھے گھوڑے ہیں۔ نہ یہاں اچھا گوشت دستیاب ہوتا ہے۔ نہ انگور ہے نہ سردا۔ نہ کوئی اور اچھا میوہ ہے۔ برف نہیں۔ ٹھنڈا پانی نہیں۔ ان کے بازاروں میں اچھی روٹی اور اچھی

خوراک نہیں ملتی۔ نہ حمام ہیں۔ نہ بڑے مدرسے ہیں۔ نہ شمع ہے نہ مشعل نہ موم بتی۔ شمع و مشعل کے بجائے یہاں کچھ غلیظ و کثیف آدمی ہیں جن کو "ڈیوٹی" کہتے ہیں، جو اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چوبی تپائی لیے رہتے ہیں۔ جس کی ایک ٹانگ کے ساتھ شمع کے بالائی سرے کی شکل کا ایک آہنی ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ یہ ایک ڈھیلی ڈھالی سی بتی ایک میخ کے ذریعے تپائی کی دوسری ٹانگ سے باندھ دیتے ہیں۔ یہ بتی ہاتھ کی درمیانی انگلی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اپنے دائیں ہاتھ میں ایک کُپی سی تھامے رہتے ہیں۔ اس کپی میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس سے تیل کی پتلی سی دھار نکلتی ہے جب کبھی بتی کو تیل کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کپی سے انڈیل دیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے بڑے آدمیوں کے ہاں سو یا دو سو "ڈیوٹی" ملازم رکھے جاتے ہیں۔"

اس کے علاوہ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستانیوں کے باغوں یا محلوں میں نہ کوئی حوض ہوتا ہے نہ نہریں اور ان کی عمارتیں بدنما اور بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ ان کے کسان اور دوسرے ادنیٰ درجے کے لوگ بالکل ننگے رہتے ہیں اور صرف ایک لنگوٹی باندھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں سب سے بڑی خوبی ایک ہی ہے کہ اس میں سونا اور چاندی بہت ہے۔ آب و ہوا برسات کے دنوں میں خوشگوار ہوتی ہے۔ ہر پیشے اور حرفت کے آدمی یہاں بکثرت مل جاتے ہیں۔ پیشے زیادہ تر موروثی ہیں۔ اور خاص کاموں کے لیے خاص قومیں مقرر ہیں۔

بابر کو اپنی زندگی میں جن نشیب و فراز اور آزمائشوں سے سابقہ پڑا ان کی وجہ سے وہ جفاکشی، استقلال، بہادری اور خود اعتمادی کا پیکر بن گیا تھا۔ شکار کے دوران میں وہ خوفناک جنگلی درندوں کا تعاقب میلوں تک کرتا جاتا تھا۔ برفانی ندیوں میں اتر کر بے تکلف شناوری کرتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا شمشیر زن تھا اور اپنے سپاہیوں کے دلوں میں ہمت و جرأت اور جوش عمل پیدا کرنے کا فن خوب جانتا تھا۔ نہایت خوش باش، بشاش اور دوست نواز تھا۔ عہد و پیمان کا پکا تھا۔ اور اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی عیاری یا غداری روا نہ رکھتا تھا۔ بلکہ ان کے ساتھ ہمیشہ دریا دلی اور فیاضی کا سلوک کرتا تھا۔ اپنے بھائیوں، عزیزوں اور ہم قوموں سے ہمیشہ نیک سلوک مرعی رکھتا۔ موسیقی کے بے حد ذوق رکھتا تھا۔ اور اس کے تصنیف کیے ہوئے بعض گیت اب تک موجود ہیں۔ شعر و شاعری سے اس کی وابستگی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ خوش نویسی میں بھی کمال رکھتا تھا۔ غرض اپنے زمانے کے ذی علم اور کامل الفن اشخاص سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جنگ و پیکار میں نہایت شدید اور فوجی نظم میں نہایت سخت گیر تھا۔ لیکن اس نے انسانوں کے قتل کو کبھی اپنا

مشغلہ نہیں بنایا۔ اور بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ جرأت استقلال، تہذیب و ثقافت، خلوص اور عالی حوصلگی کے اعتبار سے ایشیا کے بہت ہی کم حکمران اس کے شریک و سہیم قرار دیے جاسکتے ہیں۔[۳۷]

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی ورود و نفوذ کی ابتدا جن چار شخصیتوں سے ہوئی (محمد بن قاسم، محمود غزنوی، محمد غوری اور بابر) ان کا مختصر تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ محمد بن قاسم سے لے کر ابوظفر بہادر شاہ تک بیسیوں مسلمانوں نے اس برِّعظیم میں اقتدارِ حکومت کا پرچم لہرایا۔ اور اپنی سیاسی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی، ادبی اور ثقافتی خدمات سے ملک کی زندگی میں پائدار انقلابات پیدا کیے۔ جن کا تذکرہ آیندہ ابواب کا موضوعِ تحریر ہے۔

حواشی

[۱] ابوزید، سرافی، ص ۱۳۵، پیرس۔

[۲] ابنِ خورداذبہ، کتاب المسالک والممالک، ص ۷۱۔

[۳] آثار البلاد، قزوینی، گرنجن، ص ۸۲۔

[۴] عجائب الہند، ص ۱۳۶۔

[۵] جامع التواریخ، ایلیٹ، جلد اوّل، ص ۶۹-۷۰۔

[۶] سیّد سلیمان ندوی، بحوالہ ضیاء الدین برنی، ص ۳۳۳۔ خزائن الفتوح، امیر خسرو، ص ۱۷۸۔

[۷] عجائب الہند، ص ۱۵۵-۱۵۷۔

[۸] تحفۃ المجاہدین بحوالہ دعوتِ اسلام، آرنلڈ، ص ۳۸۲-۳۸۳۔

[۹] خزائن الفتوح، امیر خسرو، ص ۱۵۷-۱۶۲۔

[۱۰] سفرنامہ سلیمان تاجر، ص ۲۶ تا ۲۸۔

[۱۱] فتوح البلدان، بلاذری، ایلیٹ، جلد اوّل۔

[۱۲] ایضاً۔

[۱۳] قیقان، آج کل بلوچستان میں ہے۔ غالباً قلات یا اس کے آس پاس کا کوئی مقام ہوگا۔

[۱۴] چچ نامہ و تاریخِ معصومی۔

[۱۵] چچ نامہ۔

[۱۶] فتوح البلدان، بلاذری، ص ۴۳۸۔

[۱۷] چچ نامہ، ایلیٹ، ص ۵۸۔

[۱۸] معجم البلدان یاقوت بحوالہ اصطخری، جلد ۸، ص ۲۰۱۔

[۱۹] کتابِ ہند، البیرونی، ص ۵۶۔

[۲۰] فتوح البلدان، بلاذری، ص ۴۳۹۔

[۲۱] چچ نامہ، ایلیٹ، جلد اوّل، ص ۱۸۶۔

[۲۲] ایضاً۔

[۲۳] خلاصۃ التواریخ، منشی سبحان رائے۔

[۲۴] خلاصۃ التواریخ اور فرشتہ۔

[۲۵] فرشتہ۔

[۲۶] بھیم نگر، نگرکوٹ اور کانگڑہ ایک ہی مقام کے مختلف نام ہیں۔

[۲۷] تاریخِ فرشتہ۔

[۲۸] طبقاتِ اکبری و خلاصۃ التواریخ، ''ہندوستان پر حملے'' میجر جنرل این این سیلولوف (روسی)۔

[۲۹] ''مختصر سیر گلشنِ ہند'' از لالہ بابو رام۔

[۳۰] خلاصۃ التواریخ، سبحان رائے۔

[۳۱] یہ انہلواڑہ وہی ہے، جسے نہروالا اور پٹن بھی کہتے ہیں اور وہ گجرات میں سومنات کے قریب ہے۔ گویا محمود ملتان سے موجودہ بہاول پور، جیسلمیر اور مارواڑ کے صحرائی علاقے سے انہلواڑہ ہوتا ہوا سومنات پہنچا تھا۔

[۳۲] یہ غلط ہے۔ محمود کی لکھی ہوئی فقہ کی ایک کتاب مدتوں مروّج رہی۔ وہ حافظِ قرآن تھا اور اپنی تحقیق سے حنفیت کو چھوڑ کر شافعی بن گیا تھا۔ طبقاتِ شافعیہ میں اس کے مفصل حالات درج ہیں۔

[۳۳] منہاج سراج، ص ۱۳۲۔

[۳۴] تزکِ بابری، حصہ دوم، ص ۱۷۴۔

[۳۵] ایضاً، ص ۲۵۴۔

[۳۶] ٹاڈ راجستھان، کروک، ص ۳۴۸-۳۴۹۔

[۳۷] بابر کے کردار کے متعلق یہ تمام اشارات مسٹر ایشوری پرشاد کی کتاب ''مختصر تاریخِ حکومت مسلمانانِ ہند'' سے اخذ کیے گئے ہیں، ص ۲۳۱ تا ۲۳۴۔

تیسرا باب

عسکریت کی برتری اور نظم ونسق

پہلی فصل: مسلمانوں کی فوجی برتری

جہد وعمل کے میدان میں کسی فرد یا گروہ کی کامیابی یا ناکامی کے عوامل دو ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ روحانی اور مادّی۔ اگر یہ اندازہ کرنا منظور ہو کہ کروڑوں انسانوں کا یہ ملک یعنی ہندوستان اپنی دولت ووسعت کے باوجود چند ہزار یا ایک آدھ لاکھ مسلمانوں کے مقابلے میں اتنا عاجز کیوں ہوگیا اور صدہا میل سے سربفلک پہاڑوں، گنجان جنگلوں اور کفِ دست ریگستانوں صحراؤں کو طے کرکے آنے والے پردیسیوں نے اس اجنبی ملک میں آکر ہر میدان میں فتح مبین کیوں حاصل کی؟ تو اس کے لیے ہندیوں کی ناکامی اور مسلمانوں کی کامیابی کے روحانی و مادی عوامل کا جائزہ لینا ضروری ہوگا۔

ہندوستان کا اختلاف مسلمانوں کا اتحاد:

جس زمانے میں مسلمان ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، ہندوستان بے شمار راجپوت ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ جو آپس میں ہمیشہ مصروف پیکار رہتی تھیں۔ اور پوری قوم ایک دوسرے پر اعتماد یا مقاصد کے لیے اتحاد کی اہلیت سے محروم ہوچکی تھی۔ ذات پات اور نسل وقوم کے تنوع کے علاوہ مذہبی دنیا میں بھی طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اور پشاور سے لے کر راس کماری تک بیسیوں مذاہب باہم مناظرات میں اور اپنے اپنے عقائد کی تبلیغ واشاعت میں مصروف تھے۔ غرض ہندوستان مذہب، قوم، نسل، معاشرت، سیاست کی گوناگوں تقسیمات کا شکار ہورہا تھا۔ ان کے مقابلے میں مسلمان جو باہر سے آئے، نسلوں اور قوموں کے تنوع کے باوجود بُنیانِ مرصوص کا حکم رکھتے تھے۔ اگر ان کے تفصیلی عقائد میں کسی قدر اختلاف بھی تھا تو اساسی طور پر وہ

سب کے سب خدائے واحد کے پرستار اور ایک ہی ہادی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو تھے۔ ان کا مذہب اوہام پرستی، ضعیف الاعتقادی اور ذات پات کی تفریق سے بالکل پاک تھا۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ اور اس مقصد مقدس کی تکمیل کے لیے اپنی جانیں دے دینے کا ذوق شوق ان کی زندگیوں میں تازگی اور ان کے ولولوں میں حرارت پیدا کیے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے کہ روحانی اعتبار سے وہ ہندوؤں کے مقابلے میں واضح فوقیت رکھتے تھے اور یہی وہ فوقیت تھی جس کی بنا پر انھوں نے اس عظیم الشان ملک کی فوجی طاقت کو للکارا تھا۔ حالانکہ اس کی دولت اور قوت دنیا بھر میں ضرب المثل بن چکی تھی۔

جدید ترین سامان حرب

مادّی اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان نادار تھے کیونکہ کہاں ہندوستان سونے کی کان اور کہاں پہاڑوں کے بے سروسامان ترک اور افغان۔ ہندوؤں کی فوجوں کے لیے سامان رسد اور بھیر و بنگاہ کا انتظام بے حد آسان تھا۔ کیونکہ وہ اس ملک کے مالک تھے۔ اس کے تمام ذرائع و وسائل ہر وقت ان کی خدمت کے لیے مہیا تھے اور کروڑوں روپیہ ان کے پاس تھا۔ ان کے مقابلے میں مسلمان فوجیں کتنا سامان، کس قدر رسد، اور کتنی مقدار میں اسلحہ، اور کتنا روپیہ اپنے ساتھ لاسکتی تھیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ اموی اور عباسی خلافتیں دنیا کی بلند پایہ حکومتوں میں شامل ہونے کی وجہ سے اس زمانے کے جدید جنگی سازوسامان مہیا رکھتی تھیں۔ اور ان سے افغانوں اور ترکوں نے بھی سبق حاصل کیا تھا۔ اور ان کے مقابلے میں ہندو اپنے ملک کی حدود کے اندر کنوئیں کے مینڈک بنے ہوئے صرف تیر و شمشیر، نیزوں اور بھالوں اور زیادہ سے زیادہ ہاتھیوں پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم سے لے کر بابر تک سب کی فوجوں کے ساتھ منجنیقیں بھی تھیں، عرادے بھی تھے، دبابے بھی تھے، روغن نفت کے گولے بھی تھے، آتشیں تیر بھی تھے بلکہ بابر کے ساتھ تو توپ خانہ بھی تھا۔ اور بندوق باز مجاہدین بھی تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی جنگی تکنیک بھی بے شمار میدانوں کی مجرب اور آزمودہ تھی۔ اور ان تمام جدید خصوصیات سے ہندو بالکل محروم تھے۔ راجپوتوں کی جرأت و شجاعت مسلم سہی لیکن اس پر قدامت اور بربریت کا رنگ غالب تھا۔ مسلمانوں کی تازہ دم قوت کا مقابلہ ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ذیل میں ہم ان جنگوں کی بعض خصوصیات واضح کرنا چاہتے ہیں جن میں مسلمانوں

نے اپنی قلت اور ہندوؤں کی کثرتِ تعداد کے باوجود فتح وظفر کے پھریرے اڑائے۔

دیبل کی لڑائی:

یہ معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے ساتھ صرف بارہ ہزار مجاہدین تھے جن میں سے چھ ہزار شامی گھڑ سوار اور چھ ہزار عراقی شتر سوار تھے۔ جب وہ دیبل پہنچا تو سندھیوں کی پوری قوت اس کے مقابلے کے لیے موجود تھی۔ محمد بن قاسم کے آدمیوں نے شہر کے پاس خندقیں کھودیں۔ اور ان کے دفاع کے لیے نیزہ بازوں کے دستے متعین کیے جو اپنے اپنے جھنڈے اٹھائے اپنے اپنے مقام پر متمکن ہوگئے۔ چونکہ سندھیوں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ دیبل کے مندر کا دیوتا ان حملہ آوروں کو تہس نہس کردے گا اس لیے محمد بن قاسم نے اپنی مشہور منجنیق نصب کرائی۔ جس کو "عروسک" کہتے تھے۔ اور جس کو کھینچنے پر پانسو آدمی مقرر تھے۔ منجنیق استعمال کرنے والے نے دیبل کے مندر کے جھنڈے کو تاکا۔ اور اس پر منجنیق سے ایسا پتھر مارا کہ جھنڈا ٹوٹ کر گر پڑا بلکہ مندر کے کلس کو بھی نقصان پہنچا۔ یہ دیکھ کر دیبل کے عام باشندوں پر ہیبت چھا گئی۔ اور سندھی فوج نے باہر نکل کر عربوں کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ لیکن جب روحانی اعتبار سے شکست مکمل ہوچکی ہو اور حوصلے جواب دے چکے ہوں تو مقابلہ فائدہ نہیں دیتا۔ چنانچہ چند گھنٹے میں سندھیوں نے شکستِ فاش کھائی اور محمد بن قاسم نے دیبل پر قبضہ کرلیا۔

داہر سے جنگ:

پھر جب اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دریائے سندھ کو عبور کر کے داہر سے فیصلہ کن جنگ کی جائے تو ہندوؤں کو یقین تھا کہ عرب دریا کو عبور نہ کرسکیں گے۔ اور اگر بفرضِ محال وہ اس مشکل کو حل کرگئے تو لڑائی میں دریا ان کی پشت پر ہوگا اور وہ شکست کے بعد بھاگ کر کسی طرف نہ جاسکیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ سندھ جیسے دریا کو عبور کرنا آسان کام نہ تھا لیکن محمد بن قاسم کو تجویز سوجھ گئی اس نے بہت سی کشتیاں جمع کرائیں پھر انہیں لمبان میں ایک دوسری کے ساتھ رسّوں سے بندھوایا۔ جب دیکھا کہ کشتیوں کا یہ زنجیرہ دریا کے پاٹ کے برابر ہوگیا ہے تو اس کا ایک سرا مغربی کنارے پر خوب مضبوطی سے بندھوا دیا اور کشتیوں میں بڑے ماہر تیر اندازوں کو بٹھا کر پُل کے دوسرے سرے کو دریا میں دھکیل دیا۔ جب یہ زنجیرہ دریا کی رَو کے زور سے بڑھا تو اس کا دوسرا سرا مشرقی کنارے پر جالگا۔ آدمیوں نے فی الفور اُتر کر اُس سرے کو بھی

کنارے کے ساتھ باندھ دیا۔ آس پاس تیر انداز مورچے جما کر بیٹھ گئے اور عربوں کی پوری فوج کشتیوں کے اس پل سے گزر کر پار ہوگئی۔[۱]

اس وقت محمد بن قاسم کے پاس ایک تو اپنے بارہ ہزار عراقی و شامی تھے ان کے علاوہ ایک ہندو سردار بھی تین ہزار آدمی ساتھ لے کر آملا تھا۔ اس پندرہ ہزار کے مقابلے میں داہر کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہی اور ایک سو جنگی ہاتھی تھے اور اپنے ملک کے وسائل بھی قبضے میں تھے۔ البتہ محمد بن قاسم کے لشکر میں نو سو نفت انداز ضرور تھے۔ جو آتش ریز تیر پھینک کر آگ لگا سکتے تھے۔ بہت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر جب داہر نے اپنا ہاتھی عرب لشکر کی طرف بڑھایا تو ایک نفت انداز نے اس کی ہودے پر تاک کر ایسا تیر مارا کہ ہودے میں آگ لگ گئی ہاتھی بھاگ کر پاس کی جھیل میں گھس گیا۔ داہر نے ہاتھی سے اُتر کر لڑنا شروع کیا اور مارا گیا۔ اس کی فوج ہزاروں نعشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور سندھ عربوں کے زیر نگیں ہوگیا۔

جنگ لمغان:

سبکتگین اور محمود نے ہندوستان سے جتنی لڑائیاں لڑیں ان سب میں فتح پائی۔ اور عمر بھر کبھی شکست کا منہ نہ دیکھا۔ لطف یہ ہے کہ ان تمام جنگوں میں مسلمانوں کی جمعیت ہندوؤں کے مقابلے میں بے حقیقت ہوتی تھی۔ مثلاً جنگ لمغان میں جہاں سبکتگین کا مقابلہ کرنے کے لیے جے پال ہندوستان بھر کے راجپوت راجاؤں کی متحدہ فوج لے کر آیا تھا، سبکتگین کی فوج ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اور جے پال کے ساتھ تین لاکھ جرار لشکر اور بے شمار جنگی ہاتھی تھے۔[۲] جب سبکتگین نے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر جے پال کے لشکر کا معائنہ کیا اور اس کی کثرت کو دیکھا تو اپنے دل کو قوی کر کے یہ تصور کیا کہ باز کو کلنگوں کی کثرت اور قصاب کو گوسفندوں کی کثرت سے خوف نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا مجھے بھی ہندوؤں کی کثرت سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہنگامۂ حرب و ضرب برپا ہوا تو مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔ اور جے پال کا لشکر تتر بتر ہو کر بھاگ گیا۔

جنگِ پشاور:

پھر جب سبکتگین کے انتقال کے بعد جے پال نے پھر عزم جنگ کر کے پشاور کے پاس ڈیرے ڈالے۔ اور ادھر سے محمود غزنوی بھی وہاں پہنچا تو فرشتہ کا بیان ہے کہ اس وقت جے پال

کے ساتھ بارہ ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے تھے۔ نظام الدین ہروی نے ''طبقات'' میں سواروں کی تعداد دس ہزار بتائی ہے اور پیادوں کے لیے لفظ ''بسیار'' استعمال کیا ہے۔ روسی میجر جنرل سیولوف نے اپنی کتاب میں جے پال کے پیادوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار بتائی ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں متعدد مؤرخین کے بیانات کا موازنہ کرنے کے بعد یہ رائے دیتے ہیں کہ جے پال کے ساتھ اس جنگ میں جو جمعیت تھی وہ بیالیس ہزار سپاہیوں اور تین سو ہاتھیوں سے ہرگز کم نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں محمود کی فوج کو سب مؤرخین یک زبان ہوکر صرف دس ہزار بتاتے ہیں۔ جن میں سوار اور پیادے سب شامل تھے۔ تعداد کے اس واضح تفاوت کے باوجود محمود پر کوئی گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی۔ لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جے پال کی فوج پندرہ ہزار نعشیں چھوڑ کر بھاگی۔ اور جے پال اور اس کے پندرہ بڑے بڑے سردار محمودی فوج کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔

دُوسری جنگِ پشاور:

اس کے بعد جب انند پال نے غدّاری کی۔ اور داؤد قرمطی کے ساتھ سازباز بھی کرلی۔ تو اسے یقین ہوگیا تھا کہ محمود ضرور مجھ سے انتقام لینے کے لیے پنجاب پر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ اس نے عزم کرلیا کہ بطور پیش بندی ایسی تیاری کی جائے کہ سارا ہندوستان محمود غزنوی کی قوت کو ختم کردے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان بھر کے چھوٹے بڑے راجاؤں کے پاس قاصد بھیجے۔ اور برہمنوں کی مدد سے ملک بھر میں جنگ کے لیے اس قدر جوش وخروش پیدا کردیا کہ غریب عورتوں نے چرخے کات کات کر بھی جو پیسہ پیدا کیا وہ بھی سرمایۂ جنگ میں دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بہت بڑا لشکر فراہم ہوگیا۔ جس کے متعلق مؤرخین کا بیان یہ ہے کہ اس سے قبل ہندوستان کی اتنی بڑی فوجی جمعیت کسی میدان میں فراہم نہ ہوئی تھی۔ یعنی ہندو لشکر کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچ گئی۔ جس کے ساتھ سینکڑوں ہاتھی بھی تھے۔ بلاشبہ محمود کو اس جمِ غفیر سے اپنی قلیل فوج کا مقابلہ کرکے پریشانی ہوئی۔ لیکن اس نے عزم کرلیا کہ فتح ہو یا موت پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں لشکر چالیس روز تک ایک دوسرے کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ محمودی لشکر تو اس لیے حملہ کرنے میں متامّل سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کی قوت کم تھی۔ لیکن ہندو محض اس لیے رُکے رہے کہ خدا جانے کیا صورت پیش آئے۔ اس لیے مزید فوجوں کا انتظار کرلینا چاہیے۔ آخر چالیس دن کے بعد محمود نے سبقت کی اور ایک ہزار تیراندازوں کو حکم دیا کہ ہندو فوج

پر تیر اندازی کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے آئیں تا آنکہ ہندو محمودی خندقوں کے پاس آ جائیں۔ اور مسلمان فوج زیادہ کامیابی سے ان کا مقابلہ کر سکے۔ تفصیل کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ حاصلِ کلام یہ کہ انند پال میدان جنگ سے منہ موڑ کر بھاگ گیا۔ ہندوؤں کی متحدہ فوج چاروں طرف منتشر ہوگئی۔ اس شکست فاش سے ہندوستان بھر کے راجپوت راجاؤں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔

کالنجر کی لڑائی:

کالنجر کی لڑائی کے متعلق بھی مؤرخین کا بیان یہ ہے کہ سلطان محمود کے ہمراہ بہت قلیل فوج تھی جو دو منزلہ اور سہ منزلہ یلغار میں مشکل ہی سے کام دے سکتی تھی۔ لیکن نندا چھتیس ہزار سوار پینتالیس ہزار پیادے اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی لیے کھڑا تھا۔ محمود نے جب غنیم کی یہ جمعیت دیکھی تو قلیل فوج ساتھ لانے پر پشیمان ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعا مانگی۔ رات لشکر نے آرام کیا۔ صبح اٹھ کر سنا کہ رات نندا کے دل پر جنودِ حق کا کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ سب ساز و سامان وہیں چھوڑ کر اور اپنی جان بچا کر صبح ہونے سے پہلے ہی فرار ہوگیا۔ سلطان کی فوج کو دوسرے مالِ غنیمت کے علاوہ پانسو اسّی جنگی ہاتھی بھی ہاتھ آئے۔

جنگ تراوڑی:

تراوڑی کی دوسری جنگ کے موقع پر بھی پرتھی راج نے محمد غوری کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں سے استمداد کی۔ چنانچہ فرشتہ کے قول کے مطابق ڈیڑھ سو راجا بذاتِ خود اپنے لشکروں سمیت میدان جنگ میں موجود تھے۔ دونوں لشکر تراوڑی کے میدان میں ایک دوسرے کے درمیان چند کوس کا فاصلہ اور سرسوتی ندی کو حائل رکھ کر صف آراء ہوئے۔ طبقاتِ ناصری کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی فوج کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ منتخب التواریخ نے بتایا ہے کہ ان میں اسّی ہزار پیادے اور چالیس ہزار سوار تھے۔ پرتھی راج کے ساتھ جو لشکر تھا۔ اس کی تعداد تاریخ فرشتہ اور دوسری تواریخ میں ''تین لاکھ سوار اور تین ہزار سے زیادہ جنگی ہاتھی'' لکھی ہے۔ اور پیادوں کی تعداد کے متعلق ''لاتعداد'' اور ''بے قیاس'' کے الفاظ لکھے ہیں۔

مسلمانوں کا اسلوبِ جنگ:

اس سے قبل بھی سبکتگین اور محمود کا انداز پیکار یہی رہا ہے کہ وہ میمنہ اور میسرہ کو ہندوؤں

پر حملہ کرنے کا حکم دیتے تھے اور خود دس بارہ ہزار تازہ دم فوج کو ساتھ لیے میدانِ جنگ سے دور منتظر رہتے تھے۔ جب ہندو لشکر لڑ لڑ کر تھک جاتا تھا تو دفعتاً اس محفوظ فوج کو لے کر تھکے ہندو سپاہیوں پر بجلی کی طرح جا پڑتے تھے اور یہی ہلّہ فیصلہ کن ثابت ہوتا تھا۔ یہی کیفیت تراوڑی کی دوسری جنگ میں پیش آئی۔ محمد غوری نے رات کے وقت اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصے پر ایک ایک تجربہ کار سردار کو مقرر کیا۔ اور حکم دیا کہ پہلے ایک سردار حملہ کرے اور دوسرے اپنی اپنی جگہ چپ چاپ تماشا دیکھتے رہیں۔ جب لڑائی کا جوش و خروش کمال کو پہنچ جائے تو جو سردار مصروف ہو وہ اپنی فوج کے ساتھ اس طرح پیچھے ہٹنا شروع کر دے کہ دشمن فوج کو اپنی فتح کا یقین ہو جائے اور وہ زیادہ دلیر ہو کر پیچھے ہٹنے والوں کا پیچھا کرے۔ اسی حالت میں دوسرا سردار اپنی تازہ دم فوج ساتھ لے کر حملہ کرے تاکہ ہندو اس کی طرف متوجہ ہوں۔ وہ بھی پہلے سردار ہی کی طرح کچھ دیر لڑنے کے بعد پیچھے ہٹنا شروع کر دے۔ اس طرح چاروں سردار باری باری لڑیں۔ اور دوسرے رفیقوں کو ستانے کا موقع دے دیں۔ بارہ ہزار منتخب شہسواروں کو الگ کر کے سلطان نے اپنے زیر کمان رکھا۔ جب یہ چاروں سردار لڑ چکے اور ہندو لشکر ادھر ادھر منتشر ہونے لگا تو سلطان اپنے بارہ ہزار سواروں کو لے کر ہندو لشکر کے قلب پر حملہ آور ہوا۔ جہاں پرتھی راج اور اس کے ڈیڑھ سو راجا اور بے شمار چنے ہوئے سورما جمع تھے۔ یہ لوگ اس ناگہانی آفت سے اس قدر گھبرائے کہ سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ پرتھی راج بھی بھاگا۔ لیکن تعاقب کرنے والوں نے اس کی شمعِ حیات کو گل کر دیا۔

فتح بنگال:

ہندوستان کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی اس قدر ہیبت چھا گئی تھی کہ محض ان کے آ جانے کی خبر ہی سے غنیم راہِ فرار اختیار کر لیتا تھا۔ جب محمد بختیار خلجی نے ملک بہار کے سب سے زیادہ مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعے پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ صرف دو سو سپاہی تھے۔ فتح بہار کے بعد محمد بختیار خلجی بنگال کی طرف متوجہ ہوا۔ جس کا صدر مقام اس زمانے میں ندیا تھا۔ جب وہ ندیا کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی فوج کو تو پیچھے چھوڑا۔ اور صرف اٹھارہ آدمیوں کے ساتھ شہر ندیا میں داخل ہوا۔ جب یہ لوگ راجا لکشمن سین کی محل سرائے کے دروازے پر پہنچے اور دربانوں نے مزاحمت کی تو ان کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ لکشمن سین اس وقت کھانا کھانے بیٹھا تھا۔ شور غل کی

آواز سن کر اسے معلوم ہوا کہ مسلمان آ گئے۔ یہ سنتے ہی راجا حواس باختہ ہو کر ننگے پاؤں سرنگ کے راستے بھاگا۔ اور اوڑیسہ پہنچ کر وہاں کے ایک مندر میں پناہ گزیں ہوا۔ بس اس واقعہ کے بعد بنگال پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور یہ قبضہ غالباً پوری تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔

پانی پت کی پہلی لڑائی:

اگرچہ افغان اس سے پہلے متعدد میدانوں میں دادِ شجاعت دے چکے تھے اور ہندوؤں کے بڑے بڑے لشکروں کو نیچا دکھا چکے تھے۔ لیکن دو تین صدیوں تک ہندوستان میں رہ کر ایک تو ان میں وہ پہلی سی بات نہ رہی تھی۔ دوسرے وہ جدید ترین آلاتِ جنگ بھی مہیا نہ کر سکے تھے۔ چنانچہ وہ مغل فوجوں کا کامیاب مقابلہ نہ کر سکے۔

جب بابر کو معلوم ہوا کہ افغانوں کے لشکر کی تعداد مغلوں کی فوج سے بہت زیادہ ہے تو اس نے سمجھ لیا کہ ان کو صرف اعلیٰ درجے کے قواعد دان رسالے اور نئے توپ خانے ہی کی مدد سے شکست دی جا سکتی ہے۔ بابر کے توپ خانے کے بڑے جرنیل دو تھے۔ استاد علی اور مصطفیٰ۔ بابر نے ان کے مشورے سے سات سو توپ بردار چھکڑوں کو چمڑے کے مضبوط تسموں سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھا اور ہر دو چھکڑوں کے درمیان ''تودے'' تیار کیے تاکہ اس مضبوط دیوار کی وجہ سے توپچی اور گولنداز محفوظ رہیں۔ یہ استحکام محاذِ جنگ کے اس حصے میں کیا گیا جس پر استاد علی اور مصطفیٰ مامور ہونے والے تھے۔[۳]

پانی پت پہنچ کر توپ خانہ قائم کر دیا گیا۔ دائیں ہاتھ پانی پت کا قصبہ تھا اور بائیں طرف خندقیں کھود کر اور درختوں کو کاٹ کاٹ کر ان کے تنوں اور شاخوں کو ناقابل نفوذ دیوار بنا دیا گیا۔ غرض بابر اور اس کے جرنیلوں نے اس کھلے میدان میں اپنے لیے ایک قلعہ قائم کر لیا تھا۔ جہاں سے وہ دشمن پر جانفرسا حملے کر سکتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ ابراہیم لودی اگر کنجوسی سے کام نہ لیتا تو بہت ہی بڑا لشکر فراہم کر سکتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں ''بھاڑے'' کے سپاہی آسانی سے مل سکتے ہیں۔ افغانوں کا لشکر کمزور تھا۔ اس لیے کہ اس کے سپاہی زیادہ تر ''بھاڑے'' کے تھے۔ علاوہ بریں ابراہیم خود ناتجربہ کار تھا۔ اور وہ عاقبت اندیشی کے بغیر مصروف جنگ ہو گیا تھا۔

آٹھ دن تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے پڑے رہے۔ اور کسی نے سبقت نہ کی۔ آخر بابر کا جامِ شکیب لبریز ہو گیا۔ اس نے میمنہ، میسرہ اور قلب کو قائم کیا اور دائیں بائیں

دور دور منگولوں کے دستے متعین کیے۔ تاکہ "تلوغمہ" کے اسلوب سے حملہ کریں۔ یہ منگولوں کی ایک مشہور جنگی چال تھی۔ جو ہمیشہ دشمن کے لیے مہلک ثابت ہوتی تھی۔ غرض پوری جنگ بابر کے پروگرام کے مطابق لڑی گئی۔ توپ خانے نے لودی کی فوج پر موت کا مینہ برسا دیا۔ اور تیر و شمشیر تو اپنا کام کر ہی رہے تھے۔ چند گھنٹوں میں ابراہیم لودی مارا گیا اور ہندوستان میں اقبال بابری کے جھنڈے گڑ گئے۔

کنواہہ کی جنگ:

اب اس جنگ کا حال سنو جو کنواہہ کے مقام پر ہوئی اور جس میں راجپوتوں کی فوجی طاقت پر وہ کاری ضرب لگائی گئی جس سے اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ رانا سانگا کے جھنڈے تلے بڑے بڑے راجپوت راجا ہزاروں کے لشکر لے کر جمع ہوئے۔ جن کی مجموعی تعداد بابر کے بیان کے مطابق دو لاکھ ایک ہزار تھی۔ صاحب طبقاتِ اکبری نے اصل لڑنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سوار بتائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی پیادہ فوج ہوگی۔ بابر کی فوج اس کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔ اس نے حسب معمول میمنہ، میسرہ اور قلب کو قائم کیا۔ میمنہ ہمایوں کے سپرد ہوا۔ اور میسرہ پر سید مہدی خواجہ مامور کیا گیا۔ قلب کی سرداری خود بابر نے اپنے ہاتھ میں لی۔ اور دائیں بائیں تلوغمہ کے لشکر قائم کیے تاکہ عین لڑائی کی شدت کے وقت غنیم کے پہلو اور عقب پر حملہ کریں۔ توپچی اور بندوق باز اسی طریقے سے چھکڑوں اور رمورچوں کے زنجیرے کے پیچھے رکھے گئے اور استاد علی کو حکم دیا گیا کہ اپنے پورے تباہ کن ساز و سامان کے ساتھ قلب کے آگے متمکن رہے۔

صبح ساڑھے نو بجے جنگ شروع ہوئی اور شام کے وقت تک راجپوتوں کے متحدہ لشکر کی شکست مکمل ہوچکی تھی۔ بڑے بڑے راجا ہلاک ہوگئے تھے اور رانا سانگا بھاگ کر کسی پہاڑی قلعے میں دبک چکا تھا۔

ان تفصیلات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جن لوگوں نے ہندوستان کی فوجی طاقت کو تہس نہس کردیا۔ وہ وحشی اور لٹیرے نہ تھے۔ بلکہ نہایت بلند حوصلہ، شجاع، قواعد دان، اعلیٰ درجے کے ساز و سامان رکھنے والے اور جنگی سائنس کے ماہر واقع ہوئے تھے۔ اور ہندوستانیوں میں یہ خوبیاں اس درجے کی نہ تھیں کہ وہ میدانِ جنگ میں ان سے عہدہ برآ ہوسکتے۔ ترک، افغان اور

مغل مسلمان تھے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے جوش نے ان میں قوتِ ایمانی کی بجلیاں بھر دی تھیں۔ اور دنیا کی کوئی طاقت ان کو مغلوب نہ کرسکتی تھی۔ یہی وہ فوجی برتری تھی جس نے مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک یہ توفیق بخشی کہ وہ کروڑوں کی آبادی کے ملک پر نہایت کامیاب حکمرانی کرتے رہے۔ لیکن جونہی ضعف ایمان نے ان کے حوصلے پست کردیے۔ اور ان کی فوجی طاقت بھی اغیار کے مقابلے میں حقیر ہوگئی تو اقتدار ان کے قبضے سے نکل گیا۔ اور وہ دوروں کے محکوم بن گئے۔ اور اگر آج بھی مسلمان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیرو اور فرمان بردار بن جائیں تو ان کی منتشر قوتوں میں وہی ولولہ اور جوش نئے سرے سے اُبھر سکتا ہے۔

دوسری فصل: سلاطین و پادشاہانِ ہند کی حیثیت
خلافتِ اسلامی سے وابستگی

ہندوستان پر سب سے پہلا حملہ محمد بن قاسم نے کیا جو دمشق کے اُموی خلیفہ کی طرف سے اس کام پر مامور کیا گیا تھا۔ فتح سندھ کے بعد اس علاقے پر جو حکومت قائم ہوئی وہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت تھی۔ سندھ کے گورنر دربارِ خلافت ہی کی طرف سے مامور ہوکر آتے تھے اور انہی کے سامنے جواب دِہ ہوتے تھے۔

تین سو سال بعد جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کا رُخ کیا تو بنو امیّہ کی خلافت مدّتوں سے ختم ہوچکی تھی۔ اور خلافتِ آلِ عباس کا مرکز بغداد تھا۔ خلیفہ قادر باللہ نے محمود کی اسلامی حمیت و شجاعت سے متاثر ہوکر اُسے خلعت اور خطاب سے سرفراز کیا۔ اگرچہ اس وقت تک مرکزِ خلافت کمزور ہوچکا تھا اور اس کے مختلف صوبوں کے حکمران عملاً خودمختار تھے۔ لیکن خلیفہ کی شرعی حیثیت تمام سُنّی مسلمانوں کے نزدیک مسلّم تھی۔ اور خودمختار سلطان بھی رسماً خلیفہ کے حضور اظہار اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے۔ محمود غزنوی نے بھی اپنے لیے سلطان کا لقب تجویز کیا۔ لیکن خلیفہ کی بیعت و اطاعت کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ اس زمانے کے اکابرِ علم کی رائے یہ تھی کہ جو علاقے مرکز خلافت سے دور واقع ہوں اور ان پر آسانی سے حکومت نہ کی جاسکے۔ ان کے حکمران خلیفۂ اسلام کے نائب ہوتے ہیں۔[۴] یہاں تک کہ پندرھویں صدی کے وسط میں بھی خلیل بن شاہین الظاہری نے یہی لکھا کہ مشرق و مغرب میں کوئی حکمران ''سلطان'' کا لقب اختیار نہیں کرسکتا جب تک اس کے اور خلیفۂ اسلام کے درمیان قرار دادِ اطاعت نہ ہوجائے۔[۵]

چنانچہ جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کا الحاق اپنی سلطنت سے کرلیا تو چونکہ وہ قانونی طور پر نائب خلیفہ تھا۔ اس لیے پنجاب خلافتِ اسلامیہ کا ایک حصہ قرار پایا۔ محمود کے جانشین بھی برابر خلیفۂ عباسی کی خدمت میں اظہارِ اطاعت کرتے رہے۔ پھر جب محمد غوری نے پنجاب کو فتح کیا تو غیاث الدین اور محمد غوری کے سکوں پر برابر خلیفہ کا نام کندہ ہوتا تھا۔ غیاث الدین کو خلیفہ المستضی بامراللہ اور الناصر الدین اللہ کی طرف سے بارہا خلعت عطا ہوئے اور اس کو ''ناصر المؤمنین'' لکھا گیا۔[٦]

جب دہلی میں قطب الدین ایبک حکمران ہوا تو اس کو محمد غوری کے بھتیجے غیاث الدین محمود سے سندِ حکومت ملی۔ لیکن سمجھا یہی گیا کہ وہ خلیفۂ اسلام کا مطیع و منقاد ہے۔ ملتان میں ملاحدہ کے استیصال کی وجہ سے (جو حقیقت میں خلافتِ اسلامی کے دشمن تھے) محمد غوری اور قطب الدین ایبک خلافت کے منظورِ نظر ہو چکے تھے۔ دہلی کا پہلا سلطان جس نے باضابطہ خلیفۂ اسلام سے خلعتِ تسلیم پایا شمس الدین التمش تھا۔ جس کے سکوں پر پہلے دن ہی سے خلیفہ الناصر الدین اللہ کا نام کندہ تھا۔ ۶۲۶ھ میں خلیفہ ابوجعفر منصور المستنصر باللہ کے وکلا دہلی پہنچے۔ اور سلطان، ان کے وزراء بلکہ غلاموں تک کے لیے خلعت لائے۔ اس موقع پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ شہر آراستہ کیا گیا۔ اور وکلا کی بے حد آؤ بھگت کی گئی۔[۷] علاء الدین مسعود شاہ نے ۶۴۱ھ میں آخری خلیفہ عباسی مستعصم کا نام اپنے سکے پر کندہ کرایا۔

جب ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے مستعصم اور اس کی خلافت کو ختم کر دیا۔ اور قلمروِ خلافت کے اکثر حصے منگولوں کے قبضے میں چلے گئے تو بڑی مشکل پیش آئی۔ لیکن سلاطین دہلی نے مستعصم کی وفات کے بعد بھی اسی کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری رکھا۔ حالانکہ یہ حادثہ سب کو معلوم ہو چکا تھا اور ''طبقاتِ ناصری'' میں جو سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں لکھی گئی، زوالِ خلافتِ بغداد کی پوری کیفیت درج ہے۔[۸] مستعصم کا نام اس کی وفات سے چالیس سال بعد تک دہلی کے سکوں پر موجود رہا۔ یہاں تک کہ جلال الدین فیروز خلجی کے انتقال کے بعد رکن الدین ابراہیم نے اس کو محو کر کے اپنے آپ کو ''ناصر امیر المؤمنین'' لکھا۔ علاء الدین خلجی نے اس لقب پر ''یمین الخلافہ'' کا اضافہ کر دیا۔ یعنی اگرچہ خلیفہ باقی نہ رہا تھا لیکن یہ سلاطین بدستور مددگارِ خلافت کہلاتے رہے۔ جلال الدین فیروز خلجی کے زمانے میں ایک سازش ہوئی کہ اب چونکہ خلافتِ عباسیہ باقی نہ رہی، اس لیے ایک بزرگ سیدی مولی کو خلیفہ بنالیا جائے۔ لیکن جلال الدین نے اس سازش کو سختی

سے دبا دیا۔ اور سازشیوں اور ان کے نامزد خلیفہ کو قتل کر دیا۔[۹] بعض لوگوں نے سلطان علاء الدین خلجی کو خلیفہ بننے کی ترغیب بھی دی لیکن وہ نہ مانا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا اور یہ لقب اختیار کیا۔ ''الامام الہمام خلیفہ رب الکونین السلطان ابن السلطان الواثق باللہ امیر المومنین قطب الدنیا والدین ابوالمظفر مبارک شاہ''۔ لیکن اس کے بعد ناصر الدین خسرو اور پھر غیاث الدین تغلق نے وہی پرانا لقب ناصر امیر المومنین ہی کافی سمجھا۔ اس زمانے میں امرا و علما عام طور پر خلیفہ اور خلافت کے مسئلے پر بحث کیا کرتے تھے۔ اور وہ گروہ غالب رہتا تھا جو حقیقت پسند تھا اور یہ رائے دیتا تھا کہ جب خلیفہ اور خلافت باقی ہی نہیں اور کوئی امیر المومنین موجود ہی نہیں تو اس کا ناصر بننا کیا معنی؟ محمد تغلق اس رائے کا قائل تھا لیکن کوئی نئی راہ اختیار کرنے میں تامل کر رہا تھا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ عباسی خلافت مصر میں منتقل ہوگئی ہے اور پناہ گزین المستکفی باللہ امیر المومنین تسلیم کیا جاچکا ہے۔ چنانچہ اس نے اس نئے خلیفہ کے حضور میں اظہارِ اطاعت کیا۔ کچھ مدت بعد خلیفہ الحاکم ثانی کی طرف سے حاجی سعید صرصری علم سندِ حکومت اور خلعت لے کر پہنچ گیا۔ جس کا بڑی شان سے استقبال کیا گیا۔ اور بے شمار روپیہ خیرات کیا گیا۔ محمد تغلق کو تین دفعہ علَم اور خلعت پہنچے۔ اس نے ہر دفعہ نہایت عجز و انکسار سے خلیفہ کی بخشش کو قبول کیا اور جواب میں بیش بہا تحائف بھیجے۔ دربار کے شاعر بدر چاچ نے قصیدے لکھے جن میں محمد تغلق کو آسمان پر چڑھانے کے بجائے خلیفہ کی تعریفیں کیں۔ مثلاً

امامِ حق کہ شد اورا محمد تغلق
بدل غلام دبہ تن چاکر و بجاں مولا[۱۰]

فیروز شاہ کو بھی خلیفہ کی طرف سے خلعت اور علَم وصول ہوئے اور اس نے انتہائی عجز سے ان کو قبول کیا۔[۱۱] اس کے سکّوں پر المستکفی باللہ کے لڑکوں یعنی ابوالعباس احمد اور ابوالفتح المعتضد باللہ کے نام کندہ ہیں۔ اسی سلطان کے زمانے میں دکن کی بہمنی حکومت کو بھی قاہرہ سے شرف قبول حاصل ہوا۔

خاندان سادات کا سلطان خضر خاں تیمور کے ماتحت تھا اور اپنے آپ کو تاجدار نہ کہتا تھا۔ پھر شاہ رخ نے اس کو اجازت دے دی کہ خطبہ میں اپنا نام شامل کر لے۔ خضر خاں کے بیٹے مبارک شاہ اور اس کے جانشینوں نے صرف ''نائب امیر المومنین'' کہلانے پر اکتفا کیا۔ یہی

کیفیت لودیوں کے زمانے میں جاری رہی۔ ۱۵۱۷ء میں ترکان آل عثمان نے خلافت عباسی کے نام نہاد وجود کو بھی ختم کردیا۔ اور سلطان ترکی خلیفہ بن گیا۔ لیکن خاندان تیموری نے ترکان آل عثمان کی خلافت کو کبھی قبول نہیں کیا۔

مغلوں سے قبل دہلی کے حکمران سلاطین کہلاتے تھے۔ لیکن بابر نے ''پادشاہ'' کا لقب اختیار کیا۔ گویا مغل بادشاہوں کے زمانے میں یہ تصور ختم ہوگیا کہ ہندوستان کی سلطنتِ اسلامی سیاسی اعتبار سے ایک ناقابلِ تقسیم دنیائے اسلام کا جزو ہے۔ ہمایوں کے فرار کے بعد سوریوں نے نام نہاد خلیفہ کا ذکر اپنے سکّوں پر کیا۔ لیکن مغلوں نے سکّہ و خطبہ میں اپنے سوا اور کسی امام یا خلیفہ یا سلطان کا نام لینا روا نہیں رکھا۔

اس میں شک نہیں کہ خلافتِ اسلامی کے مرکز اور خلیفہ اسلام کی ذات سے سلاطین کی یہ وابستگی محض شرعی و قانونی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ خلافت ہی اس قدر قوی رہ گئی تھی کہ وہ ان عقیدت مند سلاطین کے کاروبارِ حکومت میں مداخلت کرسکتی۔ نہ یہ سلاطین ہی اس امر کو روا رکھ سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں صرف بعض سلاطین ہی ایسے ہوں گے جو ذاتی حسن عقیدت کی وجہ سے ''جانشین پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم'' سے اظہارِ اطاعت کرتے ہوں۔ ورنہ اکثر تو محض علماء اور عامۃ المسلمین میں اپنی ہردلعزیزی کو برقرار رکھنے اور اپنی حکومت کو اسلامی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے یہ تدبیر اختیار کرتے تھے۔ مثلاً علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی آزاد خیالی اور بعض علماء سے ان کے اختلافات اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ وہ دینی حلقوں کے غیر محدود اقتدار کے روادار نہ تھے۔ لیکن لامحالہ انھیں بھی خلافت سے اظہارِ عقیدت کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ عوام ان سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ بہرحال مندرجہ بالا تفصیل سے یہ تو ثابت ہے کہ اتحادِ عالمِ اسلام کا جذبہ مسلمانوں میں ہمیشہ نہایت قوی رہا ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی شکل میں قیامِ خلافت کے ضرور قائل رہے ہیں۔ خواہ اس خلافت کو دنیوی طاقت حاصل ہو یا نہ ہو۔

سلاطین اور شریعتِ اسلامی:

خلافت سے اس نام نہاد وابستگی کے سوا اور کوئی ثبوت اس امر کا موجود نہیں کہ دہلی کے سلاطین اور پادشاہ کاملاً خودمختار نہ تھے۔ بلاشبہ قانونِ ملکی کی اساس شریعتِ اسلامی پر تھی اور کوئی حکمران شریعت کو پسِ پشت ڈال کر مقبولِ عام نہ رہ سکتا تھا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں

کہ بعض حکمرانوں نے بعض حالات میں شریعت کی خلاف ورزی کی۔ لیکن ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ وہ احکامِ شریعت کے آگے جھک گئے۔ محمد تغلق بعض آدمیوں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ علماء و فقہاء نے احکامِ شرع کے ماتحت اس کی مخالفت کی۔ لیکن جب اس کے دلائل و براہین سنے تو منطقی اعتبار سے قائل ہوگئے اور انھیں فتویٰ دینا پڑا۔[۱۲] یعنی محمد تغلق نے حاملانِ شریعت سے فتویٰ لیے بغیر اپنے حکم پر عمل نہیں ہونے دیا۔ سلطان علاء الدین خلجی نہایت اکھڑ قسم کا حکمران تھا۔ لیکن قاضی مغیث سے اس کا جو معاملہ ہوا اس کو تمام مورخین نے اہمیت دی ہے۔ جب سلطان نے رشوت خوار افسروں اور اہلکاروں کو وحشیانہ سزائیں دیں تو قاضی مغیث نے علی الاعلان کہہ دیا کہ یہ سزائیں شریعتِ حقہ کے خلاف ہیں۔ سلطان نے پوچھا کہ میں نے شہزادگی کے زمانے میں دیوگیر (دکن) کی فتح کے موقع پر جو مال غنیمت حاصل کیا تھا۔ آیا وہ میری ملکیت ہے یا بیت المال کی؟ قاضی نے جواب دیا چونکہ وہ مالِ غنیمت عساکر اسلامی کی مدد سے حاصل ہوا تھا۔ اس لیے وہ بیت المال کا ہے۔ اس کے بعد سلطان نے سوال کیا کہ بیت المال میں سلطان اور اس کے بچوں کا کیا حصہ ہے؟ اس کا جواب قاضی مغیث نے شریعتِ اسلامی کے مطابق تفصیل سے دیا۔ جس پر سلطان غیض و غضب سے آگ بگولا ہوگیا۔ لیکن قاضی نے کہا کہ میں اظہارِ حق سے باز نہیں رہ سکتا۔ آپ مجھے قید میں ڈال دیجیے یا قتل کر دیجیے میں تو قرآن و حدیث کے سوا اور کسی مصلحت کی بنا پر فتویٰ نہیں دے سکتا۔ سب کو یقین تھا کہ قاضی مغیث کے قتل کا حکم دیا جائے گا۔ لیکن جب دوسرے دن قاضی مغیث اپنے گھر والوں کو آخری الوداع کہہ کر دربار میں حاضر ہوا تو سلطان نے مرحمتِ خسروانہ سے کام لے کر قاضی کو خلعت اور انعام عطا کیا۔ چونکہ اصل جھگڑا سزاؤں کی شدت پر ہوا تھا۔ اس لیے سلطان نے قاضی سے کہا کہ ''میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہوں۔ میں بغاوت کے سدباب کے لیے جس میں ہزاروں جانیں تلف ہوجاتی ہیں، ایسے احکام صادر کرتا ہوں جو سلطنت کی بہتری اور عامۃ الناس کی بہبود کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ جب بعض لوگ توجہ اور احترام سے کام نہیں لیتے اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو میں انھیں مطیع و فرماں بردار بنانے کے لیے سختی کرتا ہوں۔ میں بعض افعال کے جواز یا عدم جواز کو نہیں جانتا۔ اور وہی کرتا ہوں جو سلطنت کی بھلائی کا تقاضا ہوتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ روزِ قیامت مجھ سے کیا سلوک کیا جائے گا۔''[۱۳]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علاء الدین خلجی اور علماء کے درمیان اختلاف محض تاویل و

توجیہہ کا تھا۔ خلجی شریعت کا منکر نہیں تھا۔ بلکہ یہ محسوس کرتا تھا کہ علما عملی سیاست سے بے بہرہ ہیں اور انتظامِ مملکت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ یہ وہ اختلاف ہے جو علمائے اسلام اور سلاطین اسلام کے درمیان ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو وضع قوانین میں بہت ہی کم اختیارات حاصل تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے شخصی اور مذہبی قانون میں وہ بالکل مداخلت نہ کرسکتے تھے۔ ہندوؤں کو بعض رسوم بعض مسلمان سلاطین کو بالکل پسند نہ تھیں۔ لیکن وہ ان میں مداخلت کی جرأت نہ کرسکتے تھے۔ شریعت کی کھلم کھلا بے احترامی یا خلاف ورزی ناقابل تصور تھی۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کی وفاداری ختم ہوجاتی تھی۔ جن کو حکم ہے کہ **لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق** چنانچہ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایسے حالات میں مسلمانوں نے حکمران کے خلاف بغاوت کردی۔ مثلاً ناصر الدین خسرو کے بعض پٹھوؤں نے اسلام کی توہین کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا تخت چھن گیا۔ [۱۴]

جب مغل بادشاہ اکبر نے اسلام کے خلاف رویہ اختیار کیا تو مشرق میں بڑے زور کی بغاوت پھوٹ پڑی اور شمال مغرب میں اس کے بھائی نے حملہ کردیا۔ سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔ آخر اکبر نے کچھ تالیفِ قلوب کے لیے اسلام سے وابستگی ظاہر کی۔ اور کچھ راجپوتوں اور ایرانیوں کی مدد سے بغاوت پر قابو پالیا۔ اس کے بعد جہانگیر کو باپ کی حکمتِ عملی ترک کرنی پڑی اور اسلام سے رابطہ استوار کرنا پڑا۔ اس نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو قید سے رہائی دے کر انتہائی عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ اور حضرت کی شرائط کو منظور کیا جو سب کی سب احکامِ اسلام کے احترام اور ان کی تعمیل کے مطالبہ پر مبنی تھیں۔

اقتدار کے ستون:

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا اقتدار جن ستونوں پر قائم تھا وہ یہ تھے:

۱۔ احترامِ شریعت جس سے مسلمان عوام مطمئن رہیں۔ اور علماء وفقراء کی تعظیم وتکریم جن سے عامۃ المسلمین کو عقیدت تھی۔

۲۔ ہندوؤں کے مذہب اور ان کے معاشری ادارات سے تعرض نہ کرنا۔

۳۔ امرا کی تنظیم اور ان کی مصافی اور غیر مصافی امداد پر اعتماد۔

۴۔ سلطنت کے وزراء، حکام اور اہلکاروں کا تعاون۔

۵۔ عوام (ہندو اور مسلمان) کی آسائش و بہبود کی تجاویز پر عمل کرنا۔

۶۔ فوج کو مطمئن رکھنا۔ تنخواہوں کے علاوہ اموالِ غنیمت سے حصہ دینا اور کارہائے نمایاں کا صلہ دینا۔

جو سلاطین تختِ سلطنت پر متمکن ہوتے تھے وہ محض وراثت کی وجہ سے حکمرانی کے حق دار نہ سمجھے جاتے تھے۔ بلاشبہ حکمرانی بعض خاندانوں میں محدود ہوتی تھی۔ لیکن اول یہ ضروری نہ تھا کہ باپ کی جگہ ضرور ہی بیٹا بیٹھے۔ دوم ہر سلطان کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ علماء، امراء اور دوسرے وجوہ الناس اس کی ذات پر متفق ہو جائیں۔ سب سے پہلے ان کی بیعت و اطاعت لازمی تھی۔ جب وہ کسی پر اتفاق کر لیتے تو اس کی سلطانی کا اعلان کر دیا جاتا۔ گویا انتخاب کا طریقہ کسی نہ کسی رنگ میں محفوظ تھا۔ معز الدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ اور ناصر الدین محمود کے انتخاب کا ذکر منہاج سراج میں موجود ہے۔[۱۵] عصامی نے شمس الدین کیومرث، شہاب الدین عمر اور قطب الدین مبارک شاہ کے انتخاب کا حال لکھا ہے۔[۱۶] اور تغلق نامہ میں غیاث الدین تغلق کے انتخاب کا ذکر ہے۔[۱۷] جلال الدین فیروز خلجی نے جنگ میں کامیابی حاصل کر کے تخت پر اپنا حق قائم کر لیا تھا۔ لیکن انتخاب کی ظاہری صورت پھر بھی ملحوظ رکھی گئی۔[۱۸]

خود مختار حکمرانی کے زمانے میں حکمرانوں کی حیثیت وہ تھی جو آج کل رئیسِ مملکت اور وزیر اعظم کے عہدوں کو متحد کر دینے سے رونما ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ حکمران مرکزی حکومت کے رئیس اعلیٰ ہوتے تھے۔ لہٰذا پوری مملکت کے نظم و نسق کی ذمہ داری انھی پر تھی۔ اور قصر سلطانی حکومت کا سب سے بڑا محکمہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سلطانوں اور بادشاہوں کو نظم مملکت پر بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ وہ وزیروں اور امیروں سے مشورے کرتے۔ انھیں احکام دیتے۔ بعض مقدمات کی سماعت کر کے خود ہی فیصلے صادر کرتے۔ نظم و نسق میں، علم و فضل میں، شعر و ادب میں اور عام وفاداری و جانسپاری میں جو لوگ امتیازِ خصوصی رکھتے تھے انھیں خلعت و خطاب اور انعام و اکرام سے سرفراز کرتے۔ غریبوں، حاجت مندوں اور مفید عام اداروں کی امداد کرتے۔ شاہی درباروں جلوسوں اور ضیافتوں میں رونق افروز ہوتے۔ اور ان میں شان و شوکت کی فراوانی کا یہ عالم ہوتا کہ دیکھنے والوں کو خدا یاد آ جاتا۔ حکمرانوں کو رسمیات کی پابندی اور عظمت اور دبدبے کے اظہار میں بے انتہا تکلف سے کام لینا پڑتا۔ اور وہ تھک کر چور ہو جاتے۔ تاریخ کی کتابوں میں ان رسمی

تقریبات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ''منہاج سراج''، ''عفیف''، ''منتخب التواریخ''، ''مآثر''، ''خلاصۃ التواریخ''، ''ضیا برنی'' وغیرہ میں جابجا ایسی تفصیلات ملتی ہیں۔ اور ابن بطوطہ [۱۹] نے تو انھیں بے حد دلچسپی سے لکھا ہے۔

وکیلِ دار:

قصر سلطانی اور دولت کدۂ شاہی کے کاروبار کو باقاعدہ رکھنے کے لیے امیروں، افسروں، اہلکاروں، نقیبوں، چوبداروں اور غلاموں کی ایک فوج متعین تھی۔ ان سب کا اعلیٰ ترین افسر ''وکیلِ دار'' کہلاتا تھا جو محل کا مقتدر نگران کار تھا۔ پورے عملے فعلے کو تنخواہیں اور وظیفے دینا اس کا کام تھا۔ محل کا باورچی خانہ، آبدار خانہ، اصطبل بلکہ حکمران کے بچوں کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمے ہوتی تھی۔ [۲۰] وکیل دار کا دفتر اور عملہ بہت وسیع تھا۔ چونکہ محل کے تمام متعلقین و متوسلین، درباری امرا، شاہی مصاحب اور ندیم، شہزادے اور بیگمات اس کے دست نگر تھے، اس لیے وکیل دار کا مرتبہ بہت اونچا سمجھا جاتا تھا۔ غزنوی دور میں ''وکیل دار'' اور مغلوں کے عہد میں ''وکیل دار خانہ'' کہلاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک ''میر سامان'' یعنی چیف سٹور کیپر کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ [۲۱]

حاجب و نقیب:

وکیل دار کے بعد امیر حاجب کا رتبہ تھا۔ جس کو باربک بھی کہتے تھے۔ اس کے ماتحت متعدد حاجب ہوتے تھے۔ اور ان میں سے بعض چیدہ آدمی خاص حاجب کہلاتے تھے۔ یہ لوگ حکمران کے حضور میں عام لوگوں کی اور امیروں وزیروں کی عرضیاں پیش کرتے تھے۔ جب تک یہ کسی کا تعارف نہ کراتے وہ حکمران کی خدمت میں باریاب نہ ہوسکتا۔ [۲۲] اس لیے یہ عہدہ بھی اہمیت میں وکیل دار سے کم نہ تھا اور ان دونوں عہدوں پر صرف وہ لوگ مقرر کیے جاتے جو حکمران کے مخلص دوست یا رشتہ دار ہوتے۔ اگر حکمران کبھی بنفس نفیس میدان جنگ میں جاتا تو حاجب اس کے اے ڈی کانگ کا کام دیتے۔ [۲۳]

نقیب ایک اور عہدہ تھا جو ان بڑے عہدوں کے مقابلے میں نہایت پست تھا۔ لیکن حکمران کے قرب کی وجہ سے معزز سمجھا جاتا تھا۔ نقیبوں کا افسر ''نقیب النقبا'' کہلاتا تھا جو سونے کا گرز لیے رہتا اور ایک طلائی مکٹ پہنتا جس پر مور کے پروں کی کلغی لگی ہوتی تھی۔ نقیب لوگ عوام

کو احکامِ شاہی پڑھ کر سناتے اور سواری شاہانہ کے آگے آگے بآواز بلند اعلان کرتے جاتے۔[۲۴] شاہی باڈی گارڈ کے سپاہی ''جاندار'' کہلاتے تھے۔ اور ان کا افسر سرجاندار کے لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ باڈی گارڈ کے لیے جو سپاہی منتخب ہوتے وہ سب کے سب بلند قامت، وجیہ، بہادر اور جوان ہوتے۔ حکمران کے اسلحہ کی دیکھ بھال کرنے والے سلحدار تھے۔ اور ان کا افسر سرسلحدار کہلاتا تھا۔ حرم سرائے شاہی کا پہرا ہیجڑوں کے سپرد تھا جن کو خواجہ سرا کہتے تھے۔[۲۵] یہ محل کے اندر باہر آمدورفت اور پیغام رسانی کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ اور حرم کی حکمران اور بیگمات کی خدمت کے لیے حاضر رہتے تھے۔ خاص حرم کی حفاظت پر ''سراپردہ دارانِ خاص'' مقرر تھے۔ جن کی سرداری کا کام کسی امیر کے سپرد ہوتا تھا۔

دوسرے عہدے اور کارخانے:

ان کے علاوہ بعض چھوٹے ملازم بھی تھے۔ کتب خانہ محل شاہی کا مہتمم کتاب دار، باورچی خانے کا مہتمم خاصہ دار اور اس کے ماتحت چاش نگر، پانی کا انتظام کرنے والا سرآب دار۔ فرنیچر اور خیمہ وخرگاہ کا نگران فراش، سلطان کو وضو کرانے والا تشت دار، لکھنے کا سامان مہیا رکھنے والا دوات دار۔ قریب ترین شاہی خدمت گار آغاچی۔ محل کا مسجل (رجسٹرار) دبیر سرا۔ حکمران کی جیب خاص کا امین بابلہ دار یا خزینہ دار۔ حکمران کے چتر برداروں کا افسر سرچتر دار۔ محل کا طبیب خاص ملک الحکما۔ سلطان کے جھنڈوں کی ذمہ داری قوربیگ پر تھی۔ اور نشاناتِ سلطانی کی دیکھ بھال کا ذمہ دار امیر توزک تھا۔ (برنی، منہاج، بیہقی)۔

محل شاہی کے متعلقات میں سب سے زیادہ دلچسپ اور وسیع ادارے ''کارخانے'' کہلاتے تھے۔ یہ دو قسم کے ہوتے تھے۔ راتبی اور غیر راتبی۔ راتبی وہ کارخانے تھے جو اصطبل اور باورچی خانے کے لیے اشیائے خوردنی اور گھاس چارے کا انتظام کرتے تھے۔ اور قصر شاہی کے لیے روشنی کی شمعیں مہیا کرتے تھے۔ غیر راتبی کارخانوں میں فرنیچر، دریوں اور خیمہ وقنات کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ ہر کارخانے کا نگران کوئی امیر (ملک یا خان) ہوتا تھا اور ایک متصرف مقرر کیا جاتا تھا۔ جو حساب کتاب رکھتا تھا۔ بعض زمانوں میں کارخانوں کے افسر تین ہوتے تھے۔ مہتر (یعنی حاکمِ اعلیٰ) مشرف (یعنی نگران) اور تحویلدار (یعنی خزانچی)۔

چونکہ حکمران کی حضور سے سال بھر میں بے شمار خلعت دیئے جاتے تھے جن میں

زیورات و جواہرات بھی شامل ہوتے تھے۔ اس لیے محل کے ساتھ زربفت کمخاب اور اطلس کی پارچہ بافی اور زیورات طلائی کی تیاری میں صدہا اعلیٰ درجے کے باکمال کاریگر سال بھر مصروف رہتے تھے۔ اس کارخانے کو جامہ دار کارخانہ کہتے تھے۔ تیر و شمشیر، تیغ و سنان، زرہ بکتر اور دوسرے سامانِ جنگ کا کارخانہ بہت بڑا تھا۔ آخور بیگ گھوڑوں کی پرورش اور نسل کشی پر مامور تھے۔ اور شحنۂ فیل ہاتھیوں کا اہتمام کرتے تھے۔ رسل و رسائل کے لیے اونٹوں، خچروں، بیلوں اور سانڈوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ اور ان کے لیے بھی علیحدہ علیحدہ اصطبل اور باڑے موجود تھے۔ حکمران کے لیے شکار کا انتظام کرنے والا ایک الگ محکمہ تھا جس کا افسر میر شکار اور اس کا ماتحت نائب میر شکار کہلاتا تھا۔ اور یہ دونوں اہلکار امراء میں سے منتخب کیے جاتے تھے۔ عفیف نے اپنی کتاب میں بے شمار کارخانوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً شمعدار خانہ، عطر دار خانہ، پائیگاہ، پیل خانہ، ستور خانہ، تشت دار خانہ، علَم خانہ، گھڑیال خانہ، فراش خانہ، رکاب خانہ، زرّاد خانہ، سلح خانہ وغیرہ۔

ایک معزز عہدہ دار ''امیر مجلس'' کہلاتا تھا جو سلطان یا پادشاہ کی نجی مجلسوں کا انتظام کرتا تھا۔ ان مجلسوں میں حکمران کے صرف ذاتی دوست اور ندیم شریک ہوتے تھے۔ خوش ذوق سلاطین ہمیشہ اپنے مصاحبوں کا انتخاب بڑے بڑے باکمال علماء و شعرا میں سے کرتے تھے۔ اور انھی کی وساطت سے ملک کے بعض علمی و ادبی ادارے سلطان کی جود و سخا سے استفادہ کرتے تھے۔[۲۶]

قصرِ سلطانی اور استحکام:

یاد رکھنا چاہیے کہ محل کے یہ عہدہ دار اور ملازم اور ہزاروں غلام محض محل ہی کی خدمات پر مامور نہ تھے بلکہ ملک کا بہت بڑا اثاثہ سمجھے جاتے تھے۔ اور جب کبھی کوئی جنگ پیش آجاتی تو یہی حاجب اور نقیب فوجوں کی کمان کرتے۔ یہی کارخانے جنگی سامان اور فوجی ضروریات مہیا کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ اور محل کے ہزارہا غلاموں کی فوج اپنے آقا کے جھنڈے تلے ایسی جاں فروشی سے لڑتی کہ مملکت کی باضابطہ فوج بھی دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔ محل کے اصطبل اور فیل خانے ہزاروں ہاتھی، گھوڑے اور دوسرے جانور جنگی ضروریات کے لیے مہیا کر دیتے۔

نشاناتِ خسروی:

اگرچہ شاہی و سلطانی کے نشانات خصوصی بے شمار تھے۔ عفیف نے تو کوئی ایکس

نشانات شمار کرائے ہیں۔ لیکن بڑے بڑے شان تین تھے۔ خطبہ یعنی نماز جمعہ وعیدین سے پہلے ہر مسجد کا خطیب خطبہ میں سلطانِ وقت کا نام لیتا تھا۔ سکہ یعنی ہر حکمران کو اپنے نام کا سکہ مضروب کر کے اپنی مملکت میں چلانے کا خصوصی حق حاصل تھا۔ طراز یعنی ریشمی کپڑے یا زربفت و کمخاب پر صرف سلطان کا نام کاڑھا جاسکتا تھا اور کسی کو اس کا حق و اختیار نہ تھا۔[۴۷]

تیسری فصل: بادشاہ کی ذات کی اہمیت

تزک و احتشام:

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دربار تزک و احتشام، جاہ و جلال اور رعب و داب کے اعتبار سے ازمنۂ متوسط کے بڑے بڑے درباروں پر سبقت لے گئے تھے۔ دہلی و آگرہ میں تو بڑی بڑی عالیشان شاہی عمارتیں اور قلعے موجود تھے اور مستقل قیام کے بہترین انتظامات مہیا تھے۔ لیکن جب بادشاہ سفر میں ہوتا تو خیمہ وخرگاہ کا سامان اس قدر عظیم الشان، وسیع و نادر ہوتا کہ دشت و بیابان میں جنت فردوس کا سا سماں پیدا ہوجاتا۔ اور کوچ کے وقت یوں معلوم ہوتا گویا ایک پورا شہر حرکت کر رہا ہے۔ وزراء و امرا، بیگمات، شاہی کارخانے، صدہا اہلکار اور ہزاروں سپاہی اور پہرے دار اپنے آقائے ولی نعمت کے جلو میں ہوتے۔ ہاتھیوں، گھوڑوں، اونٹوں، خچروں اور سامان باربرداری کا کچھ شمار نہ ہوتا یہ تزک و احتشام سیاسی اعتبار سے بہت اہم فوائد کا حامل تھا۔ اس سے رعایا کے قلوب پر حکمران کی عظمت کا نقش جم جاتا اور وہ احترام آمیز ہیبت جو اس زمانے میں حکمرانوں کے اقتدار کا جزو لاینفک تھی بدرجۂ اتم قائم ہوجاتی۔ برنی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ سلاطین کے درباروں میں رعب وجلال کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات بڑی بڑی سلطنتوں کے سفیر اور بڑے بڑے خراج گزار حکمران شہنشاہ کی حضور میں وفور مہابت کی وجہ سے غش کھا جاتے تھے۔

عوام سے رابطہ:

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حکمران اپنی رعایا کے لیے ہوّا بن گئے تھے۔ قطب الدین ایبک سے لے کر عالمگیر تک کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا جس نے رعایا کے ساتھ اپنا سلسلۂ ربط وضبط براہِ راست قائم نہ رکھا ہو۔ اور ایوان عام میں عام لوگوں کی فریادیں اور شکایتیں

بنفسِ نفیس سن کر ان کی داد رسی نہ کی ہو۔ بلکہ ان حکمرانوں کی غریب نوازی اور رعایا پروری کی داستانیں ہندوستان کی تمام زبانوں کے شعر و ادب کا سرمایہ بنی ہوئی ہیں۔

صنعت وفن کی ترویج وترقی:

قصر شاہی کے متعلقہ کارخانوں میں جو صنعتیں اور حرفتیں بروئے کار تھیں۔ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر قائم رکھنے کا کام خود حکمران ہی کرتے تھے۔ جس سے نہ صرف دربار اور مملکت کے ساز وسامان کا معیار بلند رہتا بلکہ مصوری، نقاشی، پارچہ بافی، زرگری، جواہر تراشی، خیاطی، باورچی گری اور معماری وغیرہ کے بڑے بڑے باکمال ماہرینِ فن ملک کے ہر گوشے سے کھچ کر قصر سلطانی کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور بادشاہ، اس کے امرا اور بعض ولایتی استادوں کے زیرِ ہدایت ہر چیز میں آئے دن جدتیں پیدا کرتے۔ پھر ان مصنوعات کے نمونے عوام کے لیے سرمایۂ نقل وتقلید بن جاتے۔ گویا قصر سلطانی سے صنعت اور فن کی شعاعیں نکل نکل کر ملک بھر کو روشن کر رہی تھیں۔

مصروفیتیں:

ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کی مصروفیتوں کا حال پڑھ کر بے حد تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنھیں قدرت نے شاہی وخسروی کے بہترین سامان اور عیش وآرام کے بدیع المثال وسائل عطا کر رکھے تھے اپنی جانوں پر اتنی تکالیف کیونکر برداشت کر لیتے تھے۔ کم وبیش اکثر بادشاہوں کا یہ حال تھا کہ وہ آخر شب بیدار ہوکر نماز تہجد ادا کرتے اور اوراد و وظائف کے بعد نمازِ فجر پڑھتے۔ پھر تلاوتِ قرآن مجید کے بعد ناشتا کرتے اور جھروکے میں جلوہ افروز ہوکر رعایا کو ''درشن'' سے شاد کام کرتے۔ دیوان خاص میں آکر وزیروں اور مشیروں سے مہمات ملکی پر مشورہ کرتے، احکام دیتے اور مملکت کی پالیسیاں مرتب کرتے۔ پھر دیوان عام میں آتے۔ عامۃ الناس کی فریادیں سنتے۔ مقدمات فیصل کرتے۔ مظلوموں کی داد رسی کا حق ادا کرتے۔ دوپہر کے وقت خاصہ تناول کرنے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ قیلولہ کرتے۔ پھر نماز ظہر کے بعد حرم میں جاکر بیوہ اور دوسری مصیبت زدہ عورتوں کی عرضیاں پڑھتے اور ان کی مدد معاش کے احکام صادر کرتے۔ غرض یہ سلسلہ جاری رہتا۔ تاآنکہ عشاء کی نماز پڑھی جاتی اور اس کے بعد حرم سرا میں پہنچ کر آرام کرتے۔ ان روزانہ مشاغل کے علاوہ آئے دن رسمی اور تیوہاری دربار منعقد ہوتے۔ شاہی

ضیافتیں ہوتیں۔ سواری مبارک کے جلوس نکلتے۔ اور ان تھکا دینے والی مصروفیتوں کے بعد جب بادشاہ اپنی خواب گاہ میں پہنچتا تو خدا کا شکر ادا کرتا۔

ذمہ داریاں:

ان بادشاہوں کو جنگ کی حالت میں اپنی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لینی پڑتی اس لیے کہ امراہوں یا منصبدار، غلام ہوں یا سپاہی، سب کے سب اپنی عقیدت و فدویت کا مرکز صرف ذاتِ شاہانہ کو جانتے تھے۔ اور انھیں اسی کے سامنے سرفروشی و جانسپاری کے جوہر دکھانے میں مزا آتا تھا۔ جاگیرداری نظام میں بغاوتیں ناگزیر ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان کی سرکوبی کے لیے بھی بادشاہ ہی کو حرکت کرنی پڑتی تھی۔ اور تاریخ مظہر ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے حکمرانوں کو مہینوں بلکہ برسوں ان ہی مشغولیتوں کے باعث دارالخلافہ کی شکل دیکھنی بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ جنگی اور سیاسی چالیں سوچنا اور چلنا، ہر معتمد علیہ کو اس کے مناسب مقام پر متعین کر کے موزوں فرائض سونپنا، کارہائے نمایاں کرنے والوں کو منصب، انعام اور جاگیر سے سرفراز کرنا اور غافلوں کو سزائیں دینا، یہ سب کام حکمرانوں ہی کو کرنے پڑتے تھے۔ خود مختار بادشاہی بلاشبہ بظاہر بڑی دلفریب چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ذرا اس کی ذمہ داریوں کو تو دیکھو کہ کس قدر گراں اور کتنی جان لیوا واقع ہوئی ہیں۔

مسلمان بادشاہ مسلمانوں کے شرعی امور کا انصرام کرتے۔ غیر مسلموں کو خاص طور پر عدل و انصاف اور رواداری برتاؤ سے مطمئن رکھتے۔ دوسری مملکتوں کے سفیروں کو باریاب کرتے۔ اپنے سفراء کو منتخب کر کے دوسرے ملکوں میں بھیجتے۔ علمائے کرام اور مشائخ طریقت کی صحبت سے استفادہ کرتے اور ان کی خدمت و مدارات میں مصروف رہتے۔ شاعروں، ادیبوں، مؤرخوں، مصوروں، معماروں، موسیقاروں اور دورے باکمالوں کے کمال کی قدردانی کرتے اور ان کو روزینوں، وظیفوں اور عطیوں سے مالا مال کر دیتے۔ تاکہ وہ اپنی معاش کی طرف سے بے فکر ہوکر شب و روز ثقافتی فنون کو ترقی دینے میں مصروف رہیں۔ اور کسی باکمال کو اپنی حکومت سے ناقدر دانی کی شکایت پیدا نہ ہو۔ خاندان شاہی کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مناسب اور موزوں استاد مقرر کرتے۔ اور انھیں حکمرانی کی آیندہ ذمہ داریوں کے قابل بناتے۔ تاریخ پڑھنے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان بادشاہوں میں سے اکثر ذاتی اعتبار سے بھی تعلیم یافتہ اور تہذیب

پذیر ہوتے۔ ان میں بعض شاعر تھے بعض ادیب و مصنف تھے۔ بعض علوم دینی میں بڑے بڑے علما کو پرے بٹھاتے تھے۔ بعض نہایت خوش قلم خطاط تھے۔ بعض موسیقی اور اس کے معارف و غوامض کے ماہر واقع ہوئے تھے۔ اور بعض دوسرے علوم وفنون میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔

تفصیلات کی طرف توجہ:

علاوہ بریں یہ حکمران دن رات اس فکر میں رہتے تھے کہ بازاروں اور منڈیوں میں عوام کے استعمال کی تمام چیزیں سہل الحصول اور ارزاں رہیں تاکہ عامۃ الناس پر زندگی گراں نہ ہونے پائے۔ رشوت خور اہلکاروں کو عبرت انگیز سزائیں دی جائیں اور کوشش کی جائے کہ حکومت کا نظم رعایا کے لیے آفات کا نہیں بلکہ برکات کا باعث ہو۔ الغرض یہ بادشاہ ''حکمران کم اور اہلکار زیادہ'' تھے۔ بلکہ اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق تو بعض غیر مسلم مورخین کی نکتہ چینی کا ماحصل صرف یہ ہے کہ وہ بادشاہوں کی طرح اونچی سطح پر پالیسی مرتب نہ کرتا تھا۔ بلکہ ''دفتری حکومت'' کے افسروں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں مین میکھ نکالتا تھا اور ہر شکایت کی تحقیق بذاتِ خود کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

مالِ غنیمت ''لوٹ'' نہیں ہوتا:

بلاشبہ تاریخ ہند میں بعض ایسے مسلمان بادشاہوں کا ذکر بھی موجود ہے جنھوں نے کسی وقت غیض وغضب یا جوشِ انتقام میں ظلم وستم بھی روا رکھا۔ ہم ان کی حمایت و مدافعت پر مکلّف نہیں ہیں۔ جو فاتح کسی دوسرے ملک کے عساکر پر میدانِ جنگ میں فتح حاصل کر لیتا ہے اس کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ مفتوح ملک کو تاخت و تاراج کرے یا پُرامن باشندوں کو تہِ تیغ کر دے۔ ایسا بادشاہ یا جرنیل یقیناً ظالم اور لٹیرا ہے۔ لیکن اگر کوئی فاتح دشمن پر فتح پانے کے بعد اس کے اموال کو بطور غنیمت حاصل کر لیتا ہے تو دنیا کا کوئی بین الاقوامی جنگی قانون اس غنیمت کو لوٹ مار قرار نہیں دیتا۔ بعض غیر مسلم اور متعصب مورخین کا یہ رویہ نہایت عجیب ہے کہ وہ ہر مسلمان فاتح کو رہزن اور لٹیرا قرار دیتے ہیں اور ہر حالت میں غنیمت کا ترجمہ لوٹ ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اندرون ملک سے حاصل کیا ہوا مال ہر پھر کر اندرون ملک ہی صرف کیا گیا۔ کیونکہ مسلمان بادشاہ ہندوستان کو اپنا وطن بنا چکے تھے اور غزنی وغور وفرغانہ جانے کا نام نہ لیتے تھے۔

ان چند سطور سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان کا مسلمان حکمران محض ''شاہ جم جاہ'' ہی نہ تھا بلکہ حکومت و مملکت کا سب سے زیادہ مخلص، محنتی اور مصروف اہلکار تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ شاہی کو امانتِ الٰہی سمجھتا تھا۔ اور اس کے تقاضوں سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہونا چاہتا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ خود اس کی شاہی و خسروی کا قیام اس خلوص، محنت اور مصروفیت ہی پر موقوف تھا۔

تفریح موردِ الزام نہیں

اگر ان میں سے بعض بادشاہ کبھی ناؤ نوش کی محفلیں آراستہ کرتے تھے۔ یا رقص و غنا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یا سیر و شکار میں مصروف ہوجاتے تھے تو ان کی اشد شدید مصروفیتوں، دماغ سوز الجھنوں اور تھکا دینے والے درباری اور ملکی مشغلوں کے پیشِ نظر ان کی اس تفریح کو بہت زیادہ موردِ الزام قرار نہ دینا چاہیے۔ ہاں جو حدودِ اعتدال سے تجاوز کرتے تھے، وہ خدا و خلقِ خدا دونوں کے مجرم تھے اور ان کی تائید و حمایت کوئی بھی نہیں کرسکتا۔

چوتھی فصل: مرکزی حکومت

محکمے، مداخل و مخارج اور فوج

وزرات:

آئینِ حکومت اور نظامِ مملکت کے متعلق قرآن مجید کا بنیادی حکم وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمر ابتدا ہی سے مسلم سلاطین کے پیشِ نظر رہا ہے۔ اور وہ ہر زمانے میں وقت کی ضرورت کے اعتبار سے اس کی مختلف شکلیں اختیار کرتے رہے ہیں۔ آج کل کے نیابتی ادارات کا وجود اس زمانے میں نہ تھا۔ لیکن چونکہ اسلام کی روح جمہوری تھی اس لیے مسلمان خلفا و سلاطین اپنے اقدامات سے پہلے مشورہ ضروری سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے سلاطین نے حکومت کے نظم و نسق کا آئین زیادہ تر خلافتِ عباسیہ سے اخذ کیا تھا اور اس میں مقامی حالات کے تقاضوں سے بعض ترمیمیں اور اضافے کرلیے تھے۔ ہر بادشاہ وزیر کی امداد سے حکومت کرتا تھا اور جس طرح خلفائے راشدین اپنے زمانوں میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کرتے تھے۔ اسی طرح یہ سلاطین اپنے درباروں کے معتمد علیہ ارکان و امراء اور مختلف محکموں کے بڑے افسروں سے صلاح لینا ضروری سمجھتے تھے۔

وزیر التنفیذ

ماوردی نے بتایا ہے کہ وزیر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وزیر التفویض۔ دوسرا وزیر التنفیذ۔ اول الذکر وہ وزیر ہے جس کو بادشاہ اپنے اختیارات تفویض کر دے۔ گویا وہ ملک کا سب سے بڑا حاکم مختار ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اہم معاملات میں بادشاہ کی منظوری کے بغیر قدم نہیں اٹھاتا۔ وزیر التنفیذ صرف اس حیثیت سے بادشاہ کا نائب ہوتا ہے کہ وہ احکام شاہی کی تعمیل کراتا ہے۔[۲۸] اگرچہ قانوناً اس کو عمومی اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ لیکن چونکہ سب احکامِ شاہی اس کے محکمے سے جاری ہوتے ہیں اور وہ دفتری حکومت کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا ہے اس لیے اس کو بے دست و پا بھی نہیں کہہ سکتے اور حضور شاہی میں اس کے قرب و رسوخ کے باعث امرا سے لے کر عوام تک اس کے دست نگر ہوتے ہیں۔ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ کسی معتبر غیر مسلم کو بھی وزیر التنفیذ مقرر کر سکتا ہے۔ مثلاً سلطان عضد الدولہ نے ایک عیسائی کو اپنا وزیر مقرر کر رکھا تھا۔ سلاطین ہند کے اکثر و بیشتر وزراء وزیر التنفیذ تھے۔

وزیر کو انتہائی قابلیت، ہوشمندی، احتیاط اور ذمہ داری سے چلنا پڑتا تھا۔ اس لیے کہ بادشاہ مختلف النوع معاملات میں اس کے مشورے کا طالب ہوتا تھا۔ مہمات امور ملکی سے لے کر علوم و فنون اور شاعری و موسیقی تک میں اس سے رائے طلب کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جاگیرداری نظام میں امرا اور درباریوں کی طرف سے سازش اور چغل خوری کا اندیشہ ہر وقت لگا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ امرا اور قصر سلطانی کی بعض شخصیتوں نے بیرم خاں جیسے ذی اقتدار وکیل السلطنت اور وزیر اعظم کے خلاف سازشیں کر کے اکبر کو اس سے بالکل برگشتہ کر دیا تھا۔ اور اس قسم کی مثالیں تاریخ میں کم نہیں ہیں۔

دیوانِ وزارت

سلاطین کے دور میں وزیر کا محکمہ ''دیوان وزارت'' کہلاتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نائب وزیر بھی ہوتا تھا۔ اور چونکہ مالیات کے شعبے کی پوری ذمہ داری وزیر ہی پر تھی۔[۲۹] اس لیے دخل و خرج اور محاسبہ کے صیغوں کے بڑے بڑے افسر دیوانِ وزارت ہی سے وابستہ ہوتے تھے۔ مثلاً مستوفی الممالک (آڈیٹر جنرل) اور مشرف الممالک (اکاؤنٹنٹ جنرل) فیروز شاہ نے اپنے عہد میں ان دونوں افسروں کے فرائض الگ الگ کر دیے تھے۔ مشرف الممالک مداخل کے

حسابات رکھتا تھا اور مستوفی الممالک مخارج کی نگرانی کرتا تھا۔[۳۰] مشرف کے ماتحت حسابات کے مختلف صیغوں کے انصرام کے لیے ''ناظر'' اور ''وقوف'' بھی مقرر کیے جاتے تھے۔ مشرف اور مستوفی کے عہدے مغل شاہوں کے ماتحت بھی بدستور قائم رہے۔ (مغلوں کے زمانے میں وزیر دیوان کہلاتا تھا) وزیر کو ''صدر عالی''[۳۱] اور ''خواجۂ جہاں'' کے القاب سے بھی ملقب کیا جاتا تھا۔

دوسرے دیوان

''دیوانِ وزارت'' کے ساتھ ہی تین اور بڑے وزارتی محکمے تھے۔ دیوانِ رسالت، دیوانِ عرض، دیوان انشاء۔

''دیوان رسالت'' کے ماتحت دین، عدل، اور حسبہ کے شعبے تھے۔ اس دیوان کا سب سے بڑا افسر صدر الصدور کہلاتا تھا۔ اور عموماً وہی قاضی الممالک بھی ہوتا تھا۔ اور علماء اور ائمۂ مساجد کے علاوہ محتسب اور محکمۂ قضا کے تمام قاضی اس کے ماتحت ہوتے تھے۔[۳۲] ''دیوان عرض'' کا اعلیٰ افسر ''عارض الممالک'' کہلاتا تھا جس کو کنٹرولر جنرل ملٹری ڈیپارٹمنٹ کہنا چاہیے۔ افواج شاہی کی نگرانی، تقسیم تنخواہ اور فوجی باربرداری کے جانوروں کی دیکھ بھال کے سب کام اس کے ذمے تھے۔ دیوان انشا کا حاکم اعلیٰ ''دبیرِ خاص'' تھا جس کے ماتحت متعدد ''دبیر'' کام کرتے تھے۔ اس محکمے کو سیکرٹریٹ کہا جاسکتا ہے اور ''دبیر خاص'' گویا حکومت کا چیف سیکرٹری اور بادشاہ کا کانفیڈنشل کلرک ہوتا تھا۔ اونچے پیمانے پر خط و کتابت اور مراسلہ نگاری کا کام ''دبیر خاص'' کے سپرد تھا۔ بادشاہ کے خاص فرامین جن کو ''فرامین طغرا'' کہتے تھے اور عام حکم نامے جنھیں ''احکام توقیع'' کہا جاتا تھا، اسی ''دیوان انشا'' سے جاری ہوتے تھے اور ''خریطہ دار'' ان کو مکتوب الیہم تک پہنچاتے تھے۔[۳۳] ایک بڑا افسر ''برید الممالک'' تھا۔ یعنی ڈاک کا انچارج۔ اس کے ماتحت وقائع نگاروں اور شاہی خبر رسانوں کا وسیع عملہ ملک بھر میں کام کرتا تھا۔ اور ہر علاقے کی صحیح خبریں انتہائی باقاعدگی کے ساتھ بادشاہ اور وزیر تک پہنچتی رہتی تھیں۔

قانون و انتظام:

ایک اور اہم محکمہ ''دیوان ریاست'' کہلاتا تھا۔ اس کو ''عدل'' بھی کہتے تھے۔ اس کا کام یہ تھا کہ منڈیوں اور بازاروں پر نگرانی رکھے۔ اور اشیائے تجارت کے نرخوں کو قائم رکھنے میں ہر

دم چوکنا رہے۔ اس محکمے کے کارکن رائی کہلاتے تھے۔ بعض سلاطین اور رائی جاسوسوں کے ذریعے سے نرخ معلوم کرتے رہتے اور گراں فروشوں کو عبرت انگیز سزائیں ملتیں۔[۳۴] تین اور عہدے بے حد اہم تھے۔ محتسب، امیر داد، کوتوال۔ ''محتسب'' کا کام یہ تھا کہ اخلاق عامہ کی حفاظت کرے۔ بدعقیدہ ملحدین کا پتہ چلائے اور انھیں کیفر کردار کو پہنچائے۔ بازاروں میں ماپ تول کی نگرانی کرے اور جہاں دکانوں میں ناجائز ذخائر یا اشیائے خوردنی میں آمیزش کا سراغ ملے وہیں سزا و تعزیر کی مشین کو حرکت میں لائے۔[۳۵] ''امیر داد'' عدالتی شعبے کا ایک انتظامی افسر تھا۔ اور ''کوتوال'' کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ کوتوال کے فرائض وہی تھے جو پولیس کمشنر یا کسی بڑے شہر میں کپتان پولیس کے ہوتے ہیں۔ پولیس کی نفری اس کے ماتحت پہرے داری اور مجرموں کی سراغ رسی میں مصروف رہتی تھی تاکہ رعایا امن و امان سے زندگی بسر کرے۔

مغلوں کے محکمے:

مغل بادشاہوں کے زمانے میں بڑے بڑے محکمے یہ تھے:

۱۔ مالیات و خزانہ (وزیر یا دیوان کے ماتحت)

۲۔ فوج کے حسابات اور مشاہروں کا محکمہ (میر بخشی کے ماتحت) جو پہلے ''دیوان عرض'' تھا۔ اور عارض الممالک کے ماتحت تھا۔

۳۔ دولت خانہ شہنشاہی کا محکمہ (خان سامان کے ماتحت) جو پہلے وکیل دار کے ماتحت تھا۔

۴۔ عدل و انصاف کا محکمہ (قاضی القضاۃ کے ماتحت) جو پہلے قاضی الممالک تھا۔

۵۔ اوقاف مذہبی اور عطیاتِ خیرات (صدر الصدور کے ماتحت)

۶۔ احتساب اخلاق عامہ (محتسب کے ماتحت)

۷۔ توپ خانہ (میر آتش یا داروغہ توپ خانہ کے ماتحت)

۸۔ برید۔ ڈاک اور خبر رسانی (داروغہ ڈاک چوکی کے ماتحت)

۹۔ ٹکسال۔ دارالضرب شاہی (داروغہ ٹکسال کے ماتحت)۔

کچھ اور اہم عہدے:

مستوفی اور مشرف کے علاوہ جن کا ذکر آ چکا ہے۔ ذیل کے عہدے بھی اہم تھے:

۱۔ آورجہ نویس۔ دربار کے مصارف روزانہ کا مہتمم۔

۲۔ ناظر بیوتات۔ مہتمم کارخانجات شاہی۔

۳۔ میر بحری۔ امیر البحر۔ بندرگاہوں کا افسر۔

۴۔ میر برّی۔ مہتمم جنگلات۔

۵۔ آختہ بیگی۔ مہتمم اصطبل شاہی۔

۶۔ خوان سالار۔ مہتمم مطبخ شاہی۔

۷۔ واقعہ نویس۔ خبر نویس شاہی۔

۸۔ میر عرض۔ حضور شاہ میں عرضیاں پیش کرنے والا افسر۔

ان تمام محکموں میں بے شمار نائب اور ارکان عملہ اور منشی متصدی کام کرتے تھے۔ قانون و عدلیہ کے محکمے میں صدر الصدور مذہبی نوعیت کے دیوانی مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔ قاضی القضاۃ گویا چیف جسٹس تھا۔ مفتی قوانین شریعت کی توضیح اور قاضی شہادت کی تحقیق کرتا تھا۔ میر عدل فیصلے سناتا تھا۔ علاوہ بریں میر عدل قاضی کے اثر و نفوذ اور مملکت کے مفاد عامہ کے درمیان توازن قائم رکھنے کا فرض ادا کرتا تھا۔ قاضی کو ہدایت کی جاتی تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مقدمات کی سماعت کرتے ہوئے وہ ہر قوم کے احکامِ مذہبی اور رسوم و رواجات کو مدنظر رکھے تاکہ کسی کو بے انصافی کی شکایت نہ ہو۔[۳۶]

مرکزی حکومت کے ذرائع آمدنی

حکومت کے مداخل و مخارج کا نظام شریعتِ اسلامی۔ خلافتِ عباسیہ کی روایات اور ہندوستان کے مقامی احوال و کوائف پر مبنی تھا۔ بڑے بڑے ذرائع آمدنی یہ تھے:

جزیہ، خراج، محاصل درآمد، مال غنیمت، خزائن و دفائن، معاون۔ ان کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے تجارتی ٹیکس بھی تھے جو منڈیوں اور بازاروں کی بعض اجناس پر وصول کیے جاتے تھے۔ لیکن ان کی مقدار اس قدر قلیل تھی کہ فراوانی اور ارزانی کے اس دور میں اس کی ادائی محسوس بھی نہ ہوتی تھی۔

جزیہ

ایک آدھ مغل بادشاہ کے سوا باقی تمام سلاطین کے عہد میں وصول کیا جاتا رہا۔ ہندو از روئے شریعتِ اسلامی ''ذِمّی'' قرار دیے گئے تھے۔ کیونکہ سلطنت اسلامی نے ان کی حفاظت کا

ذمہ اٹھا رکھا تھا۔ ان پر قوانینِ شریعت نافذ نہ تھے۔ ان کے لیے سلطنت کی فوجی خدمت ضروری نہ تھی۔ ان پر زکوٰۃ فرض نہ تھی۔ اور یہ تینوں قیود مسلمانوں پر شرعاً عائد تھیں۔ جزیہ عورتوں، بچوں، از کار رفتہ بوڑھوں، اپاہجوں، اندھوں، ناداروں، پجاریوں اور جوگیوں وغیرہم کو معاف تھا۔ سب سے پہلے محمد بن قاسم نے سندھ کے ہندوؤں کو ذمی تسلیم کر کے ان پر اسلام کی مسلمہ و مروجہ شرح کے مطابق جزیہ عائد کیا۔ (چچ نامہ)۔ جزیہ ادا کرنے والوں کے تین درجے باعتبار استطاعت قرار دیے گئے تھے۔ ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ درجے سے فی کس ایک دینار، متوسطین سے فی کس دو دینار اور اعلیٰ درجے کے خوشحال لوگوں سے چار دینار فی کس سالانہ کے حساب سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ [۳۷] سلاطین ہند نے یہ شرح دس بیس اور چالیس ٹنکہ سالانہ مقرر کی تھی۔ اس کے مقابلے میں ہر صاحب نصاب مسلمان شرعاً مکلّف تھا کہ سال کے بعد اپنے نصاب کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرے۔ شرعی قوانین کے آگے سر تسلیم خم کرے اور سلطنت کی فوجی خدمت کے لیے ہر وقت آمادہ رہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ زکوٰۃ چاندی، سونے، مویشیوں کے گلوں اور مالِ تجارت پر بھی عائد تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں کئی گناہ زیادہ روپیہ سالانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

جزیہ کوئی نیا ٹیکس نہ تھا جو مسلمانوں ہی نے ایجاد کیا ہو۔ ایران میں غیر ایرانیوں سے اسی قسم کا ایک محصول ''گزیت'' کے نام سے وصول کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے یہ اصطلاح بھی ایران ہی سے اخذ کی تھی اور گزیت کو جزیہ کہتے تھے۔ رومن بھی غیر رومی شہریوں سے ایک خاص ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔ خود ہندوستان بھی اس سے ناآشنا نہ تھا۔ مثلاً قنوج کے گاہرواڑ خاندان کے راجاؤں نے ایک ٹیکس عائد کر رکھا تھا جس کو ترشکا ڈنڈ کہتے تھے۔ یہ ٹیکس ہندوؤں سے اس لیے وصول کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں سے سلطنت کے دفاع کا بندوبست کیا جائے۔ اور مسلمانوں پر اس لیے عائد تھا کہ وہ قنوج کی ریاست میں بودوماند رکھتے تھے۔ [۳۸]

خراج

خراج و عشر بھی شریعت اسلامی کے احکام کے مطابق وصول کیے جاتے تھے۔ لفظ خراج بھی ایران کے ''خراگ'' سے ماخوذ تھا۔ قرنِ اولیٰ کے مسلمان اس اصطلاح کو ٹیکس کا مترادف سمجھتے تھے۔ لیکن بعد میں اس کا اطلاق صرف اراضی کے مالیے اور لگان پر ہونے لگا۔ فقہا نے

خراج پر ضخیم کتابیں لکھیں اور شرعی اعتبار سے اس کی قسمیں اور شرحیں واضح کیں۔ کون سی اراضی خراجی ہے۔ کون سی عشری ہے۔ خراج مقاسمہ کیا ہے۔ خراج وظیفہ کس کو کہتے ہیں۔ تعین شرح کا کیا طریقہ ہے۔ خراج نقدی کی صورت میں ہو یا پیداوار کی بٹائی پر مبنی قرار دیا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس کی بعد ہر ملک، ہر معاشرے اور ہر اراضی میں اس کے حالات کے مطابق خراج تجویز کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے سلاطین اور بادشاہوں نے بھی وقت اور موقع اور پیداوار کے لحاظ سے اس کی شرحیں مقرر کیں۔ سلاطین عام طور پر پیداوار کا پانچواں حصہ وصول کرتے تھے۔ علاء الدین خلجی نے ایک دفعہ نصف طلب کیا۔ لیکن وہ مخصوص حالات تھے کیونکہ منگولوں کے حملوں سے سلطنت بے حد زیر بار ہو رہی تھی۔ لیکن قطب الدین مبارک شاہ نے اس کو منسوخ کر کے پھر حسب معمول کر دیا۔[۳۹] بابر نے ''ایک سو کے بجائے ایک سو تیں'' کا مطالبہ کیا۔ یعنی تقریباً ایک چوتھائی۔[۴۰] شیر شاہ سوری نے بھی ملتان میں ایک چوتھائی تجویز کیا۔ چونکہ امیر تیمور اپنے بعض علاقوں سے پیداوار کا ایک تہائی وصول کرتا تھا۔[۴۱] اس لیے اکبر نے بھی خراج کی شرح ایک تہائی تک بڑھا دی۔

اقطاع، جاگیرات، ریاستیں

غزنویوں کے زمانے سے پٹھانوں کے عہد تک ملک میں بڑے بڑے امرا کو جو علاقے جاگیر میں دیے جاتے تھے ان کو ''اقطاع'' کہتے تھے۔ ان پر بھی پیداوار کے تخمینے کے مطابق خراج تجویز کیا جاتا تھا۔ بعض سلاطین اس نظام کے حامی تھے اور بعض مخالف۔ کیونکہ بعض اقطاع کے جاگیردار مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے یا بعض حالات میں مرکز کی کمزوری کے باعث خود مختار ہو جاتے تھے۔ اور مرکز کے لیے نقصان و پریشانی کا موجب ہوتے تھے۔ لیکن یہ نظام نشتم پشتم جاری رہا۔ بعض ریاستوں میں چھوٹے چھوٹے ہندو راجا اور ٹھاکر حکومت کرتے تھے اور ہندو مہاراجوں کے زمانے میں بھی نیم آزاد سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ انھیں اپنے اپنے علاقے کے کاشتکاروں پر پورا پورا اثر و نفوذ حاصل تھا۔ اس لیے مسلمان سلاطین نے بھی انھیں بدستور رہنے دیا اور باہم مفاہمت سے خراج کی رقوم کا تعین ہو گیا۔[۴۲] لیکن یہ سردار اور ٹھاکر بعض اوقات سرکشی کر کے خراج روک لیتے تھے اور ان کے خلاف مرکز کو فوج کشی کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح بعض سرداروں کو مفتوح کر کے ان کے علاقے سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔ لیکن پھر بھی بہت

سی باقی رہے اور حملۂ تیمور کے بعد کی طوائف الملوکی میں مالِ غنیمت کا حصہ حاصل کرنے کے لیے مسلمان طالع آزماؤں کا ساتھ بھی دیتے رہے۔ شیر شاہ اور ہمایوں جب تخت دہلی کے لیے لڑ رہے تھے تو ہندو سردار دونوں طرف کی فوجوں میں شامل تھے۔[۴۳] بہرحال یہ لوگ بھی خراج و باج کی آمدنی کا ایک ذریعہ تو تھے لیکن ان سے رقوم کی وصولی متواتر نہ ہو سکتی تھی۔

مغلوں کا دہ سالہ بندوبست

مغلوں کے زمانے میں خراج تمام تر سلطنت کے نظام وصولی کے تحت آ گیا تھا۔ اور ۱۵۷۵ء میں تو ٹوڈرمل نے تمام جاگیریں موقوف کر دیں اور بنگال و بہار کے سوا باقی ساری قلمرو کو ایک سو بیاسی پرگنوں میں تقسیم کر کے ان پر ''کروڑی'' مقرر کر دیے۔ پھر ٹوڈرمل نے سالانہ تخمینوں کی مصیبت سے تنگ آ کر دہ سالہ بندوبست رائج کیا اور پورے غور و خوض کے بعد مالیہ اراضی کی شرحیں معین کر دیں۔[۴۴] سلاطین اور مغل بادشاہوں کے زمانوں میں خراج کے جو نظام قائم تھے۔ ان کی تفصیلات بہت طویل اور پیچیدہ ہیں جن کو ان کے مطالعہ کا شوق ہو وہ کتب تاریخ اور آئین اکبری وغیرہ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

دفائن و معاون

دفینوں اور کانوں کے متعلق فقہا کی رائے یہ تھی کہ ان میں سے جو کچھ برآمد ہو، اس کا پانچواں حصہ سلطنت لے سکتی ہے۔ باقی چار حصے اس زمین کے مالک کو ملنے چاہئیں اور اسی پر ہندوستان کے مسلمان بادشاہ عمل کرتے رہے۔ جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔ اس کے متعلق شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ اس کا پانچواں حصہ (خمس) سلطنت کو ملنا چاہیے اور باقی چار حصے سپاہیوں میں تقسیم کر دینے چاہئیں۔ لیکن سلاطین کے عہد میں آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ چار حصے تو حکومت لے لیتی تھی اور پانچواں حصہ سپاہیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس پر سلطان فیروز شاہ کے علماء نے اعتراض کیا تو سلطان نے پھر وہی پرانی شرح قائم کر دی۔[۴۵]

حکومت جو نہریں جاری کرتی تھی ان پر آبیانہ وصول کیا جاتا تھا۔ جسے ''حق شرب'' کہتے تھے اور جو عام طور پر پیداوار کے دسویں حصہ سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ تجارت درآمد پر محصول شرعاً مال تجارت کا چالیسواں حصہ اور گھوڑوں پر بیسواں حصہ مقرر تھا اور غیر مسلموں سے دگنا لیا جاتا تھا۔[۴۶] محمد تغلق نے ایک دفعہ یہ محاصل دگنے کر دیے لیکن بعد میں گھٹا کر پھر شرعی محصول

عائد کر دیا۔[۴۷]

میزانیہ اور شعبہ ہائے مصارف

"اس زمانے میں میزانیہ کا طریقہ یہ تھا کہ مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والا روپیہ بعض خاص مصارف کے لیے وقف کر دیا جاتا تھا۔ اور وزراء متوقع مداخل و مخارج کا اندازہ کر لیتے تھے۔ صرف خراج ایک ایسا ذریعہ آمدنی تھا جو موسموں کے موافق و مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتا گھٹتا رہتا تھا۔ لیکن باقی ذرائع علی العموم یقینی تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں صنعت و تجارت کی دنیا میں ناگہانی انقلاب رونما نہیں ہوتے تھے اور عالمگیر اہمیت رکھنے والے عوامل بھی رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتے تھے۔ مصارف کی بڑی بڑی مدیں یہ تھیں:

دولت خانہ شاہی، نظم و نسق، حکومت، فوج، مذہبی و خیراتی تنظیمات و ادارات، معاشری خدمات، امور عامہ، شعبہ ہائے ترقی زراعت اور انعامات و عطیاتِ سلطانی۔

زکات اور عشر سے حاصل ہونے والا روپیہ خیراتی مقاصد پر صرف کیا جاتا تھا اور دوسرے محاصل زیادہ تر غیر مذہبی اور دنیاوی مطالبات کی تکمیل کے لیے وقف تھے۔"[۴۸]

ہم اس سے پیشتر بتا چکے ہیں کہ قصر سلطانی یا دولت خانہ شاہی بھی عملاً حکومت ہی کا ایک بڑا محکمہ تھا۔ اس لیے جو روپیہ بادشاہ کی ذات پر صرف ہوتا تھا وہ بھی مخارجِ سلطنت ہی کا جزو تھا اور بادشاہ کی ذاتی مملوکات بھی حقیقت میں سلطنت ہی کا اثاثہ تھیں۔

فوج:

چونکہ ہندوستان پر بیرونی حملوں کا اندیشہ ہر وقت رہتا تھا اور ملک کے اندر بھی کئی عناصر حکومت کی مخالفت میں مصروف کار رہتے تھے۔ اور کبھی نسلی اور کبھی مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرتے رہتے تھے اس لیے سلاطین و پادشاہانِ دہلی اپنی فوجی تنظیم پر خاص توجہ صرف کرتے تھے۔

مغلوں سے پہلے جو سلاطین حکمران رہے ان کی اور مغلوں کی فوجی تنظیم میں بڑا فرق تھا۔ علاوہ ازیں مغلوں کے زمانے میں منصب داری نظام، توپخانہ اور بحری فوج کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم پہلے سلاطین کی فوجی تنظیمات کا ذکر کریں گے اور اس کے بعد مغلوں کے نظام عسکری کا خاکہ کھینچ کر دکھائیں گے۔ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وزرات کے ماتحت ایک سر رشتہ "دیوانِ عرض" کے نام سے قائم تھا جس کا رئیس اعلیٰ عارض الممالک کہلاتا تھا۔ یہ گویا فوج نظم

ونسق کا سب سے بڑا ذمہ دار افسر تھا۔ سپہ سالار قانونی اعتبار سے خود سلطان ہی ہوتا تھا۔ اس لیے عارض الممالک کو قریب قریب ڈیفنس منسٹر سمجھنا چاہیے۔ وہی فوج بھرتی کرتا تھا۔ وہی رنگروٹوں کی تنخواہ مقرر کرتا تھا۔ فوج کے افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہ، ان کی ترقی، تنزلی اور تفویض فرائض سب کچھ اسی کے سپرد تھی۔ سپلائی، ٹرانسپورٹ، کمسریٹ، آرڈیننس سب محکمے اسی کے ماتحت تھے۔ وہ فوجوں کا ریویو لیتا، پریڈ ملاحظہ کرتا، مہمات کی تیاری، دورانِ جنگ میں ہر چیز کی دیکھ بھال اور نگرانی، مال غنیمت کی فراہمی اور تقسیم بھی اسی کے ذمے تھی۔[۴۹]

حلیہ اور داغ

عارض الممالک کا محکمہ فوجی نفری کی فہرست مہیا رکھتا جس میں ہر سپاہی کا ''حلیہ'' اور اس کے متعلق پوری تفصیلات درج ہوتیں۔ رسالے کے گھوڑوں کے داغ کا کام بھی باقاعدہ ہوتا۔ تاکہ رسالے کے سوار گھوڑا بدل نہ دیں۔ ''حلیہ'' کو چہرہ بھی کہتے تھے۔ پریڈ اور معائنہ کے موقع پر حلیہ اور داغ کی یادداشتوں کے مطابق پوری فوج اور اس کے گھوڑوں کا جائزہ لیا جاتا۔ تاکہ مبادا سپاہیوں کی جگہ دوسرے اشخاص وردی پہن کر آجائیں اور سرکاری گھوڑوں کی جگہ دوسرے ٹٹو پیش کر دیے جائیں۔ بعض سرداروں اور امیروں کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اپنے مفوضہ سپاہیوں کی تنخواہیں وصول کر لیتے اور پریڈ کے دن یونہی ادھر ادھر کے دھوبی، دُھنیے جمع کر کے پیش کر دیتے۔ حلیہ اور داغ نے ان فریب بازیوں کا دروازہ بند کر دیا تھا۔[۵۰]

فوج مختلف مقامات پر رکھی جاتی اور اس کی تعداد کا فیصلہ ان مقامات کی ضرورت اور جنگی اہمیت کے پیشِ نظر کیا جاتا۔ دہلی میں جو فوج متعین ہوتی تھی اس کو ''حشمِ قلب'' کہتے تھے جس میں ''شاہی غلام''، ''جاندار'' اور ''خاصہ خیل'' (پہرہ دارانِ قصر سلطانی) اور ''افواجِ قلب'' جو براہِ راست سلطان کے زیرِ کمان تھیں، شامل ہوتی تھیں۔ صوبوں کے صدر مقامات پر جو فوج رہتی تھی اس کو ''حشمِ اطراف'' کہتے تھے۔ شمال مغربی سرحد پر فوجی استحکام کا خاص خیال رکھا جاتا اور نہایت وفادار اور معتبر سپاہی کسی شہزادے یا بڑے جرنیل کے ماتحت وہاں متعین کیے جاتے۔ ملک میں جابجا قلعے بنائے جاتے تھے۔ جن میں فوج مقیم رہتی تھی۔ مثلاً قطب الدین ایبک نے بہت سے ایسے قلعے قائم کیے جو ''کوتوالوں'' کے ماتحت ہوتے تھے۔ یہ لفظ اصل میں ''کوٹوال'' یا ''کوٹپال'' تھا۔ اور کوٹ قلعہ کو کہتے ہیں۔ یعنی ''کوتوال'' اصلاً قلعہ دار کو کہتے تھے لیکن بعد میں یہ

لفظ پولیس افسر کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔[۵۱]

گھڑسوار اور ہاتھی:

سواروں کے رسالے پر خاص توجہ صرف کی جاتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں کسی بادشاہ کی جنگی قوت کا اندازہ اس کے سوار سپاہیوں ہی سے کیا جاتا تھا۔ کتبِ تواریخ میں ان سواروں کی وردیوں، زرہ بکتر اور آلات و اسلحہ کا مفصل ذکر موجود ہے۔ بعض سوار اور ان کے گھوڑے زرہ بکتر سے آراستہ ہوتے اور ہر سوار کے پاس دو تلواریں، ایک خنجر، ایک ترکی کمان اور تیروں کا ایک ترکش ہوتا تھا۔ فالتو گھوڑوں کا انتظام بالکل مکمل ہوتا تھا۔ چنانچہ رسالہ ایک اسپہ، دو اسپہ، سہ اسپہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا۔[۵۲] بے شمار گھوڑے ملک میں پالے جاتے تھے۔ اور بے شمار عرب، ترکستان اور روس سے درآمد ہوتے تھے۔ علاء الدین خلجی کے زمانے میں صرف دہلی اور اس کے مفصلات میں ستر ہزار گھوڑے موجود تھے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملک بھر میں کتنے گھوڑے ہوں گے۔ غزنویوں کے زمانے ہی سے ہاتھیوں کی اہمیت فوج میں مسلّم ہوگئی تھی۔ ہاتھیوں پر متعدد سپاہی تیر و کمان اور دوسرے اسلحہ لے کر بیٹھ جاتے اور پیادہ و رسالہ دونوں پر موت کا مینہ برسا دیتے۔ خود ہاتھیوں کو زرہ بکتر پہنا دیے جاتے اور ان کی سونڈوں اور بڑے دانتوں کے ساتھ درانتیاں باندھ دی جاتیں۔ مختلف سلاطین کے پاس ہاتھیوں کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ محمد تغلق کے پاس تین ہزار ہاتھی تھے۔ فیروز شاہ نے بنگال پر حملہ کیا تو چار سو ستر ہاتھی اس کے ساتھ تھے۔ محمد شاہ بہمنی (دکن) کے پاس تین ہزار ہاتھی تھے۔ سلطان محمود شرقی نے ایک ہزار چار سو ہاتھی لے کر دہلی پر حملہ کیا تھا۔ ہاتھیوں پر سلطان کا اجارہ ہوتا تھا۔ کوئی شخص سلطان کی اجازت کے بغیر ہاتھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ احتیاط اس لیے کی گئی تھی کہ ہاتھیوں کا استعمال ناجائز نہ ہونے پائے۔ ہاتھی بنگال اور سیلون سے منگائے جاتے تھے۔ اوسط قیمت فی ہاتھی سات آٹھ ہزار روپے تھی۔ ہاتھیوں کے محکمہ کا افسر ''شحنۂ فیل'' کہلاتا تھا۔[۵۳]

پیدل فوج کے سپاہی ''پائک'' کہلاتے تھے۔ یہ زیادہ تر ہندو، غلام اور ایسے ادنیٰ طبقوں کے لوگ ہوتے تھے جن کو گھوڑا رکھنے کی استطاعت نہ تھی۔ زیادہ کام کے پائک بنگال سے آتے تھے۔ شخصی پہرے داری اور دربانی کا کام انھی کے سپرد تھا۔ ان میں تیر انداز بھی تھے جن کو ''دھانک'' کہتے تھے۔

آتشیں اسلحہ:

آتشیں اسلحہ میں نفت کے گولے، آتش ریز تیر اور بھالے شامل تھے۔ علاء الدین خلجی کے زمانے میں نہایت ابتدائی قسم کی توپیں بھی بن گئیں تھیں۔ لیکن سلاطین نے اسلحہ آتشیں کی طرف زیادہ توجہ صرف نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی بابر کے توپ خانہ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ منجنیق اور عرّادے البتہ موجود تھے جن کی مدد سے دشمن کے قلعوں پر موثر سنگباری ہو سکتی تھی۔ اور ان کا پھینکا ہوا گولہ ایسی شدت سے جا کر پڑتا تھا کہ قلعوں کی دیواریں پھوٹ کر گر پڑتی تھیں۔ چرخ اور فلاخن بھی پتھر پھینکنے کے کام آتے تھے۔ محاصرے میں بعض ایسے جارحانہ و مدافعانہ آلات یا تعمیرات کا استعمال کیا جاتا تھا کہ غنیم عاجز ہو جاتا تھا۔ گرگج محاصرین کو دیوار قلعہ کی بلندی کے برابر پہنچا دیتا تھا۔ ساباط ایک زمین دوز یا مسقّف راستہ تھا جس میں محاصرین خود محفوظ رہتے تھے لیکن قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈال دیتے تھے۔[۵۴]

غیر جنگی افراد:

فوج کے لاکھوں غیر جنگی افراد بھی ہوتے تھے۔ طلایہ (یعنی سکاؤٹ) ان کو یزکی بھی کہتے تھے۔ جنگی ہسپتالوں کے کارکن، بینڈ اور نقارے بجانے والے، جھنڈے اٹھا کر چلنے والے، خیمہ و خرگاہ کا اہتمام کرنے والے، لکڑی کاٹنے والے، زمین کھودنے والے، باورچی اور دوسرے بے شمار غیر مسلح لوگ ہر فوج کے ساتھ رہتے تھے۔ داؤدی لکھتا ہے کہ جب اسلام شاہ سوری نے ہمایوں کے خلاف لشکر آرائی کی تو ڈیڑھ لاکھ لکڑی کاٹنے والے اور ڈیڑھ لاکھ خندقیں کھودنے والے اس کے ہمراہ تھے۔[۵۵]

کیمپ اور جنگ:

جب کبھی جنگ پیش آتی فوج کا محکمہ ھندسی (انجینئرنگ) سب سے پہلے لشکر کا ایسا مقام نزول تجویز کرتا جہاں پانی، ایندھن اور گھاس چارہ آسانی سے مل سکے۔ سب سے آگے جنگی سپاہیوں کا کیمپ ہوتا۔ اس کے پیچھے دولت خانہ سلطانی کے خیام برپا ہوتے۔ اس کے عقب میں اسلحہ و سامان جنگ، باربرداری کے جانور، اور بھیر و بنگاہ کی نفری جاگزیں ہوتی۔ گویا سلطان اور اس کے گھر والے پورے کیمپ کے درمیان میں خیمہ زن ہوتے اور اگر کوئی حقیقی اور فوری خطرہ

ہوتا تو پورے کیمپ کے گرد خندقیں کھودلی جاتیں یا دفاع کے دوسرے انتظامات کیے جاتے۔ میدان جنگ میں حقیقی رزم و پیکار کے وقت رسم قدیم کے مطابق میمنہ، میسرہ، ہراول، قلب اور عقب کے حصے قائم کیے جاتے۔ یہ دستور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آتا تھا۔ سلاطین دہلی اس کے علاوہ دو ''جناح'' بھی دائیں بائیں قائم کرتے۔ سلطان فوج کے عین درمیان علماء میں گھرا ہوا کھڑا ہوتا تھا۔ آگے پیچھے تیرانداز ہوتے۔ سامنے ہاتھیوں کی صف ہوتی اور ہاتھیوں سے بھی آگے سلطان کے مسلح غلاموں کی صف آراستہ کی جاتی۔[۵۶]

فوج میں مختلف عناصر:

سلاطین کی فوجیں رنگا رنگ عناصر پر مشتمل ہوتی تھیں۔ غزنویوں کی فوج میں ہزاروں ہندو شامل تھے۔ اور وہ عہدہ دار اور افسر بھی تھے۔ امراء میں غالباً تلک سے زیادہ ذی اثر کوئی نہ ہوگا جو ایک ہندو نائی کا بیٹا تھا۔[۵۷] ہندو سپاہی غزنوی فوج میں سلجوقیوں کے خلاف لڑتے رہے۔ قطب الدین ایبک نے ہندوؤں کا رسالہ بھرتی کیا تھا۔ جب ملک چھجو نے جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی تو بے شمار ہندو سواروں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ناصرالدین خسرو اور اس کے مخالف غیاث الدین تغلق دونوں کی فوج میں ہندو سپاہی موجود تھے۔[۵۸] محمد تغلق کی فوج میں ترک، خطائی، ایرانی، ہندوستانی اور دوسرے عناصر بھی شامل تھے۔

تنظیم عسکری:

فوج کی تنظیم کا یہ حال تھا کہ دس سواروں کا افسر سرخیل، دس سرخیلوں کا افسر سپہ سالار، دس سپہ سالاروں کا افسر امیر، دس امیروں کا افسر ملک اور دس ملکوں کا افسر خان کہلاتا تھا۔ امیران پنجہ، امیران صدہ اور امیران ہزارہ بھی تھے۔[۵۹] اسلام شاہ سوری نے اپنی فوج میں پچاس، ڈیڑھ سو، دو سو اور پانسو کے کمانداروں سے اپنی فوج کو منظم کیا تھا۔ اور بڑے افسروں کے ماتحت پانچ، دس اور بیس ہزار سپاہی رکھے تھے۔ ضبط و نظم کا اہتمام نہایت سختی سے کیا جاتا تھا۔ ہر ماتحت کا فرض تھا کہ اپنے افسر کی بلاچون و چرا اطاعت کرے۔ غنیم کے ملک میں کھیتوں اور جائدادوں کو نقصان پہنچانے کی سخت ممانعت تھی۔ سوائے اس صورت کے کہ کسی علاقے کو تاخت و تاراج کرنا ہی منظور ہو۔[۶۰]

فوج کی تعداد اور مشاہرہ:

فوج کی تعداد کی کیفیت یہ تھی کہ مثلاً علاء الدین خلجی کے پاس چار لاکھ پچھتر ہزار سوار تھے۔[۶۱] فیروز شاہ کے پاس ایک لاکھ اسی ہزار غلاموں کے علاوہ نوے ہزار دوسرے سوار تھے۔[۶۲] محمد تغلق کا رسالہ نو لاکھ سواروں پر مشتمل تھا۔[۶۳] شیر شاہ کے پاس پچیس ہزار توپچی صرف دہلی میں تھے اور کئی ہزار اہم قلعوں میں متعین تھے۔

تنخواہوں کے متعلق کچھ اندازہ کرنا مقصود ہو تو ''صبح الاعشا'' کا یہ بیان ملاحظہ ہو کہ خان کو دو لاکھ ٹنکہ، ملک کو پچاس سے ساٹھ ہزار تک، امیر کو تیس سے چالیس ہزار تک، سپہ سالار کو کوئی بیس ہزار، چھوٹے افسروں کو ایک ہزار سے دس ہزار ٹنکہ تک سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور یہ تمام تنخواہیں براہِ راست حکومت کی طرف سے بصورت نقد ادا کی جاتی تھیں۔ باقاعدہ فوج کے سپاہی وَجھی کہلاتے تھے اور جو عارضی طور پر بھرتی کر لیے جاتے ان کو غیر وجھی کہتے تھے۔[۶۴] علاء الدین خلجی کے زمانے میں سوار کو دو سو چونتیس ٹنکہ سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ کیونکہ اس عہد میں اشیائے خوردنی بے حد ارزاں تھیں۔ محمد تغلق ہر سوار کو پانچ سو ٹنکہ تنخواہ اور اس کے ساتھ کھانا کپڑا اور چارہ بھی دیتا تھا۔ کیونکہ اس کے عہد کے اواخر میں فوج زیادہ تر باغیوں کی سرکوبی میں مصروف رہتی تھی اور راشن کی حقدار بھی تھی۔

مغلوں کی فوج (ماخذ زیادہ تر آئین اکبری)

سلطنت مغلیہ کے ابتدائی دور میں قلمرو بدستور جاگیرداروں میں منقسم رہی اور جو امرا ان جاگیروں پر متصرف تھے ان کا فرض تھا کہ وقت پڑنے پر سواروں کی مقررہ تعداد مہیا کریں۔ لیکن بعض جاگیردار بددیانتی سے کام لیتے اور مقررہ تعداد مستقل طور پر نہ رکھتے۔ اور ملا بدایونی کے بیان کے مطابق جائزہ اور موجودات کے وقت بہت سے خوانچہ فروشوں، جولاہوں، دھنیوں، بڑھئیوں اور سبزی فروشوں کو جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے، وردیاں پہنا کر لے آتے اور جائزے کے بعد ان کو منتشر کر دیتے۔ اکبر نے جاگیروں میں ایک نقص اور بھی دیکھا کہ جاگیر عملاً ایک ''سلطنت اندرونِ سلطنت'' ہونے کی حیثیت سے بعض اوقات فتنہ کا باعث ہوتی ہے تو اس خرابی کا سدِّ باب کرنے کے لیے منصب داری کا نظام قائم کیا۔ منصب دار سلطنت کے مستقل ملازم سمجھے جاتے تھے۔ اصلاً تو ان سے تنظیم عسکری ہی مقصود تھی۔ لیکن بہت سے منصب

داروں کو غیر فوجی محکموں میں بھی خدمتیں سپرد تھیں۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ منصب داروں کے درجے چھیاسٹھ تھے لیکن حقیقت میں کوئی تینتیس درجوں کا ذکر کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ سب سے چھوٹا منصب ''بست سوار'' کا تھا اور بڑے سے بڑا پنجہزاری۔ لیکن اکبر کے عہد ہی میں بعض معزز امرا اور ارکان سلطنت منصب ہفت ہزاری پر بھی فائز کیے گئے۔ بلکہ ایک دہ ہزاری منصب بھی تھا جو صرف خاندان شاہی کے افراد کو دیا جاتا تھا۔ ہفت ہزاری بھی اولاً شہزادوں ہی کے لیے وقف تھا۔ لیکن بعد میں مان سنگھ، ٹوڈرمل اور قلیچ خاں جیسے اور گرانقدر خدمات انجام دینے والوں کو بھی ملنے لگا۔

نظامِ منصب داری

منصب داری نظام کی خصوصیات یہ تھیں:

اول۔ منصب داروں کے تقرر، ترقی و تنزلی کے اور موقوفی کے تمام تر اختیارات صرف شہنشاہ کو حاصل تھے۔

دوم۔ منصب داری کا حق موروثی نہ تھا۔ بلکہ منصب دار کی وفات کے بعد اس کے تمام حقوق، تمام مشاہرے اور خطبات و اعزازات ختم ہوجاتے تھے اور اس کے بچوں کو از سرنو اپنی زندگی کا آغاز کرنا پڑتا تھا۔

سوم۔ منصب دار کے لیے ضروری نہ تھا کہ وہ پست ترین درجے پر مقرر ہوکر ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا بالائی درجوں پر پہنچے۔ بلکہ شہنشاہ کو اختیار تھا کہ جس شخص کو چاہے جونسا منصب بھی مناسب سمجھے عطا کردے۔ بعض افراد کو پہلے ہی دن دو ہزاری، سہ ہزاری بلکہ پنج ہزاری منصب بھی عطا کردیے جاتے تھے۔

چہارم۔ ہر منصب دار کا فرض تھا کہ گھوڑوں، ہاتھیوں، باربرداری کے جانوروں اور گاڑیوں اور چھکڑوں کی ایک مقررہ تعداد مہیا رکھے۔

آئین اکبری میں دو قسم کے منصبوں کا ذکر آتا ہے۔ منصب سوار اور منصب ذات و سوار۔ مثلاً ''پنج ہزاری پنج ہزار سوار''۔ اور ''پنج ہزار ذات و پنج ہزار سوار'' پنج ہزاریوں کے سوا باقی منصب دار تین قسموں کے تھے۔ درجہ اول کا منصب دار وہ سمجھا جاتا تھا جس کی ''ذات'' اور ''سوار'' کی تعداد مساوی ہوتی تھی۔ درجہ دوم کے منصب دار وہ تھے جن کے ''ذات'' کا شمار سواروں سے

دگنا ہوتا تھا۔ اور درجہ سوم میں وہ تھے جن کے ''سوار'' کا شمار ذات کی نسبت نصف سے بھی کم ہوتا۔ یا ''سوار'' کا خانہ بالکل ہی خالی ہوتا۔ ذات اور سوار کے سلسلے میں منصب داروں کو جو رقوم ملتی تھیں ان کی تفصیل بتانا بے حد مشکل ہے لیکن یہ امر قطعی ہے کہ ان کو سواروں کی مقدار تعداد اور اسپ و فیل اور باربرداری کا سامان مہیا رکھنا پڑتا تھا۔ اور ذات سے مراد غالباً ان کا ذاتی الاؤنس تھا۔

منصب داری نظام کے قیام کا اولین مقصد یہ تھا کہ ''سوار فوج'' کا انتظام بہترین اور معتبر شخصیتوں کے سپرد رہے کیونکہ اس زمانے میں فوج کا موثر ترین عنصر رسالہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ شہنشاہ اس کے متعلق بطور خاص ذاتی توجہ سے کام لیتا تھا۔ اور چہرہ و داغ کی پابندیاں بھی اسی لیے عائد کی گئی تھیں کہ منصب دار بددیانتی سے کام نہ لے سکیں۔

داخلی واحدی:

منصب داروں کے علاوہ بعض دوسرے سپاہی بھی تھے جن کو داخلی اور احدی کہتے تھے۔ داخلی سپاہیوں کی ایک مقررہ تعداد منصب دار کے سپرد کردی جاتی تھی۔ لیکن ان کی تنخواہ سلطنت کی طرف سے ادا کی جاتی تھی۔[۶۵] احدی وہ لوگ تھے جو اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور شہنشاہ ان کو اپنے باڈی گارڈ کی حیثیت سے بھرتی کرتا تھا۔ ''آئین'' میں لکھا ہے کہ بہت سے قابل اور بہادر افراد ایسے ہیں جنھیں شہنشاہ نے کوئی منصب تو عطا نہیں کیا لیکن انھیں دوسروں کے احکام کی تعمیل سے آزاد کردیا ہے۔ ایسے اشخاص براہ راست شہنشاہ کی ملازمت خاصہ میں ہیں۔ اور اپنی آزادی کے اعتبار سے معزز ہیں۔[۶۶] احدیوں کے لیے ایک علیحدہ محکمہ اور ایک علیحدہ بخشی مقرر کیا جاتا اور دربار کے کسی ممتاز امیر کو ان کی سرداری کے لیے نامزد کیا جاتا۔ ان پر حلیہ اور داغ کی پابندیاں برابر عائد تھیں۔ احدی کے طور پر بھرتی ہونے کے استحقاق اور طریقے کے متعلق آئین میں خاصی تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ احدیوں کی تنخواہیں عام سپاہیوں سے زیادہ ہوتی تھیں۔ اور بعض تو پانسو روپے ماہانہ تک پاتے تھے۔

پیادہ فوج اس فوج سے بہت مختلف تھی جو ہمارے زمانے میں ''انفنٹری'' کہلاتی ہے۔ اس میں پیادہ سپاہی نقل و حمل کے ملازم اور دوسرے ''شاگرد پیشہ'' سبھی شامل تھے۔ ایک حصہ بندوقچیوں پر اور دوسرا شمشیر بازوں پر مشتمل تھا۔ اول الذکر توڑے دار بندوقیں چلاتے تھے۔ اور

آخر الذکر شمشیر و خنجر سے لڑتے تھے۔ ان کے علاوہ ''دربان''، ''خدمتیے'' ''پہلوان'' اور ''کہار'' (پالکی بردار) بھی پیادہ فوج ہی میں شامل تھے۔

توپ خانہ:

مغلوں کا توپ خانہ فوج کا بہت مؤثر عنصر تھا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے توپ خانہ بابر اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہمایوں کے پاس بھی توپوں کی افراط تھی۔ توپیں صرف باہر ہی سے نہ منگائی جاتی تھیں بلکہ جنوبی ہند میں بھی ڈھالی جاتی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ بہت بھاری تھیں اور اکبر کو میکانکیات سے خاص دلچسپی تھی اس لیے اس کی نگرانی میں جو توپیں ڈھالی گئیں وہ مضبوط ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ہلکی بھی تھیں۔ اس کے علاوہ ایسی توپیں بھی تیار کی گئیں جن کے مختلف حصے الگ الگ کر کے بوقت ضرورت جوڑ لیے جاتے تھے۔ اس سے توپ خانے کے نقل و حمل میں بہت آسانی ہوگئی۔ توپخانے کا سب سے بڑا افسر ''میر آتش'' یا داروغہ توپ خانہ کہلاتا تھا۔ اور عام طور پر پنج ہزاری منصب رکھتا تھا۔ اس کی امداد کے لیے ایک مشرف بھی مقرر کیا جاتا تھا۔

بحری قوت

مغلوں کے پاس جہاز بھی تھے۔ اگرچہ اول اول تو محض تجارتی کشتیاں کافی سمجھی جاتی تھیں لیکن پرتگیزیوں سے مقابلہ ہونے پر مغلوں نے بحری قوت کو اہمیت دی اور آئین اکبری[۶۷] شاہد ہے کہ ایک امارت بحری قائم کی گئی۔ جو بندرگاہوں کے انتظام کے علاوہ بہت بڑی کشتیوں کے بیڑے کی دیکھ بھال بھی کرنے لگی۔ جن میں ہاتھی بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پر پہنچائے جاتے تھے۔ تجربہ کار ناخدا مقرر کیے گئے جو مدّ و جزر اور راستوں سے واقف تھے۔ دریائی محصولات معاف کر دیے گئے تاکہ کشتی بان کافی معاش پیدا کر سکیں۔[۶۸]

جہاز سازی:

شہنشاہ اکبر نے جہاز سازی کی صنعت کو فروغ دیا۔ اس زمانے میں شمالی ہند کے دریاؤں میں بھی جہاز چلتے تھے۔ چنانچہ لاہور، الہ آباد اور کشمیر میں جہاز سازی کے کارخانے قائم کیے گئے جن سے راوی، گنگا اور جہلم و اٹک کے ذریعے جہاز رانی بہت سہل اور عام ہوگئی۔ بعض کشتیوں پر توپیں بھی نصب کی جاتی تھیں اور بحری فوج بھی باقاعدہ عسکری نظام کے ماتحت منظم

تھی۔[۶۹]

ہاتھی

مغلوں نے ہاتھیوں پر بھی خاص توجہ صرف کی اور ان سے ہر میدانِ جنگ میں کام لیا۔ شہنشاہ کے ذاتی استعمال کے ہاتھی "خاصہ" کہلاتے تھے اور باقی دس دس، بیس بیس اور تیس تیس ہاتھیوں کے "حلقے" قائم کیے گئے تھے۔ بہت سے حلقے امرا و منصب دارانِ سلطنت کے سپرد کیے گئے تھے کہ ان کی پرورش اور دیکھ بھال کریں۔

تعداد

مختلف تاریخی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سلاطین اور بادشاہان مغل کے زمانوں میں کم و بیش تین چار لاکھ کی فوج ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اور میدان جنگ میں مغلوں کی ترتیب عسکری زیادہ تر وہی تھی جو وسط ایشیا میں مروّج چلی آتی تھی اور جس پر غزنوی، غوری اور بابر عمل کرتے تھے۔

پانچویں فصل: صوبجاتی نظم و نسق

ہندوستان کے صوبوں کی حکومتیں قریب قریب مرکزی حکومت سے ملتی جلتی تھیں۔ حاکمِ صوبہ بادشاہ کا نائب اور نظم و نسق کا رئیس اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے صوبائی محکمے بالکل مرکزی محکموں کے نمونے پر قائم تھے۔ معمولاً ان محکموں پر مرکزی حکومت کی نگرانی اور مرکزی وزراء و حکام کا اقتدار تھا۔ لیکن دور دست صوبے عام طور پر خود مختار سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع بہت محدود اور دیر طلب تھے اس لیے صوبجات کے حاکموں کو آج کل کے گورنروں سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ لیکن اس کے باوجود قاضیوں اور مال گزاری کے اعلیٰ افسروں کے تقرر کا اختیار بادشاہ ہی کے قبضے میں تھا۔ حسن نظامی نے گورنری کے لیے "ایالت" یا "ولایت داری" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابتدائی ایام میں غالباً گورنروں کے اختیارات بہت وسیع تھے۔[۷۰] ضیاء الدین برنی ان گورنروں کے لیے لفظ والی استعمال کرتا ہے۔[۷۱] ایک زمانے میں ان کو مُقطع بھی کہتے تھے۔ محمد بن تغلق کے عہد میں مقطع کی جگہ امیر نے لے لی۔ اور لودی اس حاکم کو شِقدار یا شِقداران کہا کرتے تھے۔

والیٔ ولایت کے عہدے پر پادشاہ ہمیشہ نہایت معتبر اور کار آزمودہ امیر کو مقرر کرتے اور ان سے توقع رکھتے کہ وہ سپاہیوں، ملازموں اور اہلکاروں کی حفاظت و سرپرستی، بغاوتوں کی سرکوبی، عوام کے آرام و آسائش کا اہتمام اور عدل و انصاف کا انتظام بالکل اسی طرح کریں گے جیسے مرکز میں بادشاہ کرتا ہے۔ والیوں کے فوجی اختیارات اس لیے محدود تھے کہ مملکت شاہی کے عارض الممالک کے ماتحت صوبوں میں بھی عارض مقرر تھے جو باقاعدہ اپنی رپورٹیں مرکز کو بھیجتے رہتے تھے۔ جب محمد بن تغلق کے عہد میں سپاہیوں کو تنخواہیں بصورت نقد خزانۂ عامرہ سے ادا ہونے لگیں تو فوج پر سلطنت کی گرفت اور بھی زیادہ مضبوط ہوگئی۔ ہندوستان میں جو ہندو ریاستیں موجود تھیں انھوں نے سلطان کی اطاعت تو قبول کر لی تھی اور خراج بھی ادا کرتی تھیں لیکن ان کا نظم ونسق اپنی پرانی قومی روایات کے مطابق بدستور جاری تھا اور اس میں سلطنت کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ راجا بھی آہستہ آہستہ بالکل مطیع ہوگئے اور سلطنت کے ملازمان دیوانی کے اختیارات میں اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں سلطان کی نافذ کردہ اصلاحات پر پوری قوت سے عمل درآمد ہونے لگا۔[۷۲] مرکز کی وزارت مالیات کو ہر صوبے کے مداخل و مخارج کی کیفیت بھیجی جاتی تھی۔ اور اگر کوئی والی وزیر کے اہلکاروں کو مطمئن نہ کرسکتا اور روپے کا تغلب ثابت ہوتا تو والی سے وہ روپیہ جبراً وصول کیا جاتا۔ محمد تغلق نے اس مقصد کے لیے ایک دیوان مستخرج مقرر کردیا تھا۔ فیروز شاہ کا وزیر بھی مالی معاملات میں والیوں کو بالکل درست رکھتا اور اس میں سختی کو روا رکھنا ضروری سمجھتا۔[۷۳]

ہر صوبے میں ایک ''صاحب دیوان'' ہوتا جسے عموماً خواجہ کہتے تھے۔ اس افسر کو وزیر کی سفارش پر خود بادشاہ مقرر کرتا تھا۔ اس کا کام یہ ہوتا کہ مفصل اور باقاعدہ حسابات صدر دفتر میں بھیجتا رہے۔ اگرچہ خواجہ والی کے ماتحت ہی سمجھا جاتا تھا لیکن اس کا تقرر بادشاہ کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی جواب دہی وزیر کے آگے تھی۔ اس لیے گورنر اس کے کام میں مداخلت نہ کرسکتا تھا۔ جب سلطان مسعود غزنوی نے احمد نیالتگین کو لاہور کا والی مقرر کیا تو وزیر احمد حسن نے والی کو بتایا کہ تمھارا صاحب دیوان قاضی شیراز تمھارے ماتحت ہوگا لیکن اسی ماتحت کی رپورٹوں کا نتیجہ تھا کہ والی برخاست کردیا گیا۔[۷۴]

صوبہ شقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور ہر شق کا حاکم شقدار کہلاتا تھا لیکن یہ تقسیم ان صوبوں میں ہوتی تھی جو زیادہ وسیع تھے۔ مثلاً محمد تغلق نے دکن کو چار شقوں میں تقسیم کردیا تھا۔ یہ

صوبے نہیں ہو سکتے کیونکہ دکن کی یہ چاروں شقیں ایک ہی والی کے ماتحت تھیں۔ جب محمد تغلق ہی کے عہد میں صوبہ دواب میں بغاوت پھوٹ پڑی تو شقداروں اور فوجداروں کو حکم دیا گیا کہ باغیوں کو گرفتار کرو اور لوٹ لو۔[۷۵]

جب بہلول لودی نے کمپل، پٹیالی، شمس آباد، سکیت، کول، مارہرہ اور جلالی کے پرگنے سلطان حسین شرقی سے چھین لیے تو اس نے ان میں سے ہر ایک میں شقدار مقرر کیے۔[۷۶] کچھ مدت کے بعد بڑے صوبوں کی شقوں کو سرکار کہنے لگے۔ آہستہ آہستہ جون پور، مالوہ، دکن، گجرات، پنجاب میں بڑے بڑے حاکمِ ولایت مقرر ہوئے۔ یہاں تک کہ اکبر نے جونئی تنظیم کی اس میں پورا ہندوستان صرف پندرہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔[۷۷]

شق یا سرکار کے بعد جو چھوٹی انتظامی وحدت تھی، وہ پرگنہ کہلاتی تھی۔ جس میں کم وبیش ایک سو گاؤں ہوتے تھے۔ ابن بطوطہ نے بتایا ہے کہ سو دیہات کے مجموعے کو صدی کہتے تھے۔ مثلاً نواح دہلی میں ''ہندپت'' صدی موجود تھی۔ یہ غالباً اندرپت کا پرگنہ ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صدی کی اصطلاح صرف ان پرگنوں کے لیے ہوگی جو دہلی کے آس پاس ہوں گے اور جن پر مرکزی حکومت کا براہ راست اقتدار ہوگا۔ چنانچہ ابن بطوطہ خود لکھتا ہے کہ ''جن علاقوں کا انحصار دارالخلافہ پر تھا۔ وہ صدیوں میں تقسیم کیے گئے تھے۔''[۷۸] لیکن کسی دوسرے مورخ نے صدی کا ذکر نہیں کیا بلکہ پرگنہ کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔

پرگنوں کا انتظام اور دیہات سے مالیہ وصول کرنے کا کام تمام تر ہندوؤں کے سپرد تھا (چچ نامہ)۔ محمود غزنوی نے پنجاب میں اور قطب الدین ایبک نے دوسرے مقبوضہ علاقوں میں یہی انتظام قائم رکھا اور دوسرے سلاطین بھی پٹواریوں، مکھیوں اور مقدموں ہی کے ذریعے سے مالیہ وصول کرتے رہے۔ تاریخوں میں خُوط اور بلاھر کا ذکر بھی آتا ہے جو ہمارے نزدیک ''زمیندار'' اور ''کاشتکار'' کے مترادف ہیں۔ خوط اور بلاہر بعد میں متروک ہوگئے۔ لیکن مقدم، مکھیا اور پٹواری تو آج تک چلے آتے ہیں۔ ہر پرگنے میں ایک چودھری اور ایک متصرف دونوں مالیہ وصول کرتے تھے۔ مترف یا عامل تو سرکاری ملازم ہوتا ہے لیکن چودھری لازماً کاشتکاروں کا نمایندہ تھا۔ اور غالباً ہمارے نمبردار سے ملتا جلتا ہوگا۔ افغانوں کے ماتحت ایک قانونگو کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ غالباً مقامی رواجی قوانین کا ماہر تھا۔ جو پرگنہ کی رسوم وغیرہ سے سرکاری ملازموں کو مطلع کرتا تھا۔ پھر مشرف، تحصیل، گماشتے اور سرہنگ بھی تھے اور دفتری عملہ بھی تھا۔[۷۹] مشرف ایک قسم کا انسپکٹر

تھا جو فصلوں کا معائنہ کر کے سرکاری واجبات کا فیصلہ کرتا تھا۔ اور اس کا فیصلہ غیر جانبدارانہ سمجھا جاتا تھا۔ محصل نقد یا جنس کی صورت میں وصول کرتا تھا۔ گماشتہ ایجنٹ کو کہتے ہیں یعنی کارندہ۔ سرہنگ گویا چپراسی تھا جو کاشتکاروں اور مقدموں کو سرکاری احکام اور سمن پہنچاتا تھا۔[۸۰]

رفتہ رفتہ پرگنے کا افسر شقدار کہلانے لگا۔ یہاں تک کہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں شقدار، امین یا منصف، فوطہ دار یا خزانہ دار اور کارکن مقامی نظم ونسق کے ذمہ دار تھے۔ جب سرکاریں قائم ہوئیں تو ان کے عہدے دار ''شِق دارِ شقداراں''، ''منصفِ منصفاں اور خزانہ دار کے ناموں سے موسوم ہوئے۔ غرض یہ سارا نظام آج کل کی ترقی یافتہ حکومتوں کے مقابلے میں کسی اعتبار سے پست یا وحشیانہ وقدیمانہ نہ تھا۔ بے ضابطگیاں کونسی حکومت میں نہیں ہوتیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ عمومی انتظام میں نظم ونسق کی پوری مصلحتیں کس خوش اسلوبی سے مدِنظر رکھی جاتی تھیں۔

آج کل ریلوے اور ہوائی جہاز نے ڈاک کے مسئلے کو بالکل سادہ وسہل بنا دیا ہے۔ لیکن اس وقت کا تصور کیجیے جب یہ تمام وسائل موجود نہ تھے۔ اور سلاطینِ دہلی کو پورے ملک کے انتظام کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ غیر ملکی سیاح سب کے سب سلاطین کی ڈاک اور خبر رسانی کے انتظامات کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ شاہی ڈاک دہلی سے سندھ تک صرف پانچ دن میں پہنچ جاتی ہے حالانکہ عام مسافر یہی راستہ پچاس دن میں طے کرتے ہیں۔ ڈاک کے ذریعے صرف دو تھے۔ ایک گھوڑے، دوسرے ہرکارے۔ گھوڑے ہر چار کروہ پر بدلے جاتے تھے اور ہرکاروں کا سٹیشن ایک چوتھائی کروہ ہی کے فاصلے پر ہوتا تھا۔ ہر سٹیشن پر تین تین شیڈ بنے ہوئے تھے جن میں نئے ہرکارے موجود رہتے تھے۔ جونہی آنے والے ہرکارے کی گھنٹی کی آواز آتی یہ تازہ دم آدمی ہوشیار ہوجاتے اور اس سے خطوط لے کر اگلے سٹیشن کی طرف دوڑ پڑتے ہر سٹیشن پر دس ہرکارے موجود رہتے تھے جن کو ''دھاوے'' کہا جاتا تھا۔ صرف خطوط ہی نہیں بلکہ اسی طریقے سے خراسان کے تازہ میوے اور گنگا کا پانی سلطان کے لیے دولت آباد پہنچایا جاتا تھا۔ بعض اوقات ہرکارے اسی طرح آدمیوں کو پالکی میں بٹھا کر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ منزل پر پہنچا دیتے تھے۔[۸۱] گویا سلطان و وزیر کے لیے مملکت کے مختلف حصوں کے حالات سے باخبر رہنا اور ضروری احکام وفرامین اپنے کارپردازوں کے پاس بھیجنا بالکل آسان کردیا تھا۔

سڑکوں اور شاہ راہوں کو باقاعدہ اچھی حالت میں پرامن رکھنا قلمرو کی بہبود اور تجارت

کے لیے بے حد اہم تھا۔ چنانچہ سلاطین نے ابتدا ہی سے اس کام پر اپنی توجہ مبذول رکھی۔ قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، بلبن، علاء الدین خلجی، غیاث الدین تغلق کے زمانوں میں سڑکوں کا امن و امان مسلّم تھا۔[۸۲] محمد تغلق کے زمانے میں بھی طویل اور ہر جگہ پہنچنے والی سڑکوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ مثلاً دھار اور دہلی کے درمیان چوبیس دن کی مسافت تھی اور اس سڑک پر شروع سے آخر تک ''کروہ مینار'' بنے ہوئے تھے۔[۸۳] شیر شاہ سوری نے سونار گاؤں (بنگال) سے لے کر رہتاس (سرحد شمال مغربی) تک سڑک بنائی۔ اور یاد رہے کہ اس سے پیشتر بھی لاہور اور دہلی اور بنگال کے درمیان سڑکیں موجود تھیں۔ شیر شاہ نے یہ بہت بڑی شاہ راہ بھی درست کی اور ہر کوس پر مسجدیں، سرائیں، مینار اور کنوئیں بنائے۔ یہ وہی سڑک ہے جو آج تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے نام سے مشہور ہے۔ سڑکوں پر جو خانقاہیں اور سرائیں بنائی گئیں ان میں ہندو اور مسلمان مسافروں کو سرکاری خرچ سے کھانا مہیا کیا جاتا تھا۔[۸۴] اُلاغ مقام اس سٹیشن کو کہتے تھے جہاں گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ ان مقامات پر مسجدیں، پانی کے حوض اور دکانیں موجود تھیں جن سے ہر مسافر اپنے لیے خوراک اور اپنے گھوڑے کے لیے چارہ حاصل کرسکتا تھا۔ اس زمانے میں اکثر دریاؤں میں کشتیاں اور جہاز چلتے تھے۔ مثلاً لاہور سے سندھ تک دریائی سفر ہوتا تھا۔ ان کشتیوں اور جہازوں کی حفاظت کے لیے میر بحر کی دریائی پولیس متعین ہوتی تھی۔

امن و امان کے قیام میں بھی ان سلاطین کی حکومتیں سعی بلیغ کرتی تھیں۔ رسل و رسائل کے ان تمام انتظامات میں خلل ڈالنے والے صرف وہ ہندو ٹھاکر تھے جو سرکشی کے زور میں مسافروں اور تاجروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ان ڈاکوؤں کا سب سے بڑا مرکز وہ علاقہ تھا جس کو آج کل یو۔ پی کہتے ہیں جس کے بعض حصوں میں ان ڈاکوں کی اولاد اب تک اپنے باپ دادا ہی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔[۸۵] حکومت نے جابجا شِقداروں اور فوجداروں کو قیامِ امن کی ذمہ داری تفویض کی۔ قلعے بنائے، ان میں کوتوال بٹھائے۔ باغی قبائل کے درمیان جنگجو مسلمانوں کی بستیاں بسائیں۔ مثال کے طور پر بلبن نے کمپال۔ پٹیالی اور بھوج پور میں جو ہندوؤں کے گڑھ تھے مسلمانوں کے قصبے آباد کیے اور ان میں قلعے اور مسجدیں بنوائیں۔[۸۶] بے شمار جنگل کاٹ دیے گئے تاکہ سڑکیں نکال کر ان بغاوتوں اور ڈاکوؤں کا سدِّ باب کیا جائے۔ امیر خسرو نے علاء الدین کے عہد کے متعلق لکھا ہے کہ ''وہ چور جو دیہات میں آگ لگا دیا کرتے تھے اب چراغ جلا جلا کر سڑکوں کی حفاظت کرنے لگے۔ اگر کسی مسافر کا ایک دھاگے کا ٹکڑا بھی گم ہوجاتا تو آس

پاس کے رہنے والے اس کو تلاش کر کے دیتے۔ یا اس کی قیمت ادا کرتے۔[۸۷] سکندر لودی اور شیر شاہ کے عہد امن و امان کے لیے ضرب المثل تھے۔ محمد تغلق کے زمانے میں بعض حصوں کے شریر عناصر نے بہت پریشان کیا۔ لیکن اس کی وجہ قحط سالیوں اور اندرونی بغاوتوں کے سوا کچھ نہ تھی۔ ورنہ محمد تغلق جیسا سخت گیر بادشاہ بہترین امن و امان قائم رکھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں اکبر سے پیشتر صوبجاتی نظم و نسق بے حد ناقص تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معدوم تھا۔ کیونکہ شیر شاہ نے ملک کو سرکاروں اور پرگنوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور جابجا افغان جاگیردار بیٹھے تھے جو خود ہی تمام انتظامات کرتے تھے۔ اور مرکز سے ان کا تعلق نام نہاد سا تھا۔ ہمایوں نے دوبارہ تخت نشین ہونے کے بعد پورا ملک اپنے جرنیلوں میں تقسیم کر دیا۔ لیکن یہ جاگیرداری عملاً نہایت مضرت رساں ثابت ہوئی اور اکبر نے اس کو منسوخ کر کے ملک کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا اور جب احمد نگر فتح ہوگیا تو تین مزید صوبوں کا اضافہ ہوگیا۔ اب یہ پندرہ صوبے تھے: الہ آباد، آگرہ، اودھ، اجمیر، احمد آباد، بہار، بنگال، دہلی، کابل، لاہور، ملتان، مالوہ، برار، خاندیس، احمد نگر۔ عالمگیر کے عہد میں یہ صوبے بائیس تیئس تک بڑھ گئے تھے۔

صوبے کا حاکم ''صوبہ دار'' اور ''سپہ سالار'' کہلاتا تھا۔ صوبہ سرکاروں اور پرگنوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ لیکن ابوالفضل آئین اکبری میں سرکاروں کا ذکر ایسے انداز میں کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار محض ایک ''مالیاتی وحدت'' تھی جس میں وہ چند پرگنے شامل ہوتے تھے۔ جن کے رسوم و روایات دوبارہ مالیہ قریب قریب یکساں ہوتے تھے۔ حاکم صوبہ عام طور پر شہنشاہ کا کوئی منظور نظر امیر ہوتا تھا اور اس کے تقرر میں عمر کا کوئی لحاظ نہ تھا۔ مثلاً مرزا عزیز کو کلتاش اور عبدالرحیم چھوٹی عمر ہی میں گورنر بنا دیے گئے تھے۔ صوبہ دار نہ جنگ و صلح کا اعلان کر سکتا تھا نہ جھروکہ درشن میں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے سوا وہ ہر اعتبار سے اپنے صوبے کا حکمران تھا۔ وہ انتظامی، عدالتی اور فوجی محکموں کا رئیس اعلیٰ تھا۔ قاضیوں اور میر عدلوں کے فیصلوں کی اپیل اس کے ہاں ہوتی تھی۔ چند اعلیٰ افسروں کے سوا جن کا تقرر بارگاہِ شہنشاہی سے ہوتا تھا دوسرے تمام سرکاری ملازموں کا تقرر و تنزل گورنر کے اختیار میں تھا لیکن وہ نہ تو مذہبی امور میں مداخلت کر سکتا تھا نہ شہنشاہ کی منظوری کے بغیر سزائے موت دے سکتا تھا۔

صوبہ دار کے ماتحت یہ عہدے تھے۔ دیوان، صدر، عامل، بتیکچی، فوطہ دار یا خزانہ دار، فوجدار، کوتوال، واقعہ نویس اور مالگزاری کے دوسرے اہلکار مثلاً قانونگو اور پٹواری۔

دیوان۔ مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر ہو کر آتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ صوبہ دار کو نظمِ حکومت کے کام میں مدد دے۔ لیکن اس کے حرکات و افعال پر بھی نظر رکھے۔ خزانہ اس کے ماتحت تھا اور وہی صرفِ زر کے احکام صادر کرنے کا مختار تھا۔ اگر صوبہ دار اور دیوان کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جاتا تو معاملہ مرکزی حکومت میں پیش کیا جاتا تھا۔

صدر۔ اس عہدہ دار کو بھی مرکزی حکومت ہی مقرر کرتی تھی۔ یہ دیوان سے بھی زیادہ خودمختار تھا کیونکہ مذہبی امور اس کے ماتحت تھے۔ قاضی اور میر عدل اسی کے ماتحت کام کرتے تھے اور یہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ کے باعث واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ اور اپنے اختیار سے زمین اور وظائف عطا کر سکتا تھا۔

عامل۔ یہ گویا محکمہ مال گزاری کا رئیس اعلیٰ تھا۔ اس کے ماتحت کارکن، مقدم اور پٹواری تھے۔ اس کے فرائض یہ تھے کہ مال گزاری کی تجویز میں پوری احتیاط سے کام لے۔ نادہندگی کی سخت سزا دے۔ رہزنی اور ڈاکے کے مجرموں کو سزا دے کر امن وامان قائم رکھے۔ کاشت اراضی پر نگرانی رکھے۔ زمینداروں، جاگیرداروں اور بازار کی قیمتوں کے متعلق پوری معلومات حکومت کو بہم پہنچائے اور رشوت کا سد باب کرے۔

بتیکچی۔ یہ عامل کے برابر حیثیت رکھتا تھا اور قانونگوؤں کے کام کی نگرانی اس کے سپرد تھی۔ وہ اپنے علاقے کے رسوم و رواجات سے پوری طرح واقف ہوتا تھا۔ قابل کاشت اور ناقابل کاشت اراضی کے نقشے تیار کرنا، آمدنی اور خرچ کے متعلق بیانات مرتب کرنا اور اراضی اور مالگزاری کے متعلق سالانہ رپورٹ مرکزی حکومت کو بھیجنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

خزانہ دار۔ یہ کاشت کاروں سے تمام رقوم وصول کرتا تھا۔ خزانہ اس کی تحویل میں رہتا تھا۔ روزنامچہ باقاعدہ لکھنا اور رسیدیں دینا اس کا فرض تھا۔ اس کو حکم تھا کہ دیوان کے دستخط شدہ واؤچر کے بغیر کوئی رقم کسی کو ادا نہ کرے۔

فوجدار۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ مددگار اور ماتحت افسر کی حیثیت سے فوجدار سب سے ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ وہ صوبائی فوج کا کمانڈر ہونے کی وجہ سے صوبہ دار کو قیام امن وامان میں مدد دیتا تھا۔ صوبے میں متعدد فوجدار ہوتے تھے۔ ہر فوجدار چند پرگنوں کا انچارج ہوتا تھا۔ جب عامل کو وصول مالگزاری کے سلسلے میں کسی نادہند یا سرکش گاؤں سے سابقہ پڑتا تو اس کی تحریری اطلاع پر فوجدار اس کو فوجی امداد مہیا کرتا۔ اس افسر کا تقرر و تنزل صوبہ دار کے اختیار

میں تھا۔

کوتوال۔ آئینِ اکبری میں کوتوال کے فرائض تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اصلاً یہ پولیس افسر تھا لیکن بعض معاملات میں اسے مجسٹریٹی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔ شہروں میں امن و امان قائم رکھنا اس کا سب سے بڑا فرض تھا۔

واقعہ نویس۔ یہ لوگ صوبے کے واقعات، صدر مقام کی تقریبات اور ہر قسم کی خبریں لکھ کر مرکزی حکومت کو بھیجتے تھے۔ اور شہنشاہ کو ملک بھر کے حالات سے مطلع رکھتے تھے۔ ان کا کام بے حد نازک تھا اس لیے کہ اگر ان کی مہیا کی ہوئی اطلاع کسی دوسرے ذریعے سے غلط ثابت ہو جاتی۔ یا ان کی واقعہ نویسی میں جانب دارانہ پہلو پیدا ہوتا تو ان پر آفت آ جاتی۔ ان کو ہدایت تھی کہ جب کسی افسر کو کوئی ناواجب حرکت کرتے دیکھیں تو اس کو سمجھائیں کہ اگر آپ اس حرکت سے باز نہ رہے تو پھر شکایت نہ کیجیے گا کیونکہ واقعہ من و عن شہنشاہ تک پہنچ جائے گا۔

مالگزاری کے چھوٹے ملازم۔ مقدم، قانونگو اور پٹواری قریب قریب وہی حیثیت رکھتے تھے جو آج کل رکھتے ہیں۔ اور ان کے فرائض بھی وہی تھے جو زمانہ حاضر میں نمبرداروں، قانونگوؤں اور پٹواریوں کے ہیں۔

قاضی۔ میر عدل اور مفتی کی مدد سے عدل و انصاف کا کام سرانجام دیتے تھے۔ ان کے فیصلوں کی اپیل صوبہ دار کی عدالت میں ہو سکتی تھی۔ جب عدلیہ کے افسروں کے درمیان کوئی اختلاف ہوتا تو اس کا فیصلہ مرکزی حکومت ہی کر سکتی تھی۔ ملزموں کو عدالت میں حاضر کرنا کوتوال کا فرض تھا۔ کوئی ملزم سماعت مقدمہ کے بغیر ایک رات سے زیادہ قید خانے میں نہ رکھا جا سکتا تھا۔ غرض افسروں اور اہلکاروں کے کام پر ہر قسم کی نگرانی اور طرح طرح کی قیود عائد تھیں جن سے مقصد یہ تھا کہ جبر، زیادہ ستانی اور بے انصافی کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔ صوبہ دار بھی مطلق العنان نہ تھا۔ لیکن فاصلوں کی دوری، رسل و رسائل کی مجبوری اور جنگ و بغاوت کی حالت میں اسے بعض اختیاراتِ تمیزی حاصل تھے تاکہ انتظام میں خلل نہ پڑنے پائے۔

مغلوں کے دور میں عوام نہایت مطمئن تھے۔ چراگاہوں کی کمی نہ تھی۔ اور دودھ گھی افراط سے اور ارزاں مل سکتے تھے۔ اکبر نے مالگزاری کا جو نظام قائم کیا تھا وہ کاشت کاروں کے لیے رحمت تھا۔ سرکاری واجبات مقرر و معیّن تھے اور ہر کاشت کار کو معلوم تھا کہ اس کے ذمے کتنی رقم یا جنس وغیرہ واجب الادا ہے۔ حکومت کے افسروں کو فریب کاری اور رشوت ستانی سے باز

رکھنے کے لیے ایسے معقول تحفظات مہیا کیے گئے تھے جو بہترین انسانی دانش و تدبر سے وجود میں آسکتے تھے۔ شہنشاہ کے حکام اعلیٰ دیانت دار تھے۔ اور ٹوڈرمل کی عقابی نظر انتظامات کے ایک ایک گوشے کو انتہائی حزم و احتیاط سے دیکھ رہی تھی۔ اگر کہیں زیادہ ستانی یا غصب و جبر کا سراغ ملتا تو مجرموں کو سخت سزائیں دی جاتیں۔ اور کوئی شخص بلوہ بچ کر نہ سکتا تھا۔ جیسے آج کل چالاک وکلاء کی مدد سے اکثر مجرم چھوٹ جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ دور دست صوبوں میں شہنشاہ کے منشا پر پوری طرح عمل نہ ہوتا ہو اور افسر اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال بھی کرتے ہوں لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکتا کہ شرح مالگواری کا بوجھ کاشتکاروں کے لیے ناگوار تھا۔ اور اہلکاران مالگزاری عام طور پر سرکاری ہدایات کی خلاف ورزی کرتے تھے۔[۸۸]

مسافروں کے آرام و آسائش کے لیے سڑکوں کے کناروں پر سایہ دار درخت لگوائے جاتے تھے۔ ان درختوں میں بیشتر تخمی میوہ دار درخت بھی ہوتے تھے۔ مثلاً بیر، جامن، توت، آم وغیرہ اور ہر گاؤں میں مسافروں کی شب باشی کے لیے تکیے اور دائرے تعمیر کرائے گئے تھے جہاں آگ، پانی اور خوراک کا انتظام گاؤں والوں کی طرف سے ہوتا تھا۔ بعض بڑی بڑی خانقاہوں اور مقابر کے نام جاگیریں بھی عطا کی جاتی تھیں۔ جہاں درس و تدریس کا مشغلہ جاری رہتا تھا اور طالب علموں اور عالموں کو خوراک اور ضروریاتِ زندگی ملتی تھیں۔[۸۹]

حواشی

[۱] چچ نامہ۔

[۲] زینت التواریخ اور تاریخِ ملکم صاحب۔

[۳] تزکِ بابری۔

[۴ و ۵] آرنلڈ کی ''خلافت''، ص ۴۳-۴۷ اور ۱۰۱ و ۱۰۲، بحوالہ چہار مقالہ نظامی عروضی۔

[۶] منہاج سراج، ص ۷۶-۱۲۵۔

[۷] منہاج سراج، ص ۱۷۴۔

[۸] منہاج سراج، ص ۴۳-۴۳۳۔

[۹] ضیاء الدین برنی، ص ۲۰۸-۲۱۲۔

[۱۰] قصائد بدر چاچ، ص ۲۹۔

[۱۱] عفیف، ص ۲۷۴-۲۷۵۔

[۱۲] تاریخ مبارک شاہی، ص ۱۱۵-۱۱۶۔

[۱۳] ضیاء الدین برنی، ص ۲۱۶ و ۲۱۷۔

[۱۴] ضیاء الدین برنی، ص ۳۱۱۔

[۱۵] منہاج سراج، ص ۱۹۱- ۱۹۸- ۲۰۸۔

[۱۶] عصامی، ص ۱۹۹- ۳۴۱- ۳۴۵۔

[۱۷] تغلق نامہ، ص ۱۴۱۔

[۱۸] ضیاء الدین برنی، ص ۱۷۳۔

[۱۹] ابنِ بطوطہ، جلد ۳، ص ۲۱۷ سے ۲۴۲ تک۔

[۲۰] سیاست نامہ، ص ۸۲۔

[۲۱] اکبر نامہ، ص ۲۰۲- ۳۰۶۔

[۲۲] ابنِ بطوطہ، جلد ۳، ص ۲۲۳- ۲۲۴۔

[۲۳] برنی، ص ۹۰۔

[۲۴] ابنِ بطوطہ، جلد ۳، ص ۲۲۸- ۲۳۲۔

[۲۵] برنی، ص ۳۷۵۔

[۲۶] منہاج سراج، ص ۲۳۸۔

[۲۷] تمدنِ اسلامی، جرجی، زیدان، ص ۹۶۔

[۲۸] جرجی، زیدان، التمدن الاسلامی، ص ۱۱۵- ۱۱۶۔

[۲۹] سراج عفیف، ص ۴۱۹- ۴۲۰۔

[۳۰] عفیف، ۴۰۹- ۴۱۰۔

[۳۱] ابنِ بطوطہ، جلد سوم، ص ۳۳۲۔

[۳۲] ابنِ بطوطہ، جلد سوم، ص ۳۷۷۔

[۳۳] برنی، ص ۴۷۰۔

[۳۴] سیاست نامہ، ص ۴۹۔

[۳۵] خزائن المفتوح، ص ۱۸۔

[۳۶] آئینِ اکبری و اکبر نامہ۔

[۳۷] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد اوّل، ص ۱۰۵۱۔ عفیف، ص ۳۸۳۔

[۳۸] راجستھان، ص ۱۱۱۶۔

[۳۹] برنی، ص ۲۸۷ و ۳۸۳۔

[۴۰] توزکِ بابری، دوم، ص ۳۴۵۔

[۴۱] توزکاتِ تیموری، ص ۳۶۲۔

[۴۲] تحفۃ الکرام، ف۔ ۲۶۰ ب۔

[۴۳] عفیف ۱۰۳۔ تاریخ مبارک شاہی، ۱۸۷-۲۲۵۔

[۴۴] آئینِ اکبری۔

[۴۵] فتوحاتِ فیروز شاہی، ف ۳۰۰ ب۔

[۴۶] ہدایہ، ص ۱۷ تا ۱۴۔

[۴۷] ابنِ بطوطہ، گِب، ص ۱۴۵۔

[۴۸] اشتیاق قریشی: "نظم سلطنتِ دہلی"، ص ۱۲۶-۱۲۷۔

[۴۹] برنی، ص ۶۲-۱۰۱-۱۰۲۔

[۵۰] سروانی، ف ۶۸ ب۔

[۵۱] منہاج سراج، ۳۲۳۔ برنی ۵۹-۱۰۹۔ تاج المآثر، ف ۶۷ ب۔

[۵۲] برنی، ص ۳۰۳۔

[۵۳] اشتیاق قریشی، بحوالہ ہائے مختلف۔

[۵۴ و ۵۵] اشتیاق قریشی، بحوالہ ہائے مختلف۔

[۵۶] صبح الاعشا، ص ۶۷۔

[۵۷] بیہقی، ص ۶۱۳ وغیرہ۔

[۵۸] تغلق نامہ، ص ۱۲۸-۱۳۳۔

[۵۹] برنی، ص ۴۹۵۔

[۶۰] سروانی، ف ۷۳ ب۔

[۶۱] صبح الاعشا، ص ۶۶۔

[۶۲] فرشتہ اوّل، ۲۰۰۔

[۶۳] عفیف، ۲۹۸۔ صبح الاعشا، ص ۷۱۔

[۶۴] عفیف، ص ۲۹۸۔ صبح الاعشا، ص ۷۱۔

[۶۵] آئینِ اکبری، جلد اوّل، ص ۲۵۴۔

[۶۶] آئینِ اکبری، جلد اوّل، ص ۲۴۹ و ۲۵۰۔

[۶۷] آئینِ اکبری، جلد اوّل، ص ۲۷۰۔

[۶۸ و ۶۹] ایشوری پرشاد، تاریخ حکومتِ مسلم در ہند، ص ۳۳۸۔

[۷۰] تاج المآثر، ف ۴۸ ب، ۱۲۴ ب۔

[۷۱] برنی، ۸۱-۹۵ وغیرہ۔

[۷۲] برنی، ۲۸۸-۲۸۹۔

[۷۳] عفیف، ۳۹۷۔

[۷۴] بیہقی، ۴۹٦-۴۹۸۔

[۷۵] برنی، ۳۹۷۔

[۷٦] طبقاتِ اکبری، جلد اوّل، ص ۳۱۰۔

[۷۷] آئینِ اکبری، ۱-۳۔

[۷۸] ابنِ بطوطہ، جلد سوم، ص ۳۸۸-۳۸۹۔

[۷۹] برنی، ۲۸۸-۲۸۹۔

[۸۰] برنی، ۲۸۸۔

[۸۱] ابنِ بطوطہ، جلد سوم، ۹۵-۹٦۔

[۸۲] تاج المآثر، ف ۱۲۹۔ برنی، ۵۷-۵۸۔

[۸۳] برنی، ۴۴۳۔ ابنِ بطوطہ، جلد چہارم، ص ۴۲-۴۳۔

[۸۴] خلاصۃ التواریخ، سوجان رائے، ف ۱۵٦۔

[۸۵] اشتیاق قریشی، ''نظم ونسق سلطنتِ دہلی''، ص ۲۰۱۔

[۸٦] برنی، ۵۸۔

[۸۷] خزائن الفتوح، ۱۹-۲۰۔

[۸۸] ایشوری پرشاد، ''مسلم حکومت کی تاریخ''، ص ۳۳۲۔

[۸۹] تاریخِ فرشتہ، عہدِ شہنشاہ اکبر۔

چوتھا باب

علوم وفنون

پہلی فصل: علم اور تعلیم کی سرپرستی

ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں حکمران کی ذات کو سیاست، معاشرت، جنگ دفاع اور دوسری ملکی سرگرمیوں کے اعتبار سے مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل تھی اور ملک کی خوشحالی یا بدحالی کا تمامتر انحصار حکمران ہی کی صفات پر تھا۔ علوم وفنون کی ترویج وترقی کا بھی یہی حال تھا۔ اکثر سلاطین اپنے ثقافتی فرائض کا احساس رکھتے تھے اور ان کے زمانوں میں علوم اور درس و تدریس نے حیرت انگیز ترقی کی کیونکہ سلاطین علم کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنے اوقات بھی وقف کرتے تھے اور روپیہ بھی پانی کی طرح بہاتے تھے۔ اس فصل میں یہ بتانا مقصود ہے کہ سلطان محمود غزنوی سے لے کر آخری بادشاہوں تک علما کی قدردانی اور ترویج علم کے سلسلے میں کیا کام ہوا۔

محمود غزنوی

تمام مؤرخین متفق ہیں کہ محمود غزنوی علم وفن کی قدردانی میں اپنے تمام معاصر حکمرانوں سے بڑھا ہوا تھا۔ حمد اللہ مستوفی کا بیان ہے کہ ہر سال یہ سلطان علماء وشعرا کی امداد میں جو روپیہ صرف کرتا تھا اس کی مقدار چار لاکھ دینار تھی۔[۱] اس نے مرمرِ خارا کی ایک عظیم الشان اور خوبصورت مسجد بنائی جو بیش بہا قالینوں اور سنہری و روپہلی فانوسوں اور آرائش کے دوسرے سامانوں سے مزین تھی۔ ایک دارالعلوم قائم کیا جس میں مختلف زبانوں کی بیشمار عجیب و نادر کتابیں جمع کیں۔ اس کے ساتھ ایک عجائب گھر بھی تھا۔ اس وسیع ادارے کے انصرام کے لیے، طلبہ کے گزارے کے لیے اور علوم وفنون کے عالی قدر اساتذہ کے لیے خطیر رقم وقف کی۔ عنصری ایک بہت بڑا عالم، فلسفی اور شاعر تھا جسے محمود نے اپنے دربار میں ادبیات کا محتسب مقرر کر رکھا

تھا۔ وہ غزنی کی اس یونیورسٹی کی صدر مدرسی پر مامور ہوا۔[۲] فرشتہ کا بیان ہے کہ کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں علماء وفضلا کا اتنا بڑا مجمع نہ تھا جتنا محمود غزنوی نے اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔[۳]

محمود کے جانشین

محمود کا جانشین مسعود علماء وفضلا کا اتنا بڑا قدر دان تھا کہ وہ دور دور سے اس کے دربار کی طرف کھچے چلے آتے تھے۔ ان میں ایک بہت بڑا فلسفی اور ہیئت دان ابوریحان خوارزمی تھا۔ جس نے علم ہیئت پر ایک عمدہ کتاب ''مسعودی'' کے نام سے لکھی جس کے صلے میں اس کو ایک ہاتھی کے بار کے برابر چاندی عطا کی گئی۔ ایک اور فقیہ و عالم ابومحمد نساہی نے امام ابوحنیفہؒ کی فقہ پر کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نام بھی سلطان کے نام پر مسعودی ہی رکھا گیا۔ مسعود نے اپنے عہد حکومت کے آغاز میں بہت سی مسجدیں بنائیں اور اپنی قلمرو کے مختلف شہروں میں بے شمار مکاتب و مدارس قائم کر کے ان کو عطیات و اوقاف سے مالا مال کیا۔[۴] سلطان علماء کی صحبت کو بے حد پسند کرتا تھا اور وہ بھی اس کے اس قدر گرویدہ تھے کہ اپنی کتابیں اسی کے نام پر معنون کرتے تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں اتنے مدرسے، مسجدیں اور دینی ادارے تعمیر کیے کہ ان کا شمار میں آنا مشکل ہے۔[۵] البیرونی جیسا نامور عالم مسعود ہی کے دربار میں تھا جس نے ہندوؤں کے علوم وفنون کو سنسکرت سے ترجمہ کیا اور ریاضیات، فلکیات، نجوم، فلسفہ، طب، دواسازی کے علوم کی طرف مسلمان علماء ومترجمین کی توجہ مبذول کرادی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی حکایات وغیرہ کا ترجمہ بھی عربی اور فارسی میں ہونے لگا۔[۶]

غزنوی خاندان کا ایک سلطان ابراہیم تھا۔ اسے تعلیم دینیات سے بے حد شغف تھا۔ وہ مذہب و اخلاق پر امام یوسف سجاوندی کے مواعظ باقاعدہ سنتا۔ اور امام صاحب کی زجر و تنبیہ پر نہایت نیازمندانہ سرتسلیم خم کر دیا کرتا۔[۷]

سلطان بیرام بن مسعود کی تشنگی علم غیر معمولی تھی۔ اس نے بھی علماء وفضلا کی قدردانی فیاضانہ کی اور جو علما اس کے دربار میں جمع ہوئے ان میں شیخ نظامی گنجوی (صاحب مخزن اسرار) اور سید حسن غزنوی تھے۔ یہ دونوں شعر و فلسفہ کی دنیا میں نامور تسلیم کیے جاتے تھے۔ سلطان نے بہت سی غیر ملکی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا جن میں کلیلہ دمنہ بھی شامل ہے۔

محمد غوری

سلطان محمد غوری کو علم کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ اس کی زندگی زیادہ تر فوجی کارناموں میں بسر ہوئی۔ لیکن اجمیر پہنچ کر اس نے بھی مسجدیں تعمیر کیں اور مدرسے قائم کیے۔[۸] یہ معلوم ہے کہ محمد غوری کے ہاں کوئی بیٹا نہ تھا اور وہ اپنی تمام تر شفقت پدرانہ اپنے ترکی غلاموں پر صرف کرتا تھا۔ ان غلاموں میں قطب الدین ایبک (سلطان ہند)، تاج الدین یلدوز (حکمران غزنی) اور نصیر الدین قباچہ (حاکم ملتان و سندھ) بھی تھے۔ جنہیں محمد غوری نے نہ صرف علوم زمانہ کی بلکہ فنونِ حکومت کی تعلیم بھی دلوائی۔ اور انہیں اس قابل بنا دیا کہ وسیع مملکتوں پر کامیابی سے حکومت کر سکیں۔[۹]

خاندانِ غلاماں

قطب الدین ایبک نے نیشاپور میں فارسی اور عربی کے علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے نائب بختیار خلجی نے ملک کے مختلف حصوں میں بے شمار مسجدیں تعمیر کیں اور مدرسے قائم کیے۔[۱۰] التمش اپنی سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے علوم وفنون کی طرف کافی توجہ نہ کر سکا حالانکہ وہ علماء وفضلا کا بے حد قدر دان تھا اور اس کے زمانے میں دہلی اہل کمال کا مرکز بن چکا تھا۔ نور الدین محمد غوری جس نے فارسی میں تاریخی حکایات کا ایک پسندیدہ مجموعہ مرتب کیا تھا اسی سلطان کے دربار میں اس کی فیاضی سے بہرہ اندوز تھا۔ فخر الملک تیس سال تک خلیفہ بغداد کا وزیر رہا اور علم و دانش کے لیے مشہور و نامور تھا۔ التمش نے اس کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا جس سے اس کی علم دوستی اور مردم شناسی ظاہر ہے۔ التمش نے ایک بڑا مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس کو کوئی ایک سو سال کے بعد فیروز تغلق نے بہت خستہ حالت میں پایا اور اس کو دوبارہ تعمیر کرایا اور اس میں چوب صندل کے دروازے لگوائے۔[۱۱] التمش نے اپنے بیٹے محمود اور بیٹی رضیہ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطانہ رضیہ قاریۂ قرآن بھی تھی۔ علماء کی قدر دان بھی تھی۔ اس نے دہلی میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا جس کو ''مدرسہ مُعزّیہ'' کہتے تھے جب قرامطہ و ملاحدہ نے دہلی پر حملہ کیا تو ان کا ایک دستہ بازار بزازاں میں سے گزر کر اس مدرسے کے صدر دروازے میں گھس گیا اور سمجھا کہ یہ جامع مسجد ہے۔ وہاں ان لوگوں نے عوام پر حملہ کر کے ان کو تہ تیغ کیا۔ اس سے اس مدرسے کی عظمت تعمیر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[۱۲]

ناصر الدین محمود

ناصر الدین محمود نہایت درویش صفت بادشاہ تھا۔ خود عالم تھا اور اپنے ہست سالہ عہدِ حکومت میں علم دوستی کا حق ادا کرتا رہا۔ اپنی معاش کتابت سے پیدا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خوبصورت قران مجید ایک سو سال بعد قاضی کمال الدین نے ابن بطوطہ کو دکھایا تھا۔[۱۳]

یہ سلطان ادبیاتِ فارسی کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ سراج کی مشہور تاریخ طبقاتِ ناصری اسی سلطان کے دربار میں لکھی گئی۔ چنانچہ اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس وقت جالندھر میں ایک بڑا مدرسہ موجود تھا۔ جب اُلغ خاں اعظم کے ساتھی ایک مہم میں کامیابی حاصل کر کے دہلی واپس جا رہے تھے تو انہوں نے عید الضحیٰ کی نماز اسی مدرسے کے ہال میں ادا کی تھی۔[۱۴]

بلبن

ناصر الدین محمود کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا۔ یہ بھی علم و فن کا مربی تھا اور اس کے دربار میں متعدد فضلا جمع تھے۔ جب اسی زمانے میں چنگیز خاں نے خراسان وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا تو پندرہ شہزادے بے خانماں ہوکر دہلی آ گئے تھے جن کی پذیرائی اور مدارات بلبن نے نہایت شاہانہ پیمانے پر کی تھی۔ ان شہزادوں کے ساتھ اس زمانے کے بڑے بڑے علما بھی تھے۔ گویا ہندوستان کے سلطان کا دربار علم اور دولت دونوں کا مرکز تھا۔[۱۵]

سلطان بلبن کا بڑا بیٹا محمد بہت خوش ذوق نوجوان تھا۔ چنانچہ اس نے اساتذہ کے کلام میں سے بیس ہزار شعر کی ایک بیاض بھی مرتب کر رکھی تھی۔ اس شہزادے کی توجہ سے دہلی میں بہت سی ادبی مجالس قائم ہوگئی تھیں۔ خود شہزادے کی مجلس اس کے محل میں منعقد ہوتی تھی۔ جس کی صدارت اس کا اتالیق امیر خسرو کرتا تھا۔ سلطان کے دوسرے لڑکے قرہ خان بُغرا نے بھی ایک ادبی مجلس قائم کی۔ یہ رسم جو چلی تو امرا نے اپنی اپنی مجلسیں مرتب کر لیں۔ چنانچہ دہلی کا کوئی محلّہ ان مجلسوں سے خالی نہ رہا۔ ان میں شعرا اشعار پڑھتے، قصہ گو داستانیں سناتے اور رقص و موسیقی کے مظاہرے بھی کیے جاتے۔ علم و ادب کا چرچا گھر گھر پھیل گیا۔[۱۶]

یہاں تک کہ شہزادہ محمد نے بعض باکمالوں کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ اس زمانے کے علما و ادبا کی سیر چشمی ملاحظہ ہو کہ شہزادہ لاہور میں ایک نامور فاضل شیخ عثمان ترمذی کے پاس حاضر ہوا۔ ہدایا پیش کیے۔ منت سماجت کی کہ آپ توران واپس نہ جایئے لیکن شیخ نے منظور نہ کیا۔ علاوہ

بریں اس نے دو دفعہ اپنے قاصد شیراز بھیجے اور شیخ سعدی سے استدعا کی کہ آپ ہندوستان تشریف لے آئیے۔ کچھ تحائف بھی بھیجے اور روپیہ بھی ارسال کیا۔ اور یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ شیخ سعدی کے لیے ملتان میں ایک خانقاہ بھی بنوا دی جائے گی اور چند گاؤں اس کے مصارف کے لیے وقف کردیئے جائیں گے۔ شیخ نے دونوں دفعہ ضعف پیری کے بہانے سے انکار کردیا۔ کچھ اشعار بطور معذرت لکھ بھیجے۔ اور لکھا کہ آپ کی مجلس کے صدر امیر خسرو بہت قابل اور باکمال ہیں۔ انہی پر اکتفا کیجئے۔[۱۷]

سلطان بلبن نے ایک دفعہ شہزادہ محمد کو نصیحت کی کہ علم و دانش رکھنے والے لوگوں کا سراغ لگانے میں انتہائی کوشش کرو اور اپنی مہربانی اور دریا دلی سے ان کو اپنا بنالو۔ تاکہ وہ تمہاری مشاورت کی روح اور تمہارے اقتدار کی پشت پناہ بن جائیں۔ پھر جب بلبن فتح بنگالہ کے بعد واپس دہلی آیا تو اس نے ایک تو فخر الدین کوتوال کو بڑے بڑے اعزازت دیئے کیونکہ اس نے اس کی سہ سالہ غیر حاضری میں دہلی کا انتظام نہایت دانشمندی سے کیا تھا۔ اور اس کے بعد خود بنفس نفیس بعض علماء و فضلا کے مکانوں پر گیا اور انہیں بیش قیمت تحائف دیئے۔[۱۸] بلبن ہی کے عہد میں شیخ شکر گنج، شیخ بہاؤالدین، شیخ بدر الدین عارف غزنوی، قطب الدین بختیار کاکی، سید مولیٰ اور دوسرے متعدد ماہرین علوم و فنون موجود تھے اور سلطان ان سب پر اپنی توجہات مبذول رکھتا تھا۔ سیدی مولی نے دہلی میں ایک مرکز علوم بھی قائم کرلیا تھا۔ اور ایک خیرات خانہ بھی کھولا تھا جس سے فقراء، درویشوں اور مسافروں کی مدد کی جاتی تھی۔[۱۹] سیّدی مولی علم و تقویٰ میں مشہور تھے لیکن جلال الدین خلجی کے زمانے میں بعض لوگوں نے ان کو خلیفۂ اسلام بنانے کی سازش کی اور وہ بیچارے بھی متہم ہوکر جلال الدین خلجی کے حکم سے قتل کردیے گئے۔

خاندانِ خلجی

سلطان جلال الدین خلجی بھی علم و ادب کا قدردان اور مربی تھا۔ اس کی مجالس میں امیر خسرو، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، مؤید دیوانہ، امیر ارسلاں قلی، اختیار الدین یاغی اور باقی خطیر جیسے شعرا و مؤرخین و علما شامل ہوتے تھے۔ سلطان نے اپنے زمانۂ شہزادگی ہی میں امیر خسرو کو وظیفہ عطا کیا تھا اور جب خسرو عارض الممالک کے عہدے پر فائز ہوا تو اس کو بارہ سوٹنکہ انعام بھی دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد سلطان نے اس کو اپنا مصحف بردار مقرر کیا۔ امرا میں شامل کرکے

اس کو اجازت دے دی کہ سفید کپڑوں میں حاضر دربار ہوا کرے۔ یہ وہ امتیاز تھا جو صرف خاندان شاہی کے ارکان اور بڑے امرا ہی کو دیا جاتا تھا اس کے علاوہ امیر خسرو کو کتب خانہ شاہی دہلی کا مہتمم بھی مقرر کیا۔

علاء الدین خلجی

علاء الدین خلجی پہلے پہلے تو علم و ادب سے بیگانہ تھا۔ نہ خود پڑھا لکھا تھا نہ اپنے شہزادوں کی تعلیم پر متوجہ تھا لیکن کچھ مدت کے بعد اسے ناخواندگی کا احساس ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے پڑھنا شروع کیا اور جب فارسی کی کتابیں سمجھنے لگا تو علماء کی صحبت سے بھی مستفیض ہونے لگا۔ مثلاً وہ مولانا کہرامی اور قاضی مغیث الدین کا بے حد احترام کرتا تھا۔ معلوم ہے کہ وہ ایک دفعہ قاضی مغیث الدین کی بیباکی اور صاف گوئی پر غضب ناک ہوگیا تھا لیکن دوسرے ہی دن اس نے اپنے روّیے کی تلافی کے لیے قاضی کو ایک ہزار تنکہ اور ایک طلا کار صدری عنایت کی تھی۔

اگرچہ سلطان علاء الدین خلجی علماء و فضلا سے علی العموم نہایت تکبر و تغافل سے پیش آتا تھا۔ لیکن چونکہ علم کا چرچا عام ہو چکا تھا اور اہل دہلی علم دوستی کی روح سے سرشار تھے اس لیے دہلی بڑے بڑے اہل کمال کا مرکز بن رہا تھا۔[۲۰] فرشتہ لکھتا ہے کہ بے شمار محل، مساجد، دارالعلوم، حمام، مقبرے، قلعے، سرکاری و غیر سرکاری عمارتیں یوں تعمیر ہوگئیں۔ گویا یہ سارا کام جادو کے زور سے ہو رہا ہے۔ علماء کا اتنا ہجوم مختلف علاقوں سے کبھی نہ ہوا تھا۔ علوم و فنون کے بڑے بڑے ماہرین میں پینتالیس ایسے تھے جو دارالعلوموں میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔[۲۱] سلطان علاء الدین خلجی کا وزیر شمس الملک بہت فاضل آدمی تھا اور زمانے کے بڑے بڑے علماء اس کے شاگرد تھے۔ اگر سلطان علاء الدین شمس الملک کے تمام مشوروں پر عمل کرتا تو اس کے لیے اور ہندوستان کے لیے بے حد مفید ہوتا۔[۲۲] قاضی مغیث الدین کے بھائی سید تاج الدین اور سید رکن الدین اس زمانے میں علم و تقویٰ کے لیے مشہور تھے۔[۲۳] حضرت نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ اور شیخ عثمان (مخدوم سراج الدین) بھی اسی زمانے میں ہوئے ہیں اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس ایک بیش بہا کتب خانہ بھی تھا۔

برنی کے بیان کے مطابق اس سلطان کے زمانے میں علم بدیع و بیان، فقہ، اصول فقہ، اصول دین، نحو، تفسیر وغیرہ کے بعض اتنے بڑے علما دہلی میں جمع تھے جو بخارا، سمرقند، بغداد، قاہرہ،

دمشق، اصفہان اور تبریز کے عالی مرتبت علما سے بھی زیادہ فاضل تھے۔ برنی نے ان کے علاوہ کوئی پچاس اور علما کے نام بھی لکھے ہیں۔ دہلی میں جمال الدین شاطبی، علاء الدین مقری اور خواجہ ذکی جیسے مفسر اور مولانا عماد الدین حسن، مولانا حامد، مولانا لطیف اور ان کے صاحب زادے مولانا ضیاء الدین سنامی اور شہاب الدین خلیلی جیسے واعظین ہفتے میں ایک دن "تذکیر" منعقد کرتے تھے۔ کبیر الدین ادب و خطابت میں نامور تھا۔ برنی اس کے "فتح ناموں" کی بے حد تعریف کرتا ہے۔ اطبّا میں بدر الدین دمشقی، صدر الدین، جوینی طبیب وغیرہ بہت باکمال تھے۔ ان کے علاوہ چند منجم اور موسیقار بھی موجود تھے۔

خاندانِ تغلق

مبارک خلجی کا دور علم و فضل کے لیے موافق نہ تھا۔ کیونکہ بادشاہ عیش و عشرت اور غفلت کا شکار ہوگیا تھا اور اہل کمال دہلی کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ لیکن غیاث الدین تغلق نے علما و فضلا کی سرپرستی کی۔ مدرسے قائم کیے اور علما، شیوخ و سادات کو وظیفے عطا کیے اور ایک فقہ بھی مرتب کی جو قرآن اور سلطنتِ دہلی کے بعض معمولات پر مبنی تھی۔ سلطان محمد تغلق خود نہایت فاضل آدمی تھا اور اپنے عہد کے آغاز میں علما سے گہرا رابطہ رکھتا تھا۔ خود ادبیات، طب، فلکیات اور ریاضیات میں درخور دانی رکھتا تھا۔ فلسفۂ یونان کا ماہر تھا۔ اور سعد منطقی، نجم الدین انتشار، مولانا زین الدین شیرازی اور دوسرے علمائے اجل سے مباحثے کرتا رہتا تھا۔ قرآن اور فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کا حافظ تھا۔[۲۴] چونکہ یہ سلطان خود رائے تھا اس لیے امرا کے مشورے کے خلاف اس نے دیوگیر کو دہلی کی جگہ نیا دارالخلافہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور آبادی کو وہاں منتقل کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کا جمگھٹا بکھر گیا اور نئے دارالخلافے کے قیام کا خواب بھی پریشاں ہوکر رہ گیا۔ ضیا برنی اور ابن بطوطہ نے اس تجویز اور اس کی ناکامی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ بہرحال سلطان محمد تغلق کے عالم اور علم دوست ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مسالک الابصار فی الممالک والامصار میں ابوالعباس احمد نے لکھا ہے کہ اس بادشاہ کے دربار میں ہزار شعرا اور بارہ سو طبیب تھے۔ کھانے پر بیٹھتا تھا تو دو سو فقہا اس کے دسترخوان پر ہوتے تھے۔ جن سے وہ عالمانہ مذاکرات کیا کرتا تھا۔ تمام ملکی و غیر ملکی اہل کمال کی خبرگیری اور مدارات صدر جہاں اور اس کے سکرٹریوں کے سپرد تھی۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ جن بڑے بڑے

عالموں نے محمد تغلق کے دربار سے ربط پیدا کیا ان میں نصیر الدین، عبدالعزیز، شمس الدین، عضدالدین، مجدالدین اور برہان الدین جیسے علامہ بھی شامل تھے۔

فیروز شاہ تغلق

محمد تغلق کے انتقال کے بعد دولت آباد (دیوگیر) کا قصہ تو ختم ہوگیا لیکن اس کے جانشین فیروز شاہ تغلق نے ایک شہر فیروز آباد کے نام سے تعمیر کرنا شروع کیا۔ لیکن چونکہ یہ دہلی کے قریب تھا اور فیروز شاہ نے دہلی کی آبادی کو وہاں منتقل کرنے کی کوشش نہ کی اس لیے نیا دارالخلافہ مضر ہونے کے بجائے مفید ثابت ہوا۔ فیروز شاہ تغلق اپنی قدر دانیِ علم و فضل، فیاضی اور اولوالعزمی کے اعتبار سے سلاطین ہند میں مثال نہیں رکھتا تھا خود بھی نہایت تعلیم یافتہ آدمی تھا اور اس نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''فتوحاتِ فیروز شاہی'' کے نام سے مرتب کی تھی۔ (فرشتہ) یہ سلطان عطایا و وظائف پر ایک کروڑ چھتیس لاکھ ٹنکہ سالانہ صرف کرتا تھا جس میں سے چھتیس لاکھ ٹنکہ کی رقم علماء دین اور دوسرے فضلا کو دی جاتی تھی۔ [۲۵]

ہر جمعہ کی نماز کے بعد سلطان کی تفریح کے لیے ہر حصے سے جو گویّے، قصہ گو اور پہلوان محل میں جمع ہوتے تھے ان کی تعداد تین ہزار کے قریب ہوتی تھی۔ غلاموں کی تعلیم و تربیت پر سلطان کی توجہ بہت مبذول تھی۔ بعض غلام اس کی ہدایت کے ماتحت قرآن پڑھتے اور اس کو حفظ کرتے تھے۔ بعض علومِ دین حاصل کرتے تھے۔ بعض کتابیں لکھا کرتے تھے اور بعض کو صنعت و کاریگری کی تربیت بڑے بڑے صناعوں کے ماتحت دلائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی بارہ ہزار غلام سلطان کے کارخانوں میں ہر قسم کی صنعتوں پر مامور ہوگئے تھے۔ اٹھارہ ہزار ایسے غلام تھے جن کی تعلیم و تربیت اور آرام و آسائش پر کافی روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ اور ان کی دیکھ بھال کے لیے وزیراعظم کے نگرانی میں ایک علیحدہ محکمہ مامور تھا۔ [۲۶]

عظیم الشان مدرسے

سلطان نے جو بڑے بڑے مدرسے قائم کیے ان کا ذکر فرشتہ میں بھی ہے۔ اور خود سلطان نے ''فتوحات'' میں بھی ان کا حال بیان کیا ہے۔ منشی سجان رائے نے خلاصۃ التواریخ میں مدرسوں کی تعداد تیس بتائی ہے۔ لیکن جامع التواریخ میں چالیس اور عبدالباقی کی مآثر رحیمی میں پچاس لکھی ہے۔ ''فتوحات'' میں سلطان نے کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ اس نے بے شمار

مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کیں اور سلاطین سابق کی جو عمارات امتدادِ زمانہ سے ضرر پذیر ہو چکی تھیں ان کو نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ مثلاً محمد غوری کی جامع مسجد (دہلی) اور سلطان شمس الدین التمش کے مدرسے کو دوبارہ تعمیر کر کے اصلی حالت پر بحال کیا۔ سلطان علاء الدین اور شیخ الاسلام نظام الحق والدین کے روضوں کی بھی مرمت کی اور ان عمارتوں میں صندل کے دروازے لگائے (فتوحات)۔ فیروز شاہ نے جو مدرسے خود بنائے ان میں ایک مدرسہ فتح خان (شہزادہ ولی عہد) کے مقبرے کے قریب قدم شریف میں واقع تھا۔ اور دوسرا فیروز آباد میں تعمیر ہوا جس کو فیروز شاہی مدرسہ کہتے تھے اور یہ نہایت عظیم الشان عمارت تھی جس کے محاسنِ تعمیر کا ذکر تعمیرات کی فصل میں کیا جائے گا۔

اس مدرسے میں دو فضلائے روزگار اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ ایک مولانا جلال الدین رومی جو تفسیر، حدیث اور فقہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ (یہ وہ مولانا رومی نہیں جن کی مثنوی مشہور ہے) اور دوسرے ایک سمرقندی فاضل تھے۔ یہ بھی علومِ دین ہی کی تدریس میں مصروف تھے۔ معلمین و متعلمین مدرسے میں اکٹھے رہتے تھے۔ دینی و دنیاوی علوم کی تعلیم کا یکساں انتظام تھا۔ ساتھ ہی ایک بڑی مسجد تھی جسمیں تمام اہالی مدرسہ باقاعدہ پنج وقتہ نماز ادا کرتے تھے۔ غریبوں، مسافروں اور محتاجوں کی امداد مدرسے کی طرف سے کی جاتی تھی۔ کامیاب طلبہ کو وظیفے دیئے جاتے تھے اور مدرسے میں جتنے معلمین، طلبہ اور مسافر رہتے تھے ان کے مصارف اس سرمائے سے دیے جاتے تھے جو حکومت کی طرف سے مدرسے کے لیے وقف تھا۔ کتب تاریخ میں اس مدرسے کے متعلق جو تفصیلات درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت وسیع دارالعلوم تھا جس کے کئی شعبے تھے اور فیروز شاہ کے دوسرے تمام مدرسوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔[۲۷]

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی تعلیم کا انتظام بھی خاطر خواہ تھا۔ کیونکہ حکومت کے کئی عہدوں پر ہندو فائز تھے۔ اور فارسی اور عربی جاننے کے بغیر ان عہدوں کے فرائض کی بجا آوری ممکن نہ تھی۔ نگر کوٹ (کانگڑہ) میں جوالا مکھی کا مندر تھا، جو اب تک موجود ہے۔ اس مندر میں قدیم ہندو علوم کی کوئی تیرہ سو کتابیں تھیں۔ فیروز شاہ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو اس نے بعض فاضل ہندوؤں کو وہاں بھیجا اور حکم دیا کہ بعض کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ اس زمانے کے ایک شاعر عزالدین خالد خانی نے ایک کتاب کو ہندی نظم سے فارسی نثر میں ترجمہ کیا اور سلطان نے اس کا نام ''دلائل فیروز شاہی'' تجویز کیا۔[۲۸] سلطان فیروز شاہ کے عہد میں جو فلسفی اور فقیہ

موجود تھے ان میں مولانا عالم اندایتی فقیہ، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے مرشد مولانا خواجگی، اور عربی اور فارسی کے فاضل مولانا احمد تھانیسری اور قاضی عبدالمقتدر زیادہ نمایاں ہیں۔

سلطان فیروز شاہ عالم و فاضل اشخاص کو افلاس و احتیاج کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا تھا جو علما اور اہل کمال نارسائی یا شرم کی وجہ سے اپنی احتیاج ظاہر نہ کر پاتے تھے ان کے لیے سلطان نے کوتوال اور دوسرے حکامِ اضلاع کو حکم دے رکھا تھا کہ ایسے آدمیوں کا سراغ لگا کر انہیں دربار میں پیش کریں۔ چنانچہ ایسے اشخاص کو کارخانہ ہائے حکومت میں ملازمتیں دے دی جاتی تھیں۔[۲۹]

فیروز شاہ کے بعد غیاث الدین ثانی، ابوبکر، اور نصیر الدین کے عہد ہائے حکومت مختصر رہے۔ اور محمود تغلق کے زمانے میں تیمور کا حملہ ہوا جس نے ملک بھر کو تلپٹ کر دیا۔ دہلی اور اس کی نواحی ولایات میں جنگ و پیکار، لوٹ مار، قتل و خون کا وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ تعلیم و تعلّم کا تمام کاروبار ختم ہو گیا۔

سادات

خاندان سادات کے پہلے بادشاہ تو تعلیم کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ لیکن جب بہلول لودھی نے آخری سید بادشاہ علاء الدین سے دہلی چھین لی تو اس نے بدایوں جا کر کچھ مساجد، مقبرے اور مدرسے قائم کیے گویا دہلی سے سو میل کے اندر علم کا ایک اور مرکز پیدا ہو گیا۔ جس میں بہت سے مدارس کھل گئے اور دہلی اور فیروز آباد کا شروع کیا ہوا کام پھر جاری ہو گیا۔

خاندانِ لودھی

اس کے بعد خاندان لودھی کا آغاز ہوا۔ سلطان بہلول لودی نے دہلی کے علاوہ ایک اور شہر آگرہ کی بنیاد رکھی۔ یہ سلطان خود تو چنداں تعلیم یافتہ نہ تھا لیکن علماء کی صحبت کا بے حد شوقین تھا اور انہیں عطیات و انعامات بھی دیا کرتا تھا۔ مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ اس نے چند بڑے مدرسے بھی قائم کیے۔ اس کے بعد سلطان سکندر لودھی نے پایہ تخت آگرہ میں منتقل کر دیا اور اب علما و فضلا کا رجوع نئے دارالخلافہ کی طرف ہو گیا۔ سلطان سکندر خود تعلیم یافتہ اور علم کا قدردان تھا۔ اس نے حکم دیا کہ فوجی افسر سب تعلیم یافتہ ہونے چاہئیں۔[۳۰] اس نے تروار اور متھرا میں مدرسے قائم کیے۔ مذہبی مباحثات کو سننے کا بے حد شائق تھا۔ سید صدر الدین قنوجی، میاں

عبدالرحمٰن سیکری، میاں عزیز اللہ سنبھلی اس کے دربار میں مستقل طور پر مقیم تھے۔ اور ان کے علاوہ دہلی، تلمبہ، سرہند اور قنوج کے بعض علما کو بھی کبھی مباحثات کے لیے طلب کرلیا کرتا تھا۔

اس سلطان کے عہد میں ہندوؤں نے عام طور پر فارسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے علوم کی تحصیل بھی شروع کردی اور سلطان کے حکم سے بعض ہندی اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ ایک پرانی طب کی کتاب ''ارگرمہابیدک'' کا ترجمہ بھی مرتب کیا گیا۔ خواص خاں کے مرنے پر میاں بدھ اس کے جانشین ہوئے انہوں نے بہت سے خوشنویسوں اور عالموں کو جمع کیا اور مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھوانی شروع کیں۔ انہوں نے خراسان سے کچھ کتابیں لاکر عالموں کے حوالے کیں۔ ہندوستان وخراسان کے اطبا کو جمع کیا اور علم طب کی کتابیں جمع کر کے ان میں سے انتخاب کیا۔ اس طرح جو کتاب تیار ہوئی اس کا نام ''طب اسکندری'' رکھا گیا۔ ہندوستان میں اس سے زیادہ مستند کتاب کوئی نہیں۔[۳۱]

سلطان سکندر کے عہد میں عرب، ایران، بخارا اور ہندوستان کے بہت سے علماء سلطان کی علم دوستی اور فیاضی کی وجہ سے آگرہ میں جمع ہوگئے جن کو سلطان کے حکم سے امرا نے زمینیں عطا کیں اور انعامات بھی دیے۔ ایک امیر مسند علی خاں کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی صاحبِ علم جو اس امیر کا وظیفہ یاب ہوتا، انتقال کر جاتا تو وظیفہ اس کے پسماندگان کی طرف منتقل کر دیا جاتا۔ اور اگر وہ محض بیوی ہی چھوڑ جاتا تو اس خاتون کو کہا جاتا کہ کسی کو متبنّٰے کرے۔ امیر اس متبنّٰے کو اپنے خرچ سے تعلیم دلواتا اور تیر اندازی وشہسواری کی تربیت دلاتا۔

سلطان سکندر کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم تخت پر بیٹھا۔ لیکن وہ اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا جس کی وجہ سے اس کے تمام امراء اس کے مخالف ہوگئے۔ اس لیے وہ نہ علم وفن کی خدمت کرسکا اور نہ ہندوستان کو بیرونی حملہ آوروں سے بچا سکا۔

دوسری مسلمان سلطنتیں

علوم کی تعلیم اور قدر دانی صرف دہلی ہی تک محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں انہوں نے علم دوستی کی مسلّم روایات کو برابر زندہ رکھا۔

خاندانِ بہمنی

سلطان حسن گانگو بہمنی فارسی جانتا تھا اور اپنے بیٹوں کی تعلیم میں بے حد شغف رکھتا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے۔ ایک دن اس نے اپنے چھوٹے بیٹے محمود سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ بوستانِ سعدی۔[۳۲] سلسلہ آصفیہ میں ملا داؤد بیدری کے حوالے سے داؤد شاہ کے ایک بیٹے کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہفتے میں تین دن (پیر، بدھ اور ہفتہ) طالبعلموں کو پڑھایا کرتا تھا۔ اس کو زاہدی، شرح تذکرہ اور تحریر اقلیدس (ریاضی)، شرح مقاصد (فقہ) اور مطوّل (بلاغت و بیان) سے خاص لگاؤ تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو بطور نصاب یہ کتابیں پڑھاتا تھا۔

مجاہد شاہ بہمنی ترکی اہل زبان کی طرح بول سکتا تھا۔ محمود شاہ خود عربی اور فارسی کا عالم تھا۔ عرب و ایران کے بہت سے فضلا و شعرا اس کے دربار میں آئے اور عواطفِ خسروانہ سے مستفیض ہوئے۔ اس سلطان نے ۱۳۷۸ء میں یتیموں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں بہت ذی علم اساتذہ مقرر کیے سب طلبہ کے لیے قیام و طعام کا انتظام سرکاری خرچ سے کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی قلمرو کے متعدد شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچ پور، دولت آباد، چول وغیرہ میں بھی یتیموں کے لیے مکاتب کھولے جن کے مصارف کے لیے کافی اوقاف کا انتظام کیا۔ اس کے دانشمندانہ اندازِ حکومت کی وجہ سے اہل دکن اس کو ارسطو کہا کرتے تھے۔[۳۳]

فیروز شاہ بہمنی

سلطان فیروز شاہ بہمنی بہت باکمال زباندان تھا۔ عبرانی میں تورات پڑھ سکتا تھا اور یہ زبان اس نے ان یہودیوں سے سیکھی تھی جو ساحلِ ملیبار پر مدت سے آباد تھے۔ اس کے حرم میں عرب، سرکیشیا، جارجیا، ترکی، یورپ، چین، افغانستان، بنگال، گجرات، تلنگانہ، مہاراشٹر اور راجپوتانہ کی بہت سی خواتین موجود تھیں اور وہ ہر خاتون سے اس کی زبان میں گفتگو کرسکتا تھا۔ ہر ہفتہ، پیر اور جمعرات کو علم نباتات، علم ہندسہ اور علم منطق کے لکچر سنا کرتا تھا اور خود بھی بہت سے علوم کا ماہر تھا۔ ہر چوتھے دن وہ کاروبار مملکت شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کے سولہ صفحے نقل کیا کرتا تھا۔ اور اپنا زیادہ تر وقت علماء و مورخین، خوانندگانِ شاہنامہ اور دوسرے اہل فن کی صحبت میں بسر کرتا تھا اور یہ صحبتیں آدھی رات تک جاری رہتی تھیں۔ وہ ہر سال گوا اور چول کی

بندگاروں سے مختلف ملکوں کو جہاز بھیجتا تھا تاکہ مشاہیر علم کو اس کے دربار میں لائیں۔ اس کے دربار میں جو نامور اور باکمال علماء جمع تھے۔ ان میں ملا اسحاق سرہندی بھی تھے جن کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ فیروز شاہ نے فلکیات کے مطالعہ کے لیے دولت آباد کے قریب ایک درّے کی چوٹی پر ایک رصد گاہ تعمیر کرائی۔ جس کا اہتمام ایک ماہر فلکیات حکیم حسین گیلانی کے سپرد تھا۔ سید محمد گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے علم کا شہرہ سن کر سلطان فیروز خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن چونکہ خود بہت متبحر عالم تھا اس لیے سید صاحب کا علم اسے جچا نہیں۔ لیکن اس کے بھائی خان خاناں کو سید صاحب سے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ اس نے ان کے لیے ایک قصر عالی شان بھی تعمیر کیا۔ اور ان کے ملفوظات سننے کے لیے ان کی خدمت میں اکثر حاضر رہتا تھا۔[۳۴]

محمد شاہ بہمنی اور وزیر محمود گاواں

احمد شاہ بہمنی بھی سیّد محمد گیسو دراز سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرے علما کی پرورش کی علاوہ سید صاحب کو گلبرگہ کے نزدیک بہت سے دیہات اور بہت سی اراضی علی الدوام عطا کی اور ان کے لیے گلبرگہ کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا۔ بعد کے بادشاہوں کے عہد علمی لحاظ سے معمولی تھے۔ لیکن محمد شاہ بہمنی دوم بہت ذی علم بادشاہ تھا جس کو خواجۂ جہاں نے اپنی نگرانی میں زمانے کے نامور فاضل صدر جہاں شوستری سے تعلیم دلوائی۔ فیروز شاہ بہمنی کے بعد سلاطین میں علم و فضل کا دوسرا درجہ محمد شاہ ہی کو حاصل ہے۔ اس کا وزیر محمود گاواں علما کی سرپرستی اور امداد میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ خود بھی ادب اور ریاضی میں کمال رکھتا تھا۔ دکن کے کتب خانوں میں اس کی تصنیف روضۃ الانشا اور بعض نظمیں اب تک موجود ہیں۔ وہ ہر سال خراسان و عراق کے بڑے بڑے علما کو تحائف و ہدایا بھیجتا تھا اور علما بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ چنانچہ ملا عبدالکریم سندھی نے اس کی سوانح عمری بھی لکھی۔ دکن کے کسی مقام پر شاید ہی کوئی ایسا عالم ہوگا جو محمود گاواں کی قدر دانی و سخاوت سے مستفیض نہ ہوا ہو۔ اور اس کی پبلک عمارات کے کھنڈر اب تک (یعنی فرشتہ کے زمانے تک) پائے جاتے ہیں۔ ان میں بیدر کا مشہور مدرسہ بھی ہے جو محمود گاواں نے اپنی موت سے صرف دو سال پیشتر مکمل کیا تھا۔[۳۵]

مدرسہ عالیہ بیدر

میڈوز ٹیلر نے اپنی کتاب تاریخ ہند میں مدرسہ بیدر کا جو حال لکھا ہے اس سے اندازہ

کیا جاسکتا ہے، کہ ہندوستان کے سلاطین جو مدرسے تعمیر کرتے تھے۔ ان کی شان و شوکت کا کیا حال تھا۔ وہ لکھتا ہے ''شہر بیدر میں محمود گاواں کا مدرسہ شاید اس عہد کی عظیم ترین مکمل عمارت تھا۔ ایک نہایت وسیع احاطے کے اردگرد دو منزلہ عمارت تھی جس میں محرابیں ہی محرابیں تھیں۔ اور یہ ساری عمارت نہایت اچھے کمروں میں منقسم تھی۔ سامنے کے حصوں میں دونوں گوشوں پر سو سو فٹ سے بھی اونچے میناز بنائے گئے تھے۔ اور عمارت کا چہرہ کاشی کاری سے مزین تھا جس پر نیلی، زرد اور سرخ زمین پر گلکاری کی گئی تھی اور خطِ کوفی میں قرآن مجید کی آیات ثبت تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر علو اور پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔'' [۳۶] اس مدرسے کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی اور طلبہ کے استعمال کے لیے ایک کتب خانہ بھی مہیا کیا گیا تھا جس میں تین ہزار مجلدات تھیں۔ [۳۷] مرتضٰی حسین نے حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ محمود گاواں کے مکان سے پینتیس ہزار کتابیں دستیاب ہوئی تھیں جس سے اس کے شغفِ علمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی آمدنی تو بے اندازہ تھی لیکن وہ زیادہ تر روپیہ ترویجِ علم ہی پر صرف کر دیتا تھا۔ اور خود زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ چٹائی پر سوتا اور مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتا۔ انتقال کے بعد اس کے خزانے میں بہت ہی کم رقم پائی گئی۔ محمود شاہ بہمنی عیاش طبع بادشاہ تھا۔ بھان متیوں اور رقاصوں اور شرابیوں کی صحبت میں بسر کرتا تھا۔ لہٰذا اس کے زمانے میں علم کو کوئی ترقی حاصل نہ ہوئی۔ لیکن بحیثیت مجموعی سلاطینِ بہمنی علوم و فنون اور اسلامی ثقافت کے بہت بڑے سرپرست تھے۔

بیجاپور

بعض مورخین کا خیال ہے کہ بیجاپور اصل میں وِدّیاپور یعنی ''شہرِ علم'' تھا اور کلیان کے چالوکیہ خاندان نے یہاں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا جو ہندوؤں کے علوم کا مرکز تھا۔ لیکن ہندوؤں کی چالوکیہ سلطنت ختم ہوجانے کے بعد یہ مرکز بھی ویران ہوگیا۔ اور مسلمانوں نے برسرِاقتدار ہوتے ہی اس مدرسے کو ازسرِنو رونق بخشی۔ حکومت بیجاپور کے بانی عادل بادشاہ نے اچھی تعلیم پائی تھی۔ نظم و نثر خوب لکھتا تھا اور خطابت و فصاحت سے بہرہ ور تھا۔ ایران، ترکستان اور روم کے بہت سے اہلِ علم اس کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ [۳۸] اس کے جانشین اسمٰعیل عادل شاہ کے علم و ذوق کی کیفیت بھی یہی تھی۔ ابراہیم عادل شاہ کے زمانے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے سرکاری حسابات کو فارسی کی بجائے ہندی میں لکھنے کا حکم دیا۔ اور بہت سے برہمن جو اس کام

پر مقرر کیے گئے وہ حکومت میں بہت اثر ونفوذ کے مالک بن گئے۔ یوسف عادل شاہ کے زمانے میں ہندوؤں کو مالگزاری کے محکموں میں بڑا اقتدار حاصل ہوگیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بادشاہ نے ایک مرہٹہ سردار کی بیٹی سے شادی کرلی تھی۔ کتب خانہ عادل شاہی کا کچھ حصہ بیجاپور کے آثار مبارک میں اب تک موجود ہے۔ باقی بے شمار کتابیں مغل شہنشاہ اورنگ زیب گاڑیوں میں بھر کر دارالخلافہ میں لے گیا تھا۔

احمد نگر

احمد نگر کی سلطنت کا پہلا بادشاہ احمد نظام شاہ بچپن ہی میں احمد شاہ بہمنی کی فوج کے ہاتھ قید ہوگیا تھا۔ احمد شاہ نے اس کو اپنے بڑے لڑکے شہزادہ محمود کے ساتھ ہی تعلیم دلوائی۔ احمد نظام شاہ بے حد ذہین ثابت ہوا اور بہت جلد عربی و فارسی ادبیات پر حاوی ہوگیا۔ لیکن علوم کی ترویج کے بجائے فن شمشیر زنی کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ لہٰذا مدرسے قائم کرنے کے بجائے احمد نگر کے ہر حصے میں شمشیر بازی اور کشتی گیری کے اکھاڑے قائم ہوگئے۔[۳۹]

گولکنڈہ

گولکنڈہ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ ترویج علوم میں عالی مرتبہ رکھتا تھا۔ اس نے حیدر آباد کے وسط میں ''چار مینار'' کی عمارت اور مسجد تعمیر کی۔ یہ ایک بہت عظیم الشان مدرسہ تھا اور اس میں معلمین و متعلمین یکجا رہتے تھے۔ اس کے علاوہ سلطان نے اور بھی بہت سے مدرسے اور علوم و فنون کے مرکز قائم کیے اور ان میں علما کو بیش قرار مشاہروں پر مقرر کیا۔ ایک مدرسہ حیدر آباد کے مضافات میں بھی تعمیر کیا گیا تھا۔[۴۰] ان بڑے مدارس کے علاوہ جنوبی ہند میں بے شمار ابتدائی مکاتب بھی موجود تھے جو استادوں کے مکانوں میں قائم ہوتے تھے۔ ایک یوروپین مورخ لکھتا ہے کہ ان مکتبوں میں شاگرد آلتی پالتی مار کر بنچ یا چٹائی پر بیٹھتے تھے۔ سرکنڈے کے قلم یا واسطین سے کاغذ پر لکھتے تھے۔ کاغذ زیادہ تر چین سے درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ یورپی کاغذ کے مقابلے میں اچھا نہ ہوتا تھا۔ یورپ کا کاغذ صاف اور پتلا تھا۔ قرآن اور فارسی کی تعلیم زیادہ تر مسلمان حاصل کرتے تھے۔ میسور کا آخری بادشاہ ٹیپو سلطان کئی زبانیں جانتا تھا۔ اور اس کے پاس ایک کتب خانہ بھی تھا جو ہر قسم کی ایشیائی اور یورپی کتابوں سے مالا مال تھا۔ (شوبرل کی تاریخ ہند)

مالوہ

مالوہ کے شاہی خاندان کا بادشاہ سلطان محمود خلجی علم و فن کا بہت بڑا قدر دان اور سرپرست تھا۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں اہل علم کی اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ مالوہ ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ بڑے بڑے علما و فلاسفہ بیرونی ممالک سے آئے اور خود قلمرو مالوہ کے مدرسوں سے بھی بے شمار فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ فرشتہ کی رائے میں مالوہ ادبی نفاست میں شیراز وسمرقند سے مقابلہ کرتا تھا۔[۴۱] مالوہ کے بے شمار مدرسوں میں جو سلطان محمود خلجی کی دریا دلی سے قائم ہو گئے تھے، ایک مانڈو میں بھی تھا جس کی عمارت سلطان ہوشنگ کی مسجد کے بالمقابل تعمیر کی گئی تھی۔ مالوہ میں اس زمانے کا سب سے بڑا عالم شیخ چاند تھا۔ سلطان غیاث الدین کے زمانے میں تعلیم نسواں پر بھی توجہ کی گئی اور حرم کی خواتین کو تعلیم دینے کے لیے قابل استانیاں مقرر کی گئیں۔[۴۲] یہ سلطان نہایت فیاض اور خدا ترس تھا۔ ہر رات چند ہزار طلائی مہریں اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا اور صبح اٹھ کر حاجت مندوں کو خیرات کر دیتا۔ اس کے حرم میں ستر خواتین حافظۂ قرآن تھیں اور جب سلطان پوشاک زیب تن کرتا وہ اوّل سے آخر تک برابر قرآن مجید کی تلاوت کرتی رہتیں۔

خاندیش

خاندیش کا دوسرا بادشاہ ناصر خاں تھا جو حضرت شیخ برہان الدین کے جانشین شیخ زین الدینؒ کا مرید تھا۔ یہ دونوں بزرگ علم و فضل میں نامور تھے اور دولت آباد کے مدرسے میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ سلطنت کے صدر مقام برہان پور میں ایک بڑا مدرسہ قائم تھا۔ جس کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ ناصر خاں فاروقی نے چالیس سال تک اس سلطنت میں مختلف ممالک کے اہل علم کو جمع کیا اور علم و ادب کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔[۴۳]

جون پور

جس زمانے میں مغربی ہند خاندان سادات کے ماتحت سخت بدنظمی اور ابتری کا شکار ہو رہا تھا۔ جون پور میں سلطان ابراہیم شرقی نے شمع علم روشن کی اور اس شمع کی روشنی اس قدر دیرپا ثابت ہوئی کہ اس سے کوئی ایک سو سال بعد بھی فرید خاں (جو بعد میں شیر شاہ سوری بن کر تخت

ہند پر متمکن ہوا) اپنے باپ کو لکھتا ہے کہ حصول تعلیم کے لیے سہرام سے جون پور بہت بہتر ہے۔ چنانچہ شیر شاہ نے جون پور ہی کے ایک مدرسے میں تعلیم پائی۔[۴۴] ابراہیم شرقی علم وفضل کا بہت بڑا سرپرست تھا اور بہت سے مصنّفین نے اپنی تصنیفات کو اس کے نام سے معنون کیا ہے۔ اس کے زمانے میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی جیسا نامور عالم اور فلسفی موجود تھا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہ داد جونپوری کے علم وفضل کا طوطی بولنے لگا۔ ظاہر دہلوی، مولانا حسن نقشی، مولانا علی احمد نشانی اور مولانا نورالحق بھی علم وادب کے آفتاب تھے۔[۴۵] سلطان کے حکم سے بعض فقہی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ مثلاً فتاویٰ ابراہیم شاہی، ارشاد وغیرہ۔[۴۶]

پندرھویں صدی کے وسط میں محمود شاہ ابن سلطان ابراہیم کی بیوی بی بی راجی نے ایک جامع مسجد، ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ تعمیر کرائی جس کا نام ''نماز گاہ'' رکھا۔ اور معلمین و متعلمین کے لیے وظائف مقرر کیے۔ منعم خاں خان خاناں نے ایک عالم مسمّٰی شیخو کے لیے جون پور کے پل کے پاس ایک عمارت بنائی جس کے اندرونی حصوں کو طالب علم استعمال کرتے تھے اور بیرونی حصے کرائے پر دیے جاتے تھے تاکہ اس آمدنی سے طلبہ کے مصارف پورے ہوتے رہیں۔[۴۷] تذکرۃ العلما اور سیر الملوک میں اس ''شہر علوم'' کی بعض تفصیلات لکھی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جون پور میں آغاز آبادی ہی سے ہندوستان کے اکثر حصوں خصوصاً اودھ اور الہ آباد کے صوبوں سے لوگ جوق در جوق حصول تعلیم کے لیے جمع ہوتے تھے اور سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں تو یہاں سینکڑوں مدرسے اور مسجدیں قائم تھیں جن کے معلمین اور متعلمین کے لیے التمغا ہیں اور جاگیریں وقف کی گئی تھیں۔ تاکہ وہ معاش کی طرف سے بے فکر ہوکر خدمت علم میں مصروف رہیں۔ ہمایوں سے لے کر شاہ جہاں کے وقت تک جون پور برابر مرکز علم رہا۔ بلکہ شاہ جہاں تو اس کو ''شیراز ہند'' کہا کرتا تھا۔ محمد شاہ کے زمانے تک شاہان دہلی کا یہ معمول رہا کہ وہ ہمیشہ حاکمان جون پور کو فرمان بھیجتے رہے کہ شہر میں جمع ہونے والے معلمین اور متعلمین کی خدمت سے غافل نہ ہوں۔ جونپور میں ایک خاص وقائع نگار مقرر کیا جاتا تھا۔ تاکہ ہر مدرسے کے حالات سے بادشاہ کو مطلع رکھے۔ شہزادگان و امرا جب اس شہر سے گزرتے تو اس کے مدرسوں کا معائنہ کرکے عطیات دیتے تاکہ سلاطین دہلی کی خوشنودی کا باعث ہوں۔ ۱۷۳۵ء کا ذکر ہے کہ نواب سعادت خاں نیشاپوری اودھ، بنارس اور جونپور کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ ایک دفعہ وہ اس شہر میں آیا تو اس بات پر ناراض ہوکر کہ مقامی علما اس کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے، ان کے وظائف و

جاگیرات کی تنسیخ کے احکام صادر کر بیٹھا۔ علمی حلقوں میں قیامت مچ گئی اور مدرسے ویران ہونے لگے۔ لیکن مختار الدولہ کے ایما پر نواب آصف الدولہ نے تمام جاگیریں اور وظیفے بحال کر دیے۔ قریب قریب اسی وقت جونپور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔[۴۸]

ملتان

شاہانِ ملتان میں سے حسین لنگاہ نے جو خود بھی ذی علم بادشاہ تھا بہت سے مدرسے قائم کیے اور بڑے بڑے علما کو گراں قدر وظیفے دے کر تدریس و تعلیم پر مامور کیا۔[۴۹] حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان نے کسی کو گجرات بھیجا کہ وہاں کی عظیم الشان عمارتوں کو دیکھ کر رپورٹ کرے۔ جب اس شخص نے آ کر بتایا کہ آپ اپنی دولت و ثروت کے باوجود گجرات جیسی عمارتیں نہیں بنا سکتے تو سلطان غمگین ہوا۔ اس پر وزیر نے کہا کہ گجرات عمارتوں کی وجہ سے بڑا ہو گا۔ لیکن ملتان علم و فضل میں اس پر برتری رکھتا ہے۔

سندھ اور کشمیر

سندھ کا بادشاہ شاہ بیگ ارغون نہایت تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اور بہت سے مصنفین نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ وہ علم و فضل کا بہت بڑا قدردان تھا۔ کشمیر سولھویں صدی میں سلطان زین العابدین بڈشاہ کی علم دوستی اور علما نوازی پر فخر کر سکتا ہے۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ نے قوانین فقہی کو تانبے کی تختیوں پر کندہ کرا کر عام بازاروں اور عدالتوں کے کمروں میں آویزاں کرایا۔ تاکہ لوگ ان قوانین کا علم حاصل کر لیں۔ اکبر کے زمانے میں حسین خالی والی کشمیر نے بہت سے مدرسے قائم کیے۔ اور پرگنہ آساپور کو ان کے مصارف کے لیے وقف کیا۔[۵۰]

بنگال

بنگال میں حاکم صوبہ غیاث الدین نے تیرہویں صدی کے آغاز میں لکھنوتی کے مقام پر ایک عالی شان مسجد، ایک بڑا مدرسہ اور ایک کارواں سرائے تعمیر کی۔ یہ علم و ادب کا سرپرست تھا۔ اور علما کو گراں قدر وظائف دیتا تھا۔ بنگال کے حکمران جہاں مسلمانوں کی تعلیم پر متوجہ تھے وہاں ایسے علوم کی ترویج بھی کر رہے تھے جو بنگلہ بولنے والوں کے لیے موجب کشش ہو۔ سب سے پہلے ناصر شاہ نے مہابھارت کو بنگلہ میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکمران بنگلہ کا اس قدر سرگرم

معاون تھا کہ بنگال کے مشہور شاعر وڈیاپتی نے اپنا ایک گیت اس کے نام سے منسوب کیا۔ اسی شاعر نے سلطان غیاث الدین دوم کی بھی بے حد مدح و ثنا کی ہے۔ سلطان غیاث الدین نے حمید الدین ناگوری سے علوم دین کی تحصیل کی تھی۔ اور حضرت قطب العالم رحمتہ اللہ علیہ اس کے ہم سبق تھے۔[۵۱] موضع عمر پور کے قریب ایک جگہ ''درس باڑی'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک مدرسہ تھا۔ یوسف شاہ کے زمانے کا ایک کتبہ بھی اس پر موجود ہے۔ اس قسم کے مدرسوں کے اور کھنڈر بھی موجود ہیں۔ مثلاً اشتھی پورہ میں بھی ایک مدرسہ تھا جس کو اب تک مدرسہ ٹیلہ کہتے ہیں۔ حسین شاہ بھی بنگلہ کا بہت قدر دان تھا۔ اس نے بھاگوت پُران کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے مالا دھر باسو کو مقرر کیا۔ اور حضرت قطب العالم کی یادگار کے طور پر ایک مدرسہ اور شفا خانہ بھی تعمیر کرایا۔ گوڑ میں ساگر ڈیگی کے شمالی کنارے پر ایک بہت بڑی چوکور عمارت کے کھنڈر ہیں یہ بھی ایک مدرسہ تھا جو حسین شاہ نے بنایا تھا۔ رَیونشا نے اپنی کتاب ''گوڑ'' میں لکھا ہے کہ یہ مدرسہ بہت بڑا تھا۔ سنگ مرمر اور سنگ خارا کا بنا ہوا تھا اور گوڑ کے دوسرے مدرسوں سے نوعیت میں مختلف تھا۔ مولانا الٰہی بخش نے اپنی کتاب ''خورشید جہاں نما'' میں بتایا ہے کہ ''ریاض السلاطین'' کے مشہور مصنف غلام حسین کے مکان کے پڑوس میں گوڑ کے ایک محلے کے اندر ایک بڑا مدرسہ قائم تھا۔ اس کا کتبہ مظہر ہے کہ اس کا بانی بھی حسین شاہ ہی تھا۔

نواب مرشد قلی جعفر خاں بہت ذی علم آدمی تھا اور اہل علم و تقویٰ کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ہر صبح قرآن کی کتابت کرتا اور اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے نسخے مکہ، مدینہ اور دیگر مقامات مقدسہ کو بھیجتا تھا۔ اسی زمانے میں بیر بھوم کا ایک زمیندار اسد اللہ اپنی آمدنی کا نصف علما کی امداد اور دیگر کارہائے خیر کے لیے دے دیتا تھا۔[۵۲]

سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ علی ویردی خاں بھی بے حد علم دوست آدمی تھا۔ اس نے بہت سے ارباب علم و فضل کو اپنے دربار واقع مرشد آباد میں جمع کیا اور ان کو بیش قرار وظائف بھی دیے۔ ان میں میر محمد علی، حسین خاں تقی قلی خاں، علی ابراہیم خاں، حاجی محمد خاں اور دوسرے علما شامل تھے۔ میر محمد علی کے پاس دو ہزار کتابوں کا ایک کتب خانہ بھی تھا۔[۵۳] میر قاسم بھی علما کا قدر دان تھا اور سیر المتاخرین میں اس کی سرپرستی کی چند مثالیں بھی مندرج ہیں۔

بنگال میں انگریزوں کے ورُود کے بعد علما و فضلا کی سرپرستی اور علوم و فنون کی خدمت کا وہ دور جو صدہا سال سے چلا آتا تھا ختم ہوگیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے عربی و فارسی کی تعلیم

چھوڑ کر انگریزی اختیار کر لی۔

—(۲)—

دَورِ مغلیہ

بابر

بابر تعلیم یافتہ اور خوش ذوق بادشاہ تھا۔ اس کو عربی، فارسی اور ترکی نظم و نثر لکھنے کا بے نظیر ملکہ حاصل تھا۔ اس کی توزک واقعات کی صحت کے علاوہ محاسن تحریر سے بھی مالا مال ہے۔ جس زمانے میں اسلوب انشا تکلّف و تصنّع سے گرانبار تھا اس نے انتہائی سلاست و سادگی سے اپنی خودنوشت سوانح عمری مرتب کی جو آج تک نثر کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ شعر و شاعری کا ذکر تو اپنے موقع پر آئے گا لیکن بابر نے ''مفصل'' کے نام سے عروض پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ [۵۴] لین پول نے اپنی کتاب ''بابر'' میں لکھا ہے کہ ''پانچ سال کی عمر میں اس کو سمرقند لے گئے۔ اس کے بعد چھ سال تک غالباً وہ زیر تعلیم رہا۔ ترکی و فارسی میں اس کی مہارت شاہد ہے کہ وہ ادبیات میں بہترین استفادہ کر چکا تھا۔ ہمیں اس کی ابتدائی تربیت کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں لیکن غالباً وہ تربیت زیادہ تر خواتین خاندان کی توجہ کا نتیجہ تھی۔''

جو اہلِ علم سب سے پہلے بابر کی توجہ اور سرپرستی سے مستفید ہوئے، وہ تین تھے۔ اوّل میر خوند کا پوتا خوند امیر مصنف ''حبیب السیَر''، دوم مولانا شہاب الدین معمائی، اور سوم مرزا ابراہیم ہراتی۔ خوند امیر بنگال کی مہم میں بابر کے ساتھ تھا۔ یہ وہی خوند امیر ہے جس کو بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں نے بھی اپنے دربار میں رکھا۔ اور اس نے ہمایوں کے نام پر ''قانونِ ہمایوں'' لکھی جس کا ذکر ابوالفضل نے اکبر نامے میں کیا ہے۔ وہ ہمایوں کے ساتھ گجرات گیا اور انتقال کے بعد دہلی میں نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسروؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ [۵۵]

فلکیات سے دلچسپی

بابر کو فلکیات سے بھی دلچسپی تھی۔ سمرقند کی رصدگاہ کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ''اس رصدگاہ کی مدد سے الغ بیگ مرزا نے زیچ گورگانی بنائی۔ جس پر اب تک انحصار کیا جاتا

ہے۔ اس زیچ کی اشاعت سے پہلے زیچ ایل خانی کا استعمال عام تھا جو ہلاکو خاں کے زمانے میں مراغہ کی رصدگاہ کی مدد سے خواجہ نصر نے مرتب کی تھی۔ ہلاکو خاں بھی ایلخانی کہلاتا تھا۔ دنیا بھر میں سات آٹھ سے زیادہ رصدگاہیں موجود نہیں۔ ان میں سے ایک خلیفہ مامون الرشید نے بنائی تھی۔ جس میں ''زیچ مامونی'' کی ترتیب کی گئی۔ ایک اور بطلیموس نے تعمیر کی تھی۔ ایک اور رصدگاہ ہندوستان کے راجا بکرماجیت کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ یہ ہندو راجا سلطنت مالوہ (جس کو اب مانڈو کہتے ہیں) میں اُجین اور دھار کا حکمران تھا۔ ہندو اب تک اسی رصدگاہ میں تیار کی ہوئی زیچ استعمال کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ زیچ سب سے زیادہ ناقص اور نامکمل ہے۔ اس رصدگاہ کو تعمیر ہوئے ۱۵۸۴ برس گزر چکے ہیں۔'' [۵۶]

جب بابر نے پنجاب پر حملہ کیا تو پنجاب کے افغان امیر غازی خاں کے پاس ایک قیمتی کتب خانہ تھا۔ جب غازی خاں نے غداری کی تو بابر نے اس کو قید کرلیا اور اس کے کتب خانے پر قبضہ کر کے بعض کتابیں ہمایوں اور کامران کو بھی بھیجیں۔ اس کتب خانے میں دینیات کی کتابیں بھی تھیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بابر کتابوں کی قدر و وقعت کا مبصر بھی تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ ''مجھے بظاہر تو یہ کتابیں بہت اہم نظر آتی تھیں لیکن دیکھنے سے وہ چنداں اہم معلوم نہ ہوئیں۔'' بابر کے زمانے میں شیخ زین خوانی نے واقعاتِ بابری کا ترجمہ کیا۔ [۵۷]

ہمایوں

ہمایوں علم ہیئت اور جغرافیہ کے مطالعہ کا بہت شوقین تھا۔ اس نے عناصر کی نوعیت پر مقالے بھی لکھے تھے۔ اور اپنے استعمال کے لیے زمینی اور آسمانی کرّے (گلوب) بھی تیار کرائے تھے۔ [۵۸] ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتا ہے کہ اس کی فطرتِ صالحہ اسکندر کی ہمت اور ارسطو کی علمیت کا مجموعہ تھی۔ ہمایوں نے اپنی قلمرو میں اپنے مقربوں کو تین حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ علما و مشائخ، ادبا و شعرا، فقہا و قضاۃ، ''اہل سعادت'' کہلاتے تھے۔ بادشاہ کے اعزہ، امرا، وزرا اور سردارانِ فوج کو ''اہل دولت'' سے موسوم کیا تھا۔ حسن و نشاط اور فنونِ لطیفہ کی قابلیت رکھنے والے ''اہل مراد'' تھے۔ ہفتے میں ان طبقات سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے بعض دن مخصوص کیے گئے تھے۔ ہمایوں اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتا اور انہیں اکرام و انعام سے مالا مال کر دیتا۔ کتابوں کا عاشق تھا۔ یہاں تک کہ جب پناہ گزین کی حیثیت سے بھاگا ہے اس وقت بھی اپنے مہتمم کتب

خانہ اور چند منتخب کتابوں کو ساتھ لیے پھرتا تھا۔ جس وقت اس نے کھمبائیت میں ڈیرا ڈالا ہے اس کے پاس بہت سی کتابیں تھیں۔ جن میں تاریخ تیمور لنگ کا ایک نایاب نسخہ بھی تھا۔ رات کو جنگلی ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ڈیرے پر حملہ کیا اور کتابیں بھی لے گئے۔ لیکن وہ نسخہ کسی طرح واپس مل گیا۔ لال بیگ کا باپ نظام جس کو باز بہادر کا لقب حاصل تھا۔ بادشاہ کا مہتمم کتب خانہ تھا۔[۵۹] شیر شاہ نے پرانے قلعہ میں ''شیر منڈل'' کے نام سے ایک عمارت بنائی تھی جس کو عیش گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن ہمایوں نے دوبارہ تخت نشین ہوتے ہی اسے کتب خانہ بنا دیا۔ اسی کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر اس کا انتقال ہوا تھا۔

ہمایوں نے دہلی میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا۔ جس کے صدر مدرس شیخ حسین تھے۔ اس عہد میں شیخ زین الدین خوافی نے چنار کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ شیخ کو انتقال کے بعد اسی مدرسے میں دفن کیا گیا۔ ان کی یادگار میں آگرہ کے بالمقابل جمنا کے کنارے ایک مکتب تعمیر کیا گیا۔[۶۰] سٹیفن نے اپنی کتاب ''آثار قدیمہ'' میں بتایا ہے کہ نئی دہلی کے قریب ہمایوں کا جو مقبرہ ہے وہ بھی ایک زمانے میں مدرسے کا کام دیتا تھا۔ اور تعلیم کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ مدرسہ مقبرے کی چھت پر تھا اور علم و فضل اور اثر و نفوذ رکھنے والے لوگ اس مدرسے کی خدمت پر مامور کیے جاتے تھے لیکن گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے یہ مقام اپنی علمی شہرت کھو چکا ہے اور اس کے کمرے جو تشنگانِ علم سے معمور رہتے تھے اب خالی اور سنسان پڑے ہیں۔[۶۱]

شیر شاہ

شیر شاہ سہسرام کا رہنے والا تھا۔ چونکہ اس کا باپ اس کی تعلیم کی طرف سے غفلت کرتا تھا اس لیے شیر شاہ جون پور چلا گیا۔ باپ نے اس کو واپس بلانا چاہا لیکن اس نے لکھ دیا کہ میں حصول تعلیم کا شائق ہوں۔ اور جون پور اس لحاظ سے سہسرام پر فضیلت رکھتا ہے۔ شیر شاہ نے محنت سے پڑھنا شروع کیا۔ سعدی و نظامی کی تصانیف مثلاً گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور بعض کتابیں فلسفے کی بھی پڑھیں۔ عربی میں بھی مہارت بہم پہنچائی۔ کافیہ کو قاضی شہاب الدین کی شرح کی مدد سے پڑھا۔ شاہانِ سابق کی سوانح عمریاں بھی اس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ وہ اکثر مدرسوں اور خانقاہوں میں جاتا اور علما و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتا۔ اپنے عہد حکومت میں اس کی عادت یہ تھی کہ جب کبھی بعض علما اس کے پاس مددِ معاش حاصل کرنے کے

لیے آتے تو ان سے ''حاشیہ ہندی'' کے متعلق سوالات کیا کرتا کیونکہ اسے تاریخ و سیر کی کتابوں سے بہت شغف تھا۔[۶۲] اس بادشاہ نے نارنول (اب ریاست پٹیالہ میں) میں ایک بہت بڑی عمارت میں مدرسہ قائم کیا۔ اسی مقام پر شیر شاہ کے پڑدادا حسن کا مقبرہ ہے جو شیر شاہ نے ایک لاکھ روپیہ صرف کر کے بنایا تھا۔

شیر شاہ کے بیٹے کو بھی علم و شعر کا ذوق حاصل تھا۔ شیخ ابوالحسن کنبوہ اور مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری سے بہت روابط رکھتا تھا۔ اس زمانے کے مشہور فاضل شیخ علائی تھے۔[۶۳]

اکبر

کتب تاریخ کے بعض بیانات سے یہ غلط فہمی عام ہو چکی ہے کہ محمد جلال الدین اکبر بادشاہ بالکل ناخواندہ تھا۔ دراصل یہ چیز تو زک جہانگیری سے چلی اور عام ہوگئی۔ تو زک میں جہانگیر لکھتا ہے کہ میرا باپ اگر چہ ناخواندہ تھا لیکن عالموں اور ذہین و طباع لوگوں سے پیہم مذاکرات کرنے کی وجہ سے اس کی زبان اس قدر شستہ ہوگئی تھی کہ اس کی گفتگو سننے والوں کو یہ احساس نہ ہو سکتا تھا کہ وہ قطعاً غیر تعلیم یافتہ ہے۔ وہ نثر و نظم کے محاسن کو بخوبی سمجھتا تھا اور اس فہم و ذوق میں وہ اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔[۶۴] لیکن ''واقعاتِ جہانگیری'' کہ وہ بھی جہانگیر کی خودنوشت سوانح عمری سمجھی جاتی ہے۔ مظہر ہے کہ اگر چہ اکبر بہت زیادہ عالم نہ تھا لیکن جب وہ علما سے گفتگو کرتا تھا تو اس سے سننے والوں کو یہی احساس ہوتا تھا کہ بادشاہ تمام علوم کا ماہر ہے۔[۶۵] یعنی اس کتاب نے اکبر کو ناخواندہ نہیں بتایا بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ وہ اصلاً زیادہ عالم نہ تھا۔ علاوہ بریں جو شخص ملک کے نامور پنڈتوں اور مولویوں سے ہر قسم کے علمی مسائل کے متعلق بحث و مذاکرہ کر سکتا تھا۔ اور نثر و نظم کی صنعتوں اور خوبیوں کو بخوبی سمجھتا تھا اسے جاہل و ناخواندہ کہنا پرلے درجے کی زبردستی ہے۔

اکبر کی علمی معلومات

یہ واقعہ ہے کہ ہمایوں نے اکبر کی تعلیم پر ملا عبداللطیف کو مقرر کیا۔ اور بیرم خاں نے بھی عبداللطیف ہی کو اکبر کی اتالیقی پر فائز رکھا۔ پیر محمد خاں اور حاجی محمد خاں بھی اس کے اتالیق تھے۔[۶۶] ابوالفضل اس امر کا شاہد ہے کہ چار سال چار ماہ چار دن کی عمر میں اکبر کی ''بسم اللہ'' کرائی گئی۔ اور مولانا اعظم الدین اس کے استاد مقرر کیے گئے۔[۶۷] جب اعظم الدین کبوتر

بازی کا عادی ہونے کی وجہ سے موقوف کیا گیا تو مولانا بایزید اس کے جانشین ہوئے۔ بعد میں منعم خاں اکبر کی فوجی تربیت پر مامور کیا گیا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اکبر داستان امیر حمزہ کا بے حد شوقین تھا۔ اور آئین اکبر سے ظاہر ہے کہ اکبر نے عمر بھر مطالعہ جاری رکھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی عالم اس کو کتابیں پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اور اکبر کی کیفیت یہ تھی کہ ہر روز صفحے گن کر سنانے والے کو اس کا معاوضہ ادا کر دیتا تھا۔

ابوالفضل کا بیان ہے کہ علم و ادب اور تاریخ کی شاید ہی کوئی قابل ذکر کتاب ہو جس کو اس نے انتہائی توجہ سے نہ سنا ہو۔ ذیل کی کتابیں اکبر نے بار ہا پڑھوا کر سنیں:

اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، تصانیف شاہ شرف الدین منیری، گلستانِ سعدی، حدیقہ حکیم سنائی، مثنوی مولانا روم، جام جم، شاہ نامہ فردوسی، مثنویات شیخ نظامی، تصانیف خسرو و جامی، دیوان ہائے خاقانی و انوری، اور متعدد کتبِ تاریخ۔ [۶۸]

علمی مصروفیتیں

تاریخ کی تمام کتابیں شاہد ہیں کہ نظم و نسق حکومت کی گرانبار ذمہ داریوں کے باوجود اکبر ہر روز فلسفیوں، صوفیوں، عالموں اور مورخین کی باتیں سنتا۔ اس نے فتح پور سیکری میں جو "عبادت خانہ" تعمیر کرایا وہ قصر شاہی کے باغ میں واقع تھا۔ اس عبادت خانے میں چار بڑے بڑے ہال تھے۔ مغربی ہال میں سادات، جنوبی میں علما، شمالی میں مشائخ اور اہل حال۔ اور مشرقی میں دربار کے وہ امرا اور افسر جمع ہوتے تھے جو علم کا ذوق شوق رکھتے تھے۔ بعد میں عبادت خانہ علما کی بحث و نزاع کا مرکز بن گیا۔ لیکن اکبر اس سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔ ہندو پنڈت اور عیسائی مشنری بھی ان مجلسوں میں شریک ہوتے۔ سب شرکائے مجلس کو مٹھیاں بھر بھر کر روپے اور اشرفیاں دیتا اور روز بروز اپنے علم میں اضافہ کرتا رہتا۔ یہ مجلسیں اکثر آدھی رات اور بعض وقت صبح تک برپا رہتیں۔

کتابوں کے ترجمے فارسی میں

اکبر نے سنسکرت اور دوسری زبانوں کی بعض کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ ۱۵۸۲ء میں ملا عبدالقادر، نقیب خاں اور ایک نومسلم برہمن کو حکم دیا گیا کہ مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ اس کتاب کے اٹھارہ حصوں میں سے دو کوئی تین چار ماہ میں ترجمہ کر دیے گئے۔ پھر کچھ

حصہ ملا شیری اور نقیب خاں نے اور کچھ سلطان حاجی تھانیسری نے مکمل کیا۔ اس کے بعد فیضی کو حکم ہوا کہ اس سیدھے سادے ترجمے کو نفیس نظم و نثر میں منتقل کرے۔ لیکن وہ دو حصوں سے زیادہ نہ کر سکا۔ بہر حال مہابھارت کا ایک اچھا خلاصہ فارسی میں مرتب ہو گیا جس کا نام رزم نامہ رکھا گیا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے چار سال کی محنت سے رامائن کا فارسی ترجمہ مکمل کیا۔ اتھروو وید کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے، لیلاوتی کا ترجمہ فیضی نے، علم ہیئت کی ایک کتاب تاجک کا ترجمہ مکمل خاں گجراتی نے، واقعات بابری (ترکی) کا ترجمہ فارسی میں عبدالرحیم خان خاناں نے، تاریخ کشمیر کا ترجمہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے، جامع رشیدی کا ترجمہ ملا عبدالقادر نے، اور مجمع البلدان (عربی میں علم جغرافیہ کی کتاب) کا ترجمہ ملا احمد ٹھٹھوی، قاسم بیگ، شیخ منور اور ملا عبدالقادر نے کیا۔ سنسکرت کی کتاب ہری بنس کا ترجمہ نصر اللہ مصطفیٰ نے اور پنج تنتر کا ترجمہ مولانا حسین واعظ نے کلیلہ دمنہ کے نام سے مکمل کیا۔ اس کے بعد اس کتاب کا ایک سادہ ترجمہ بھی ہوا جس کا نام عیار دانش رکھا گیا۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں کے انداز پر نل اور دمینتی کے عشق کی داستان بھی فارسی میں نظم کی گئی۔ جن دنوں دربار قنوج میں تھا، شہنشاہ نے ملا عبدالقادر کو حکم دیا کہ سنگھاسن بتیسی کا فارسی نظم و نثر میں ترجمہ کرے۔ ایک فاضل برہمن ملا کی مدد کے لیے مامور کیا گیا۔ ترجمہ مکمل ہونے پر اس کا نام ''نامۂ خرد افزا'' رکھا گیا جس سے تاریخ نکلتی ہے۔ یہ کتاب شاہی کتب خانے میں رکھی گئی۔ شاہ نامہ نثر میں منتقل کیا گیا۔ حیات الحیوان کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا گیا۔

زیچ اُلغ بیگ کا ترجمہ امیر فتح اللہ شیرازی کی نگرانی میں اور کشن جوشی، گنگا دھر اور مہیش مہانندا کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں ابوالفضل کی زیر نگرانی کرایا گیا۔ تاریخ الفی نقیب خاں اور مولانا احمد ٹھٹھوی نے لکھی۔ لیکن اس کی تکمیل جعفر بیگ اور آصف خاں نے کی۔[۲۹]

کتب خانے

اکبر کو کتابیں جمع کرنے کا جنون تھا۔ کتب خانہ شاہی کی کچھ کتابیں حرم سلطانی میں رہتی تھیں اور کچھ محل کے مردانہ حصے میں رکھی جاتی تھیں۔ فتح گجرات کے موقع پر اعتماد خاں گجراتی کا کتب خانہ بھی اکبر کے ہاتھ آیا۔ اس میں بہت سی نادر کتابیں موجود تھیں۔ جو کتب خانہ شاہی میں داخل کی گئیں لیکن بعد میں شہنشاہ نے وہ بعض علما و مشائخ میں تقسیم کر دیں۔ ملا عبدالقادر کو

انوار المشکوٰۃ کا ایک نسخہ عطا ہوا۔ جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کے ذاتی کتب خانے میں چار ہزار چھ سو نہایت نایاب کتابیں موجود تھیں۔ جن میں سے بعض خود مصنفوں کے ہاتھ کی اور بعض ان کے معاصرین کی لکھی ہوئی تھیں۔ یہ تمام کتابیں کتب خانہ شاہی میں داخل کی گئیں اور ان کو تین حصوں میں تقسیم کر کے رکھا گیا۔ پہلے حصے میں شاعری، طبابت، نجوم اور موسیقی۔ دوسرے حصے میں علم اللسان، فلسفہ، تصوف، ہیئت و ہندسہ اور تیسرے حصے میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں جمع تھیں۔ فیضی کے اس کتب خانے میں مثنوی نل و دمن کے ایک سو ایک نسخے موجود تھے۔[۷۰]

امرا و علما کے ہاں اکثر نہایت گرانقدر کتب خانے موجود تھے جن میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے نادر نسخے جمع رہتے تھے۔

تعلیم شہزادگان

اکبر نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کی تعلیم کا نہایت مناسب انتظام کر رکھا تھا اور اس کام پر بڑے بڑے نامور علما مامور تھے۔ قطب الدین خاں اور عبدالرحیم مرزا شہزادہ سلیم کے اتالیق تھے۔ فیضی اور شریف خاں شہزادہ مراد کو تعلیم دیتے تھے۔ سیّد خان چغتائی شہزادۂ دانیال کا اتالیق تھا۔ شہزادہ مراد جیسوئیٹ پادریوں سے انجیل بھی پڑھتا تھا۔ اکبر نے اپنے پوتے شاہ جہاں کی اتالیقی پر ابوالفضل اور ایک برہمن کو مقرر کر رکھا تھا۔

تعلیم رعایا

اکبر نے اپنی ہندو اور مسلم رعایا کی تعلیم کا انتظام شاہان سابق سے بہت بڑھ چڑھ کر کیا۔ قلمرو کے مکاتب و مدارس میں ہندو اور مسلم طالب علم اکٹھے پڑھتے تھے۔ فارسی پڑھانے کا انداز اس قدر صحیح اور سائنٹیفک تھا کہ چند ہفتوں کے اندر طالب علم فارسی نثر ونظم روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ باعتبار علوم تعلیم کی ترتیب یہ تھی۔ اخلاق، ریاضی، حسابات، زراعت، ہندسہ، ہیئت، علم الارض، معاشیات، سیاست ملکی، طبیعات، منطق، فلسفۂ فطرت، مجرد ریاضیات، دینیات اور تاریخ، ہندو طلبہ دیا کرن (صرف ونحو) ویدانت اور پتنجلی پڑھتے تھے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ نظام تعلیم میں تبدیلیوں کی وجہ سے مکاتب و مدارس قلمرو کے لیے زیب و زینت کا سامان بن گئے۔ آئے دن قلمرو کے مختلف حصوں میں نئے نئے مکاتب اور بڑے بڑے مدرسے قائم کیے جا رہے تھے۔ فتح پور سیکری کی پہاڑی پر اکبر نے ایک اتنا بڑا مدرسہ قائم کیا کہ سیاح اس کی کوئی نظیر پیش نہ کر سکتے

تھے۔ اس کے علاوہ شہر میں بے شمار دوسرے مدرسے بھی تھے جو شہنشاہ کے حکم سے بنائے گئے تھے۔ آگرہ میں بھی بہت سے مدرسے تھے جن میں تعلیم و تدریس کے لیے شیراز سے معلمین طلب کیے گئے تھے کیونکہ شیراز اس زمانے میں مسلمانوں کے علوم کا مشہور مرکز تھا۔

عبدالحمید لاہوری ''بادشاہ نامہ'' میں لکھتا ہے کہ مشہور فاضل شیخ عبدالحق نے بیس سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ کی تحصیل مکمل کر لی تھی۔ اور قرآن مجید بھی حفظ کر لیا تھا۔ اور شیخ عبدالحق نے لکھا ہے کہ میں دن میں دو دفعہ صبح و شام گرمی میں اور جاڑے میں دہلی کے ایک مدرسے میں جایا کرتا تھا۔ اور صرف تھوڑے عرصے کے لیے اپنے گھر کھانا کھانے آتا تھا۔ میرا گھر مدرسے سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ یعنی مجھے روزانہ آٹھ میل کی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔ یہ شائقین علم کے شوق و ذوق کا عالم تھا۔[۷۱]

اس زمانے میں بے شمار اہل علم اپنے گھروں پر بھی شاگردوں کو پڑھاتے تھے۔ یہ نصاب درس عام مدرسوں کے نصاب سے بلند تر ہوتا تھا اور اس کی تکمیل کے بعد طالب علم فارغ التحصیل سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً ملا عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ نے اپنے وطن بساور کو چھوڑ کر آگرہ میں علوم کی تکمیل کی۔ یہاں انہوں نے مہر علی بیگ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس قسم کے شخصی مراکز علم بے شمار تھے اور ان کا فیض عام تھا۔[۷۲]

امرائے اکبری کی علمی خدمات

بعض امرا بھی خدمتِ علم پر روپیہ صرف کرتے تھے۔ مثلاً شہنشاہ کی دایہ ماہم انگہ (ادھم خاں کی ماں) نے ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ یہی وہ مدرسہ ہے جس کی چھت سے اکبر پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ طبقات اکبری میں بیان کیا گیا ہے کہ جب شرف الدین حسین دربار سے بھاگ کر نا گور چلا گیا تو اس کے ایک غلام فولاد نے تاؤ کھا کر شہنشاہ کو ہلاک کرنے کا منصوبہ باندھا۔ اور کسی طرح اُردوئے شاہی میں داخل ہوگیا۔ اکبر شکار کھیل کر واپس آ رہا تھا کہ اس کمبخت نے اس مدرسے کی چھت پر چڑھ کر شہنشاہ پر تیر چلایا۔ جس سے شہنشاہ زخمی ہوگیا۔ خدام شاہی نے اس غدار کا تلواروں سے قیمہ کر ڈالا۔ یہ مدرسہ کھنڈر کی صورت میں پرانے قلعہ دہلی کے مغربی دروازے کے بالمقابل واقع ہے۔ ایک اور مدرسہ خواجہ معین نے تعمیر کیا تھا۔ مرزا مفلس سمرقندی تین سال تک اس مدرسہ میں پڑھاتے

رہے۔[۷۳]

اکبر ماہرین علوم وفنون کو وظائف و انعامات سے نوازتا رہتا تھا۔ فتح کشمیر کے موقع پر اس نے علمائے کشمیر کو مالا مال کر دیا۔ ہندو اور مسلمان اہل علم سب اس کی سخاوت سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ چنانچہ تروینی کے بنگالی شاعر مادھو چاریہ نے اپنی کتاب چنڈی منگل میں اکبر کی مدح وثنا میں کافی زور قلم صرف کیا ہے۔ طبقات اکبری میں کوئی پچانوے علما و ادبا شعرا کی فہرست دی گئی ہے۔ جن میں سے اکثر شہنشاہ کے وظیفہ خوار تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: امیر میر تقی شریفی، ملا سید سمرقندی، شیخ ابوالفضل، ملا علاء الدین ہندی، ملا صادق حلوائی، مرزا مفلس سمرقندی، حافظ تاشقندی، ملا عبداللہ سلطانپوری، شیخ عبدالغنی دہلوی، قاضی جلال الدین ہندی۔

بیرم خان کا بیٹا عبدالرحیم خان خاناں دربارِ اکبری کے ممتاز ترین امرا میں سے تھا اور علم وفن کی سرپرستی میں مشہور روزگار تھا۔ خود بھی فارسی، ترکی، عربی اور ہندی میں نظم ونثر بے تکلف لکھتا تھا۔ اس نے توزک بابری (ترکی) کا فارسی ترجمہ کرکے اکبر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں کا بیٹا میرزا ایرج بھی تعلیم یافتہ امیر تھا۔ میرزا جان شیرازی کے ایک شاگرد مولانا خیر الدین رومی اس کے اتالیق تھے۔ اس کو ایک اور استاد سے بھی حصولِ تعلیم کا موقع ملا جو احمد آباد کے مدرسے میں تیئیس سال تک معلمی میں مصروف رہا تھا۔ عبدالرحیم کے پاس ایک نادر کتب خانہ بھی تھا جس سے بعض اہل علم اکثر استفادہ کرتے تھے۔ بہت سے لوگ خود خان خاناں کے پاس حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔ کوئی پچانوے علما مختلف طریقوں سے عبدالرحیم کی فیاضانہ توجہ سے بہرہ ور تھے۔[۷۴]

غرض اکبر اور اس کے امرا نے جس وسعتِ قلب اور دریا دلی سے علم وفن اور اس کی تعلیم و تدریس کی خدمت کی، اس کی مثالیں شاہان سابق میں نہیں پائی جاتیں۔ نہ آیندہ بادشاہ اس کی علم دوستی کا مقابلہ کر سکے۔ وہ قدر دانی علما وشعرا اور شوقِ ترویج تعلیم میں عمر بھر مصروف رہا۔ ہندوستان کی ذہنی تربیت میں اس کا بڑا حصہ ہے اور اس کی رواداری کے باعث ہندو اور انگریز مورخین بھی اس کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں۔

جہانگیر

جہانگیر کے پہلے اتالیق مولانا میر کلاں محدث تھے جو اکبر کے زمانے میں ہرات سے

آئے تھے۔ عبدالرحیم میرزا اور قطب الدین محمد خاں کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ بلکہ قطب الدین خاں کے تقرر پر ایک جشن منعقد کیا گیا جس میں اتالیق نے حسب رواج شہنشاہ کی خدمت میں ہاتھی اور دوسرے ہدایا پیش کیے اور شہزادے کو کندھے پر بٹھا کر زر و جواہر کے تشت نثار کیے۔[۷۵]

اگرچہ جہانگیر کی تعلیم و تربیت ہندوستان میں ہوئی تھی لیکن وہ فارسی کے علاوہ ترکی بھی خوب جانتا تھا۔ چنانچہ توزک بابری کا اصل نسخہ (ترکی) اس کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ یہ نسخہ بابر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا لیکن اس میں چار باب کم تھے۔ جہانگیر نے وہ چار باب نقل کر کے اس میں اضافہ کر دیے۔ اور اس پر ترکی زبان میں لکھ دیا کہ یہ باب میں نے نقل کر کے بڑھائے ہیں۔ اس نے محمد ہادی اور معتمد خاں کی مدد سے اپنی سوانح عمری توزک جہانگیری مرتب کی۔ اور اس کے بعد اپنے کتب خانے کے متصدیوں کو حکم دیا کہ بہت سے نسخے تیار کریں۔ یہ نسخے حکام سرکاری اور ملک بھر کے معزز امرا کو تقسیم کیے۔ پہلا نسخہ شاہ جہاں کو عنایت ہوا۔[۷۶]

جہانگیر نے ایک قانون نافذ کیا کہ جو امیر یا دولت مند سیاح لاوارث فوت ہو جائے۔ اس کی املاکِ متروکہ بحق شہنشاہ ضبط کر کے اس سے مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر اور مرمت کا کام انجام دیا جائے۔[۷۷] بہت سے مدرسے جو تیس تیس سال سے چرند و پرند کے مسکن بنے ہوئے تھے جہانگیر نے ان کی مرمت کر کے انہیں معلمین و متعلمین سے آباد کیا۔ آگرہ جو اکبر کے زمانے میں علم وفن کا مرکز بن چکا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں بدستور قائم رہا۔ وہ خود توزک میں لکھتا ہے کہ باشندگان آگرہ علوم وفنون کی تحصیل میں بہت محنت کرتے ہیں اور ہر مذہب و مسلک کے معلمین اس شہر میں آباد ہو چکے ہیں۔

کتب خانہ شاہی کا مہتمم مکتوب خاں تھا۔ جب جہانگیر گجرات گیا تو ایک کتب خانہ ساتھ لے گیا جس سے اس کے شوق کتب بینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اس کتب خانے سے شیوخِ گجرات کو تفسیر حسینی، تفسیر کشاف اور روضۃ الاحباب عنایت کیں اور ان کتابوں کے پشتوں پر اپنے ہاتھ سے گجرات آنے اور کتابیں عنایت کرنے کی تاریخ ثبت کی۔ (توزک جہانگیری)

جہانگیر کے زمانے میں بڑے بڑے علماء درس و تدریس کے کام میں مصروف تھے۔ ان میں مرزا غیاث بیگ ریاضی اور انشا پردازی کا ماہر تھا۔ اس کے علاوہ ملا روز بہان شیرازی، ملا

شکر اللہ شیرازی، ملا تقی شوستری، میر ابوالقاسم گیلانی، ملا باقر کشمیری، ملا مقصود علی، قاضی نور اللہ شوستری، ملا فاضل کابلی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مطلّب سلطان پوری، رحمان بھورا گجراتی، حسن فراغی گجراتی، حسین گجراتی، خواجہ عثمان حصاری، ملا محمد جونپوری اور بہت سے دوسرے باکمال بھی موجود تھے۔[۷۸]

شاہ جہاں

شاہ جہاں کے عہد میں وہ تمام مدارس جو شاہانِ سابق اور امرا کے زمانوں میں قائم کیے گئے تھے مع اپنے اوقاف کے نہایت رونق پر رہے۔ اس کے علاوہ اس نے خود جامع مسجد دہلی کے قریب ایک شاہی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ کار سٹیفن نے بتایا ہے کہ جامع مسجد کے شمال میں شاہی شفا خانہ اور جنوب میں شاہی مدرسہ واقع تھا۔ یہ دونوں عمارتیں ۱۷۵۷ء کے ہنگامے سے بہت پہلے کھنڈر ہو چکی تھیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد بالکل پیوندِ زمین کر دی گئیں۔ (آج کل شفا خانے کے کھنڈروں پر ڈفرن ہسپتال کے نام سے انگریزوں کا تعمیر کردہ شفا خانہ موجود ہے۔) یہ عمارتیں مسجد کے ساتھ ہی ۱۶۵۰ء میں تعمیر کی گئی تھیں۔ سرسید احمد خاں نے لکھا ہے کہ ''بعد میں مولوی محمد صدر الدین خاں صدر الصدور شاہ جہاں آباد نے یہ مدرسہ اپنے نام منتقل کرالیا تھا اور مرمت و اضافہ کے بعد اس میں تازہ روح پھونک دی تھی۔'' شاہ جہاں نے ایک اور مدرسہ دارالبقا کے کھنڈروں کی بھی مرمت کرائی تھی۔ اور چند ممتاز علما کو اس میں مدرس مقرر کیا تھا۔ بادشاہ وقت نے مولانا صدر الدین صدر الصدور کو اس مدرسے کا نگراں مقرر کیا۔ اس کے پاس ہی دو بڑے بڑے حوض، ایک مسجد، ایک شفا خانہ اور ایک بڑا بازار واقع تھا۔[۷۹]

شہزادہ داراشکوہ

شہزادہ داراشکوہ کو سنسکرت زبان، ہندوؤں کے ادبیات اور یوگ و تصوف سے خاص شغف تھا۔ وہ فارسی اور عربی بھی خوب جانتا تھا اور شیخ ہروی خراسانی اس کے اتالیق تھے جو خود اس زمانے کے ایک نامور عالم مولانا عبدالعلیم کے شاگرد تھے۔ یہ شہزادہ ہر وقت برہمنوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ اور اس نے ملک بھر سے ذی علم آدمیوں کو جمع کر کے ویدوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا تھا۔ وہ خود بھی متعدد کتابوں کا مترجم اور مصنف تھا۔ اس نے اپنشدوں کا ترجمہ سرِّ الاسرار (یا سرِّ اکبر) کے نام سے کیا۔ اس کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا

ہے کہ زمانۂ قیام کشمیر میں وہ ایک مشہور صوفی بزرگ ملا شاہ کا مرید ہوگیا تھا۔ وحدت الوجود کا قائل تھا اسی وجہ سے اس نے بنارس سے چند فاضل پنڈتوں کو بلا کر ان کی مدد سے اپنشدوں کا ترجمہ کیا جو ۱۶۵۷ء میں مکمل ہوا۔ بھگوت گیتا یوگ وششٹ اور رامائن کا ترجمہ بھی داراشکوہ ہی کا کیا ہوا ہے۔ ایک سنیاسی بابا لال داس سے شہزادے کی جو گفتگو ہوئی اس کو ''مکالمۂ بابا لال داس'' کے نام سے مرتب کیا۔ سفینۃ الاولیا میں اولیائے اسلام کے حالات لکھے۔ سکینۃ الاولیا میں حضرت میانمیر رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے خلاف کا حال لکھا۔ نادر النکات، حسنات العارفین اور رسالہ حق نما۔ یہ تین رسالے تصوف پر تالیف کیے۔ ایک کتاب مجمع البحرین لکھی جس میں ہندوؤں اور صوفیوں کی اصلاحاتِ وحدت الوجود کے درمیان تطابق قائم کیا۔ غرض اس شہزادے کی توجہ زیادہ تر تصوف کی طرف مبذول رہی اور اس کی حوصلہ افزائی سے علم کے اس شعبے نے بھی خاصی ترقی کی۔[۸۰]

اورنگ زیب عالمگیر

ہندوستان کے شہنشاہوں میں یہ بادشاہ اپنی بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے۔ عابد و متقی انسان تھا۔ علم سے بے حد شغف رکھتا تھا۔ خصوصاً فقہ اسلامی کی تدوین و ترتیب اور اس کے نفاذ پر بہت متوجہ رہتا تھا۔ اس نے بے شمار مکاتب و مدارس قائم کیے۔ ایک دفعہ اس نے لکھنؤ کے ایک محلہ فرنگی محل میں ولندیزیوں کی عمارتیں ضبط کیں اور انہیں مدرسہ قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ میں اب تک موجود ہے (سفرنامۂ برنیئر)۔ اس نے مکرمت خاں دیوان گجرات اور قلمرو کے دوسرے افسروں کو یہ حکم بھیجا کہ میزان سے لے کر کشاف تک جتنے طلبہ تعلیم پا رہے ہوں ان سب کو معلمین مدارس اور مقامی صدر کی منظوری سے مالی امداد دی جائے۔ تاریخ فرح بخش میں محمد فیض بخش نے لکھا ہے کہ عالمگیر طلبہ کو ان کی تعلیم و تدریس کے دوران میں روزانہ وظائف دیا کرتا تھا۔ مثلاً میزان پڑھنے والے کو ایک آنہ۔ منشعب کے طالب علم کو دو آنے اور شرح وقایہ اور فقہ تک کے طلبہ کو آٹھ آنے روزانہ ملتے تھے۔ ۱۶۷۶ء میں اس نے گجرات کے مدرسوں کی مرمت کے لیے گراں قدر رقم منظور کی۔ اکرم الدین صدر نے احمد آباد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے کے صرف سے ایک مدرسہ تعمیر کیا اور شہنشاہ سے امداد طلب کی۔ اس پر عالمگیر نے دو گاؤں سوندرہ اور سیھا بطور جاگیر مدرسے کے نام

وقف کر دیے۔[۸۱] اس مدرسے کے علاوہ بعض بزرگوں نے اور مدرسے بھی قائم کیے۔ مثلاً بیانہ میں قاضی رفیع الدین محمد نے قاضیوں کی مسجد کے پاس ایک مدرسہ تعمیر کیا۔ جس کے کتبے پر تاریخ ۱۰۸۰ھ (۱۶۷۰ء) درج ہے۔

اس زمانے میں سیالکوٹ علوم اسلامی کا بڑا مرکز تھا۔ اور ملک کے اکثر حصوں سے لوگ اس قصبے کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ مشہور عالم مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے بیٹے مولوی عبداللہ ایک مدرسے میں تعلیم دیتے تھے (یہ مدرسہ مسجد مولانا عبدالحکیم کے نام سے اب بھی قائم ہے) سیالکوٹ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں بہت اچھا کاغذ بنتا تھا۔ مان سنگھی اور ریشمی کاغذ خاص طور پر مشہور تھا۔ کیونکہ وہ ساخت کے اعتبار سے صاف مضبوط اور پائیدار تھا۔ سیالکوٹ کے نواح میں تین گاؤں کاغذ سازوں سے آباد تھے۔ یہاں سے کاغذ ملک کے دوسرے حصوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اور شہنشاہان دہلی کے دفاتر میں بھی زیادہ تر یہی کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔[۸۲] (یہ تین گاؤں نیکا پورہ، رنگ پورہ اور ہیرانوالہ پورہ کے نام سے اب بھی آباد ہیں اور یہاں کاغذ اب بھی بنایا جاتا ہے)۔

عالمگیر کی تعلیم

اورنگ زیب نے جن بڑے بڑے علما اور اہل فن سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامی سعد اللہ خاں (وزیر شاہ جہاں)، مولانا محی الدین عرف ملا مومن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی، ملا شیخ احمد (ملا جیون)، شیخ عبدالقوی، ملا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانشمند خاں کے اسما خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں (عالمگیر نامہ)۔

شہنشاہ عربی، فارسی، ترکی (چغتائی) اور ہندوستانی چار زبانوں بوجہ احسن جانتا تھا۔ اور ان زبانوں میں بے تکلف گفتگو کرتا تھا۔ لیکن فارسی پڑھنے لکھنے کا بے حد شوقین تھا۔ عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری میں لکھا ہے کہ تفسیر، حدیث اور فقہ پر اس کی توجہ بطور خاص مبذول رہتی تھی۔ اور طریقت، سلوک اور اخلاق کی کتابیں مثلاً احیاء العلوم، کیمیائے سعادت۔ رسائل شیخ زین الدین و قطب الدین و محی الدین شیرازی او رمکتوبات شیخ احمد سرہندی اکثر زیر مطالعہ رکھتا تھا۔ غالباً آل تیمور میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے قران مجید حفظ کیا۔

پینتیس سال کی عمر میں حفظ شروع کیا۔ تاریخ ہوئی سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی (۱۰۶۲ھ)

اور ختم حفظ کی تاریخ "لَوْحِ مَحْفُوظ" (۱۰۷۸ھ) ہوئی۔ ایک شاعر نے رباعی لکھی

تو محیِ دین و مصطفٰی حافظ تو　　　　تو صاحبِ سیف و مرتضٰی حافظ تو

تو حامیِ شرع و حامی تو شارع　　　　تو حافظ قران و خدا حافظ تو

شہنشاہ نے شاعر کو صرف اس رباعی پر سات ہزار روپے انعام دیا۔ تعلیم کے متعلق اس کے خیالات نہایت دانشمندانہ اور عملی تھے۔ چنانچہ برنیئر نے ملا صالح کا ایک قصہ لکھا ہے۔ (گو مؤرخین اس کو نہیں مانتے کہ عالمگیر کا کوئی استاد ملا صالح نامی بھی تھا) جس کو اورنگ زیب نے یہ کہہ کر ملامت کی کہ "تم نے مجھے صرف نحو اور منطق و فلسفہ میں الجھائے رکھا حالانکہ تمہارا فرض تھا۔ مجھے یہ بتاتے کہ روئے زمین کی اقوام کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔ ان کے وسائل، ان کی قوت، ان کے اسلوب جنگ، ان کے اوضاع اور اعتقادات ان کے نظامِ حکومت کی کیا کیفیت ہے اور مجھے تاریخ کے باقاعدہ مطالعہ سے یہ بتاتے کہ سلطنتوں کے آغاز اور ان کے عروج و زوال کے کیا اسباب ہوئے۔ اور وہ کونسے واقعات، حوادث یا لغزشیں تھیں جن کی وجہ سے دنیا میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے۔ تاکہ یہ معلومات کاروبار مملکت میں میرے کام آتیں۔"

اورنگ زیب اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کی نقلیں کیا کرتا تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھیجتا تاکہ حرمین میں ان نسخوں کی تلاوت کی باعث وہ داخل ثواب ہو۔ انتقال کے وقت تحریر مصحف باری کی اجرت کے ۳۵۰ روپے اس کے بٹوے سے برآمد ہوئے جو حسب وصیت نامہ فقراء کو تقسیم کر دیے گئے۔

عالمگیر کے رقعات شاہد ہیں کہ وہ زبانِ فارسی کا بے نظیر انشا پرداز تھا۔ اور اسے قلیل الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ اس نے اپنے شہزادوں، امیروں اور صوبہ داروں کو جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں بھی ان کی تعلیم و ہدایت کے لیے قیمتی نصائح و مواعظ قلمبند کیے ہیں۔ عالمگیر کا عہد بڑے بڑے جلیل القدر علما سے لبریز تھا۔ ملا محمد یعقوب میر عدل شیخ سلیمان منیری داروغہ اردوئے معلی، شیخ عبدالعزیز اکبر آبادی منشی دربار، شیخ قطب برہان پوری، ملا قطب ہانسی ملتانی، ملا عوض وجیہ محتسب لشکر، ملا عبداللہ سیالکوٹی (فرزند ملا عبدالحکیم سیالکوٹی)، قاضی عبدالوہاب (قاضی عسکر)، شیخ الاسلام پسر عبدالوہاب، ملا شرف الدین لاہوری، ملا عبدالباقی جون پوری، قاضی محب اللہ بہاری اور بے شمار دوسرے اہل کمال عہد عالمگیری میں موجود تھے۔ حضرت عبداللطیف برہان پوری، حضرت شیخ برہان، حضرت شیخ بایزید، حضرت ملا

قطب الدین شہید سہالوی، حضرت میر نصیر الدین ہروی اس زمانے کے بڑے بڑے اولیاء و اصفیا تھے اور شاہنشاہ ان کا بیحد احترام کرتا تھا۔

فقہ حنفی کی تدوین

چونکہ عالمگیر کو فقہ اسلامی سے خاص شغف تھا۔ اس نے شیخ نظام کے زیر ہدایت علمائے حنفی کی ایک پوری جماعت کو فقہ کی کتاب لکھنے پر مامور کیا۔ جس کا نام بعد میں فتاویٰ عالمگیری رکھا گیا۔ جو فقہ حنفیہ کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم (والد شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ) مولانا میر محمد قنوجی، ملا محمد جمیل، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جون پوری، شیخ وجیہہ الدین، شیخ رضی الدین، سید علی اکبر سعد اللہ خانی، سید نظام الدین ٹھٹھوی، مولانا جلال الدین محمد، مولانا محمد شفیع، ملا وجیہہ الرب، ملا محمد فائق، ملا محمد اکرم ملتانی، ملا محمد غوث، میر میراں علامہ ابوالفرح (عرف سید معدن)، ملا غلام محمد قاضی القضاۃ لاہوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری اس کتاب کی ترتیب میں شامل تھے۔ شہنشاہ خود ہر روز اس کتاب کے ایک دو صفحے سنتا تھا۔ اور علما کو مشورے دیتا تھا۔ شہنشاہ کو دینیات سے جو مخصوص دلچسپی تھی اس کی وجہ سے کتب خانہ شاہی کے دینی حصے میں گراں قدر کتابوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔

عالمگیر نہایت راسخ العقیدہ اور پرہیز گار مسلمان تھا۔ تہجد کے بعد صبح پانچ بجے سے سات بجے تک تلاوت قرآن مجید کرتا اور پھر ڈھائی بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک کتابت قرآن مجید اور مطالعہ کتب میں گزارتا۔ جمعرات کی شام کو رات گئے تک تلاوت و نماز میں مصروف رہتا اور سلطنت کے کاروبار بھی نہایت باقاعدگی اور دقتِ نظر سے انجام دیتا۔ غرض سلاطینِ مغلیہ میں تقویٰ، محنت، علم دوستی، علما پروری اور ترویجِ تعلیم کے اعتبار سے یہ بادشاہ بہت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ [۸۳]

بہادر شاہ

زبدۃ التواریخ میں مولوی عبدالکریم نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ نے بہت اچھی تعلیم پائی تھی۔ اور علما کی صحبت کا بے حد مشتاق تھا۔ اس کے عہد میں دو نئے مدرسے دہلی میں قائم ہوئے۔ ایک کی بنیاد غازی الدین نے رکھی یہ آصف جاہ اول کا بیٹا تھا جو دکن میں خاندانِ آصفیہ کا بانی تھا، غازی الدین اورنگ زیب کا ایک معتمد علیہ افسر اور بہادر شاہ کے دربار کا ایک مقتدر امیر تھا۔

دہلی میں اجمیری دروازے کے قریب اس نے ایک مدرسہ تعمیر کیا جس کے احاطے کے اندر ایک مسجد اور ایک اپنا مقبرہ بھی بنوایا۔ دوسرا مدرسہ خان فیروز جنگ نے بنایا۔ اور وہ مرنے کے بعد اسی مدرسے میں دفن ہوا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں قنوج کے مقام پر ایک مدرسہ فخر المرابع کے نام سے قائم تھا جس میں فرخ آباد کے مولوی علیم الدین اور مولوی نعیم الدین نے تعلیم پائی۔[۸۴]

محمد شاہ

اگرچہ سید بھائیوں کی سازشوں اور نادر شاہ کے حملے کی وجہ سے محمد شاہ کے عہد میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن بادشاہ کے حکم سے انبر کے راجا سوائی جے سنگھ (بانی جے پور) نے جے پور، اجین، متھرا، بنارس اور دہلی میں رصدگاہیں تعمیر کیں تاکہ علم ہیئت کی ترویج ہو۔ دہلی کی رصدگاہ فصیل شہر کے باہر جنتر منتر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۱۷۲۴ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ خونخوار جاٹوں نے پچاس برس کے اندر ہی اندر اس کو تباہ کردیا۔[۸۵] اسی رصدگاہ کے مشاہدات کے ماتحت مرزا خیر اللہ اور شیخ محمد محدث نے جے سنگھ کی زیرنگرانی ''زیج محمد شاہی'' مرتب کی جس کی صحت ۱۷۴۱ء میں دو سیاروں کے قران کے وقت پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ ۱۷۲۲ء میں نواب شرف الدولہ نے ایک مدرسہ مع مسجد تعمیر کیا۔ نادر شاہ نے دہلی پر حملے کے دوران میں قتلِ عام کو حکم دیا تھا۔ وہ سید محمد بلگرامی کی کتاب تبصیرات الناظرین کے بیان کے مطابق 'مدرسہ روشن الدولہ'' میں بیٹھ کر دیا تھا۔ بعض مؤرخین مسجد روشن الدولہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور مدرسے کا نام نہیں لیتے۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں مسجد و مدرسہ قریب قریب لازم وملزوم تھے اس لیے ایک اور مدرسے کا وجود بھی ثابت ہی سمجھنا چاہیے۔

شاہ عالم ثانی

اگرچہ نادر شاہ مال و دولت کے علاوہ شاہان مغلیہ کے کتب خانے پر بھی ہاتھ صاف کرگیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم ثانی کے وقت کتابوں کی فراہمی دوبارہ شروع کردی گئی تھی۔ غلام قادر روہیلے نے جو شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالنے کا مجرم ہے جواہر خانے میں داخل ہوکر ایک صندوق جواہرات کا۔ بہت سے نسخے قرآن مجید کے اور آٹھ بڑی ٹوکریاں کتابوں کی کتب خانہ شاہی سے لوٹ لیں۔[۸۶] اودھ کے نواب وزیر آصف الدولہ کے ماتحت اس کے وزیر حسن رضا خاں نے فرخ آباد میں ایک مدرسہ تعمیر کیا جس میں مولانا عبدالوحید خیر آبادی درس

علوم دیا کرتے تھے۔

ہم نے پہلی فصل ''علم وتعلیم کی سرپرستی'' کے عنوان سے قائم کر کے اس کے تین حصے کیے۔ پہلے دو حصوں میں مسلمان بادشاہوں کی علمی و تعلیمی خدمات کا تذکرہ کیا ہے جو کسی طرح مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ مختلف امرا اور نوابوں کی جاگیروں میں بھی علوم وفنون کی ترویج و ترقی آغاز سے انجام تک برابر جاری رہی جس کا مفصل تذکرہ ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے اور تیسرے حصے میں عورتوں کی تعلیم کے متعلق تھوڑا سا تذکرہ کیا گیا ہے۔

—— (۳) ——

تعلیمِ نسواں

مسلمانوں کے دور میں جہاں لڑکوں کی تعلیم کا اہتمام و انتظام اکثر سلاطین، امرا اور علما کی طرف سے بوجہ احسن کیا جاتا رہا۔ وہاں لڑکیوں کی تعلیم سے بھی غفلت نہیں کی گئی۔ اگرچہ زمانے کے بعض معاشرتی حالات اور قدامت پرست عناصر کے مخصوص خیالات تعلیم نسواں کی کماحقہ توسیع میں حائل ہوتے رہے لیکن چونکہ اسلام میں مرد اور عورت پر طلب علم بطور فریضہ عائد تھی اس لیے علمِ دین کے مبادی کی تعلیم ہر بچے اور بچی کو دی جاتی رہی۔ ہر محلے کی مسجد کے پیش امام کے حجرے میں بچوں اور بچیوں کی مخلوط تعلیم کا ایک مکتب ہوتا تھا جس میں وہ انہیں قرآن مجید اور مسئلے مسائل کی تعلیم دیتا تھا۔ اور جن بچوں اور بچیوں کے والدین اس امر کا مطالبہ کرتے تھے انہیں فارسی لکھنا پڑھنا بھی سکھا دیا کرتا تھا۔ جونہی بچہ چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہوجاتا تھا اس کے والدین اس کی رسم تسمیہ خوانی (بسم اللہ) ادا کرتے تھے۔ اور استاد پہلے ہی دن اس کو تبرکاً و تیمناً پہلا سبق دے دیتا تھا۔ اس موقع پر والدین حسب استطاعت محلے اور مکتب میں شیرینی تقسیم کرتے۔ مسجدوں کے مکاتب کے علاوہ بعض گھروں کی بیبیاں اپنے اپنے ہاں بچوں کو قرآن اور مسائل نماز اور روزہ کی تعلیم دیتی تھیں اور یہ پرائیویٹ استانیاں بے حد واجب الاحترام سمجھی جاتی تھیں۔ ان حقائق کے لیے ہمیں کسی حوالے یا سند کی ضرورت نہیں کیونکہ شمالی ہند میں ہر مسلمان اس سے واقف و آشنا ہے اور مسجدوں کے مکاتب اور پرائیویٹ استانیاں اب بھی ابتدائی دینی تعلیم دینے میں مصروف ہیں۔

جعفر شریف نے ''قانون اسلامی'' میں لکھا ہے کہ جب کوئی لڑکا یا لڑکی قرآن مجید ختم

کر لیتے تھے تو معلم کو باقاعدہ ہدایا پیش کیے جاتے تھے۔ وقتاً فوقتاً معلم اپنے شاگردوں کو عیدیاں لکھ کر دیتے تھے۔ یہ عیدیاں رنگین یا زرافشانی کاغذ پر لکھی جاتی تھیں۔ اور ان پر شعر یا نثر میں مبارک بادِ عید لکھی جاتی تھی۔ بچہ یا بچی اس عیدی کو پا کر اپنے والدین کو دکھاتے اور معلم کو ہر گھر سے انعام اور تحفے بھیجے جاتے تھے۔

یہ کیفیت تو عام مسلمانوں کی تھی متوسط الحال اور بالائی طبقے کے گھروں میں باقاعدہ استانیاں ملازم ہوتی تھیں۔ محلدار، اَنّا اور دَوا کے ساتھ ساتھ آتون بھی ہوتی تھیں۔ جن کا کام بچیوں کو پڑھانا اور فرائض اتالیقی ادا کرنا تھا۔ سلاطین و امرا کے ہاں شہزادیوں اور امیر زادیوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے استانیاں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے سن رسیدہ علما مقرر کیے جاتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں جابجا اس امر کی شہادتیں ملتی ہیں کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین اپنی شہزادیوں کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ صرف کرتے تھے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے دورِ زوال و انحطاط میں تعلیم نسواں کی جو مخالفت ہوئی۔ اور جس میں بعض بڑے بڑے علما نے بھی حصہ لیا وہ محض زوال کا اثر اور روایات اسلامی کی فراموشی کا نتیجہ تھا۔ ورنہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں ثقافت کے اس اہم ترین شعبے یعنی تعلیم نسواں سے کبھی غفلت نہیں کی۔ بلکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بادشاہ جتنا زیادہ دیندار ہوتا تھا اسی قدر تعلیم نسواں پر اس کی توجہ زیادہ مبذول ہوتی تھی۔

سلطان شمس الدین التمش سے زیادہ دیندار کون ہوگا۔ جس کو اس کے ہم عصر اولیائے وقت میں شمار کرتے تھے۔ اس کی جانشین سلطانہ رضیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قصر سلطانی کی دوسری شہزادیاں اور دربار شاہی کے امرائے مقربین کی بیٹیاں بھی حصول تعلیم میں سرگرم ہوں گی۔ چونکہ ہمارے مورخین زیادہ تر بادشاہوں اور سیاسی شخصیتوں ہی کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس دور کی ان تعلیم یافتہ خواتین کا تذکرہ ضروری نہیں سمجھا جو سیاسی اعتبار سے اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ لیکن تاریخ کے اکثر دریچوں سے حقیقت جھانکتی ہوئی نظر آ ہی جاتی ہے۔ مثلاً مالوہ کے مشہور سلطان غیاث الدین کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے اپنی حرم سرا میں دربار کے علیحدہ دفاتر قائم کر رکھے تھے اور ایک دفعہ تو اس کے قصر شاہی کے اندر کوئی پندرہ ہزار عورتیں تھیں۔ ان میں استانیاں تھیں۔ گانے والیاں تھیں۔ دعائیں پڑھنے والیاں تھیں اور دوسرے تمام پیشوں اور حرفتوں کی ماہر عورتیں موجود تھیں۔[۸۷] ان استانیوں کا وجود ہی اس امر کی دلیل ہے کہ محل میں تعلیم نسواں کا عام رواج تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ویسی عالم و فاضل۔ ادیب اور شاعر عورتیں کم ہیں۔ جیسی مثلاً بنوامیہ و بنو عباس کی خلافتوں اور اندلس کی حکومت کے زمانے میں تھیں۔ اور جن کے تذکرے تاریخ و ادبیات کی کتابوں کی زینت ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سلاطین مغلیہ کے دور میں نہ صرف تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔ بلکہ بعض نہایت قابل و فاضل خواتین بھی پیدا ہوئیں۔ مثلاً بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نہایت شستہ و شائستہ مذاق کی انشا پرداز اور مورخہ تھی۔ اس کے پاس ایک کتب خانہ بھی تھا جو اس نے خود فراہم کیا تھا۔ اس کی کتاب ''ہمایوں نامہ'' [۸۸] صرف اس دور کی مستند ترین تاریخ ہی نہیں۔ بلکہ اس سے حرم شاہی کے حالات اور مصروفیتوں پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

ہمایوں کی بھانجی (شہزادی شاہ رخ کی بیٹی) سلیمہ سلطانہ بیرم خاں سے بیاہی گئی تھی۔ یہ شہزادی بہت پڑھی لکھی اور شاعرہ تھی۔ [۸۹] اور بیرم خان کے انتقال کے بعد شہنشاہ اکبر کی ملکہ بنی۔ کیونکہ اکبر اس کی تحصیلاتِ علمی اور ذوق شعر کی بے حد قدر کرتا تھا۔ اکبر کی دودھ پلائی ماہم اَنگہ جس نے اپنے جوڑ توڑ سے بیرم خان کی بیخ کنی میں بہت بڑا حصہ لیا تھا، پڑھی لکھی اور علم دوست خاتون تھی۔ اس نے دہلی میں جو عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا تھا اس کا ذکر اس سے پہلے کیا جاچکا ہے۔ اکبر کو لڑکیوں کی تعلیم سے خاص شغف تھا۔ فتح پور سیکری میں اس نے جو محل تعمیر کرایا۔ اس میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ کمرے مخصوص کردیے تھے۔ ظاہر ہے کہ دہلی و آگرہ کے محلوں میں بھی یقیناً اس مقصد کے لیے خاص انتظام ہوگا۔ جس کا ذکر مورخین نے نہیں کیا۔ لیکن فتح پور سیکری کے انتظام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس بادشاہ نے اپنے ہر محل میں ''گرلز سکول'' کا بندوبست کیا ہوگا۔ [۹۰]

جہانگیر کی مشہور ملکہ نور جہاں بیگم کے جتنے حالات کتب تاریخ میں مندرج ہیں ان سے واضح ہے کہ وہ فارسی و عربی میں بہرہ وافر رکھتی تھی۔ اور اشعار بے تکلف کہتی تھی۔ اس کے علم اور اس کی ذہانت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے کاروبارِ سلطنت کے اجرا کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی اور تمام شعبہ ہائے حکومت میں اپنی صوابدید سے احکام و فرامین جاری کرتی تھی۔ شاہ جہاں کی ملکہ ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) فارسی میں خاصی مہارت رکھتی تھی۔ اور شعر بھی کہتی تھی۔ اس کی بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ اور اپنے زمانے کے ارباب علم کی مالی امداد و سرپرستی کرتی تھی۔ شاہ جہاں کے زمانۂ نظر بندی میں یہی بیٹی تھی جو اپنے بڈھے

باپ کی ندیم و دمساز تھی اور اس کو کتابیں پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔

پروفیسر سرکار نے "حکایاتِ اورنگ زیب" میں لکھا ہے کہ حافظہ ستی النساء بیگم فارسی کی عالمہ تھی اور ملکۂ ممتاز محل کی ناظرۂ پیشی کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اسی کی سفارش سے ملکہ غریب و نادار علما و مشائخ کی بیٹیوں کو عطیات و وظائف دیا کرتی تھی۔ اور ستی النساء بیگم ہی جہاں آرا بیگم کی تعلیم و تربیت اور اتالیقی کے منصب پر ممتاز ہوئی تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی بڑے شہزادی زیب النساء بیگم بہت عاقلہ و عالمہ تھی۔ عالمگیر نے اسے خود تعلیم دی تھی۔ اور اس کو قرآن مجید کے مطالب و معانی میں کامل بنا دیا تھا۔ یہ خاتون فارسی و عربی میں پوری مہارت اور فن خطاطی میں کمال رکھتی تھی۔ اس نے بہت سے علما شعرا اور ادبا کو وظائف دے رکھے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بہت سی کتابیں اس کے نام پر معنون کی گئیں۔ اورنگ زیب کی ایک اور بیٹی شہزادی بدر النسا، گو زیب النسا کی سی عالمہ نہ تھی لیکن حافظۂ قرآن تھی۔

یہ صرف ان خواتین کا مختصر تذکرہ ہے جن کے نام کتب تواریخ میں نہایت ممتاز اور نمایاں ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی شاہی خاندان تعلیم یافتہ شہزادیوں سے خالی نہ تھا۔ شاہانِ دکن کی شہزادیوں میں سے چاند بی بی نہایت مشہور ہے جو فنونِ جنگ اور رموز حکومت میں ماہر اور کامل تھی۔ علاوہ بریں امرائے دربار، والیانِ صوبہ جات، جاگیردار، اور علما و مشائخ اپنی بیٹوں کو تعلیم دلانے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے تھے۔ اور ان کی تقلید میں بالائی متوسط الحال طبقہ بھی تعلیم سے غافل نہ تھا۔

دوسری فصل: صوفیہ و مبلغین

جس طرح مسلمان بادشاہوں کے دربار امرا، رؤسا، فوجی جرنیلوں اور عظیم فن کاروں کا ملجا و ماویٰ تھے اور وہ سلاطین کی سرپرستی کے زیرِ سایہ ملک گیری، کشور آرائی اور ثقافت کی گراں قدر خدمات انجام دیتے تھے۔ اسی طرح فقرا و صوفیہ کے دربار عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے جہاں انہیں روحانی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ علمائے اسلام کو تو قرآن و حدیث، منطق و فلسفہ اور شریعت و فقہ کی تعلیم و ترویج سے تعلق ہونے کی وجہ سے صرف مسلم معاشرے کے ساتھ سابقہ پڑتا تھا اور وہ عام اہل ہند سے چنداں رابطہ نہ رکھتے تھے۔ لیکن صوفیہ چونکہ مبلغین تھے انہیں کسی کی تکفیر و تفسیق سے واسطہ نہ تھا۔ وہ کسی کو برا نہ کہتے۔ سب اہل عالم کو بلا امتیاز مذہب و ملت "خدا کا کنبہ"

سمجھتے۔ باہم اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے مشترک مالوفات کی تلاش میں رہتے۔ اور سب کو عرفانِ الٰہی کی تعلیم دیتے۔ اس لیے ان کے دروازے ہر کس و ناکس پر کھلے رہتے تھے۔ ان کے درباروں میں برہمن اور اچھوت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ امن و آشتی اور مساواتِ انسانی کی تلقین کر کے اسلام کے اصولِ اساسی کو تقویت پہنچاتے اور ان کی مقدس زندگیوں کے اثر سے عوام کو اسلام کی طرف کشش و رغبت ہوتی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں اسلام زیادہ تر صوفیہ ہی کی مساعی سے پھیلا۔ چونکہ ان بزرگوں کو ذاتی اغراض سے کوئی سروکار نہ تھا اس لیے سلاطین و امرا بھی ان کی عزت و توقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ اور ان کے لنگروں کے مصارف کے لیے اکثر روپیہ بھی دیتے رہتے۔ لیکن ان بزرگوں کی روز افزوں خیرات ان کے خزانوں کو ہمیشہ خالی ہی رکھتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے رسوخ سے عوام کی بعض شکایات کا تدارک کرا دیتے۔ اور عوام کی ممنونیت بھی تبلیغ کے کام میں معاون ہوجاتی۔ بعض صوفیہ نے ادب و شعر اور موسیقی کی اعانت و سرپرستی کر کے ثقافت کی گراں قدر خدمت انجام دی جس کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔

صُوفیہ کا کارنامہ

ہندوستان کے مختلف گوشوں میں دس گیارہ صدیوں تک ہزار ہا صوفیہ اور مبلغین نے کام کیا ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کا فکری جمود ٹوٹ گیا۔ جاہلانہ ضعیف الاعتقادی۔ اوہام پرستی ذات پات کے امتیاز، چھوت چھات اور شرک و انکار کی گھٹائیں جو صدیوں سے اس بدنصیب ملک پر چھائی ہوئی تھیں، چھٹ گئیں۔ اور شرفِ انسانیت کا آفتاب طلوع ہوا۔ عقیدۂ توحید اور مساواتِ انسانی کی مقبولیت عامہ کے باعث ہندوؤں کے مذہب کی بنیادیں ہل گئیں اور ان میں نئے نئے روشن خیال مذہبی مفکرین پیدا ہوئے جن کی مساعی سے پرانے ہندو دھرم کا قلع قمع ہوگیا۔ اس مذہبی انقلاب کا مفصل تذکرہ اس کتاب کے کسی آیندہ باب میں کیا جائے گا۔

ان سب بزرگوں کے حالات کی فراہمی تو ممکنات میں سے نہیں۔ البتہ چند اکابر کا مختصر سا تذکرہ سطورِ ذیل میں کیا جائے گا۔ جو اپنے زہد و تقویٰ، اپنے اعمالِ صالحہ اور اپنے تبلیغی کارناموں کے اعتبار سے بے حد ممتاز ہیں اور جن کی درگاہیں آج تک ہر مذہب و ملت کے افراد کے لیے مرجع عام بنی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں پہلے مبلغ اسلام حضرت شیخ اسماعیل بخاری ثم

لاہوری ہیں۔ جو ۱۰۰۵ء میں یہاں وارد ہوئے۔ وہ عالمِ دین بھی تھے اور صوفی صافی بھی۔ چنانچہ ان کے وعظ و ارشاد سے ہزارہا ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔ تذکرہ علمائے ہند میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

از عظمائے محدثین و مفسرین بود۔ اول کسے ست کہ علم تفسیر و حدیث بہ لاہور آوردہ۔ ہزارہا مردم در مجلس وعظ دے مشرف باسلام شدند۔

داتا گنج بخش

حضرت شیخ علی ہجویری غزنی کے ایک محلّہ ہجویر کے رہنے والے تھے۔ ۱۰۰۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۷۲ء میں انتقال کیا۔ علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد بہت سے ملکوں کی سیاحت کی۔ اور سلطان مسعود غزنوی کے عہد حکومت میں لاہور پہنچے۔ یہاں ان کا مشغلہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف رہا۔ زہد و تقویٰ اور پاک نفسی میں مثال نہ رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کی کشش سے جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے ان میں لاہور کا راجا رائے راجو بھی شامل تھا جس کو آپ نے ''شیخ ہندی'' کے نام سے موسوم کیا۔ حضرت شیخ علی ہجویری عوام میں ''داتا گنج بخش'' کے نام سے مشہور ہیں۔ یوں تو آپ نے طریقت اور تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں۔ مثلاً البیان اہل العیان، منہاج الدین، کشف الاسرار۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت کشف المحجوب کو حاصل ہوئی۔ جس میں تصوف کے مقامات و منازل، اذکار و اشغال اور صفائے باطن کی تدابیر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے داتا صاحب کے مزار پر اعتکاف بھی کیا تھا۔ چنانچہ ان کی شان میں خواجہ اجمیری کا یہ شعر زبانِ زد عام ہے۔

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

یہ حجرۂ اعتکاف حضرت داتا صاحب کے روضے کے پاس اب تک موجود ہے۔

خواجہ معین الدین اجمیری

تلقینِ اخلاق و تصوف اور تبلیغِ اسلام میں خواجہ معین الدین اجمیری کا نام غالباً ہندوستان بھر کے اولیا میں زیادہ مشہور ہے۔ آپ ۱۱۴۲ء میں سیستان کے ایک قصبے سنجر میں پیدا ہوئے۔ عراق میں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ قصبہ ہارون (علاقہ نیشاپور) میں حضرت خواجہ عثمان

ہارونی کے مرید ہوئے۔ سالہا سال کی ریاضتوں کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ممالک اسلامی کی سیاحت کے دوران میں حضرت غوث اعظم، شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجہ اوحد الدین کرمانی، شیخ نجم الدین کبریٰ اور دوسرے بے شمار اولیا سے مجالست کا اتفاق ہوا۔ ہندوستان آ کر داتا گنج بخش کے مزار پر دو مہینے چلہ کشی کی۔ ۱۱۹۲ء میں اجمیر پہنچے جو راجپوتانہ میں اس زمانے کے ہندوؤں کی فوجی طاقت کا مرکز تھا۔ آپ کی تعلیمات وکرامات کی شہرت نزدیک و دور پھیل گئی۔ اجمیر کا راجا کا گرو جے پال جوگی آپ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اور اس کے علاوہ ہزاروں ہندو آپ کے اثر سے مسلمان ہو گئے۔ حضرت خواجہ اجمیری سلسلہ چشتیہ کے بانی اور بہت بڑے ولی تھے۔ آپ کا مزار اجمیر میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ۱۲۳۶ء میں کہ سلطان التمش کا زمانہ تھا۔ آپ کا وصال ہو گیا۔

شیخ بہاء الدین زکریا

شیخ بہاء الدین زکریا ۱۱۸۲ء میں بمقام ملتان پیدا ہوئے۔ بخارا، شام اور عراق میں تحصیل علوم کی۔ شیخ شہاب الدین سہروری کی خدمت میں بمقام بغداد باریاب ہوئے۔ چونکہ تقویٰ اور صلاحیتِ باطنی سے پہلے ہی ممتاز تھے۔ اس لیے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ شیخ سہروری نے ان کو خرقۂ خلافت عطا کیا۔ اور ہدایت و ارشاد کے لیے ملتان جانے کا حکم دیا۔ شاہ ناصر الدین قباچہ والی ملتان کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ ہندوستان میں سلسلہ سہروردیہ کے پہلے بزرگ تھے۔ چشتیہ اور سہروردیہ دونوں سلسلوں میں سماع وسرود کا رواج ہے۔ چشتیہ میں زیادہ، سہروردیہ میں کم۔ لیکن شیخ بہاء الدین زکریا سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ فارسی کے نامور صوفی شاعر عراقی کے کلام سے آپ کو بہت شغف تھا۔ یہ عراقی شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے اور شیخ زکریا کے داماد تھے۔ ایک دن حضرت شیخ زکریا نے رات کے وقت ایک محفل سماع میں عراقی کی یہ مشہور غزل سنی تو آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی دام کردند
چو خود کردند رازِ خویشتن فاش عراقی راچرا بدنام کردند

۱۲۶۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ ملتان میں آپ کا مزار مرجع عام ہے۔

حضرت شیخ کے جانشین

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے بعد شیخ صدر الدین عارف ان کے خلیفہ ہوئے اور ان کے بعد شیخ رکن الدین رحمتہ اللہ علیہ نے سجادۂ طریقت کو زینت بخشی۔ یہ بہت بڑے عالم اور بہت بڑے صوفی تھے۔ آپ حضرت نظام الدین اولیا کے معاصر ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی آپ کا بے حد معتقد تھا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے ایک اور نامور خلیفہ سید جلال الدین منیر شاہ نے جھنگ آباد کیا۔ اور مدتوں ان علاقوں میں تبلیغِ اسلام کا فرض انجام دیتے رہے۔ آپ کا مزار اُوچ شریف (بہاولپور) میں ہے۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت میر سید جلال الدین حضرت شیخ رکن الدین کے خلیفہ تھے۔ آپ نے ہندوستان کے مختلف حصوں خصوصاً گجرات میں اشاعت اسلام کا کام کیا۔[۹۱] ان کے پوتے اور پڑپوتے قطب عالم اور شاہ عالم جن کے مزار احمد آباد گجرات میں ہیں۔ مدتوں شاہانِ گجرات کی عقیدت کا مرکز رہے۔[۹۲]

اُوچ میں سید محمد غوث گیلانی

حضرت سید محمد غوث گیلانی مغربی پنجاب میں سلسلۂ قادریہ کے پہلے بزرگ ہیں۔ آپ حلب میں پیدا ہوئے۔ ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ ہوکر ہندوستان آئے۔ اور اوچ، ملتان اور لاہور میں مدتِ دراز تک ارشاد و ہدایت کا فرض انجام دیتے رہے۔ سلطان سکندر لودی آپ کا مرید تھا۔ اوچ اب تک سلسلہ قادریہ کا اہم مرکز سمجھا جاتا ہے۔ حضرت سید محمد غوث گیلانی ۱۵۱۷ء میں واصل بحق ہوئے۔ اوچ میں آپ کا مزار ہے۔

خواجہ بختیار کاکی

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی عراق کے قصبہ اُوش میں پیدا ہوئے۔ حصول علوم کے بعد بغداد میں ان کی ملاقات خواجہ معین الدین اجمیری سے ہوئی۔ اور وہیں حضرت خواجہ صاحب سے خرقۂ خلافت پایا۔ جب خواجہ صاحب ہندوستان میں وارد ہوئے تو خواجہ بختیار کاکی نے بھی بغداد سے ہندوستان کا رخ کیا۔ ملتان میں شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ بہاء الدین زکریا کے مہمان رہے۔ اس کے بعد خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی

تو حکم ہوا کہ جب قربِ روحانی میسر ہے تو قربِ جسمانی کی کیا ضرورت ہے تم دہلی میں رہ کر کام کرو۔ چنانچہ حضرت بختیار کا کی مدت العمر دہلی ہی میں رہے اور وہیں مزار ہے۔ انتقال ۱۲۳۶ء میں ہوا۔ خواجہ صاحب سماع کے بہت شوقین تھے اور اپنے رفیق قاضی حمید الدین سے مل کر اکثر مجلس سماع برپا کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ چشتیا میں سماع داخلِ عبادت ہوگیا۔ حالانکہ خواجہ عثمان ہارونی سماع کے مخالف تھے۔ اور حضرت خواجہ اجمیری بھی اس کے قائل نہ تھے۔

بابا فرید شکر گنج

حضرت خواجہ بختیار کا کی کے بعد خواجہ فرید الدین شکر گنج ان کے جانشین ہوئے۔ جو عوام میں بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ملتان کے پاس ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں حصول تعلیم کے بعد ممالک اسلامی کی سیاحت کی جس کے دوران میں شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ فرید الدین عطار اور بعض دوسرے صوفیہ کرام سے مجالست کا اتفاق ہوا۔ جب سیاحت سے واپس آئے اور خواجہ بختیار کا کی کے انتقال کے بعد خرقہ خلافت ملا تو اجودھن میں مقیم ہوگئے جسے آج کل پاکپتن کہتے ہیں۔ آپ مدت العمر یہیں ہدایت و ارشاد اور ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔ بے حد پاک نفس اور مقدس بزرگ تھے۔ اخلاق کے علاوہ آپ سے اکثر کرامات بھی سرزد ہوئیں۔ سلطان بلبن آپ کا اتنا معتقد ہوا کہ اس نے اپنی بیٹی کا نکاح آپ سے کردیا۔ آپ کے سب سے بڑے خلیفہ حضرت قطب جمال الدین ہانسوی تھے۔ جن پر آپ کو بے حد اعتماد تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے جب اپنے بھانجے مخدوم علاء الدین صابر کو ولایت دہلی کی سند عطا کی حضرت ہانسوی نے وہ سند پھاڑ ڈالی۔ حضرت مخدوم نے حضرت بابا فرید سے شکایت کی تو ارشاد ہوا کہ جمال کا پھاڑا ہوا فرید نہیں سی سکتا۔ تم اب دہلی نہیں جاسکتے۔ کلیر کا علاقہ تمہیں دیا جاتا ہے۔

مخدوم علاء الدین صابر

حضرت مخدوم علاء الدین صابر حضرت بابا فرید کے بھانجے تھے۔ ۱۱۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت بابا صاحب ہی نے ان کو علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کیا۔ آپ زیادہ تر عالمِ استغراق میں رہے۔ کتابوں میں آپ کی بہت ہی کرامتیں درج ہیں۔ لیکن ہدایت و ارشاد کا کوئی ذکر نہیں۔ ۱۲۹۱ء میں انتقال ہوا۔ مزار رڑکی ضلع سہارنپور کے پاس کلیر میں واقع ہے۔ آپ سلسلہ

صابریہ کے بانی ہیں۔ آپ کے مزار پر ہر سال بڑے زور و شور سے عرس ہوتا ہے جس کی خصوصیت رقص وسرود ہے۔ گوسماع اور حال و قال کی محفلیں بھی برپا کی جاتی ہیں۔

نظام الدین اولیا

حضرت بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم حضرت نظام الدین اولیاء تھے۔ جو سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کے القاب سے ملقب ہیں۔ آپ کا اصلی اسم گرامی سید محمد ہے۔ ۱۲۳۸ء میں بمقام بدایوں آپ کی ولادت ہوئی۔ بدایوں اور دہلی میں تکمیل علوم کے بعد پاکپتن میں بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عبادت و ریاضت اور صفائے باطن کا یہ حال تھا کہ بیس برس کی عمر میں دہلی کی نیابت پر فائز کردیے گئے۔ جب آپ حضرت بابا صاحب کے مقبول و منظور بزرگ شیخ جمال ہانسوی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ سندِ نیابت پر ان کی تصدیق حاصل کریں تو حضرت ہانسوی نے سند پر یہ شعر لکھ دیا

ہزاراں درود و ہزاراں سپاس   کہ گوہر سپردم بہ گوہر شناس

اس کے بعد حضرت سلطان المشائخ دہلی سے تین میل دور ایک گاؤں میں مقیم ہوگئے۔ حضرت کا لنگر وسیع تھا۔ اور جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ نذر و نیاز کا روپیہ بے شمار آتا تھا اور اسی وقت خیرات کر دیا جاتا تھا۔ رجوع کی کیفیت یہ تھی کہ آپ کے مریدوں کی تعداد کا اندازنہیں ہوسکتا تھا۔ شہر کے عمائد و معززین بھی آپ کے مرید تھے۔ اور بادشاہ بھی آپ کا بے حد لحاظ و احترام کرتے تھے۔

حضرت سلطان المشائخ نے تین شاہی خاندانوں کا زمانہ پایا۔ خاندان غلاماں کے عہد میں آپ کے ابتدائی ایام بسر ہوئے۔ پھر خلجیوں کا دور گزرا۔ جن کے بعد غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا۔ جس کے انتقال اور حضرت ممدوح کے وصال میں صرف دو چار ہفتوں کا فصل تھا۔ بعض سیاسی وجوہ سے غیاث الدین تغلق اور حضرت سلطان المشائخ کے درمیان اختلاف ہوا۔ اور اس کا ایک شاخسانہ یہ نکلا کہ غیاث الدین کے نزدیک سماع خلاف شریعت تھا اور حضرت سلطان المشائخ اس کے حامی تھے۔ سلطان نے اس مسئلے پر بحث کے لیے دہلی کے علما و مشائخ کو جمع کیا اور مجلس نے فیصلہ کیا کہ سماع شرعاً حرام نہیں۔ اس مجلس میں سلطان المشائخ بھی شریک تھے۔

اس کے بعد سلطان غیاث الدین بنگالہ کی مہم پر گیا تو اس کے بڑے بیٹے اُلغ خاں نے

سلطان المشائخ کی مریدی اختیار کی اور فوج فراہم کر کے باپ کے تخت پر قبضہ کرنے کی زور شور سے تیاری کرنے لگا۔ سلطان غیاث الدین کو طبعاً شبہ ہوا کہ سلطان المشائخ اس کی بغاوت کی پشت پر ہیں۔ چنانچہ اس نے حضرت کو لکھا کہ میرے واپس دہلی پہنچنے سے پہلے آپ دہلی سے باہر نکل جائیں حضرت نے اس پر کہا کہ "ہنوز دہلی دور است"۔ سلطان کی مراجعت پر الغ خاں نے ایک نئے محل میں باپ کا استقبال کیا۔ یہ محل لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ابھی بادشاہ کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ یہ محل گر پڑا۔ اور سلطان غیاث الدین اس کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا۔ یہ ۱۳۲۵ء کے موسم بہار کا واقعہ ہے۔ چند روز بعد سلطان المشائخ کا بھی انتقال ہوگیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق سب مؤرخین کے نزدیک لائق، انصاف پسند اور دیندار تھا۔ ایسے بادشاہ اور سلطان المشائخ جیسے بزرگ کے درمیان اختلاف نے نہایت افسوسناک صورت اختیار کر لی۔ بلکہ بعض مؤرخین تو بے تکلف بادشاہ کی ہلاکت میں سلطان المشائخ کے اشارے کا دخل بھی بتاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت سلطان المشائخ کی نماز جنازہ حضرت رکن دین ملتانی نے پڑھائی۔ اور آپ وہیں دفن ہوئے جہاں نظام الدین کے نام سے ایک گاؤں آباد ہے۔ آپ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ فقرا و اولیا میں یہ امتیاز حضرت سلطان المشائخ ہی کو حاصل ہے کہ آپ اس عہد کی سیاست میں بھی دخیل رہے۔ بعض بادشاہوں کو آپ سے عقیدت اور بعض کو اختلاف رہا۔ علاوہ بریں آپ کا سلسلۂ ارشاد ہندوستان کے مختلف گوشوں کے علاوہ عرب اور چین تک پھیلا ہوا تھا۔ آپ نے اپنے سینکڑوں خلفا و مبلغین گجرات، دکن، پنجاب، چین، افغانستان وغیرہ میں بھیجے۔ جنہوں نے تبلیغ و اشاعت اسلام کی شاندار اور پائندار خدمات انجام دیں۔ امیر خسرو اور مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی دونوں آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے اور امیر خسرو نے تو حضرت کی ترغیب و قدردانی کے ماتحت موسیقی میں مجتہد کا درجہ حاصل کیا۔ آپ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بانی قرار پائے۔ جو صابریہ کی طرح سلسلہ چشتیہ کی ایک شاخ ہے۔ اور جس کے وابستگانِ طریقت کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

بوعلی قلندر

حضرت بوعلی قلندر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ قطب جمال ہانسوی رحمتہ اللہ علیہ

کے خالہ زاد اور حضرت سلطان المشائخ کے ہم عصر تھے۔ علوم دین کی تحصیل کے بعد آپ نے تدریس و تعلیم کا مشغلہ اختیار کیا۔ اور مسجد قوت الاسلام دہلی میں وعظ کہتے رہے۔ اسی حالت میں کسی فقیر کے جذب و اثر سے درس تدریس کو ترک کر کے قلندر بن گئے اور جنگلوں میں گھومنے پھرنے لگے۔ آپ کی عمر زیادہ تر جذب و استغراق میں بسر ہوئی۔ ۱۳۲۴ء میں انتقال ہوا۔ مزار پانی پت میں ہے۔

نصیر الدین چراغِ دہلی

حضرت نصیر الدین چراغِ دہلی حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ اور جانشین ہوئے ہیں۔ نصیر الدین محمود نام اور چراغِ دہلی لقب ہے۔ سنت کے بڑے متبع، پرہیز گار اور صاحب اثر ولی تھے۔ اپنے پیر کے مسلک کے خلاف سماع کو ناجائز اور خلافِ سنت سمجھتے تھے۔ اپنے خلفا کو بھی یہی تلقین کرتے تھے کہ علوم دین کی اشاعت اور شریعتِ اسلامی کی ترویج میں مصروف رہو۔ اپنے بھانجے اور خلیفہ اعظم خواجہ کمال الدین رحمتہ اللہ علیہ کو احمد آباد میں ہدایت کے لیے بھیجا۔ جہاں ان کے اولاد و احفاد نے سلسلہ تبلیغ جاری رکھا۔ چنانچہ خواجہ کمال الدین کے صاحبزادے شیخ سراج الدین کا مزار گجرات کے پرانے پایہ تخت پٹن میں موجود ہے۔ حضرت چراغ دہلی نے مولانا خواجگی اور شیخ احمد تھانیسری کو کالپی میں خلیفہ بنا کر بھیجا۔ وہیں ان دونوں بزرگوں کے مزار ہیں۔ دکن میں آپ کے نامور خلیفہ حضرت سید گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جن کا مزار گلبرگہ میں آج تک زیارت گاہِ عوام ہے۔ آپ نے حدیث، کلام اور تفسیر میں ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ پونا اور بلگام کے بے شمار لوگ آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ محمد تخلص کرتے تھے۔

ملیبار

جنوبی ہندوستان خصوصاً ملیبار میں تبلیغ اسلام کا چرچا اس زمانے میں شروع ہو گیا تھا جب پہلی صدی ہجری میں عرب تاجروں نے یہاں اپنے مرکز قائم کر لیے تھے۔ پھر ماپلاؤں کی آبادی بڑھنی شروع ہوئی۔ کچھ مسلمان عراق سے آ کر ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ماپلاؤں نے ہندوستان کے علاوہ ملایا، جاوا، سماٹرا اور دوسرے جزائر میں بھی اسلام پھیلایا۔ چنانچہ ان علاقوں کی آبادی میں عظیم اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

قرامطہ

جنوبی ہند کے بعد مساعی تبلیغ کے مرکز ملتان اور اوچ قرار پائے عربوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی اور ان کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ لیکن منظم تبلیغی کوشش حسن بن صباح کے پیروؤں نے شروع کی جو نویں صدی عیسوی میں ہندوستان آنے لگے۔ اور سندھ اور مغربی پنجاب میں پھیل گئے۔ اگرچہ یہ لوگ جن کو قرامطہ کہتے ہیں۔ قائم شدہ اسلامی سلطنتوں کے خلاف مجرمانہ سازشوں میں مصروف تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ یہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے بڑے مخالف تھے۔ چنانچہ دونوں نے ان کی بیخ کنی کے لیے لشکر آرائی کی۔ محمد غوری کا قاتل بھی قرمطی ہی تھا۔ سب سے پہلے حسن بن صباح کے داعیوں نے اوچ کو اپنا مرکز قرار دیا تھا۔ لیکن بہت جلد بعض سنی بزرگان و مشائخ نے ان کو باہر کیا۔ اور یہ لوگ کچھ اور گجرات کی طرف نکل گئے۔ گجرات اور بمبئی کے علاقوں میں جو لاکھوں انسانوں کی جماعتیں خوجہ اور بوہرہ کہلاتی ہیں، ان میں بے شمار انہی قرمطیوں یا اسماعیلیوں کی اولاد ہیں جو سندھ اور پنجاب سے ان علاقوں میں منتقل ہو گئے اور باقی ہندوؤں سے مسلمان ہوئے۔ بوہروں کی تعداد کوئی دو لاکھ ہے۔ ان کے مبلغ اول محمد علی تھے جن کا مزار کھمبایت میں ہے اور وفات ۱۱۳۷ء میں ہوئی تھی۔

بوہرے

آج کل بوہروں میں داؤدی بوہروں کی کثرت ہے۔ ان کے موجودہ امام یا داعی مطلق ملا طاہر سیف الدین ہیں جو سورت میں رہتے ہیں۔ آپ علوم عربیہ کے فاضل ہیں۔ اور بوہروں کے اوقاف کی آمدنی انہی کے ہاتھوں خیرات و صدقات اور تعمیر جماعت کے کاموں پر صرف ہوتی ہے۔ بوہروں کی مسجدیں اور قبرستان الگ ہیں۔ عیدین کو بھی مسلمانوں سے علیحدہ طریق پر مناتے ہیں، نمازیں پانچ کے بجائے تین پڑھتے ہیں۔ بہت سے معاملات میں ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ وراثت کے معاملے میں شرع کے پابند نہیں۔ سود لیتے اور دیتے ہیں۔ دیوالی کے موقع پر ہندوؤں کی طرح اپنی حساب کی کتابیں بدلتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ بعض معاملات میں عام مسلمانوں سے زیادہ پابند شرع نظر آتے ہیں۔ ان میں اکثر داڑھی رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے۔ نہ ہندو دھوبیوں سے کپڑے دھلاتے ہیں اور اگر دھلاتے ہیں تو

انہیں پھر پاک کر لیتے ہیں۔[۹۳]

خوجے

دوسری اسماعیلی جماعت خوجہ کہلاتی ہے۔ یہ لوگ پنجاب، سندھ، کاٹھیاواڑ اور کچھ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے اوّلیں داعی اور مبلغ نور ساگر، پیر شمس الدین اور شیخ صدر الدین تھے۔ خوجوں میں سے بعض شمالی پنجاب اور چترال میں آباد ہیں اور باقی آغا خانی ہیں۔ زمانہ حال کے مغربی معیاروں کے مطابق بہت ترقی یافتہ ہیں۔ تعلیم جدید اور تہذیب حاضر کے پابند ہیں۔ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ ان میں ایرانی النسل خاندان زیادہ ہیں۔ خود ان کے ''حاضر امام'' آغا خان ثالث ہیں۔ جن کا خاندان ایران سے آیا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح اور سر ابراہیم رحمت اللہ بھی اسی خوجہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ آغا خاں کی وسیع المشربی اور روشن خیالی نے اس جماعت کو ملت اسلامی کی طرف زیادہ متوجہ کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مسلمانوں کی قومی تحریکات میں حصہ لیتے ہیں۔ گجرات اور کچھ کے علاقوں میں اسماعیلی فرقوں کی تبلیغی کوششیں بہت قدیم سے جاری ہیں۔ لیکن سنی مبلغین بھی غافل نہیں رہے۔ چنانچہ بہت سے اولیا و مشائخ کے مزار جابجا موجود ہیں۔ انہی کی مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ گجرات میں مسلمانوں کی تعداد خاصی ہے اور ان میں اکثریت سنیوں کی ہے۔

بنگال میں جلال الدین تبریزی

بنگال میں سب سے پہلے جو بزرگ تبلیغ اسلام کی غرض سے پہنچے وہ شیخ جلال الدین تبریزی ہیں۔ آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور حضرت بہاء الدین زکریا (ملتان) کے خواجہ تاش تھے۔ شیخ جلال الدین اپنے پیر بھائی سے ملنے کے لیے ملتان آئے۔ کچھ مدت یہاں رہنے کے بعد دہلی پہنچے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ پھر بدایوں ہوتے ہوئے بنگال میں پہنچ گئے۔ یہاں آپ نے تبلیغ و اشاعت کا کام نہایت کامیابی سے انجام دیا اور بے شمار ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ آپ کا انتقال ۱۲۲۵ء میں ہوا۔ سلہٹ میں مزار ہے۔ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ سراج الدین بدایونی کو خلیفہ بنا کر بنگال بھیجا۔ ان کے مرید شیخ علاء الدین علاء الحق، پھر ان کے خلیفہ میر اشرف جہانگیری[۹۴] اور ان بزرگوں کے صدہا مریدوں نے بنگال میں اسلام پھیلایا۔ ڈاکٹر ہنٹر اور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ بنگال میں

شہروں کی بجائے دیہات میں اسلام کو بڑی کامیابی ہوئی۔ کیونکہ غریب ماہی گیروں، شکاریوں اور ادنیٰ کاشتکاروں کے لیے اسلام کی روحانیت اور مساوات بہت بڑی رحمت تھی۔ وہ اسلام میں داخل ہوتے ہی چھوت چھات اور ذات پات کی ذلت وخواری سے نجات پا گئے۔ اور اخوت اسلامی کی برکتوں سے بہرہ ور ہونے لگے۔

دکن میں سیّد گیسو دراز

دکن۔ اگرچہ ۱۳۰۴ء میں ایک عرب مبلغ کے ورود کا سراغ ملتا ہے۔ جس نے پیر مہابیر کندایت کا نام اختیار کر کے تبلیغِ اسلام شروع کی تھی۔ لیکن حقیت میں سب سے زیادہ نامور اور کامیاب مبلغ سیّد گیسو دراز ہی تھے جو ۱۳۲۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور جن کا مختصر ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مغربی ساحل کے علاقہ کونکن میں شیخ بابا عجب، سید ہاشم گجراتی، شاہ محمد صادق، سرمست حسینی اور متعدد دیگر مبلغین اسلام نے کام کیا جن کے مزار اب تک قصبہ دھانو، ناسک دھاروار میں موجود ہیں۔ بلگام، ستارا، احمد نگر کے اضلاع میں بھی بعض بزرگ دعوت وتبلیغ میں مصروف رہے۔

جنوبی ہند، دکن اور ساحلی علاقوں میں اسلام کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی لیکن افسوس ہے کہ سلاطین نے اس زرخیز زمین کی طرف توجہ نہ کی جس کی تخم ریزی تو قدسی نفس بزرگوں نے کردی تھی۔ لیکن اس کے بعد آبیاری کی ضرورت تھی۔ ان علاقوں میں کروڑوں اچھوت آباد تھے۔ جو قبولِ اسلام کے بعد صدیوں کی ذلت سے نجات پا جاتے تھے۔ اور تہذیب وتمدن کے راستے پر بے تکلف گامزن ہو کر ترقی کی منزلیں طے کرتے تھے۔ کیونکہ اسلام ان کو ذات پات کے بندھنوں سے نجات دلا کر بڑے سے بڑے مسلمان کا بھائی بنا دیتا تھا۔ اور انہیں مساوی مواقع عطا کرتا تھا۔ وہ مسلمان ہو کر شرک، بدعت، اوہام، جہالت، افلاس، غلاظت اور افسردہ طبعی سے آزادی حاصل کر لیتے اور حکمرانوں کے ہم مذہب بن کر عزت آبرو کی زندگی بسر کرتے۔

شاہ مرزاؒ

سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا ۱۳۱۵ء میں کشمیر کے راجا سنگھ دیو کے ہاں ملازم ہوئے۔ جب سنگھ دیو کو ایک تبتی نے شکست دی اور خود راجا بن بیٹھا تو اس نے شاہ مرزا کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ جب وہ مرا تو ملک میں پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ شاہ مرزا خود شمس

الدین شاہ کے نام سے تخت نشین ہوئے۔ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ نئے بادشاہ نے اپنے اختیارات سمجھ بوجھ اور نیک نیتی سے استعمال کیے۔ کشمیر کے ہندو راجا بڑے ظالم تھے۔ ان کی علانیہ پالیسی یہ تھی کہ رعیت کے پاس معمولی دال روٹی سے زیادہ کچھ نہ رہنے دیا جائے۔ نئے (مسلمان) بادشاہ کی حکومت لبرل اصولوں پر تھی۔ اس نے بے جا سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹا دیے اور وصول کرنے کے ظالمانہ طریقے موقوف کر دیے اور سرکاری لگان پیداوار کے چھٹے حصے پر مقرر کیا۔[۹۵]

امیرِ کبیر ہمدانی

۱۳۱۴ء میں بمقام ہمدان حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی ولادت ہوئی۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے کشمیر کو وہ کشمیر بنایا جس پر آج دنیا فریفتہ ہے۔ آپ ممالکِ اسلامی کی سیاحت میں صدہا اولیاء اللہ سے ملاقات کرنے کے بعد ۱۳۷۹ء میں کشمیر تشریف لائے۔ اس وقت سات سو ساداتِ ایرانی آپ کے ہم رکاب تھے۔ جو ایران کی بہترین صنعت و حرفت میں بھی مہارتِ کاملہ رکھتے تھے۔ آپ نے کشمیریوں میں تبلیغِ اسلام، اصلاحِ اخلاق اور تصفیہ باطن کا کام شروع کر دیا۔ آپ کے ہمراہی سیدوں نے ملک کے گوشے گوشے میں جا کر تبلیغی مرکز قائم کر لیے۔ اس کے علاوہ کشمیریوں کو قالین بافی، گبہ بافی، پیپر ماشی۔ سنگ تراشی اور ریشم بافی وغیرہ بے شمار فنون سکھائے۔ غرض اس دور دست پہاڑی علاقے کے مسکین اور نادار باشندوں میں نئی زندگی کی روح پھونک دی۔ ۱۳۸۴ء میں حضرت امیر کبیر ہمدانی واصل بحق ہوئے۔

سلطان سکندر لودی کا وزیر سنہا بھاٹ مشرف بہ اسلام ہوا تو اس نے کشمیریوں میں اسلام کی تبلیغ بھی شروع کی۔ اور انہیں بعض رسومِ قبیحہ سے بھی حکماً منع کیا۔ اس کے بعد سلطان زین العابدین شاہ جس کو کشمیری ''بڈشاہ'' کہتے ہیں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کے دور میں ہندوؤں سے انتہائی رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔ اور کشمیر میں اسلام کو بے حد تقویت پہنچی۔ اس کا نظم و نسق بڑی حد تک اکبر کے انداز حکومت سے مشابہ تھا۔ لیکن مذہبی اعتبار سے زین العابدین شاہ اکبر سے بالکل مختلف اور نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری

تصوف کے تین سلسلوں یعنی چشتی، قادری اور سہروردی کے بزرگوں کا ذکر ہو چکا ہے۔

ہمایوں کے زمانے میں یہاں طریقہ شطاریہ بھی رائج ہوا جو حضرت بایزید بسطامی سے منسوب بتایا جاتا ہے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری اسی طریقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چلہ کشی، دعوتِ اسماء اور عملیات میں مہارت رکھتے تھے۔ ''جواہر خمسہ'' ان کی مشہور کتاب ہے جو انہی عملیات پر مشتمل ہے۔ ہمایوں اور ایک زمانے میں اکبر کو بھی ان سے بہت ارادت تھی۔ علمائے دین مثلاً شیخ علی متقی اور شیخ گدائی ان کے مخالف تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک شیخ محمد غوث کے بعض خیالات وعقائد خلافِ شریعت تھے۔ آپ اسی برس کی عمر پا کر ۱۵۶۲ء میں واصل بحق ہوئے۔ مزار گوالیار میں ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اس زمانے کے اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ متعدد سلاسل تصوف سے نسبت رکھتے تھے۔ اپنی پاکیزہ درویشانہ زندگی سے اور اپنے ارشادات سے مدتوں ہدایت عامہ کا فرض ادا کرتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے والد شیخ عبدالاحد اور ہمایوں بادشاہ شیخ عبدالقدوس کے خلفا میں شامل تھے۔ ۶ [illegible] ء میں انتقال کیا۔ مزار گنگوہ میں مرجعِ خاص وعام ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں بھی بے شمار جلیل القدر صوفیہ پیدا ہوئے جنھوں نے عوام کی زندگ[illegible] پر بہت گہرا اور مبارک اثر ڈالا۔ لیکن تین حضرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت خو[illegible] محمد سلیمان تونسوی، حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی اور حضرت شاہ غوث علی قلندر۔

خواجہ سلیمان تونسوی

خواجہ محمد سلیمان تونسوی ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد خواجہ نور محمد مہاروی کے مرید ہوئے۔ پھر دہلی، اجمیر اور جے پور میں علوم ظاہری اور فیوض باطنی کا سرمایہ فراہم کرتے رہے۔ خواجہ نور محمد نے آپ کو اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ نہایت زاہد و متقی بزرگ تھے اور ماسوائے اللہ سے بے نیاز اور منقطع رہتے تھے۔ نواب محمد بہاول خاں والیٔ بہاولپور کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔ وفات ۱۸۴۱ء میں ہوئی۔ نواب بہاولپور نے ستر ہزار روپے کی لاگت سے آپ کا روضہ تعمیر کیا جو تونسہ شریف میں مرجعِ عوام ہے۔

شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی

شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی ضلع ہردوئی کے ایک قصبہ ملانواں میں ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد آپ نے دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق سے علوم دین کی تحصیل کی۔ پھر سلسلہ نقشبندیہ میں شاہ محمد آفاق کے مرید ہوئے۔ سند خلافت پانے کے بعد گنج مراد آباد میں مقیم ہوگئے۔ یہ غالباً حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی شریعت پروری کا اثر تھا کہ اس زمانے کے جلیل القدر صوفی بزرگ بھی ردِ بدعت اور ترویج سنت میں سرگرم تھے اور ان سے کوئی خلافِ شریعت حرکت سرزد نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن بھی کرامات و مکاشفاتِ باطنی کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تفسیر و حدیث کا درس دیتے۔ طرز زندگی کی سادگی، فقر و استغنا اور حسنِ اخلاق میں سنت نبوی کے پابند تھے۔ محتاجوں کی امداد اپنی استطاعت سے بھی بڑھ کر کرتے۔ ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوا۔ گنج مراد آباد میں مزار ہے۔

شاہ غوث علی قلندر

حضرت شاہ غوث علی قلندر مونگھیر (بہار) کے پاس ایک گاؤں میں ۷ دسمبر ۱۸۰۴ء کو پیدا ہوئے۔ والدہ بعض عوارض دماغی میں مبتلا تھیں۔ اس لیے آپ کو ایک برہمنی کا دودھ پلایا گیا۔ جب چار برس چار ماہ کے ہوئے تو ایک طرف اصلی والدہ نے بسم اللہ پڑھوا کر قرآن مجید شروع کرایا اور دوسری طرف اس برہمنی (مادر رضاعی) کے شوہر نے شاستر پڑھانا شروع کیا۔ اس کے بعد علوم عربی و فارسی اور سنسکرت کی تعلیم متوازی جاری رہی۔ آخر میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق صاحب سے حدیث اور مولانا فضل امام خیر آبادی سے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ باطنی فیوض بھی گیارہ مسلمان بزرگوں اور آٹھ ہندو درویشوں سے حاصل کیے۔ حج اور سیاحت کے بعد ۱۸۶۲ء میں پانی پت تشریف لے آئے اور ۱۸۸۰ء کو یہیں انتقال ہوا۔ آپ کے خلیفہ مولانا گل حسن نے آپ کے حالات کے متعلق ایک نہایت دلچسپ کتاب "تذکرہ غوثیہ" کے نام سے لکھی۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اور قلندری کے ساتھ ساتھ آپ ترویجِ سنت میں بھی سرگرم تھے۔ اور تصور شیخ، سجدۂ قبور، تشیع اور بدعاتِ عامہ کو خلافِ شریعت بتاتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ملک میں حضرات صوفیہ کرام نے روحیت اسلام کی

ترویج اور احکام اسلام کی تبلیغ بہت وسیع پیانے پر انجام دی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اخلاق نبوی کی تعلیم دی۔ اپنی پاکیزہ زندگیوں کا نمونہ پیش کر کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی توفیق بخشی۔ جھگڑوں اور مناقشوں سے الگ رہے اور اپنے معتقدین کو بھی محبت، رواداری، رحم و کرم اور اخلاق حسنہ کی تلقین فرماتے رہے۔

تیسری فصل: علمائے دین

چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کے احکام انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی افعال پر حاوی ہیں۔ اس لیے علمائے دین کا وجود روزِ اوّل ہی سے اسلامی معاشرے کا جزو لاینفک رہا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ امت میں ایک ایسی جماعت ہر وقت موجود رہے جو افراد امت کو نیک کاموں کی طرف دعوت دے۔ بُرے کاموں سے روکے اور ہر حال میں منشائے اسلام کی تکمیل میں ساعی رہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود سے لے کر اب تک علمائے دین کی کثیر تعداد اپنے فرائض کی بجاآوری میں مصروف رہی ہے۔ ان میں بعض ایسے جلیل القدر اکابرِ علم بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اُمتِ محمدیہ کی اصلاح و فلاح کے لیے صرف اجتہاد ہی سے کام نہ لیا۔ بلکہ عزیمت عمل کے شاندار مظاہرے بھی کیے اور اپنے اعمال سے مسلمانوں کے لیے قابل تقلید نمونے پیش کیے۔ بعض نے درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے مشغلے میں عمریں بسر کر دیں۔ اور بلاشبہ بعض ایسے بھی ہوئے جنھوں نے نفس پرست سلاطین اور امرا سے زخارف دنیوی کے حصول کی خاطر ان کے قابلِ اعتراض، مال کی تائید کی اور اپنے لیے دنیا و آخرت کی روسیاہی خریدی۔ لیکن علی العموم ایسے اشخاص کی تعداد کم ہے اور نیک نیت۔ سیدھے سادے نیکوکار علماء جو ملک کے گوشے گوشے میں مصروفِ ہدایت رہے ہیں۔ تعداد میں ہمیشہ زیادہ رہے۔

ان ہزاروں علما کے حالات کا تجسس اور استقصا تو عملاً محال ہے اور اہل علم کے تذکروں میں جن بزرگوں کے تراجم درج ہیں۔ وہ کل علما کی تعداد کے مقابلے میں آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ اس لیے یہاں صرف ان حضرات کا مختصر ذکر کیا جائے گا جو اپنے کسی نمایاں عمل کی وجہ سے تاریخ میں اپنا نقش چھوڑ گئے۔ یا جنھوں نے امت محمدیہ کی رہنمائی کے لیے تجدید و اجتہاد کی روشنی میں علمی کارنامے انجام دیے۔

شیخ مہائمی

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں فقہ اسلامی کی تدوین کا خاص اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ ''فقہ فیروز شاہی'' مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اسی بادشاہ کے ایک امیر تا تارخاں نے مولانا عالم کے زیر نگرانی ایک مجموعہ فتاویٰ مرتب کرایا۔ جس کو ''فتاویٰ تا تارخانیہ'' کہتے ہیں اور جس کا شمار فقہ حنفیہ کی مستند کتابوں میں ہے۔ فیروز شاہ کے عہد ہی میں مولانا شیخ علی ابن شیخ احمد مہائمی (بمبئی) میں پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ''تبصیر الرحمٰن'' کے نام سے عربی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ اور ربط آیات کو نہایت خوبی سے واضح کیا۔ عوارف المعارف اور فصوص الحکم (شیخ ابن عربی) کی شرحیں لکھیں۔ مولانا عبدالحی (ناظم ندوہ) کی رائے مولانا ٭ ئمی کے متعلق یہ ہے کہ ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ کے سوا حقائق نگاری میں مولانا مہائمی کا کوئی نظیر نہیں۔ آپ کی وفات ۱۴۳۱ء میں ہوئی۔ مزار مہائم (بمبئی) میں زیارت گاہِ عام ہے۔

ملک العلما دولت آبادی

چودھویں صدی میں تیمور کی مار دھاڑ سے محفوظ رہنے کی غرض سے اکثر اہل کمال مرکز سے صوبوں کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ چنانچہ ابراہیم شرقی کے عہد میں جونپور کو علمی اعتبار سے بڑا فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں نے اس شہر کو ''شیرازِ ہند'' کا لقب دیا۔ ابراہیم شرقی کے دربار میں ایک بہت بڑے عالم قاضی القضاۃ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی موجود تھے جو فقیہ و معلم کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ملک العلماء نے فارسی میں تفسیر قرآن لکھی جس کا نام ''بحرِ موّاج'' ہے۔ ''فتاویٰ ابراہیم شاہی'' کے نام سے فقہ کی کتاب بھی مرتب کی۔ اور بہت سی دوسری کتابیں بھی لکھیں۔ جونپور میں بعض دوسرے اربابِ فضل و کمال بھی گزرے ہیں۔ شمسِ بازغہ کے مصنف ملا محمود اور استاذ الملک محمد افضل ان میں بہت ممتاز ہیں۔ ہمارے دور میں اعظم گڑھ، چڑیا کوٹ اور سرائے میر علم دین کے بڑے مرکز اور علمائے جلیل القدر کے مسکن ہیں۔ یہ سب جونپور کے حوالی میں واقع ہیں اور اسی مرکز کی علمی روایات کے وارث ہیں۔

ملک العلماء کی جرأتِ حق

بہلول لودھی نے ۱۴۷۸ء میں جونپور کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد سکندر لودھی تخت نشین

ہوا۔ یہ علما و فضلا کا قدر دان تھا۔ اسی کے زمانے میں ملتان کے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ دہلی پہنچے۔ اور انہوں نے معقولات کی بعض ضروری کتابیں درس میں شامل کیں۔ اس بادشاہ کے عہد میں مولانا رفیع الدین محدث شیرازی ایران سے دہلی آئے اور مدت دراز تک آگرہ میں درسِ حدیث دیتے رہے۔ زمانہ شہزادگی میں سکندر مشرقی اضلاع کا والی تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ کورو کھشیتر میں بہت سے ہندو جمع ہیں۔ اور تالاب میں اشنان اور مندر میں پوجا کے علاوہ ہنگامہ آرائی بھی کر رہے ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ مندر کو منہدم اور ہندوؤں کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن ملک العلما قاضی شہاب الدین نے فتویٰ دیا کہ ہندو ذِمّی ہیں۔ ذمیوں کی ایک قدیم عبادت گاہ کو گرانا شریعت کے خلاف ہے۔ اور اشنان اور پوجا کی دیرینہ رسم کو بند کرنا بھی ناجائز ہے۔ اس پر شہزادہ غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ اور ملک العلما سے کہنے لگا کہ تم بھی کفار کے ساتھی ہو۔ اس لیے تم کو پہلے قتل کروں گا۔ ملک العلما نے مردانہ وار جواب دیا کہ ہر شخص کی زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور جب کوئی شخص کسی ظالم کے سامنے آئے اسے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہیے۔ تم نے مجھ سے فتویٰ پوچھا میں نے احکامِ نبوی کے مطابق جواب دے دیا۔ اگر تم کو اس پر عمل نہ کرنا تھا تو مجھ سے پوچھا ہی کیوں؟ اس پر سکندر کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور ایک عالمِ حق کی جرأت نے شریعت پر عمل کرا کر چھوڑا۔

سیّد محمد جونپوری ''مہدی''

۱۵۰۴ء میں جونپور کے ایک عالم سیّد محمد جونپوری نے ''مہدی'' ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ حج و سیاحت بھی کر چکے تھے۔ ۱۵۰۵ء میں وفات پائی۔ دعوائے مہدویت سے قبل بعض علما ان کے وعظ و خطابت کی وجہ سے اسد العلما کہا کرتے تھے۔ دعوائے مہدویت سے قطع نظر سیّد محمد جونپوری علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں بے نظیر تھے۔ پابندی شریعت کے بڑے داعی تھے۔ اور اس معاملے میں حکام کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان کی بیعت کی۔ اورنگ زیب کے زمانے تک گجرات میں بہت سے مہدوی موجود تھے۔ اور حیدر آباد دکن میں اب بھی موجود ہیں۔

شیخ علائی

بنگالہ کے ایک مشہور عالم شیخ علائی نے بھی میاں عبداللہ افغان نیازی کے زیر اثر مذہب

مہدوی اختیار کرلیا۔ شیخ علائی بہت اچھے خطیب تھے۔ اس لیے ان کی کوششوں سے ہزاروں لوگوں نے مہدویت کے عقائد اختیار کر لیے۔ اس زمانے میں شیر شاہ کا جانشین سلیم بادشاہ تھا جس کے دربار میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کا طوطی بولتا تھا۔ انہوں نے شیخ علائی کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے۔ علما کی مجلس منعقد کی۔ ہیر پھیر اور چالبازیوں سے شیخ علائی کو کافر قرار دے کر اور کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا۔

شیخ جلال تھانیسری

شیخ جلال تھانیسری علوم ظاہری اور نسبت طریقت کے اعتبار سے کامل تھے۔ اور عہد اکبری کے بڑے علما میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ''تحقیق اراضی ہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جس میں اس بات کی تردید کی ہے کہ ''اگر بادشاہِ وقت کسی غیر مستحق مسلمان کو ہندوستان میں کوئی زمین دے دے تو شرعاً وہ اس کا حق نہیں ہوجاتی۔ کیونکہ یہ زمین غیر مسلم ذمیوں کی ہے۔'' آپ نے ثابت کیا کہ وہ زمین بیت المال کی ہے اور امامِ وقت جسے چاہے دے سکتا ہے آپ کا انتقال ۱۵۸۱ء میں ہوا۔

اکبر کے زمانے میں علماء دین کے درمیان جو کشاکش ہوئی۔ اور پھر فیضی اور ابوالفضل نے ان کی کاٹ کے لیے جو تدبیریں اختیار کیں ان کی داستان ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں تفصیل سے لکھ دی ہے۔ اور مولانا محمد حسین آزاد نے ''دربار اکبری'' میں اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رکھا۔ اس لیے ان تفصیلات کا دہرانا لاحاصل ہے۔ صرف اس ڈرامے کے بعض ''ایکٹروں'' سے قارئین کا تعارف کرانا ضروری ہے۔

ملا عبداللہ سلطان پوری

مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری نے فقہ اور دوسرے علوم میں کمال حاصل کیا۔ ہمایوں نے ان کو مخدوم الملک خطاب دیا۔ شیر شاہ کے دربار میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ چنانچہ شیخ الاسلام قرار پائے۔ سلیم شاہ بھی ملا صاحب کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ اس کے بعد اکبر کے دربار میں بھی ان کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ یہ صحیح ہے کہ ملا صاحب ترویج شریعت میں بڑے سخت تھے۔ عقائد کے معمولی اختلاف پر اپنے مخالفین کو مروا ڈالنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن ملا بدایونی کو مہیا کردہ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے

کہ جب ملا عبداللہ سلطان پوری کا انتقال ہوا تو تین کروڑ روپے نقد ان کے گھر سے نکلے اور ان کے دولت کدے میں جونجی گورستان تھا اس کی قبریں کھودی گئیں تو ان میں سے مردوں کے بجائے سونے کی اینٹوں کے انبار برآمد ہوئے۔

شیخ عبدالنّبی

شیخ عبدالنّبی دہلوی صدر الصدور تھے۔ اور چونکہ مساجد کے اماموں کو جاگیریں صدرالصدور کی سفارش پر ملتی تھیں۔ اس لیے رشوت کا دور دورہ تھا۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کی درمیان عناد و خلاف کی وجہ سے دوگروہ بن گئے تھے۔ جو ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرتے۔ یہاں تک کہ بادشاہ ان دونوں گروہوں سے بیزار ہو گیا۔

شیخ مبارک اور اُن کے بیٹے

ایک فاضل اجل بزرگ شیخ مبارک ناگوری دربار میں موجود تھے۔ لیکن مخدوم الملک اور صدر الصدور ان کو بھی قتل کرانے کے درپے تھے۔ ان کو مخالفوں کے ہاتھوں جو مصیبتیں اٹھانی پڑیں ان کی تفصیل ابو الفضل نے اکبر نامہ میں اور ملا بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھی ہے۔ جب مخدوم الملک اور صدر الصدور کے اختلافات کی وجہ سے بادشاہ ان کی طرف سے بدعقیدہ ہو گیا تو اس نے ایک موقع پر شیخ مبارک سے مشورہ کیا۔ شیخ نے کہا کہ بادشاہ عادل خود مجتہد ہے۔ اختلافی مسائل میں بمناسبت وقت جو مصلحت دیکھے، اس کے مطابق حکم دے سکتا ہے۔ اس حکم کو علما و مجتہدین کی رائے پر ترجیح ہوگی۔ اس پر ۱۵۷۹ء میں ایک محضر مرتب کیا گیا۔ جس پر بہت سے علما کے دستخط کرائے گئے۔ اکبر نے اس کے بعد صدر الصدور اور مخدوم الملک دونوں کو حج کے لیے روانہ کر دیا۔ یعنی ان کا اقتدار ختم ہوا۔ اور شیخ مبارک کے بیٹے فیضی اور ابوالفضل دربار کے کاروبار پر حاوی ہو گئے۔

اس کے بعد اکبر بادشاہ کھل کھیلا۔ فساد عقائد کو نئی آزادی سے تقویت پہنچی۔ دین الٰہی کی بنیاد رکھی گئی۔ بعض علمائے حق مثلاً ملا عبدالقادر بدایونی جونپور کے قاضی القضاۃ ملا محمد یزدی، بنگالہ کے قاضی معز الملک اور بعض امرا مثلاً قطب الدین خاں کوکہ اور شہباز خاں کمبوہ نے بادشاہ کی بدمذہبی کے خلاف علی الاعلان احتجاج کیا۔ یار لوگوں نے دونوں قاضیوں کو مروا ڈالا اور متعدد دوسرے علما و مشائخ کو بھی ایک ایک کر کے عدم آباد روانہ کر دیا۔

شیخ فرید

اس زمانے کے بعد ایک بزرگ شیخ فرید (مرتضٰی خاں) کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ صرف قابل منتظم۔ بہادر سپاہی، فیاض امیر ہی نہ تھے بلکہ علوم ظاہری و باطنی سے بھی آراستہ تھے۔ انہوں نے اصلاح حالات کی کوشش کی۔ ابوالفضل کے قتل کی وجہ سے اکبر جہانگیر سے ناراض تھا۔ شیخ فرید نے ان باپ بیٹے کی صلح کرا کر جہانگیر کی ولی عہدی مسلّم کرائی۔ علما و مشائخ کی بے حد خدمت کی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ عبدالحق محدث کے مکتوبات میں بہت سے مکتوبات شیخ فرید کے نام ہیں جن میں قرآن، حدیث اور فقہ کے بعض پیچیدہ مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیخ فرید علم و فضل کے اعتبار سے بھی بلند پایہ رکھتے تھے۔ اکبر کے انتقال کے وقت شیخ فرید ہی نے جہانگیر کی جانشینی کا اہتمام کیا۔ بلکہ جہانگیر سے وعدہ بھی لیا کہ وہ قوانین و احکامِ اسلام کا پورا احترام کرے گا۔ چنانچہ اس نے یہ وعدہ پورا کیا اور تخم الحاد کو جس کی پرورش اکبر نے کی تھی پھولنے پھلنے نہ دیا۔

جہانگیر شیخ فرید کی بے حد قدر کرتا تھا۔ چنانچہ توزک میں ان کے انتقال پر بہت قدر دانی اور رنج و افسوس کا اظہار کیا ہے۔ شیخ فرید اواخرِ عمر میں صوبہ پنجاب کے گورنر مقرر کر دیے گئے۔ اسی عہدے پر ۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔

بعض علما کی دنیا داری، نفس پرستی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سرگرمی کے باعث اور اکبر کی الحاد نوازی کی وجہ سے ملک میں اسلام کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔ آزاد خیالی، اباحت، عیش و عشرت اور کفر نوازی کے رجحانات عام تھے۔ اور علمائے حق اس دورِ فتن کے خطرات سے منقار زیر پر ہو رہے تھے۔ جہانگیر کی تخت نشینی سے ان حلقوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن پوری ایک نسل کے مضر اثرات کو نابود کرنے اور اسلام اور علومِ دین کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے خاص سعی و جہد درکار تھی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ

اکبر کا عہد ہندوستان میں اسلام کی مظلومی کا عہد تھا۔ اس بادشاہ کی الحاد پرستی اور اس کے "دین الٰہی" نے دربار کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین مقدس سے بالکل بیگانہ بنا رکھا تھا۔ ملک میں شرک و بدعت، رفض، اباحت، اور عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ علمائے حق خوفِ رسوائی سے

زاویہ نشین ہو گئے تھے اور شریعت اسلامی انتہائی کس مپرسی کے عالم میں تھی۔ عین اس زمانے میں شریعت و طریقت کا ایک آفتاب طلوع ہوا۔ ابوالبرکات حضرت شیخ احمد امام ربانی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ ۱۵۶۴ء میں بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عبدالاحد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اس کے بعد مولانا کمال کشمیری (سیالکوٹ) سے معقولات، مولانا یعقوب کشمیری سے حدیث اور قاضی بہلول بدخشانی سے تفسیر و حدیث کی تکمیل کی۔ سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر آگرہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اور وہاں ابوالفضل اور فیضی سے بعض کامیاب مباحثے بھی کیے۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے علوم باطنی میں کمال پیدا کیا۔ خواجہ صاحب ان کی استعداد سے بے حد متاثر ہوئے اور ایک خط میں فرمایا ”شیخ احمد نام مردے ست از سرہند کثیر العلم وقوی العلم روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کرد۔ عجائب بسیار از روزگار اوقاتِ او مشاہدہ نمودہ۔ بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا از و روشن گردد۔“

منصب تجدید

جب حضرت خواجہ باقی اللہ سے آپ کو خرقۂ خلافت عطا ہوا تو آپ نے کچھ مدت خلوت اختیار کی جس کے دوران میں آپ کو اشارہ ہوا کہ تُو الف ثانی کا مجدد ہے۔ اسی سال آپ کو قیومیت کا منصب بھی عطا ہوا۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے۔ تو خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت عزت و احترام سے آپ کی پذیرائی کی۔ اور اپنے بہت سے خلفا اور مریدوں کو آپ کے پاس کسب فیض کے لیے بھیجا۔ آپ سرہند، دہلی اور لاہور اکثر آتے جاتے رہے۔ تجدید کے پانچویں سال ۱۶۰۵ء میں خانِ خاناں، خان اعظم، سید صدر جہاں اور مرتضیٰ خاں (شیخ فرید) آپ کے مرید ہوئے۔ جن کی وساطت سے آپ نے اکبر کو اسلام اور تقویٰ کی تلقین کی۔ جس کا اثر کچھ نہ ہوا۔ ان چاروں امرا کے نام آپ کے بہت سے خطوط ”مکتوبات امام ربّانی“ میں درج ہیں۔

ردِّ روافض

جب اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا تو انھی امرا کے ذریعے سے حضرت مجدّد صاحب نے اس سے ترویجِ شریعت اور تائیدِ اسلام کا وعدہ لیا۔ چونکہ ایران سے اکثر شیعہ

بزرگ ہندوستان آ رہے تھے اور یہاں شیعیت کا چرچا بھی زیادہ ہوگیا تھا اس لیے مجدّد صاحب نے اکثر شیعہ عقائد کی تردید کی۔ اور ''ردِ روافض'' کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا جس میں تاریخ اور حدیث سے خلفائے راشدین کے فضائل ثابت کیے۔ آپ نے اپنے ایک معتمد علیہ خلیفہ شیخ بدیع کو جہانگیر کے لشکر میں تلقین و ارشاد کے لیے بھیجا۔ چنانچہ لشکر کے بے شمار آدمی آپ کے مرید ہوگئے۔ وزیر آصف خاں نے جہانگیر سے شکایت کی کہ فلاں شخص نے مجددیت کا دعویٰ کیا ہے اور ہزار دو ہزار لوگ اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا روز افزوں اقتدار سلطنت کے لیے خطرے کا باعث ہو۔

جہانگیر کے دربار میں

اس پر جہانگیر نے مجدّد صاحب کو طلب کیا۔ حضرت دربار میں تشریف لے گئے۔ بادشاہ سے کچھ سوال و جواب ہوئے۔ لیکن حضرت نے آئینِ دربار کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہیں کیا۔ اس پر کسی کی اکساہٹ کے باعث بادشاہ غضب ناک ہوگیا اور اس نے حضرت کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کردیا۔

رہائی اور نوازشِ خسروانہ

کہتے ہیں کہ شاہ جہان نے جو حضرت کا معتقد تھا۔ آپ کو کہلا بھیجا کہ بعض علماء نے سلاطین کے سامنے سجدۂ تحیت جائز رکھا ہے۔ آپ کو دربار میں سجدہ کرلینا چاہیے۔ آپ نے فرمایا۔ عزیمت کی شان یہی ہے کہ خدائے عزوجل کے سوا کسی کے سامنے سجدہ نہ کیا جائے۔ غرض حضرت ایک سال تک قلعہ گوالیار میں بند رہے۔ اس کے بعد جہانگیر کو بعض واقعات پیش آئے۔ اور اس نے خواب میں دیکھا کہ یہ واقعات محض اس بے ادبی کا نتیجہ ہیں جو اس کی طرف سے حضرت کی شان میں سرزد ہوئی۔ چنانچہ اس نے آپ کو قلعہ گوالیار سے طلب کیا۔ اور عذر و معذرت کے بعد آپ کے ایما پر ملک میں شریعت کے احکام صادر کیے۔ جہانگیر نے اس کے بعد توزک میں دو دفعہ حضرت کا ذکر کیا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ میں نے شیخ احمد سرہندی کو ''دکان آرائی، خودفروشی اور بے صرفہ گوئی'' کی وجہ سے محبوس کیا تھا۔ لیکن آخر ان کو رہا کردیا اور خلعت۔۔ اور ایک ہزار روپیہ خرچ بھی دیا۔ تین سال کے بعد پھر ذکر کیا ہے کہ ''بدستور ہر سال خود را بہ طلا و اجناس وزن فرمودہ دروجہ مستحقاں مقرر فرمودم۔ از اں جملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنایت

شد۔"

مجدّد صاحب کی خدماتِ دینی

حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے ترویجِ شریعت میں سعی بلیغ کی جس کا اثر یہ ہوا کہ ملک کے حالات بالکل متغیر ہوگئے۔ الحاد و زندقہ کا اثر باقی نہ رہا۔ اور شریعت کو دوبارہ فروغ ہوا۔ آپ کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ آپ نے علما و صوفیہ یعنی "شریعت و طریقت" کے در میان پرانے اختلافات کو یکسر مٹا دیا۔ عقیدۂ وحدت الوجود کی نئی توجیہہ کر کے وحدت الشہود کا نظریہ قائم کیا۔ اور تصوف کے موجودہ سلسلوں کو ترک کر کے ایک نئے طریقے کو رواج دیا جس کو نقشبندیہ کہتے ہیں۔ اس طریقے کی خصوصیات ملاحظہ ہوں:

"اس طریقے کے تمامی اصل و فروع میں اتباع سنّت سنیہ اور اجتناب بدعت نامرضیہ بدرجۂ کمال ہے۔ یعنی صحابہ کبار کا سا لباس مشروط ہے۔ انہی کی معاشرت، ویسے ہی اذکار و اشغال، وہی محاسبہ نفسی اور ہردم کی حضوری۔ وہی آداب شیخ، وہی کم ریاضتی اور فیضان کثیر۔ کمالات ولایت کے علاوہ کمالات نبوت کی بھی تعلیم ہے۔ اس میں چلہ کشی کی ضرورت ہے، نہ ذکر بالجہر کی اجازت۔ نہ سماع بالمزامیر ہے، نہ قبور پر روشنی، نہ غلاف و چادر اندازی نہ ہجوم عورات، نہ سجدۂ تعظیمی، نہ سر کو جھکانا، نہ بوسہ دینا، نہ توحید وجودی، نہ دعوائے اناالحق، نہ مریدوں کو پیروں کی قدم بوسی کا حکم، نہ مرید عورتوں کی ان کے پیروں سے بے پردگی۔"

اثبات النبوت

غرض آپ تصوف و طریقت میں کسی خلافِ شریعت فعل کے روادار نہ تھے۔ ابوالفضل اور فیضی کے زیرِ اثر بعض لوگ اس بات کے قائل ہوگئے تھے کہ توحید کو ماننے کے لیے رسالت کا عقیدہ ضروری نہیں۔ آپ نے نہایت شدت سے اس خیال کی مخالفت کی اور "اثبات النبوۃ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس سے اس فتنے کا ہمیشہ کے لیے سدِّ باب ہوگیا۔ اکبر کی حد سے بڑھی ہوئی رواداری بھی اسلام کے ضعف کا باعث ہو رہی تھی۔ چنانچہ مجدد صاحب نے جزیہ اور ذبحِ بقر کو شعائرِ اسلام قرار دیا۔ آپ کے جن رسائل کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے علاوہ دو رسالے "مبدا و معاد" اور "معارف لدنیّہ" بھی مشہور ہیں اور آپ کے عقائد و اعمال کا صحیح جائزہ لینا ہو تو آپ کے فارسی مکتوبات کے مجموعے کا مطالعہ کرنا چاہیے جو تین جلدوں میں شائع ہوچکا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے جانشینوں مثلاً قیوم ثانی خواجہ معصوم، قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند، قیوم رابع خواجہ محمد زبیر اور بعض دوسرے بزرگوں نے آپ کے طریقے کی خدمت بوجۂ احسن کی۔ اور اسلام کو ہندوستان میں سربلند کیا۔

وصال ۱۰۔ دسمبر ۱۶۲۴ء مطابق ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو ہوا۔ خاک سرہند میں دفن ہوئے۔ ہر سال ۲۷-۲۸ صفر کو آپ کا عرس ہوتا ہے جس میں کوئی خلاف شریعت رسم ادا نہیں کی جاتی۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی

۱۵۵۱ء میں ایک اور عالمِ حق حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سیف الدین نے آپ کو علوم ظاہری سے آراستہ کیا۔ آپ کو پڑھنے کا شوق اس قدر تھا کہ رات کا اکثر حصہ پڑھنے میں اور دن کا اکثر حصہ کتابیں نقل کرنے میں گزرتا۔ کھیل کود سے طبیعت متنفر تھی۔ بائیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ اور پھر حرمین شریفین میں جا کر تکمیلِ حدیث کی اور اس سرزمین مقدس کے علماء و مشائخ سے باحسن وجوہ کسب فیض کیا۔ تذکرہ علمائے ہند، مآثر الکرام (غلام علی آزاد)، تذکرہ (ابوالکلام آزاد) متفقہ طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں علم حدیث نے شاہ عبدالحق محدث ہی سے فروغ پایا۔ آپ نے مشکوٰۃ کی شرح ''لمعات'' (بزبان عربی) لکھی۔ اسناد حدیث اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب تالیف کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ ''حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم و تعلم کے بانی ہوئے اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا اور ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق نے صحیح بخاری کا۔''

دیگر تصانیف

حدیث کے علاوہ شاہ صاحب نے متعدد دیگر کتابیں بھی لکھیں۔ مثلاً ''جذب القلوب فی دیار المحبوب'' جس کا ترجمہ اردو میں ''تاریخ مدینہ منورہ'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ ''مدارج النبوۃ'' (سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) شرح ''فتوح الغیب'' میں حضرت غوثِ اعظم کے ارشادات کی تشریح ہے۔ ''اخبار الاخیار'' میں ہندوستان کے اولیا و اکابر کے حالات لکھے۔ جہانگیر نے توزک میں اس کتاب (اخبار الاخیار) کے متعلق لکھا ہے کہ ''شیخ

عبدالحق دہلوی کہ از اہل فضل و اربابِ سعادت است۔دریں آمدن دولت ملازمت دریافت کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند (الاخبار والاخیار) بہ نظر درآمد خیلکے زحمت کشیدہ۔ مدتہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل و تجرید بسری بُرد۔ مردِ گرامی است۔"

شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے متجاوز بتائی جاتی ہے۔ ایک کتاب ہے "مجموعۃ المکاتیب والرسائل" اس میں آپ کے اڑسٹھ خطوط ہیں جو آپ نے شاہ ابوالمعالی رحمتہ اللہ علیہ، اپنے بیٹے نور الحق، خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ، خان خاناں، فیضی، شیخ ابوالخیر مبارک اور نواب مرتضیٰ خاں (شیخ فرید) کے نام لکھے ہیں۔ ان خطوط میں تفسیر و حدیث، جبر و قدر، شریعت و تصوف اور ترویجِ دین کی فضیلت پر نہایت سادگی اور خلوص سے اظہار خیال فرمایا ہے۔

مولانا نور الحق

شاہ صاحب کے صاحبزادے مولانا نور الحق بہت بڑے عالم اور عہد شاہ جہانی کے شیخ الاسلام تھے۔ آپ کی شرح صحیح بخاری اور شرح صحیح مسلم مشہور ہیں۔ ایک کتاب زبدۃ التواریخ بھی لکھی ہے جس میں عہد اکبری کے حالات منصفانہ انداز سے قلمبند کیے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب ۹۴ سال کی عمر میں (۱۶۴۲ء) واصل بحق ہوکر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے پاس مدفون ہوئے اور مولانا نور الحقؒ نے اپنے والد محترم کے انتقال سے اکیس برس بعد ۱۶۶۳ء میں وفات پائی۔

تعلیم و تدریس

حضرت شاہ صاحب کا زمانہ حقیقت میں معلمین و مدرسین کا دور تھا۔ علما حرمین شریفین جاتے۔ وہاں سے تکمیل علوم کرنے کے بعد واپس آکر درس و تدریس میں مصروف ہوجاتے۔ شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب متقی، فتح اللہ شیرازی، علامہ کمال الدین کشمیری (مجدد الف ثانی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے استاد)، گجرات میں علامہ وجیہہ الدین، شیخ محمد طاہر پٹنی، شیخ محبّ اللہ اکبر آبادی اسی زمانے میں ہوئے ان میں کوئی بڑا مجتہد یا مفکر نہ تھا۔ لیکن تدریسِ علوم میں ان کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔

عہد عالمگیری

عالمگیر کا عہد اگرچہ شریعت اسلامی اور علوم دینی کی ترقی و ترویج کے لیے بڑا سازگار تھا

کیونکہ بادشاہ خود نہایت متقی اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔لیکن اس عہد میں بھی علما زیادہ تر تعلیم و تدریس، حواشی نگاری اور تشریح نویسی میں مصروف رہے۔ ملا جیون نے تفسیر احمدی اور نورالانوار لکھی۔ میر محمد زاہد نے شرح مواقف، شرح تہذیب دوانی اور رسالہ قطبیہ پر حاشیے لکھے۔ قاضی محبّ اللہ بہاری نے اصول فقہ اور منطق پر کتابیں لکھیں۔ مثلاً مسلم الثبوت، مسلم العلوم، افادات جوہر فرد۔ ملا محسن نے ''ردِّ شیعہ'' اور نجم الفرقان مرتب کیں۔ البتہ عالمگیر نے بعض علمائے عصر سے فقہ حنفیہ کی ایک جامع کتاب فتاویٰ عالمگیری ضرور مرتب کرائی۔ جس کی تیاری میں علما کے وظائف پر دو لاکھ روپے کی رقم صرف ہوئی۔ اور جو حنفیوں کے نزدیک ھدایہ کے بعد فقہ کی بہترین کتاب ہے۔

فرنگی محل

لکھنؤ کا محلّہ فرنگی محل کسی زمانے میں ایک فرنگی تاجر کے تصرف میں تھا۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کے لاوارث فوت ہوجانے کی وجہ سے یہ جائداد سرکاری ہوگئی۔ عالمگیر کے زمانے میں ملا قطب الدین سہالوی اپنے قصبہ سہالی میں رہتے تھے۔ وہاں زمین کے کسی جھگڑے میں قتل ہوگئے۔ ان کے بیٹے محمد سعید سہالوی نے عالمگیر سے شکایت کی۔ جس پر فرنگی محل کا علاقہ انھیں معافی میں دے دیا گیا۔ ملا قطب الدین کے بیٹوں میں سب سے زیادہ مشہور مُلّا نظام الدین تھے جن کے نام سے مدارسِ دینیہ کا نصاب ''درس نظامیہ'' منسوب ہے۔ آپ نے بعض کتابوں پر حواشی لکھے ہیں۔ آپ کے درس نظامیہ نے ملک بھر میں رواج پایا۔ آپ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ درس نظامیہ کے متعلق نقادوں کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ اس سے قدیم ضروریات علمی بہت بڑی حد تک پوری ہوجاتی تھیں اور ادبیات فارسی کے ساتھ ملا کر یہ درس مکتفی ہوجاتا تھا اور اس کے پڑھنے والوں میں بڑے بڑے فاضل اور مجتہد علما پیدا ہوئے۔ لیکن اب اس میں معانی و بیان، ادب و لغت، طبیعیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات و اقتصادیات کے اضافے کی شدید ضرورت ہے جن کے علم کے بغیر کوئی شخص عالم کہلانے کا مستحق نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ملا نظام الدین کے صاحبزادوں میں ملا عبدالعلی بحرالعلوم مشہور ہیں۔ ان کی کرناٹک کے نواب محمد علی خاں نے سرپرستی کی اور ان کے لیے ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا جہاں وہ اپنی وفات (۱۸۱۹ء) تک درس دیتے رہے۔ ان کی تصانیف بھی زیادہ تر شروح و حواشی پر مشتمل ہیں۔ ملا بحر

العلوم تو فرنگی محل چھوڑ کر مدراس چلے گئے تھے لیکن فرنگی محل بدستور علوم دینی کا مرکز رہا۔ ایک بڑے مشہور عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی بہت سی کتابوں کے مصنف گزرے ہیں۔

بلگرام

لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ بلگرام بہت مردم خیز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سید عبدالجلیل اور ان کے صاحبزادے سید محمد بڑے عالم تھے۔ سید غلام علی آزاد حسان الہند ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ سید محمد بلگرامی اور سید طفیل محمد بلگرامی سے تعلیم پانے کے بعد حج کو گئے۔ وہاں سے علم حدیث حاصل کرنے کے بعد اورنگ آباد گئے۔ اور نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کے زیر سایہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے۔ ۱۷۸۵ء میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف میں دینی کتابیں کم ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری کی ایک جزوی شرح اور روضتہ الاولیا۔ باقی کتابیں ید بیضا، سرو آزاد، خزانہ عامرہ، مآثر الکرام تاریخ و تذکرہ پر مشتمل ہیں۔ اور فارسی شاعری اور علوم اسلامی کی تاریخ کے متعلق بیش بہا معلومات سے لبریز ہیں۔

خیر آباد

خیر آباد کے علماء کا سلسلہ مولانا فضل امام خیر آبادی سے شروع ہوتا ہے۔ جو دہلی میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مولانا فضل حق خیر آبادی متعدد کتابوں کے مصنف اور مرزا غالب کے گہرے دوست تھے۔ آپ معقولات کے امام تھے۔ آپ نے طبیعات پر بھی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آپ نے حبس دوام کی سزا پائی اور رنگون بھیجے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں وہیں انتقال کیا۔ علامہ شبلی کے استاد مولوی عبدالحق خیر آبادی بھی اسی خاندان سے تھے۔ اور رامپور میں ملازم تھے۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان سے بھی بعض علما مثلاً حافظ فخر الدین، مولوی شیخ الاسلام، مولوی سلام اللہ محدث رامپوری ہوئے جنھوں نے بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔

شیعہ علمائے لکھنؤ

اس دور میں ایک شیعہ مجتہد سید دلدار علی لکھنوی بھی بڑے عالم تھے۔ جنھوں نے دوسری تصانیف کے علاوہ وحدت الوجود کے رد میں ایک کتاب لکھی۔ علامہ تفضل حسین خاں

کشمیری (شیعہ) عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی جانتے تھے اور علوم ریاضی میں کمال رکھتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں فوت ہوئے۔ جبر و مقابلہ اور فرنگی علم ہیئت پر ان کی کتابیں موجود ہیں۔

سندیلہ اور چڑیا کوٹ

سندیلہ میں مولوی حمد اللہ سندیلوی ملا نظام الدین کے تلامذہ میں سے تھے۔ آپ نے شاہی جاگیر حاصل کر کے سندیلہ میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جس میں تعلیم پا کر بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے۔ قاضی احمد علی سندیلوی، مولوی احمد حسین لکھنوی، حافظ شوکت علی، شیخ عبدالجلیل قابل ذکر ہیں۔ قصبہ چڑیا کوٹ بھی علماء کا ایک اور مرکز تھا۔ جہاں دوسرے علما کے علاوہ مولانا عنایت رسول اور مولانا محمد فاروق نے بہت نام پیدا کیا۔ نقشبندیوں میں مرزا مظہر جان جاناں، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ غلام علی دہلوی بڑے نامور عالم گزرے ہیں۔ وہ سب اسی عہد کی پیداوار تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

اس فصل میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلے کے علما کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی حیثیت ایک فرد کی نہیں ایک تحریک کی ہے چنانچہ اس کتاب میں کسی دوسری جگہ ایک مستقل فصل آپ کے تذکارِ مقدس کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔

چوتھی فصل: تاریخ اور مورخین

مقام تعجب ہے کہ ہندوستان میں فلسفہ، مذہب، فلکیات اور ریاضیات پر تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں لیکن ہندوؤں کی توجہ تاریخ نگاری کی طرف کبھی مبذول نہیں ہوئی۔ قدیم ہندوؤں کے متعلق جو کچھ تھوڑا بہت ہمیں معلوم ہے وہ صرف پرانے کتبوں اور پتروں اور شعرا کی بعض کتابوں سے ماخوذ ہے۔ رامائن اور مہابھارت کو ہندو ''اتہاس'' (یعنی تاریخ) کہتے ہیں۔ لیکن ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والا فی الفور اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ داستان گوئی، شاعری اور ندرتِ تخیل کے اعتبار سے ان کتابوں کا مرتبہ کتنا ہی بلند ہو، انہیں تاریخ یا بیانِ واقعات سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ بلکہ بعض ہندو نقادوں اور مورخوں تک کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ رام، کرشن اور ان کے متعدد کردار حقیقت میں کبھی موجود اور زندہ بھی تھے۔ یا وہ بھی والمیک اور دیاس کے تخیل ہی کی مخلوقات ہیں۔ جن کو ہندو قوم نے حقیقی وجود تصور کر کے اپنی تاریخ کے ہیرو تسلیم کرا لیا ہے۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ کے متعلق کسی قدر معلومات یونانیوں کی بعض کتابوں اور سفر ناموں سے دستیاب ہوتی ہیں جن کو بعض یورپی مؤرخین نے اپنی تصنیفات میں استعمال کیا ہے لیکن یونانی اور فارسی تاریخوں کے درمیان جو کئی سو سال کا زمانہ حائل ہے اس کے متعلق جتنی معلومات ہندوستان کی نسبت عرب مؤرخین کی کتابوں سے حاصل ہوتی ہیں وہ کہیں اور دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ حقیقت میں عرب مؤرخین، جغرافیہ نگاروں اور سیاحوں نے ازمنۂ متوسطہ کے ہندوستان کو متعارف کرانے میں جو محنت کی ہے اس کے شکریہ و اعتراف سے یہ ملک کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے چند کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عرب مؤرخین اور ہند

کتاب المسالک والممالک ایک جغرافیہ کی کتاب ہے جس کا مصنف ابن خورداذبہ تیسری صدی ہجری میں ہوا ہے۔ اس کتاب میں اس نے سندھ اور ہند کے بلاد و امصار کا حال لکھنے کے علاوہ ہندوستان کی ذاتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

سلسلۃ التواریخ سلیمان تاجر کی تصنیف ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری میں عراق سے چین تک بسلسلۂ تجارت سفر کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں سراندیپ، جنوبی ہند اور ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے خطوں کے لوگوں، ان کی پیداوار اور ان کی رسوم معاشرت کا حال قلمبند کیا ہے۔

ابو زید حسن سیرافی بھی سلیمان تاجر کی طرح سیاح تھا۔ اور بندرگاہ سیراف (خلیج فارس) سے ہندوستان اور چین تک تجارتی بحری سفر کیا کرتا تھا۔ اس نے سلیمان تاجر کے سفر نامے کو پڑھ کر اس سے پچیس تیس برس بعد اپنی کتاب لکھی۔ اور اس میں ہندوستان کی زندگی کے متعلق اپنے مشاہدات لکھے۔

ابو دُلَف مُسْعِرْ بن مُہَلْہِلْ یتبوعی چوتھی صدی کا ایک عرب سیاح ہے جو خشکی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ وہ بغداد سے چل کر ترکستان، چین، کابل، تبت، کشمیر، ملتان ہوتا ہوا ہندوستان کے جنوبی حصے تک پہنچا۔ ملتان کے بت خانے اور مدراس کی مصنوعات اور پیداوار کا مفصل ذکر اس کی کتاب میں ملتا ہے۔

بزرگ بن شہریار نے عجائب الہند کے نام سے ایک پوری کتاب ہندوستان کے متعلق

لکھی ہے۔ یہ بھی سیاح اور جہاز ران تھا۔ اس نے جنوبی ہند اور گجرات کے تفصیلی حالات کے علاوہ بعض دوسرے خطوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

مُروج الذہب کا مصنف ایک بلند پایہ سیاح اور مورخ مسعودی ہے جو چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے۔ اس نے بھی ہندوستان کے متعلق بعض بیش قیمت معلومات مہیا کی ہیں۔

ابو اسحاق اصطخری مشہور جغرافیہ دان اور مؤرخ تھا۔ جو ۳۴۰ھ میں ہندوستان آیا اور اس کے بعد اپنی کتاب المسالک والممالک میں سندھ اور ہند کے حالات لکھے۔

ابن حوقل بھی اسی زمانے میں ہندوستان آیا۔ ابو اسحاق سے یہیں اس کی ملاقات ہوئی۔ سیاح اور جغرافیہ نگار تھا۔ اس نے ہندوستان کے متعلق بعض جغرافیائی معلومات مہیا کی ہیں۔ اور سندھ کا ایک نقشہ بھی تیار کیا۔

چوتھی صدی ہجری کا ایک اور بشاری مقدسی تھا۔ جس نے احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ ہندوستان آیا تھا۔ اس نے سندھ کا مفصل حال لکھا ہے۔

البیرونی کو کون نہیں جانتا۔ اس کی مشہور کتاب الھند نے ہندوؤں کے رسوم و رواجات، ان کے مذاہب، ان کے علوم ہندسہ، ان کے مکاتب فلسفہ کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کا اعتراف تمام ہندو مؤرخین کو ہے۔ اس نے ایک تاریخ ہند بھی لکھی۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان آیا۔ محمد تغلق کا زمانہ تھا۔ اس سیاح نے دربار میں بڑی عزت پائی۔ ملک کو خوب چل پھر کر دیکھا۔ اور سالہا سال رہ کر جو کچھ لکھا وہ مؤرخین کے نزدیک نہایت مستند ہے۔

ان مؤرخین و سیاحین کے علاوہ بلاذری کی فتوح البلدان، شہاب الدین عمری کی مسالک الابصار، ابوالفدا کی تقویم البلدان، یاقوت کی معجم البلدان، صوفی دمشقی کی عجائب البر و البحر، محمد بن علی کوفی کی کتاب چچ نامہ اور دوسری بیشمار پرانی کتابیں ہندوستان کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کی حامل ہیں۔ یہ عرب مؤرخین نہ ہوتے تو ہندوستان کی آج سے ہزار سال پہلے کی تاریخ بھی پردۂ ظلمت میں پوشیدہ رہتی۔ جس طرح اس کی قدیم تاریخ اندھیرے میں ہے۔

مؤرخین ہند

چونکہ مسلمان ذوق تاریخ نگاری کے اعتبار سے دنیا کی بڑی مہذب و شائستہ اقوام میں شمار ہوتے تھے، اس لیے جب وہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو اس زمانے سے لے کر آج تک انھوں نے بیسیوں نہیں سینکڑوں تاریخیں مرتب کیں جن میں سے اکثر چھپ کر شائع ہوچکی ہیں اور متعدد بعض کتب خانوں کے نادر ترین مخطوطات میں شامل ہیں۔ فتح سندھ سے لے کر زوالِ دولتِ مغلیہ تک جو تاریخیں لکھی گئیں، ان کو تین بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول وہ تاریخیں جو سلاطینِ دہلی کے حالات پر مشتمل ہیں۔ دوم وہ جو پادشاہانِ دہلی کے زمانوں سے متعلق ہیں۔ سوم عام تاریخیں ہیں جو ابتدا سے لے کر ہر مؤرخ کے زمانۂ حیات تک پہنچتی ہیں۔ ہندوستان کے چھوٹے خطوں اور ان کی سلطنتوں کے متعلق ان بڑی کتابوں میں بھی کافی تذکرہ موجود ہے اور ان کی علیحدہ علیحدہ تاریخیں بھی کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ تمام کتب تاریخ پر احاطہ کرنا تو ایک عمر چاہتا ہے البتہ ہم اس فصل میں چند مستند و معتبر تاریخوں کا ذکر کریں گے۔ جو پہلی صدی ہجری سے لے کر زوال مغل تک کے واقعات پر مشتمل ہیں اور اس دوازدہ صد سالہ مدت میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا جس کے تفصیلی حالات کو ہمارے مؤرخین نے ضبط تحریر میں منضبط نہ کردیا ہو۔

تواریخ سلاطینِ دہلی

''تاج المآثر'' (نظام الدین حسن نیشاپوری) قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کے عہد حکومت پر حاوی ہے (۵۸۷ھ تا ۶۱۴ھ) فتح اجمیر سے ابتدا کر کے لاہور کی صوبہ داری پر ناصر الدین محمود کے تقرر تک کے حالات اس کتاب میں موجود ہیں۔

''تاریخ فیروز شاہی'' (ضیاء الدین برنی) سلطان غیاث الدین بلبن کے جلوس سے سلطان فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سال جلوس تک (۶۶۴ھ تا ۷۵۸ھ)۔

''طبقاتِ ناصری'' (قاضی منہاج الدین بن سراج الدین جوزجانی) ابتدائے آفرینش۔ تذکرہ انبیاء و خلفائے اسلام وغیرہ کے بعد سلاطین آل امیر سبکتگین سے لے کر چنگیز خاں کے خروج اور مغلوں کے حملوں تک۔

''تاریخ فیروز شاہی'' (شمس سراج عفیف) سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد کے

واقعات جلوس سے وفات تک (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) یہ گویا ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کا تکملہ ہے۔

''خزائن الفتوح'' مشہور شاعر امیر خسرو دہلوی نے سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت کے ابتدائی پندرہ سال کے واقعات قلمبند کیے ہیں اور راجپوتانہ، گجرات، مالوہ، دیوگیر، ارنگل اور معبر کی فتوحات کا حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ امیر خسرو کی دوسری منظوم کتابوں مثلاً قران السعدین عشیقہ، مفتاح الفتوح، نہ سپہر، اور تغلق نامہ میں بھی معاصر تاریخ کے بہت سے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

''تاریخ مبارک شاہی'' (ملا یحییٰ بن احمد سرہندی) سلاطین دہلی کی تاریخ ہے جس میں سلطان محمد غوری کی فتوحات سے ۸۳۸ھ تک چھبیس بادشاہوں کا سن وار تذکرہ قلمبند کیا گیا ہے۔

افغان سلاطین

''مخزن افغانی'' (خواجہ نعمت اللہ ہروی) سلطان بہلول لودی سے ابراہیم لودی تک اور شیر شاہ سوری سے عادل شاہ سوری تک پٹھان بادشاہوں کے زمانوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ چونکہ مصنف جہانگیر کے عہد میں ہوا ہے اس لیے اس نے اس مغل بادشاہ کا ذکر بھی کیا ہے۔

''تاریخ داؤدی'' (عبداللہ) اس میں بھی لودی اور سوری سلاطین کے حالات مندرج ہیں اور یہ بھی عہد جہانگیری ہی میں لکھی گئی ہے۔

خاندانِ مغلیہ کی تاریخیں

''تزک بابری'' ظہیر الدین بابر کی خودنوشت سوانح عمری جس کو عبدالرحیم خان خاناں نے ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں بابر نے ہندوستان کے متعلق رنگارنگ معلومات درج کی ہیں۔

''تذکرۃ الواقعات'' جوہر آفتابچی کی تصنیف ہے جو ہمایوں کے محل میں آفتابہ چی کی خدمت پر مامور تھا۔ مولانا الہ داد سرہندی نے ترمیم و اصلاح کے بعد اس کا نام تاریخ ہمایونی رکھا۔ ہمایوں کے جلوس سے لے کر ہندوستان پر ہمایوں کے حملے تک کے واقعات اس میں مندرج ہیں۔

''ہمایوں نامہ'' بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے بابر اور ہمایوں اور اکبر کے حالات اکبر کی

فرمائش سے مرتب کیے۔ یہ کتاب ۹۶۲ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

''اکبر نامہ'' عہد اکبری کی مفصل تاریخ ہے جس کو شیخ ابوالفضل علامی نے مرتب کیا۔ اس کتاب میں اکبر کے جلوس سے لے کر چھیالیسویں سن جلوس تک کے واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں۔

''آئین اکبری'' بھی شیخ ابوالفضل نے لکھی۔ اس میں عہد اکبری کے نظم و نسق کی تاریخ اور سلطنت کا صوبہ وار جغرافیہ درج ہے۔

''سوانح اکبری'' میں اکبر بادشاہ کی پیدائش سے چوبیسویں سنِ جلوس تک کے حالات درج ہیں۔ امیر حیدر حسینی بلگرامی نے جو مولانا غلام علی آزاد کے پوتے تھے اس کتاب کو مرتب کیا۔

''تزک جہانگیری'' خود جہانگیر نے لکھی۔ تخت نشینی سے لے کر سترہویں سال جلوس تک کے حالات بادشاہ نے خود اپنے قلم سے لکھے۔ اس کے بعد انیسویں سال تک کے واقعات اپنی نگرانی میں معتمد خاں سے لکھوائے۔ اس کے بعد محمد شاہ کے زمانے میں مرزا محمد ہادی نے بادشاہ کی وفات تک کے واقعات قلمبند کر کے اس کو مکمل کر دیا۔

''اقبال نامہ جہانگیری'' محمد شریف معتمد خاں (مذکورہ بالا) نے لکھی ہے۔ جس میں امیر تیمور سے لے کر جہانگیر کی وفات تک کی تاریخ مکمل ہے۔

''مآثر جہانگیری'' مرزا کامگار حسینی نے لکھی اور اس میں عہد جہانگیر کے پورے حالات شاہ جہاں کی تخت نشینی تک درج کیے ہیں۔

''بادشاہ نامہ'' تصنیف مرزا امینائے قزوینی شاہ جہان کی مفصل تاریخ ہے جس میں دور اول کے دہ سالہ واقعات درج ہیں۔ یہ شاہ جہاں کا درباری مؤرخ تھا۔

''بادشاہ نامہ'' کی تین جلدیں ہیں۔ دو جلدیں ملا عبدالحمید لاہوری نے لکھیں اور تیسری محمد وارث نے۔ ملا عبدالحمید خود شیخ ابوالفضل کے شاگرد تھے اور ان کی اس کتاب پر نواب سعد اللہ خاں علامی نے اصلاح دی تھی۔ ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۷ھ تک کے واقعات اس میں مندرج ہیں۔

''عمل صالح'' محمد صالح کنبوہ نے لکھی۔ اس کو شاہ جہاں نامہ بھی کہتے ہیں۔ سابق شاہان مغل کے علاوہ اس میں عہد شاہ جہانی کے پورے واقعات لکھے ہیں۔ بلکہ عالمگیر کے آغاز حکومت کا حال بھی قلمبند کیا ہے۔ خاتمہ پر دربار شاہ جہانی کے امرا، علما و شعرا کا تذکرہ بھی ہے۔

''شاہ جہاں نامہ'' کو مرزا محمد طاہر آشنا نے مرتب کیا۔ یہ شاہ جہان کے عہد کی سی سالہ تاریخ ہے۔ اور حقیقت میں دوسری شاہ جہانی تاریخوں کا خلاصہ ہے۔ اس میں ۱۰۶۸ھ تک کے واقعات جمع کیے گئے ہیں۔

''عالمگیر نامہ'' امینائے قزوینی کے بیٹے مرزا محمد کاظم نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت کے پہلے دس سال کے واقعات لکھے ہیں۔ (۱۰۶۷ھ سے ۱۰۷۷ھ تک)۔

''وقائع گولکنڈہ'' مشہور انشا پرداز نعمت خاں عالی (نور الدین مرزا محمد شیرازی) کی تصنیف ہے جس میں اس نے اورنگ زیب عالمگیر کے محاصرۂ گولکنڈہ کے حالات و واقعات لکھے ہیں (۱۰۹۷ھ)۔

''واقعات عالمگیری'' تصنیف میر محمد عسکری عاقل خاں رازی، اورنگزیب کے عہد حکومت کے ابتدائی پنج سالہ واقعات پر مشتمل ہے جس میں داراشکوہ، شجاع، مراد اور اورنگ زیب کی خانہ جنگیوں کا مکمل حال مندرج ہے۔

''مآثر عالمگیری'' محمد ساقی مستعد خاں نے اس کتاب میں اورنگ زیب کے عہد حکومت کی تاریخ گیارہویں سال جلوس سے وفات تک لکھی ہے۔ (۱۰۷۸ھ سے ۱۱۱۸ھ تک) تخت نشینی سے دسویں سال جلوس تک کے واقعات ملا محمد کاظم کے عالمگیر نامے سے لے کر شامل کر دیے گئے اور کتاب مکمل ہوگئی۔

''بہادر شاہ نامہ'' عالمگیر کے دوسرے فرزند شاہ عالم بہادر شاہ کی حکومت کے پہلے دو سال کی تاریخ نعمت خاں عالی نے لکھی۔ اس میں اعظم شاہ اور بہادر شاہ کی لڑائیوں کا تذکرہ بھی ہے۔

''تاریخ ارادت خاں'' میر مبارک اللہ واضح (مصنف پنجر قعہ و مینا بازار) کا لقب ارادت خاں تھا۔ اس نے عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ) سے فرخ سیر کے داخلہ دہلی (۱۱۲۵ھ) تک سات سال کی تاریخ لکھی ہے۔

''شاہ عالم نامہ'' تصنیف میر غلام علی خاں شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت کے پہلے دو سال کی تاریخ ہے۔ شاہ عالم کو حصول سلطنت میں جو واقعات پیش آئے وہ اس میں درج ہیں۔ پانی پت کی اس لڑائی پر جو مرہٹوں سے ہوئی تھی۔ یہ کتاب تمام ہوئی ہے۔

''تاریخ شاہ عالم'' شاہ عالم بادشاہ کے پورے عہد حکومت کی تاریخ ہے۔ (۱۱۷۳ھ

سے ۱۲۲۱ تک) منا لال ولد بہادر سنگھ مؤرخ کا نام ہے۔

''عبرت نامہ'' محمد خیر الدین الہ آبادی نے شاہ عالم ثانی کے جلوس سے ۱۲۰۶ھ تک کی مفصل تاریخ قلمبند کی ہے۔ اور غلام قادر روہیلے کے مظالم کی تفصیل بطور خاص لکھی ہے۔

ہندوستان میں حکومت اسلامی کی عام اور مستند تاریخیں جن سے اکثر مورخین حال مواد اخذ کرتے ہیں، متعدد ہیں۔ لیکن جن کو زیادہ اعتبار و استناد حاصل ہے ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

''طبقات اکبری'' (ملا نظام الدین احمد) سبکتگین کے آغازِ حکومت سے لے کر اکبر بادشاہ کے اڑتیسویں سال جلوس تک (۳۶۷ھ تا ۱۰۰۲ھ) کے واقعات اس تاریخ میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ دکن، گجرات، بنگالہ، مالوہ، جونپور، سندھ، کشمیر اور ملتان کے سلاطین کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

''منتخب التواریخ'' (ملا عبدالقادر بدایونی) سلاطین غزنویہ کے آغاز سے اکبر کے چالیسویں سال جلوس (۱۰۰۴ھ) تک دہلی کی سلطنت کے حالات اس کتاب میں درج ہیں اور اکبر کے زمانے میں جو امرا، علماء، فقرا، حکما اور شعرا موجود تھے ان کا حال بھی لکھا ہے۔

''ذکر الملوک'' (شیخ عبدالحق حنفی محدث دہلوی) سلطان محمد غوری (معز الدین محمد بن سام) سے اکبر کے جلوس تک کے واقعات اس کتاب میں مندرج ہیں۔ یہ کتاب عام طور پر ''تاریخ حقی'' کے نام سے مشہور ہے۔

''تاریخ فرشتہ'' (حکیم محمد قاسم فرشتہ) اس میں قدیم زمانے سے ۱۰۱۵ھ تک کے واقعات ہیں۔ محمد غوری سے لے کر اکبر کی وفات تک حالات قلمبند کرنے کے علاوہ سلطنت بہمنی، بیجاپور، احمد نگر، تلنگانہ، برار، بیدر، خاندیس، گجرات، مالوہ، جونپور، ملتان، سندھ، کشمیر کے بادشاہوں کا بھی مفصل حال درج کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے بعض مشائخ کا تذکرہ بھی ہے۔

''خلاصۃ التواریخ'' (منشی سوجان رائے بٹالوی) قدیم راجگانِ ہند سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے جلوس تک کے واقعات اس کتاب میں مندرج ہیں۔ سلاطین دہلی کے ساتھ ساتھ ضمناً ان کے معاصر بادشاہوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

''منتخب اللباب'' (میر محمد ہاشم خوافی خاں) اس مؤرخ کو غلطی سے خافی خاں کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ خراسان کے قصبہ خواف کا رہنے والا تھا۔ اور خوافی کہلاتا تھا۔ اس کتاب میں

ابتدائے فتح اسلام سے محمد شاہ کے زمانے تک کے حالات درج ہیں اور سلاطین دکن کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

"سیَر المتاخرین" (نواب میر غلام حسین خاں) یہ سلاطین مغلیہ کی عام تاریخ ہے جس کی جلد اول میں اورنگ زیب کی وفات تک کے حالات شامل ہیں۔ دوسری جلد میں اورنگ زیب کی وفات سے ۱۱۹۵ھ تک سلاطین دہلی کے حالات اور تیسری جلد میں بنگالہ کے وہ واقعات جو ۱۱۵۱ھ سے ۱۱۹۵ھ تک ظہور پذیر ہوئے، تفصیل سے قلمبند کیے گئے ہیں۔

"تاریخ مظفری" (نواب محمد علی خاں انصاری) بابر کی فتح ہند سے لے کر محمد شاہ کی وفات تک سلاطینِ دہلی اور دوسرے معاصر بادشاہوں کا تذکرہ اس تاریخ میں موجود ہے۔

"خلاصۃ التواریخ" (مہاراجا کلیان سنگھ) ہندوستان کے شاہان مغل کی تاریخ ہے۔ (ابتدا سے ۱۲۲۷ھ تک) اور اس میں نظمائے بہار و بنگالہ کے مفصل واقعات بھی شامل ہیں۔

امرائے تیموریہ

"مآثر الامراء" (نواب شاہ نواز خاں صمصام الدولہ) اکبر بادشاہ کے زمانے سے لے کر محمد شاہ کے اخیر عہد تک جو امرا مشہور و نامور ہوئے ہیں ان کا مفصل و مبسوط تذکرہ اس کتاب میں مندرج ہے۔

"مآثر رحیمی" (عبدالباقی نہاوندی) یہ کتاب عبدالرحیم خان خاناں اور اس کے آباء و اجداد کا دلچسپ تذکرہ ہے۔ خان خاناں کے علمی کمالات، اس کی علم دوستی، فیاضی، شوق فراہمی کتب اور اس کے دربار کے علما و فضلا، ادباء و شعرا اور اربابِ فن کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

"تذکرۃ الامرا" (منشی کیول رام اگروال) اس کتاب میں عہد اکبری سے لے کر شاہ عالم کے عہد تک کے امرا کا تذکرہ ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس میں ہندو امرا کے حالات علیحدہ لکھے ہیں۔

سلاطین دہلی کے علاوہ ملک کے بعض دوسرے حصوں میں بھی مسلمانوں کی متعدد سلطنتیں قائم تھیں۔ وہ بھی مؤرخین کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہیں۔ بڑے مؤرخین میں شاید ہی

کوئی ایسا ہو جس نے ان سلطنتوں کے حالات اپنی کتاب میں شامل نہ کیے ہوں۔ لیکن ان سلطنتوں کی علیحدہ تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

سندھ

''چچ نامہ'' (محمد بن علی کوفی) راجا چچ والی الور اور اس کے جانشینوں کے حالات اور محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے واقعات اس کتاب میں درج ہیں۔

''تاریخ سندھ'' (سید محمد معصوم بھکری) یہ سندھ کی تاریخ مسلمانوں کی فتوحات سے لے کر اکبر بادشاہ کے تسلط تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں بنو امیہ اور بنو عباس کے حکام و عمال، سلاطین ہند کے حکام و عمال اور سندھ کے حکمران خاندانوں مثلاً سومرہ، سمہ، ارغون کے بادشاہوں کے حالات درج ہیں (۱۰۰۱ھ تک)۔

کشمیر

''واقعات کشمیر'' (ملا محمد اعظم) اس میں کشمیر کے عام حالات ابتدا سے زمانۂ تصنیف یعنی ۱۱۶۰ھ تک درج کیے گئے ہیں۔ راجگان قدیم، سلاطین کشمیر اور سلاطین تیموریہ (جہانگیر سے محمد شاہ کے جلوس تک) کی حکومتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کشمیر کے عجائب و غرائب اور مشاہیر کشمیر کے حالات بھی تفصیل سے درج کیے گئے ہیں۔

گجرات

''تاریخ گجرات'' (شاہ ابوتراب ولی) یہ گجرات کی تاریخ ہے جس میں مظفر شاہ دوم کی وفات (۹۳۲ھ) سے اکبر کی فتح گجرات اور مظفر شاہ سوم کی احمد نگر سے روانگی (۹۹۲ھ) تک کے حالات مذکورہ ہیں۔

''مراۃ سکندری'' (سکندر بن محمد عرف شیخ منجھو) یہ سلاطین گجرات کی ابتدا سے مظفر شاہ سوم کی وفات (۱۰۰۰ھ) تک کی تاریخ ہے۔ جو گجرات کا آخری بادشاہ تھا۔

''مراۃ احمدی'' (مرزا محمد حسن علی محمد خان بہادر) یہ گجرات کی عام تاریخ ہے جس میں قدیم زمانے سے مرہٹوں کے تسلط (۱۱۷۴ھ) تک کے واقعات درج ہیں۔ اس میں ضمناً سلاطین ہند کے تذکرے، عمارات، مشاہیر، نظم و نسق اور عجائبات گجرات کا مفصل حال بھی لکھا ہے۔

بہمنیہ اور نظام شاہیہ

''برہان المآثر'' (علی بن عزیز اللہ طباطبا) یہ سلاطین بہمنیہ و نظام شاہیہ کی تاریخ ہے جس میں ابتدا سے ۱۰۰۴ھ تک کے واقعات مذکور ہیں۔ گلبرگہ، بیدر، احمد نگر کے بادشاہوں کی کیفیت کے علاوہ متفرق واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔

''تذکرۃ الملوک'' (رفیع الدین ابراہیم شیرازی) ابتدا سے ۱۰۲۰ھ تک سلاطین عادل شاہی اور ان کے معاصر سلاطین ہندو دکن و ایران کی تاریخ ہے۔

عادل شاہی بیجاپور

''بساتین السلاطین'' (محمد ابراہیم زبیری) اس تاریخ میں بیجاپور کے سلاطین عادل شاہی کے حالات مندرج ہیں۔ ابتدا سے اس زمانے تک جب عالمگیر نے بیجاپور کو فتح کیا۔ اس کے بعد بیجاپور کے حالات انگریزی تسلط تک بھی مختصراً درج ہیں۔

قطب شاہی

''تاریخ سلطان محمد قطب شاہ'' (ملا عرب شیرازی) گولکنڈہ کے سلاطین قطب شاہیہ کی تاریخ ہے۔ جس میں ابتدا سے ۱۰۲۵ھ تک کے واقعات مذکور ہیں جو سلطان محمد کا چھٹا سال جلوس ہے۔

''حدیقۃ السلاطین'' (ملّا نظام الدین احمد شیرازی) یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تاریخ ہے۔ اس کی تخت نشینی سے لے کر جلوس کے سولہویں سال (۱۰۵۰ھ) تک کے حالات اس میں درج کیے گئے ہیں۔

''تاریخ ظفرہ'' (لالہ گردھاری لال احقر) اس میں سلاطین قطب شاہی کے واقعات، عالمگیر کی فتح گولکنڈہ کا حال، سلاطین آصفیہ کے وقائع، اور حیدر آباد کی مشہور عمارات کا ذکر مندرج ہے۔

آصفیہ

''حدیقۃ العالم'' (میر ابوالقاسم شوستری) سلاطین قطب شاہیہ اور سلاطین آصفیہ کی مفصل تاریخ جس میں سلطان قلی قطب شاہ کے جلوس سے ۱۲۲۳ھ تک کے واقعات مذکور ہیں۔

یعنی نظام الملک آصف جاہ ثانی تک۔

''گلزار آصفیہ'' (حکیم غلام حسین خان زمان) سلاطین قطب شاہیہ اور شاہانِ آصفیہ کی تاریخ ہے۔ ابتدا سے ۱۲۵۲ھ تک یعنی نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کی تخت نشینی تک۔ اس میں دربار آصفیہ کے مشاہیر امرا، علما، حکما اور شعرا کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اور نظم و نسقِ ملکی کی کیفیت بھی درج ہے۔

''سوانح دکن'' (منعم خاں ہمدانی) اس کتاب میں دکن کے چھ صوبوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور شاہانِ آصفیہ اور ان کے درباری امیروں کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔

''مآثر آصفی'' (لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی) شاہان آصفیہ کی مفصل تاریخ ابتدا سے ۱۲۰۰ھ تک۔ یعنی نظام الملک اول سے نواب نظام علی خاں کے زمانے تک۔ اس میں بھی امیروں اور راجاؤں کے مفصل تذکرے ہیں۔

''آصف نامہ'' (شاہ تجلی علی حیدر آبادی) نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے اجداد کا تذکرہ کرنے کے بعد آغاز سلطنت حیدر آباد سے نواب میر نظام علی خاں کے حالات جلوس سے ۱۲۰۶ھ تک درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب تزک آصفی اور آصف نامہ بھی کہلاتی ہے۔

''نگارستان آصفی'' (سید التفات حسین خاں بنارسی) شاہان آصفیہ کی اولاد اور امرا و اعیان کی تاریخ ہے۔

مرہٹہ

''وقائع جنگ مرہٹہ'' (امین الدولہ علی ابراہیم خاں) پانی پت کے مقام پر احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اس کی مفصل تاریخ ہے۔

''بساط الغنائم'' (لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی) مرہٹوں کی تاریخ میں ابتدا سے جنگ پانی پت تک کے واقعات درج ہیں۔ (یعنی ۱۱۷۴ھ تک)

اودھ

''عماد السعادت'' (سید غلام علی خاں نقوی) اودھ کے نواب برہان الملک سعادت خاں اور ان کے جانشینوں کا تذکرہ ہے۔ اور ضمناً اس میں دکن، لاہور، کابل اور بنگالہ کے معاصر نوابوں اور صوبہ داروں کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ سکھوں اور مرہٹوں کے حالات بھی لکھے ہیں۔

روھیلہ

''گلِ رحمت'' (محمد سعادت یار خان) روہیلوں کے مشہور سردار حافظ رحمت خاں کی تاریخ ہے۔

بنگالہ

''ریاض السلاطین'' (غلام حسین سلیم زید پوری) یہ کتاب بنگالہ کی ابتدا سے انگریزوں کے تسلط تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

''مظفر نامہ'' (منشی کرم علی) ناظمان بنگالہ کی مفصل تاریخ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ کے عہد نظامت سے ۱۱۸۶ھ تک جب مظفر جنگ کو انگریزوں نے حکومت بنگالہ سے معزول کیا۔

کرناٹک

''تزک والا جاہی'' (سید برہان خاں) علاقہ کرناٹک اور خصوصاً نواب انور الدین اور ان کے جانشین محمد علی خاں والا جاہ کے عہد کی مفصل تاریخ ہے۔

میسور

''نشانِ حیدری'' (میر حسین علی کرمانی) نواب حیدر علی والیٔ میسور اور نواب فتح علی خاں ٹیپو سلطان کی مفصل تاریخ جو سلطان کی شہادت کے تین سال بعد ۱۲۱۷ھ میں لکھی گئی۔

''کارنامۂ حیدری'' (ملا عبدالرحیم صفی پوری) نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے زمانوں کی مفصل تاریخ جو سلطان کے فرزند شہزادہ محمد سلطان کی فرمائش سے لکھی گئی۔

ان کتابوں کے علاوہ بے شمار دوسری مستند اور غیر مستند کتابیں موجود ہیں۔ جو ان میں سے اکثر تاریخوں کے مآخذ کا کام دیتی رہی ہیں۔ حمد اللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ، عتبی کی تاریخ یمینی، میر خوند کی روضۃ الصفا، ابوالفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی، فیروز شاہ کی فتوحات فیروز شاہی، میر خوند کی حبیب السیر، میر عبداللطیف کی لُبّ التواریخ، مولانا احمد ٹھٹھوی کی تاریخ الفی، عباس سروانی کی تحفۂ اکبر شاہی، رزق اللہ مشتاقی کی واقعات مشتاقی اور بے شمار دوسری کتابیں جن کا اس فصل میں ذکر نہیں کیا گیا، مطبوعہ یا مخطوطہ صورت میں موجود ہیں اور پوری تاریخ کا کوئی ایسا زمانہ

نہیں جس کے متعلق مسلمانوں نے معتبر و مستند واقعات تحریر نہیں کر دیے۔

تاریخوں کے اس تذکرے سے ایک مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم ثقافت کے اثرات کا اندازہ کرنے کے لیے تمام مآخذ سامنے آ جائیں۔ تاکہ قارئین جس عہد کے متعلق چاہیں براہ راست ان مآخذ سے معلومات حاصل کر سکیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ ہند کے طلبہ مستند ترین تاریخوں سے متعارف ہو جائیں۔ اور مطالعہ و تحقیق کرتے ہوئے غیر مستند ذرائع کے جنگل میں نہ بھٹکتے پھریں۔

جو قوم اپنی تاریخ کو محفوظ کر لیتی ہے وہ گویا اپنی بقائے دوام کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اس کے ماضی کی سرگزشت اس کے حال و استقبال کی تعمیر میں معاون ہوتی ہے۔ اس رازِ بقا کو مسلمان روزِ اوّل سے جانتے تھے۔ چنانچہ اقبال مرحوم کیا خوب فرماتے ہیں:

قوم روشن از سوادِ سرگزشت
خود شناس آمد زیاد سرگزشت
سرگزشتِ او چو از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود
ضبط کن تاریخ را پاینده شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

پانچویں فصل: طب اور اطبا

اس میں شک نہیں کہ قدیم یونان علمِ طب اور اس کے متعلقات کا مرکز تھا۔ اور اس کے نامور اطبا بقراط، ارسطو، جالینوس، فیثا غورث اور افلاطون کے نام آج بھی انتہائی احترام سے لیے جاتے ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری طب کو ''یونانی طب'' قرار دینے کی غلطی سب سے پہلے کس سے سرزد ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے جہاں کلدان، مصر، ایران اور ہند کے ذخائرِ علمی سے استفادہ کیا۔ وہاں اطبائے یونان کے علمی اکتشافات سے بھی فائدہ اٹھایا۔ پھر ان کی تشریح و تنقید کے بعد نئے اصول بھی قائم کیے۔ اکثر مسائل میں یونان و ہند کے بڑے بڑے نامور اطبا سے اختلاف کر کے اپنے نقطۂ نگاہ کو دنیا سے منوایا۔ اور فنِ معالجہ کو عروج و ترقی کی ان بلندیوں تک لے گئے جو اس سے قبل کسی کے تصور میں بھی نہ آئی تھیں۔ ان تمام کارناموں کے

بعد مسلمانوں کی طب کو محض "طب یونانی" قرار دینا بہت بڑی بے انصافی ہے۔ بلکہ اس کو اسلامی طب کہنا ہر اعتبار سے صحیح ہوگا۔

طب قدیم کا احیا

ساتویں صدی عیسوی میں کہ بعثت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صدی ہے، قدم طبیں انحطاط پذیر ہوچکی تھیں۔ ہندوستان، چین اور ایران کے مراکز بھی کمزور ہو چکے تھے۔ اور بابل ومصر میں تو یہ فن بالکل ہی قعرِ زوال میں گر کر معدوم ہو چکا تھا۔ ایران قریب تر تھا اور پہلی ہی صدی میں مفتوح ہوچکا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے اس ملک کے علوم وفنون کے ساتھ سب سے پہلے تعلق قائم کیا۔ فتح مصر کے بعد قدیم مصری تہذیب کے آثارِ علمیہ سے استفادے کا آغاز ہوا۔ پھر بازنطینی حکومت کے استیصال اور رومۃ الکبرے کی تسخیر کے بعد علمی تحقیق کے مزید دروازے کھل گئے۔

ایران و یونان کے تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے تھے۔ اور سکندر اعظم کی یلغار کے بعد تو یونانی حکمت وتمدن کا بہت بڑا اثر ایران نے قبول کیا۔ تیسری صدی عیسوی میں متعدد یونانی حکما ایران کے پایۂ تخت میں علوم وفنون کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں ایران کا پایۂ تخت جندی شاپور تھا۔ اس کے بادشاہ شاپور ثانی نے یونان کے بہت سے فضلا کو طلب کر کے اپنے دربار میں مناصب جلیلہ عطا کیے۔ اور اسی زمانے میں جندی شاپور کا مشہور طبی کالج قائم ہوا۔ پانچویں صدی عیسوی میں بازنطینی حکومت نے اپنے ہاں سے نسطوری علما کو خارج کردیا تو وہ لوگ بھی ایران چلے آئے۔ اور انہوں نے ایران وعراق میں طب کو فروغ دینے کا کام شروع کردیا۔ ان کے علاوہ اسکندریہ اور انطاکیہ میں بھی طبی درس گاہیں قائم ہوئیں۔

ویدک سے استفادہ

اول اول تو مسلمانوں نے طب ہندی سے استفادہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ ایک تو فاصلہ زیادہ تھا دوسرے ہندو اہل علم بہت ہی کم آمیز اور متعصب واقع ہوئے تھے اور اپنے علوم کو دوسری قوموں تک پہنچانے سے محترز رہتے تھے۔ جب خلافت اسلامی پر ایک ڈیڑھ صدی کی مدت گزر گئی تو دوسرے عباسی خلیفہ منصور کے عہد میں خالد برمکی نے ہندوستان میں ایک علمی وفد بھیجا تاکہ ہندی ادویہ، طریق علاج اور دوسرے علوم حکمیہ کے متعلق معلومات فراہم کرے۔ یہ مشن کامیاب

ہوا۔ بہت سے ہندی علما و اطبا خلافت عباسیہ سے وابستہ ہو گئے اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا جانے لگا۔

دورِ تراجم

بعض یونانی کتابوں کے ترجمے کا کام تو خلفائے بنو امیہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ امیر معاویہ کے عہد میں بھی بعض عیسائی اور یہودی اطبا نے چند کتابوں کا ترجمہ کر کے اپنے آپ کو عواطف شاہانہ کا مستحق بنا لیا تھا۔ امیر معاویہ کے پوتے خالد بن یزید کو طب اور کیمیا سے بے حد شغف تھا۔ چنانچہ علمی دنیا میں اس کا نام ''حکیم ال سفیان'' لیا جاتا ہے۔ اس نے خود بھی چند کتابیں لکھیں اور بہت سی ترجمہ کرائیں۔ اس کے پایۂ علمی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ فن کیمیا کے مشہور امام جابر بن حیان الصدفی اس کے شاگرد تھے۔ مروان بن الحکم کے ایما پر ماسر جویہ بصری نے اھرن بن اعین اسقف کی کتاب کناش[۹۶] کا عربی میں ترجمہ کیا۔ جس کے حوالے بعد میں حکیم رازی نے ''الحاوی'' میں دیے اور یہ اس کتاب کی بلند پائگی کی دلیل ہے۔ ولید بن عبدالمالک اور عمر بن عبدالعزیز کے زمانوں میں بھی بہت سی طبی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔

خلافتِ عباسیہ کا دور جہاں دوسرے علوم وفنون کی حیرت انگیز ترقی کا آئینہ دار ہے۔ وہاں طب اور اس کے متعلقات نے بھی اس زمانے میں بہت فروغ حاصل کیا۔ منصور کے عہد میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جندی شاپور کے مدرسۂ طبی کا افسر الاطبا جارج بن جبریل نسطوریوں کے خاندان کا ایک فرد تھا۔ منصور نے ایک دفعہ اس کو اپنے علاج کے لیے طلب کیا تو اس کی حذاقت اور قابلیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے دربار خلافت سے وابستہ کر لیا۔ ابو یحییٰ بطریق اور عیسیٰ ابن ماسرجویہ سے بھی متعدد کتابیں ترجمہ کرائی گئیں۔ ہارون، مامون اور متوکل بھی اس بارے میں بے حد سرگرم تھے۔ خصوصاً ہارون الرشید نے تو یحییٰ برمکی کے مشورے سے ایک بیت الحکمت قائم کیا جس میں یہودی، عیسائی، پارسی اور ہندو عالم یونانی، سریانی، سنسکرت، پہلوی اور ژند وغیرہ زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ہندوستان کی مشہور طبی کتابوں چرک اور ششرت کا ترجمہ بھی بیت الحکمت ہی میں کیا گیا تھا۔ جبریل بن بختیشوع ہارون و مامون کا طبیب خاص تھا۔ جس پر آئے دن عواطف شاہانہ کی بارش ہوا کرتی تھی۔ حنین بن اسحاق، یعقوب بن اسحاق کندی، ثابت بن قرہ حرانی اور بے شمار دوسرے

مؤلفین و مترجمین نے بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں۔ اور زبانِ عربی کو دوسرے علوم کے علاوہ طب کی کتابوں سے بھی مالا مال کر دیا۔

دورِ تحقیق و تنقید

اس کے بعد کیمیا، طبیعیات، نباتات، معدنیات اور علم الحیات پر جو طب کے متعلقہ علوم ہیں، بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ اب تحقیق و تنقید کا دور شروع ہوا۔ اور حکمائے اسلام نے اپنی اجتہادی قابلیت سے بڑے بڑے حکمائے قدیم کی تصانیف پر نقد و تبصرہ کر کے طب اسلامی کو ایک مہذب، منقح اور ترقی یافتہ طریق علاج کی حیثیت سے قائم کر دیا۔

کلیات و مسائل کے علاوہ معالجات، جراحیات، حفظ صحت، علم الادویہ، علم الاغذیہ، تشریح الاعضا، افعال الاعضا، علم الکیمیا، علم الصیدلہ (دوا سازی) اور دوسرے علوم پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں جن کا تذکرہ تاریخ اطبا کی متعدد کتابوں میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔

تین بڑے

اگرچہ خلافت عباسیہ اور خلافت اندلسیہ میں علم طب کی تدوین اور معالجات کی ترویج میں بے انتہا سرگرمی سے کام کیا گیا۔ اور اس سلسلے میں ہزاروں باکمال اطبا پیدا ہوئے اور سینکڑوں بیمارستان دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں قائم ہو گئے لیکن معالجات و جراحیات کے کمالات میں جن جلیل القدر شخصیتوں نے ساری دنیا کو صدیوں تک اپنا دست نگر اور شاگرد بنائے رکھا وہ تین ہیں۔ حکیم ابوبکر محمد ذکریا رازی، حکیم بوعلی سینا اور حکیم ابوالقاسم زہراوی۔ انہوں نے اسلامی طب کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ کم و بیش پانسو سال تک یورپ کے بڑے بڑے مدارسِ طبیہ میں انہی کی کتابوں کے ترجمے شامل درس رہے اور یہ کہنا ہرگز مبالغہ میں داخل نہیں کہ مغرب کی موجودہ طب اور سرجری زیادہ تر انہی باکمالوں کے آثار علمی سے ماخوذ ہے۔

حکیم رازی

حکیم ابو محمد زکریا رازی جسے یورپ (Rhazes) کے نام سے موسوم کرتا ہے، نویں صدی عیسوی کے وسط میں بمقام رَے پیدا ہوا۔ (یہ شہر آج کل کے تہران کے قریب واقع تھا) تیس سال کی عمر میں اس نے علم طب کا مطالعہ شروع کیا۔ اور اس میں اس قدر کمال پیدا کیا کہ

بغداد کے طبی کالج کا افسر الاطبا مقرر کر دیا گیا۔ عمر کے آخری دو سالوں میں بینائی سے محروم ہو گیا تھا۔ بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ [۹۷] اس کی کتابیں بے شمار ہیں۔ لیکن ان میں مشہور ترین الحاوی ہے جس کا لاطینی ترجمہ پچیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابن خلکان کے بیان کے مطابق اس کی تیس جلدیں ہیں۔ اس کتاب میں رازی نے طب کے متعلق کوئی مسئلہ اور کسی مرض کا کوئی معالجہ نہیں چھوڑا جس کے متعلق وسیع ترین معلومات اور مجتہدانہ اکتشافات پیش نہ کیے ہوں۔ اس کی دوسری کتابیں الجامع اور المنصوری بھی بہت مشہور ہیں۔ چودہ فصلوں کا ایک رسالہ فی الجدری والحصبہ بھی لکھا ہے جس میں سب سے پہلے چیچک اور خسرہ کے متعلق ایسی معلومات بہم پہنچائی ہیں جو اب تک صحیح تسلیم کی جاتی ہیں اور زمانہ حال کی طب ان پر کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکی۔ اطبا اسے علم طب کا معلم ثانی تسلیم کرتے ہیں۔

بُو علی سینا

دوسری جلیل القدر شخصیت شیخ الرئیس بوعلی سینا کی ہے۔ جو دنیا کے عظیم فلسفیوں کا سرتاج، مجتہد و محقق اور طب اسلامی کا بطل جلیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ بوعلی سینا مشرق و مغرب میں یکساں محترم سمجھا جاتا ہے۔ اور یورپ کے فلسفیوں اور طبیبوں نے ہمیشہ اس کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کی ہے۔ اہل علم کی رائے یہ ہے کہ شیخ بوعلی سینا معلم اول یعنی ارسطو کے بعد سب حکام میں بلند درجہ رکھتا ہے۔ یورپ اس کو Avicenna کہتا ہے اور رازی کی طرح اس کی تمام تصانیف بھی یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ شیخ نے کوئی ایک سو پانچ تالیفات چھوڑیں جن میں دو نہایت مشہور ہیں۔ ''الشفا'' اور ''القانون''۔ ''الشفا'' اٹھارہ جلدوں میں اور ''القانون'' چودہ جلدوں میں ہے۔ ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل اپنی کتاب اریبین میڈیسن میں لکھتے ہیں کہ بوعلی سینا لاطینی مغرب میں بادشاہِ طب کے لقب سے مشہور تھا۔ عربی حکما اور فلسفیوں میں سب سے زیادہ نامور تھا۔ دنیائے اسلام اور مغربی یورپ دونوں پر اس کا علمی رعب چھایا ہوا تھا۔ اس کی تمام تصانیف مسیحی طلبہ کے نصاب تعلیم کا اہم حصہ تھیں۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں شاہ ہمدان کا [illegible] مقرر ہوا لیکن درباری سازشوں سے مجبور ہو کر اصفہان چلا گیا۔ اکیس سال کی عمر میں [illegible] علوم و فنون پر ایک انسائیکلو پیڈیا لکھی (غالباً لسان العرب) لیکن [illegible] ہی مر گیا۔ اور ہمدان میں دفن کیا گیا۔ [۹۸] یہ حکمائے متقدمین [illegible]

ہے۔

شیخ فلسفہ مابعد الطبیعات میں بھی اپنے تمام اقران و اماثل میں ممتاز تھا۔ اور اس کے افکار آج تک فلسفیوں کے لیے رہنمائی کا کام دے رہے ہیں۔ علم طب کے تبحر میں اس کی مثال دور ونزدیک کہیں نہیں ملتی۔ اس کے علم وفضل کا آوازہ صدیوں تک یورپ میں گونجتا رہا۔ پروفیسر براؤن نے ''چہار مقالہ'' پر جو حواشی انگریزی میں لکھے ہیں ان میں وہ رقمطراز ہیں کہ بوعلی سینا کے علم و ذہانت کا عظیم الشان اثر صرف مشرق ہی پر نہ تھا بلکہ تمام یورپ پر بھی چھایا ہوا تھا۔ [۹۹] اس کی کتاب ''قانون'' جو عربی اور یونانی طب کا آخری مجموعہ ہے، یورپ کی یونیورسٹیوں میں پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک کل نصاب تعلیم کا نصف سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ اور مونٹ پلیئر اور لووین کی یونیورسٹیوں میں ۱۶۵۰ء تک داخل نصاب تھا۔ [۱۰۰]

زہراوی

ابوالقاسم زہراوی ہسپانیہ کے شہر قرطبہ کے قریب مدینۃ الزہرا میں پیدا ہوا۔ اور علم و تجربہ سے فراغت پانے کے بعد اندلس کے آٹھویں اموی تاجدار عبدالرحمٰن سوم کا طبیب خاص مقرر ہوا۔ اس زمانے میں قرطبہ مغربی خلافت کا مرکز تھا۔ اور علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بغداد پر بھی وجہ فضیلت رکھتا تھا۔ دس لاکھ کی آبادی کا عظیم الشان شہر تھا جس میں پچاس شفا خانے تھے۔ اس کی لائبریری میں دو لاکھ پچیس ہزار کتابیں موجود تھیں اور اسلامی دنیا کے بہترین ارباب فضل و کمال وہاں جمع تھے۔ اس لیے زہراوی کو حصول علم کے مواقع دوسرے اکابر کے مقابلے میں زیادہ حاصل تھے۔ زہراوی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخ طب میں جراحیات کا کامل الفن استاد تھا۔ بلاشبہ اس وقت بغداد، غرناطہ۔ اشبیلیہ میں بے شمار ایسے شفا خانے اور بیمارستان موجود تھے جن میں طب کے علاوہ جراحت (سرجری) کے عملیات بھی کامیابی سے انجام پا رہے تھے۔ لیکن زہراوی نے اس فن میں تخصص کا رتبہ حاصل کیا۔ اس کی بے نظیر کتاب ''التصریف'' کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کا ایک حصہ جراحیات سے تعلق رکھتا ہے جس میں زہراوی نے جسم انسانی کے ہر حصے کی جزوی تشریح کی ہے۔ آپریشن کے بہترین طریقے تجویز کیے ہیں اور آلات جراحت کی نہایت صاف اور خوبصورت تصاویر بھی شامل کی ہیں۔ یورپ کے ڈاکٹر آج اعمال جراحی میں جو آلات استعمال کر رہے ہیں وہ زیادہ تر

زہراوی ہی سے ماخوذ ہیں اور یورپی جراحی کی موجودہ ترقی یافتہ صورت صرف زہراوی کے کمالِ فن پر مبنی ہے۔

تمدن اسلامی کے دور میں جو جلیل القدر علمائے طب مشہور ہوئے۔ ان میں سے چند نمایاں اور ممتاز شخصیتوں کا تذکرہ بھی ایک پوری کتاب کا متقاضی ہے۔ یہاں ان تین حضرات کا ذکر محض یہ ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے طب و جراحت کو کس بلندی پر پہنچایا۔ اور پھر ان کے کمالات سے مشرق و مغرب نے کس قدر استفادہ کیا۔ مسلمانوں کا یہ امتیاز صرف علمی نہ تھا۔ بلکہ عملی اعتبار سے بھی انہوں نے معالجات کے صدہا مراکز قائم کر رکھے تھے۔ اور مشرقی اور مغربی خلافت کے تمام شہر بیمارستانوں سے بھرے ہوئے تھے جن میں لاکھوں بیماروں کا علاج ہوتا تھا۔ اور بڑے بڑے جلیل القدر طبیب اور کاملینِ جراحت ان بیمارستانوں میں ہاؤس فزیشن اور ہاؤس سرجن کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

بیمارستان

طب اسلامی کا اوّلین شفا خانہ غالباً ولید بن عبدالملک اموی نے دمشق میں قائم کیا جو جذامیوں کا دارالاقامہ تھا۔ اور جس میں ان کے قیام و طعام اور علاج کے لیے بہترین بندوبست کیا گیا۔ اسی طرح منصور عباسی نے اپاہجوں اور پاگلوں کے لیے دارالاقامے قائم کیے۔ ہارون رشید کے دور میں جو فی الحقیقت علمی عروج و ترقی کا بہترین دور تھا، بیمارستان جبریل بن بختیشوع، بیمارستان برامکہ اور متعدد دوسرے شفا خانے قلمرو کے مختلف حصوں میں قائم تھے۔ متوکل عباسی نے مصر میں بیمارستان مغافر، احمد بن طولون نے بیمارستان ابن طولون، کافور الاخشیدی نے بیمارستانِ کافوری اور المتوکل کی والدہ نے بیمارستان بدری قائم کیا۔

بیمارستان رَے، بیمارستان مکہ و مدینہ، بیمارستان نیشاپور، بیمارستان حربیہ، بیمارستان ابن الفرات، اور ان کے علاوہ مرو، اصفہان، شیراز، طوس، انطاکیہ، قاہرہ، اسکندریہ، میافارقین، قرطبہ، حلب، حماۃ، حران موصل، غرض بے شمار مقامات پر باقاعدہ شفا خانے قائم تھے۔ جن میں ہزارہا مریضوں کا علاج اعلیٰ درجے کے اطبا کے زیرِ نگرانی کیا جا رہا تھا۔[۱۰۱]

عالم اسلام میں طب کے عروج کا یہ عالم تھا۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے اور انہوں نے یہاں بھی اس فن شریف کو علمی و عملی حیثیت سے رواج دینا شروع کیا، ہندوستان کی

آیورویدک طب نے طب اسلامی کی پذیرائی کی اور بہت جلد ان دونوں طبوں کے درمیان جن کے اصول مشترک تھے۔ ایک ایسا امتزاج رونما ہوا کہ ہندوستانی طب اسلامی طب کی ترقی یافتہ صورت کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کرگئی۔

دورِ سلاطینِ ہند

سلطان محمد تغلق کے عہد میں صرف شہر دہلی کے اندر ستر شفا خانے موجود تھے۔ بادشاہ خود بھی طب میں مہارت رکھتا تھا اور بارہ سو طبیب ملازمت شاہی میں داخل تھے۔[۱۰۲] فیروز شاہ تغلق نے فرشتہ کے قول کے مطابق پانچ مزید شفا خانے کھولے۔ بلکہ تاریخ رشید الدین خاں (۴۹) میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ نے ایک سو شفا خانے قائم کرنے کا حکم دیا۔ غالباً یہ شفا خانے پایۂ تخت کے شفا خانوں کے علاوہ دوسرے شہروں میں کھولے گئے ہوں گے۔ اس بادشاہ نے ایک بہت بڑا شفا خانہ قائم کیا جس میں ہندو مسلم، غریب امیر ہر شخص کو دوائیں مفت دی جاتی تھیں۔ فیروز شاہ نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''فتوحات'' میں اس شفا خانے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں امیر غریب کا یکساں توجہ سے علاج کیا جاتا ہے۔ تشخیص و علاج اور تعیین دوا و غذا کے لیے ہر وقت ماہر اطبا جمع رہتے ہیں۔ دوا و غذا کے مصارف شاہی اوقاف سے پورے کیے جاتے ہیں۔[۱۰۳]

سلطان محمود شاہ نے ۸۴۹ھ میں مانڈو کے مقام پر ایک شفا خانہ قائم کیا، حکیم الحکما حکیم فضل اللہ اس کا مہتمم تھا۔

مغل اور طب

مغلوں کے دور میں طب و اطبا اور شفا خانوں کو بڑی تقویت پہنچی۔ مثلاً اکبر کے دربار میں حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم لطف اللہ گیلانی، حکیم عین الملک شیرازی، حکیم مسیح الملک شیرازی، حکیم شیخ حسن پانی پتی، حکیم علی گیلانی، حکیم نعمت اللہ، حکیم روح اللہ اور حکیم محمد اسحاق جیسے بلند پایہ اکابر فن جمع تھے اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے مشورے کے مطابق پوری قلمرو میں جابجا شفا خانے قائم کردیے گئے۔[۱۰۵] حکیم علی گیلانی کا پایۂ علمی بھی بلند تھا۔ اس نے ''قانون'' کی شرح لکھی۔ ایک فاضل طبیب حکیم مصری بھی تھے، شیخ فیضی اور خواجہ شمس الدین ان کے زیر علاج رہتے تھے۔[۱۰۶]

بے شمار شفا خانے

جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے جلوس کے ساتھ ہی یہ حکم صادر فرمایا کہ:

درشہر ہائے کلاں دارالشفاہا ساختہ بجہت معالجہ بیماراں تعین نمایند و آنچہ صرف و خرج می شدہ باشد از سرکار عالیہ شریفہ می دادہ باشند۔

شاہ جہاں نے بھی بہت سے شفا خانے قائم کیے۔ حکیم میر محمد ہاشم کو احمد آباد کے سرکاری شفا خانوں کی طبابت پر مقرر کیا۔ اور دہلی میں جامع مسجد کے شمال میں ایک شفا خانہ ۱۰۶۰ھ میں قائم کیا جس میں بلند پایہ اطبا مامور کیے۔[۱۰۷]

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں تمام ممالک محروسہ کے بڑے بڑے شہروں میں شفا خانے قائم ہو چکے تھے۔ شہر سورت میں بھی ایک شفا خانہ تھا جس کے لیے ایک افسر الاطبا کے تقرر کا ذکر رقعاتِ عالمگیری میں موجود ہے۔ اس عہد کے بعض امرا بھی طب کی سرپرستی میں شہرت رکھتے تھے۔ مثلاً اٹاوہ کے فوجدار نواب خیراندیش خاں نے جو خود بھی ایک فاضل طبیب تھے اپنے شہر اٹاوہ میں ایک شفا خانہ قائم کیا جس میں طبیب اور وید دونوں ملازم رکھے گئے۔

محمد شاہ کی عہد میں بھی دہلی میں بے شمار شفا خانے موجود تھے۔ ایک بہت بڑے شفا خانے کے مہتمم حکیم قوام الدین خاں تھے۔ اس شفا خانے کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ مقرر تھا۔[۱۰۸]

عہد مغلیہ میں نامور طبیبوں کے بعض خاندان موجود تھے جن میں اس فن شریف کی خدمت ابا عن جدٍ چلی آئی تھی۔ مثلاً مسیح الزمان خاں بہادر مرزا محمد ہاشم اورنگ زیب عالمگیر کے مشہور درباری طبیب تھے۔ آپ نے علم و حکمت پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کے صاحبزادے حکیم محمد جعفر کو محمد شاہ کے عہد میں حکیم عضد الدولہ کا خطاب دیا گیا۔ آپ منصبدار بھی تھے آپ کی حذاقت کو دیکھ کر مہاراجا جے پور آپ کو اپنی ریاست میں لے گئے۔ جہاں یہ خاندان اب تک آباد ہے۔ حکیم ذوالفقار علی خاں اسی خاندان مسیح الزمانی سے تھے۔[۱۰۹] اورنگ زیب کے مشہور وزیر نعمت خاں عالی کا باپ شیراز سے طبابت کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں حکیم محمد اکبر ارزانی نے علم طب کو اپنی مفید و جامع تالیفات سے بے حد فائدہ پہنچایا۔ ''طب اکبر'' انہی کی مشہور تالیف ہے۔ جو طب کے نصاب میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ حکیم مرزا امان اللہ

خاں نے لغات طب پر ایک کتاب ''قسطاس الاطبا'' لکھی۔ سرج الدین ابوظفر بہادر شاہ کے طبیب خاص حکیم محمد احسن اللہ خاں بھی بڑے نامور طبیب تھے۔[۱۱۰]

مغلوں کے عہد میں طب پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ اطبائے عرب کی کتابوں پر حواشی لکھے گئے۔ شرحیں مرتب کی گئیں۔ ایورویدک کے مسائل اور معلومات کو اخذ کر کے بھی مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوستان کی عقاقیر (جڑی بوٹیوں) کی تحقیق کی گئی۔ غرض اس ملک میں بھی نامور اطبا کی علمی و عملی سرگرمیاں کسی اعتبار سے دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلے میں کم نہ رہیں اور آخری دور میں جو جلیل القدر طبی خاندان اس ملک میں ہوئے ان کی مثال تو دور دور تک نہیں ملتی۔ ذیل میں انہی چشمہ ہائے فیض کے مختصر حالات درج کیے جاتے ہیں۔ (یہ حالات دستور الاطبا (حکیم محمد حسن قرشی) جلد اول سے ملخصاً اخذ کیے گئے۔)

خاندان شریفی

دہلی کا شریفی خاندان بعض وجوہ سے ہندوستان کا معزز ترین طبی خاندان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں حکیم شریف خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم محمود خاں، حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم اجمل خاں جیسے کامل الفن حضرات پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ کاشغر کے رہنے والے تھے، بابر کے ساتھ ہندوستان آئے۔ ملا علی قاری اسی خاندان سے تھے۔ ان کے پوتے فاضل خاں نے بہت ناموری حاصل کی۔

حکیم شریف خاں عہد محمد شاہی کے فاضل اور کامیاب طبیب تھے۔ آپ نے قانون، شرح اسباب اور نفیسی پر حواشی لکھے۔ جن میں وسعت نظر اور اصابت رائے کا ثبوت دیا۔ ان کے صاحبزادے حکیم صادق علی خاں بھی ذی علم طبیب تھے۔

حکیم صادق علی خاں کے فرزند حکیم محمود خاں نہایت فاضل طبیب اور کامیاب معالج تھے۔ علاج میں ان کا شہرہ ہندوستان سے نکل کر اسلامی ممالک میں پھیل گیا۔ اور مشرق وسطیٰ کے مریض بھی دہلی آنے لگے۔ پرانی وضع کے شاندار بزرگ تھے اور غربا پر خاص توجہ فرماتے تھے۔

حکیم محمود خاں کے جانشین ان کے بڑے صاحبزادے حکیم عبدالمجید خاں ہوئے۔ حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں طبی علوم میں کامل دسترس رکھنے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے نباض اور کامیاب معالج تھے۔ اور بے حد بلند خیال،

غریب پرور اور خود دار بزرگ تھے۔ آپ نے ۱۸۸۲ء میں مدرسہ طبیہ قائم کیا جو آج دہلی میں طبیہ کالج کی صورت میں موجود ہے۔

حکیم واصل خاں اپنے بڑے بھائی کے جانشین ہوئے۔ مدرسہ طبیہ میں درس دیتے رہے۔ اپنے چھوٹے بھائی حکیم اجمل خاں کے مشورے سے ایک انڈین میڈیسنز کمپنی قائم کی جو آج ہندوستانی دواخانے کے نام سے مشہور ہے۔

حکیم محمود خاں کے چھوٹے صاحبزادے حکیم اجمل خاں اپنی علمیت، ذہانت و فطانت اور حذاقت کے اعتبار سے مشہور زمانہ ہوئے۔ انہوں نے علوم دین، معقول و منقول کے علاوہ طب کی تعلیم اپنے والد ماجد محمود خاں اور برادر بزرگ عبدالمجید خاں سے پائی۔ حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ ان کے مطب میں صدہا مریض جمع رہتے تھے۔ اور وہ نہایت سکون سے ان کو دیکھتے اور علاج تجویز کرتے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے بلکہ بیرونی ممالک سے بھی مریض آ کر ان سے علاج کراتے۔ ہندوستانی دواخانہ، طبیہ کالج، مدرسہ طبیہ زنانہ کو معراج کمال تک انہی نے پہنچایا۔ اور لاکھوں روپے اپنے رسوخ سے فراہم کر کے ان اداروں پر صرف کیے۔ طبی ریسرچ کا ایک شعبہ بھی قائم کیا۔

حکیم اجمل خاں انڈین نیشنل کانگریس کے محترم مسلمان لیڈروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔ دنیا بھر میں اظہار افسوس کیا گیا اور ہندوستان میں جلسے اور ہڑتالیں ہوئیں۔

خاندان عزیزی

اودھ میں حکیم محمد یعقوب نہایت باکمال بزرگ تھے۔ قدسیہ محل اور دوسرے شاہی محلات میں آپ ہی کے مشورے پر معالجات ہوتے تھے۔ درس و تدریس کا فیض بھی جاری تھا۔ آپ کے چار صاحبزادے ہوئے۔ حکیم محمد اسمعیل، حکیم محمد ابراہیم، حکیم محمد مسیح، حکیم محمد تقی۔ یہ چاروں بڑے نامور طبیب گزرے ہیں۔

حکیم محمد اسمعیل کے تین فرزند حکیم عبدالعزیز، حکیم عبدالوحید، حکیم عبدالحفیظ ہوئے۔ حکیم عبدالعزیز نے دنیائے طب میں خاص ناموری حاصل کی۔ مایوس مریضوں اور پیچیدہ بیماریوں کے علاج میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں آپ نے لکھنؤ میں تکمیل الطب کالج کی بنیاد رکھی جس

میں طب کے علاوہ جراحت (سرجری) کی تعلیم کو بھی شامل نصاب کیا۔ اس کالج کے بے شمار فارغ التحصیل اطبا ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آپ کے چار صاحبزادے ہوئے۔ حکیم عبدالرشید، حکیم عبدالحمید، حکیم عبدالحکیم، حکیم عبدالحلیم۔

حکیم عبدالرشید سب میں بڑے تھے۔ آپ کی حذاقت اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے حکومت نے آپ کو شفاء الملک کا خطاب دیا۔ آپ نے سرجری کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ ہر قسم کے آپریشن کامیابی سے کر لیتے تھے۔ ان کے بھائی عبدالحمید کو بھی شفاء الملک کا خطاب ملا۔ طب تو آپ نے اپنے والد اور بھائی سے پڑھی۔ اور برادر بزرگ کی طرح سرجری کی تربیت کرنل اینڈرسن سول سرجن سے حاصل کی۔ چنانچہ ایک ماہر سرجن بھی ہو گئے۔ باقی دونوں بھائیوں نے بھی طب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

حکیم عبدالعزیز کے حقیقی بھائی حکیم مولوی عبدالوحید بھی بڑے نامور طبیب تھے۔ ان کے دو صاحبزادے حکیم عبداللطیف اور حکیم عبدالمجید تھے دونوں مشہور فاضل اور معالج ہوئے۔

حکیم محمد یعقوب کے دوسرے صاحبزادے حکیم محمد ابراہیم رامپور کے نواب کلب علی خاں کے شاہی طبیب رہے۔ اور تیسرے صاحبزادے حکم محمد مسیح کلکتہ میں واجد علی شاہ کے محل کے خاص طبیب شاہی مقرر ہوئے۔

رضی الدین احمد

حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے شاہی طبیب تھے۔ وہ علمی وفنی قابلیت بے نظیر رکھتے تھے۔ اس خاندان میں حکیم محمد عباد اللہ عین الدولہ، حکیم محمد رحمت کاں شمس الاطبا، حکیم محمد عزیز اللہ خاں اور حکیم مولوی ظہیر الدین بہت مشہور ہوئے ہیں۔ لیکن اس خاندان کے جس قابل فخر بزرگ نے اس زمانے میں شہرت و ناموری حاصل کی وہ شفاء الملک حکیم رضی الدین احمد خاں ہیں۔ درس و تدریس کا حلقہ وسیع تھا۔ حجاز و افریقہ تک کے لوگ آ کر استفادہ کرتے تھے۔ بعد میں خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ آپ کے صاحبزادے حکم ناصر الدین احمد ہوئے۔ فراغت تعلیم کے بعد والد سے طب پڑھی اور ان کی وفات کے بعد مسند مطب کو زینت بخشی۔ علاج میں کامیابی [illegible] ائے خیر میں سبقت کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئے۔

حکیم نور الدین

حکیم نور الدین بھیرہ ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدا تحصیل علوم دینی سے کی۔ طبیعت میں مطالعہ طب کا شوق تھا۔ لیکن معاش کی مجبوریوں کی وجہ سے اس کو جاری نہ رکھ سکے۔ آخر دو ہمراہوں کے ساتھ رامپور چلے گئے اور علوم معقول و منقول کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد حکیم علی حسین لکھنوی کی خدمت میں پہنچے۔ اور طبی کتابوں کا درس لینا شروع کیا۔ اس کے بعد استاد کے ساتھ رامپور چلے گئے اور علوم کی تکمیل کے بعد بھیرہ واپس آ کر مطب کرنے لگے۔ پھر مہاراجا جموں کشمیر کے مشیر طبی مقرر ہوکر جموں چلے گئے۔ اور وہاں دس سال نہایت عز و وقار سے زندگی بسر کی۔ آپ کی حذاقت و ذہانت کا شہرہ نزدیک و دور پھیل گیا۔ اور آپ ہندوستان کے چند منتخب اطبا میں شمار ہونے لگے۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی سے عقیدت ہو جانے کی وجہ سے آپ بھیرہ چھوڑ کر قادیان چلے گئے اور بقیہ عمر درس و تدریس، علاج معالجہ اور پرورش غربا میں بسر کردی۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد آپ ان کے خلیفہ اول قرار پائے۔

حکیم مفتی سلیم اللہ

حکیم مفتی سلیم اللہ خاں لاہوری نے علوم مروجہ کی تعلیم خلیفہ حمید الدین (جد امجد خلیفہ شجاع الدین) سے حاصل کی۔ حکیم محمد بخش سے کہ لاہور کے ممتاز اطبا میں سے تھے طب پڑھی۔ اور عملی تجربہ بھی حاصل کیا۔ حکیم محمد بخش کی اولاد میں کوئی ان کی جانشینی کا اہل نہ تھا۔ لہٰذا مفتی سلیم اللہ ان کی [illegible] مطب کرنے لگے۔ اور تلامذہ مرحوم اور دوسرے بزرگوں نے بالاتفاق مفتی صاحب کو جانشین استاد تسلیم کرلیا۔ مفتی صاحب نے استاد کے پسماندگان کی متواتر خدمت کی۔ اور جب ان کے پوتے بالغ ہوئے تو ان کے داد کا مطب ان کے حوالے کر کے خود علیحدہ مطب کرنے لگے۔

مفتی سلیم اللہ کا فیض تدریس برابر جاری رہا۔ اور دور دور کے لوگوں نے آ کر استفادہ کیا۔ تشخیص اور نباضی میں مثال نہ رکھتے تھے۔ پچاس سال تک یہ علمی و عملی چشمۂ فیض جاری رہا۔ ۱۹۲۵ء میں مفتی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کے دو صاحبزادے فہیم اللہ، مقیم اللہ تھے۔ دونوں فوت ہو چکے ہیں۔

متاخرین میں سے چند اطبا اور ان کے خاندانوں کے ذکر سے یہ عرض کرنا مقصود ہے

کہ جس طریق علاج کو مسلمان بیرون ہند سے لائے۔ اور پھر جس پر یہاں ان کے سلاطین و امرا نے ایک ہزار سال سے زائد مدت میں بہترین توجہات مبذول رکھیں، اس نے عوام و خواص میں بے حد ہر دلعزیزی حاصل کی اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ ہزارہا حکیم برصغیر کے گوشے گوشے میں اب تک نہایت کامیابی سے خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اور ایوروید کے اس ملک کی پیداوار ہونے کے باوجود طب اسلامی کے مقابلے سے عاجز آ کر پسپا ہو چکی ہے۔ بلکہ اب تو یہ کیفیت ہے کہ مغربی طب نے ایشیا کے اکثر ملکوں میں مقامی طبوں کو زیر کر کے اپنا تسلط جما لیا ہے۔ صرف ایک برصغیر ہندو پاک ہی جس میں طب اسلامی کی فرمانروائی کا جھنڈا اب تک بلند ہے اور جس کی اسی فیصد آبادی اپنے علاج کے لیے اب تک حکیموں کی دست نگر چلی آتی ہے۔

چھٹی فصل: شعرائے فارسی

سات سو برس تک ہندوستان پر فارسی زبان و ادب کا راج رہا کیونکہ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے لے کر اواخر عہد مغلیہ تک اس ملک کی درباری، علمی اور ادبی زبان فارسی تھی۔ اس زبان میں مختلف علوم و فنون کی ہزارہا کتابیں لکھی گئیں اور صدہا کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ تاریخ و سیر کی بے شمار نادر کتابوں کا تذکرہ مورخین کی فصل میں ہو چکا ہے۔ اور دوسرے علوم کی تالیفات کی طرف بھی جابجا اشارے کیے جا چکے ہیں۔ لیکن اس ملک کی ادبی روایات اور اس کی زبانوں پر جس چیز نے سب سے زیادہ گہرا اور پائدار اثر ڈالا ہے وہ فارسی کی شاعری ہے جس کے اسالیب، محاورات، تشبیہات اور استعارات، قدروں اور معیاروں نے اہل ملک کو اس قدر مسحور کر لیا کہ وہ اس زبان کی دل کشی میں محو ہو کر اپنی مقامی ادبی خصوصیات کو بھی بھول گئے۔ یہاں تک کہ کوئل اور بھونرے کی جگہ بلبل نے، موتیا و چنبیلی کی جگہ نرگس اور سوسن نے، اور مقامی عشاق کی جگہ قیس و فرہاد نے لے لی۔ نقادوں کے نزدیک یہ امر صحت مندانہ ہو نہ ہو بہرحال یہ حقیقت ہے کہ فارسی شاعری نے ہماری ادبیات کو یکسر منقلب کر دیا۔ اور ایک بالکل نئی اور تر و تازہ ادبی ثقافت وجود میں آ گئی۔ جس سے ہندوستان کی تمام زبانیں متاثر ہوئیں اور اردو کی تو پوچھیے ہی نہیں اس کا تو تمامتر سرمایہ ہی فارسی سے ماخوذ ہے اور اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کسی آیندہ باب میں آئے گا۔

۱۰۲۱ء میں سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کا الحاق دولت غزنویہ سے کیا۔ اور چند سال ہی کے اندر لاہور میں فارسی بولنے والے امرا، حکام، علما، شعرا، اولیا اس کثرت سے آباد ہو گئے کہ ادب و ثقافت کے اعتبار سے یہ شہر ''غزنین خورد'' کہلانے لگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ لاہور ہر زمانے میں ہر سلطنت کے پایۂ تخت کا مدمقابل بنا رہا ہے۔ غزنی کے دورِ عروج میں بھی لاہور اس کا حریف رہا۔ دہلی کی مرکزیت کے باوجود لاہور کی اہمیت ہر اعتبار سے مسلّم رہی۔ یہاں تک کہ اب کراچی پاکستان کا صدر مقام تو ہے، لیکن ادبی اور ثقافتی اعتبار سے لاہور کے بغیر پاکستان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ابوالفرج رُونی

بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ اس زمانے کا سب سے پہلا شاعر ابوالفرج رونی تھا جو ضلع لاہور کے ایک گاؤں رُون میں پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ یہ بیان غیر مصدقہ ہے اور اس گاؤں کا بھی کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ شاعر کئی سال تک لاہور میں مقیم رہا۔ اس نے لاہور کے متعدد گورنروں کی شان میں قصائد بھی لکھے اور بعض قصائد لاہور میں وُرودِ شاہی کی تقریبات میں مرتب کیے۔

مسعود سعد سلمان

اُس زمانے کا دوسرا بڑا شاعر مسعود سعد سلمان ہے جو لاہور میں پیدا ہوا۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اس کا زمانہ عمر ۱۰۴۶ء تا ۱۱۲۱ء بتایا جاتا ہے۔ فارسی شاعری میں مسعود سعد سلمان کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ نقادانِ ایرانی اس کو فارسی زبان کے دس اکابر شعرا میں شمار کرتے ہیں۔ مشہور ایرانی نقاد آقائے سعید نفیسی لکھتے ہیں:

''جہاں تک مسعود سعد سلمان کا تعلق ہے، اس کو اتنا بلند مرتبہ دینے کے وجوہ یہ ہیں کہ یہ ایک اچھا شاعر اور حسین نظم کا خالق ہونے کے علاوہ فارسی کا پہلا شاعر ہے جس نے شعر کو مدح کے غلبے سے پاک کیا۔ اور اس میں ذاتی تاثرات داخل کیے۔ اس نے انسانی زندگی کے حقائق کو اور خود اپنی خوشی اور غم کو بہت حسن کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس لحاظ سے وہ صرف فارسی زبان ہی کا بڑا شاعر نہیں بلکہ تمام عالم اور انسانیت کا شاعر ہے۔ کیونکہ جن جذبات کا اظہار اس نے کیا ہے وہ تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔''

ایک دفعہ مسعود شاہی عتاب کی وجہ سے نیشاپور میں قید بھی ہوگیا۔ بندی خانے میں اس نے "حبسیات" مرتب کیں۔ اور اپنے محبوب وطن لاہور کی یاد میں دردناک نظمیں لکھیں۔

دانی تو کہ دربندِ گرانم یارب
دانی رکہ ضعیف و ناتوانم یارب
شدورِ غم "لوہور" روانم یارب
یارب کہ در آرزوئے آنم یارب

ایک اور جگہ لکھتا ہے

رسید عید و من ازروئے حورِ دلبر دور
چگونہ باشم بے روئے آں بہشتی حور
مرا کہ گوید کاے دوست عید فرخ باد
نگارِ من بہ "لہا دور" و من بہ نیشاپور
رہِ دراز و غریبی و فرقت جاناں!
اگر بنالم وارید مرمرا معذور

امیر خسرو

اس زمانے کے اہل علم کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قریب قریب سبھی شاعر ہوتے تھے۔ کیونکہ شعر کہنے کا ملکہ ذاتی کلچر کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان تمام اہل علم میں سے جس کو مبدء فیاض سے شاعری کا ملکہ مخصوصاً عطا ہوتا تھا، وہ اس فن لطیف کی بلندیوں تک پہنچ جاتا تھا۔ حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری بہت بڑے ولی اور نامور صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ شاعری میں ان کا کوئی درجہ نہیں۔ لیکن ان کی کتابوں میں ان کے اشعار جابجا نظر آتے ہیں اور یہی حال اس عہد کے دوسرے بزرگوں کا ہے۔ تذکروں میں گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے بیسیوں شاعروں کا ذکر ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کو اتنی بلند حیثیت حاصل نہیں کہ اس کو نامور اور عہد آفریں شاعر قرار دیا جائے لیکن تیرہویں صدی کے وسط میں جب دہلی مسلمانوں کا پایۂ تخت قرار پا چکی تھی اور ترک سلاطین (خاندان غلاماں) مرکزی اور صوبائی صدر مقاموں کو ادب و ثقافت کا مرکز بنا چکے تھے۔ امیر خسرو جیسا عظیم نابغہ پیدا ہوا جو اوائل عمر اودھ میں بسر کرنے کے بعد شہنشاہ

غیاث الدین بلبن کے بیٹے بغرا خاں کی مصاحبت سے سرفراز ہوا۔ کچھ مدت بنگال میں بسر کی۔ اس کے بعد ملتان کے حاکم شہزادہ محمد کے دربار میں پانچ سال گزارے۔ شہزادہ محمد ایک جنگ میں مارا گیا تو خسرو دہلی پہنچ گئے اور اپنی وفات (۱۳۲۵ء) تک وہیں رہے۔

خسرو کے کمالات پر اب تک بے شمار اکابر سخن اور نقادان ادب اظہار خیال کر چکے ہیں۔ ایران کے نامور شاعر ملا جامی نے اپنی بہارستان میں خسرو کی غزلوں، مثنویوں اور قصیدوں کو خاقانی اور نظامی کا ہم پلہ بتایا ہے۔ اور اس کی خوش مذاقی اور سلیقے کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ خسرو کی غزل نہایت پاکیزہ، سہل ممتنع کا نمونہ ہوتی ہے۔ مثلاً

خبرم رسید امشب کہ تو یار خواہی آمد
سرِ من فدائے را ہے کہ سوار خواہی آمد

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بامیدآں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

بلبم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

کشتہ کہ عشق دارد نگزاردت بدینساں
بہ جنازہ گرنیائی بہ مزار خواہی آمد

بیک آمدن ربودی دل و دین و جان خسرو
چہ شود اگر بدینساں دوسہ بار خواہی آمد

ایک اور غزل ملاحظہ ہو جو خسرو کی سلاست، حقیقت نگاری اور شیرینی زبان کی مظہر ہے

اے صبا باز بہ من گوئے کہ جاناں چون است
آں گلِ تازہ و آں غنچۂ خنداں چون است

با کہ مے میخورد آں ظالم و دہ مے خوردن
آں رخ پر خوئے وآں زلف پریشاں چون است

روزہا شد کہ دلم رفت و درآں زلف بماند
یارب آں یوسف گم گشتہ بہ زنداں چون است

گلِ رعنائی و ناز است بہ مجلس بارے
حالِ آں بلبل بے چارہ بہ بستان چون است
ہم بہ جان و سرجاناں کہ کم و بیش مگوے
گوہمیں یک سخنِ راست کہ جاناں چون است
خشک سالی است دریں عہد وفا را اے اشک
زاں حوالی کہ تو می آئی باراں چون است
پست شد خسرو مسکیں بہ لکد کوب فراق
موردر خاک فرو رفت سلیماں چون است

غزل کے علاوہ خسرو نے قصیدہ، مثنوی بلکہ اردو میں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دو سخنے اور خدا جانے کیا کچھ لکھا ہے۔ چار اعلیٰ درجے کے دیوان تحفۃ الصغر، غرۃ الکمال، وسط الحیات اور بقیہ نقیہ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مثنویاں بھی ہیں۔ شاعری کے علاوہ خسرو کے کمالات موسیقی میں بھی مسلّم الثبوت ہیں جن کا ذکر اپنے مقام پر آچکا ہے۔

خسرو نے چھ سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ اور ہر عہد میں معزز اور سربلند رہے۔ ایرانیوں کے نزدیک جو ہندوستانی شعرا آقایانِ ایرانی کے کمالِ سخن سے لگا کھاتے ہیں ان میں خسرو کا نام سرفہرست ہے۔

حسن دہلوی

خسرو کے ایک دوست اور ہم عصر حسن دہلوی بھی تھے جن کی کلیات حال ہی میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ یہ بھی سہل ممتنع اور بے تکلف غزل میں مثال نہیں رکھتے۔

آں کس کہ رخت نظارہ کردہ
پیراہنِ صبر پارہ کردہ
صد رند و ہزار پارسا را
چشم تو شرا بخوارہ کردہ
وصلش نہ نصیب شد حسن را
بیچارہ ہزار چارہ کردہ

عوفی، برنی اور بدایونی نے اس دور کے متعدد شعرا کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض ولایتی اور اکثر ہندوستانی ہیں۔ لیکن خسرو کے کمال کا غلغلہ اس پورے دور میں اس قدر بلند رہا کہ کوئی دوسرا شاعر اس کے قریب بھی نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام شعرا کو شعر فارسی میں صرف اتنی حیثیت حاصل رہی کہ ان کے نام تذکروں میں باقی رہ گئے۔ دیگر ہیچ۔

عہدِ مغلیہ میں جہاں دوسرے علوم کو بے انتہا عروج حاصل ہوا وہاں شاعری بھی کمال کو پہنچ گئی۔ چنگیز و ہلاکو کی تباہ کاریوں نے آج کل کے بعض مورخین مغرب کو پوری مغل قوم کے خلاف متاثر کر رکھا ہے اور وہ مغل کا ذکر کرتے ہوئے خراب کاری اور خونخواری کے تصور سے علیحدہ ہو کر نہیں سوچ سکتے۔ حالانکہ اسلام نے بڑی بڑی تیز و تند، وحشی اور خونخوار قوموں کو اپنی تعلیمات سے توازن و اعتدال کی وہ دولت بخشی ہے کہ بڑے بڑے ماہرین نسلیات اس قلب ماہیت کو دیکھ کر حیران ہیں۔ مغلوں ہی کو دیکھ لو اسلام نے ان کی تندی و توانائی کو علم و فن کے راستوں پر لگا کر ان سے ثقافت کی کتنی بڑے خدمت لی۔ بغداد و نیشاپور کے بعد مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں کا مرکز سمرقند و بخارا کی طرف منتقل ہوگیا۔ اور دنیا جانتی ہے کہ وسط ایشیا کے ان مرکزوں نے علوم و فنون کے نشو و ارتقا میں کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔ یہی علاقہ تھا جہاں سے مغل ہندوستان میں آئے تھے۔

بابر

بابر خود نہایت عالی پایہ انشا پرداز اور شاعر تھا۔ اگرچہ اس کی زندگی قسمت کے نشیب و فراز کی ٹھوکریں کھانے میں بسر ہوئی۔ اور اس کو فراغت و اطمینان کے بہت ہی کم لمحات نصیب ہوئے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی توزک بھی لکھی۔ ایک دیوانِ غزلیات مرتب کیا۔ ایک مثنوی بھی لکھی۔ ترکی زبان کی شاعری میں اس کا مرتبہ صرف علی شیر نوائی سے دوسرے درجے پر اور باقی تمام شعرائے ترکی سے بلند تر ہے۔

ہمایوں

ہمایوں کی زندگی بھی زیادہ تر پریشانیوں میں گزری۔ لیکن بابر نے اس کی اور گلبدن بیگم کی تعلیم و تربیت پر جو توجہ صرف کی تھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ دونوں بہن بھائی شاعر اور انشا پرداز ہوگئے۔ فرشتہ اور ابوالفضل نے ہمایوں کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ بلکہ ابوالفضل تو اس کو

صاحب دیوان بھی بتاتا ہے حالانکہ دیوان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن ذیل کی دو رباعیوں سے ہمایوں کے پاکیزہ ذوق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

افسوس کہ سرمایہ زکف بیروں شد
وزدستِ اجل بسے جگر ہا خوں شد
کس نامد ازاں جہاں کہ پرسیم ازو
کا حوالِ مسافرانِ عالم چوں شد

یارب بکمالِ لطف خاصم گرداں
واقف بہ حقایق خواصم گرداں
از عقلِ جفاکار دل افگار شدم
دیوانۂ خود خوان و خلاصم گرداں

ہمایوں کا مشیر باتدبیر بیرم خاں بھی شاعر اور صاحب دیوان تھا۔ اور جب ہمایوں ایران سے واپس آ کر ازسرنو ہندوستان کا شہنشاہ بنا تو اس کے ساتھ صرف ایرانی سپاہی ہی نہ تھے بلکہ ایران کے بہت سے علما و شعرا بھی تھے اور ان لوگوں کا ورود عہد مغلیہ کے اواخر تک جاری رہا۔ یعنی ابتداءً تو اہل ہند نے فارسی افغانستان اور ترکستان کی معرفت سیکھی تھی لیکن ہمایوں کے زمانے سے ہندوستان و ایران کے لسانی روابط براہِ راست قائم ہوگئے۔ اور اہل ہند نے اساتذہ ایران سے کسبِ فیض شروع کر دیا۔

اکبر

اکبر اگرچہ کم پڑھا لکھا تھا (اور ابوالفضل تو اس کو "امی" لکھتا ہے) لیکن جس شخص کی زبان فارسی ہو۔ اور جس نے عمر بھر علما و شعرا کی صحبت میں اپنے اوقات بسر کیے ہوں۔ اور جس نے فارسی زبان کے معیاری مصنفوں اور شاعروں کی کتابیں از اول تا آخر بار بار پڑھوا کر سنی ہوں اور اپنے اس شغل میں کبھی ناغہ نہ کیا ہو، اس کو ان پڑھ کہنا محض تکلف ہے۔ اکبر فارسی کے ادب و شعر سے پوری طرح آشنا تھا۔ بلکہ بعض اوقات تقاضائے طبیعت سے شعر بھی کہہ لیا کرتا تھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

می ناز کہ دل خوں شدہ از دوریٔ او
من یار غم زدست مہجوریٔ او
در آئینہ چرخ نہ قوس قزح است
عکس است نمایاں شدہ از ''چوریٔ'' او

دو شینہ بکوئے مے فروشاں
پیمانۂ مے بہ زر خریدم
اکنوں زخمار سر گرانم
زر دادم و دردِ سر خریدم

شیخ فیضی

عہد اکبری میں ایران سے بھی متعدد جلیل القدر شعرا وارد ہندوستان ہوئے۔ اور خود ہندوستانیوں نے بھی بڑے بڑے شاعر پیدا کیے جن میں شیخ فیضی کا نام سب سے بلند تر ہے۔ اس فاضل جلیل کی قابلیت ادوار تاریخ میں دور دور مثال نہیں رکھتی۔ اس کے قصاید، اس کی غزلیات اور اس کی مثنویاں کمالِ فن، عمق فکر اور بداعت اسلوب کے اعتبار سے ہند و ایران کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین وصول کرچکی ہیں۔ دور مغلیہ میں غزالی مشہدی کے بعد ملک الشعرائی کا تاج اسی شاعر کے سر پر رکھا گیا۔ تہران یونیورسٹی نے فارسی ادب کی جو تاریخ شائع کی ہے، اس میں بتایا ہے کہ ترکانِ آلِ عثمان کے عہد حکومت میں فیضی کی شاعری ترکی میں بے حد مقبول تھی۔ اور اس کی وجہ سے ترکوں میں فارسی شاعری کا ذوق بہت ترقی کر گیا تھا۔ شیخ فیضی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ قرآن مجید کی بے نقاط تفسیر ''سواطع الالہام'' ہے جسے پڑھ کر عرب کے فضلا و فصحا نے بے ساختہ کہا تھا کہ ''تعجب ہے کہ اس شخص نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیوں نہیں کیا۔''

عرفی و نظیری کی آمد

ایران کے نو وارد شعرا میں نظیری نیشاپوری، عرفی شیرازی اور ملا ظہوری کے نام بہت نمایاں ہیں۔ اس زمانے میں خود ایران کا کوئی دوسرا شاعر بھی ان باکمالوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ فیضی کی حیثیت تو بالکل منفرد ہے۔ اور کسی نے اس کی تقلید کی جرأت نہیں کی۔ لیکن ہندوستان میں

فارسی کی غزل کو عرفی ونظیری کے پیروؤں نے بڑی تقویت پہنچائی اور ہمارے بہت سے شعرا نے معاملہ بندی میں کمال کا اظہار کیا۔ فیضی، عرفی، نظیری، ظہوری اس قدر مشہور شاعر ہیں اور ان کا کلام اب تک ہمارے ملک کے ارباب ذوق میں اتنا مقبول ہے کہ نمونے کے طور پر ان کے اشعار نقل کرنا محض تکلف معلوم ہوتا ہے۔

دیگر اکبری شعرا

ان کے علاوہ ملا عبدالقادر بدایونی، ابوالفضل اور دوسرے مؤرخین نے بے شمار شعرا کا ذکر کیا ہے جو دور اکبری میں ممتاز تھے۔ ان میں فہمی، قزوینی، غزالی مشہدی، ملا شیری، الفتی یزدی، شکیبی نمایاں ہیں۔ خود ابوالفضل علامی اور ملا عبدالقادر بدایونی بھی شاعری میں پایہ بلند رکھتے ہیں۔ ملا صاحب نے اپنی تمامتر ملائیت اور یبوست کے باوجود اپنے بھائی کے مرثیے میں جو ترکیب بند لکھا ہے اس کے حسن بیان اور درد و گداز میں کوئی کلام نہیں۔

دربار اکبری کے امرا خود بھی اکثر شاعر تھے اور شعرا کے سرپرست اور قدردان بھی خان زمان اور بہادر خاں دونوں شعر کہتے تھے۔ غزالی مشہدی اپنی بداعمالی کی وجہ سے وطن کو بھاگ گیا، وہاں سے واپس دکن آیا۔ وہاں تنگدستی کا شکار تھا۔ خان زماں نے ایک ہزار روپیہ خرچ بھیج کر بلا بھیجا۔ اس کے ساتھ ایک رباعی بھی لکھی

اے غزالی بحق شاہ نجف
کہ سوئے بندگان بیچوں آے
چونکہ بے قدر بودۂ آں جا
سر خود را بگیر و بیروں آے

("سر خود" یعنی "غزالی" کا پہلا حرف غ اور غ کے عدد ایک ہزار، یہ رقم خرچ کی طرف لطیف اشارہ ہے)

الفتی یزدی بھی خان زمان ہی کے پاس خوشحالی کے ساتھ رہتا تھا۔ اور شاعری کے علاوہ ریاضی میں بھی کمال رکھتا تھا اس کے چند اشعار بطور نمونہ کلام ملاحظہ ہوں۔

صبا بحضرت جاناں بآں زماں کہ تو دانی
نیاز مندی من عرض کن چناں کہ تو دانی

جانا! نبود مثلِ تو جانانۂ دیگر
مانندِ منِ دل ۔ شدہ دیوانۂ دیگر
اے مغبچہ از دست تو پیمانہ نہ نوشم
ماستِ الستیم ز پیمانۂ دیگر

ایک شاعر سلطان سُبکلی تھا (قندھار کے ایک گاؤں سُبکل کا رہنے والا) لوگ اسے ''چھپکلی'' کہتے تھے اور وہ بہت بھنا تا تھا۔ چونکہ خان زمان کا تخلص بھی سلطان تھا۔ اس لیے اس نے سلطان سبکلی کو ایک گراں بہا خلعت اور ایک ہزار روپیہ بھیجا۔ اور لکھا کہ یہ تخلص ہماری خاطر سے چھوڑ دو۔ اس نے ہدیہ واپس کر دیا۔ اور لکھا کہ میرے باپ نے میرا نام سلطان محمد رکھا تھا اور میں آپ سے مدتوں پہلے اس تخلص سے شعر کہتا ہوں۔ میں اس تخلص کو نہیں چھوڑ سکتا۔ خان زمان نے بلا کر سمجھایا۔ اور دھمکایا کہ اگر تخلص نہ چھوڑ دو گے تو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دوں گا بلکہ ایک ہاتھی منگا بھی لیا۔ سبکلی صاحب پھر بھی ڈٹے رہے۔ اتنے میں خان زمان کے استاد مولانا علاء الدین لاری نے کہا کہ مولانا جامی کی ایک غزل دو۔ اگر فی البدیہہ جواب کہہ دے تو معاف کر دو نہ کہہ سکے تو تم کو اختیار ہے۔ خان زمان نے جامی کا یہ مطلع پیش کیا۔

دل خطت را رقم صنع الٰہی دانست
برسرِ سادہ رُخاں حجت شاہی دانست

سلطان نے اسی وقت غزل لکھ دی جس کا مطلع تھا

ہر کہ دل را صدف سرِّ الٰہی دانست
قیمتِ گوہرِ خود را بہ کماہی دانست

خان زمان سن کر بہت خوش ہوا۔ اور بہت سا انعام دے کر سلطان کو رخصت کیا۔ اس کے بعد سلطان وہاں سے بھاگ گیا اور دوبارہ خان زمان کو شکل نہ دکھائی۔

بہادر خاں کا اصلی نام محمد سعید خاں تھا۔ بیرم خاں کا پروردہ تھا۔ بہت سی مہموں میں داد شجاعت دی۔ شمشیر زنی کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہتا تھا۔

آں شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ
گویا بمنِ خستہ رہِ جنگ گرفتہ

بہ نشستہ مہ من بہ سر مسندِ خوبی
شاہے ست کہ جابر سرِ اورنگ گرفتہ

خان اعظم کوکلتاش بھی خوب شعر کہتا تھا، یہ رباعی ملاحظہ ہو

عشق آمد و از جنوں بروں مندم کرد
وارستہ ز صحبتِ خرد مندم کرد
آزاد زبندِ دین و دانش گشتم
تا سلسلۂ زلفِ کسے بندم کرد

عبدالرحیم خان خاناں کی قدر دانی کمال اور سرپرستی شعر وسخن کے واقعات سے کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ اس نے کئی شاعروں کو اشرفیوں میں تلوا دیا۔ کئی کا منہ موتیوں سے بھروا دیا۔ ایک دن ملا نظیری نیشاپوری نے کہا ''نواب! میں نے لاکھ روپے کا ڈھیر کبھی نہیں دیکھا کہ کتنا ہوتا ہے۔'' انھوں نے خزانچی کو حکم دے کر انبار لگوا دیا۔ نظیری نے کہا اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی بدولت آج لاکھ روپے دیکھے۔ خان خاناں نے کہا کہ اللہ جیسے کریم کا اتنی سی بات پر کیا شکر کرنا۔'' یہ کہہ کر ایک لاکھ روپے کا ڈھیر نظیری کے حوالے کر دیا۔ اور کہا ''خیر اب شکر الٰہی کرو تو ایک بات بھی ہے۔''

یہ امیر ابن امیر کشورِ سخنوری کا بھی امیر تھا۔ ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں پاکیزہ شعر کہتا تھا۔ ہندی زبان کی تاریخ میں رحیم کا خاص مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ فارسی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

شمار شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزو مند است
ادائے حق محبت عنایت است ز دوست
وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورسند است
نہ زلف دانم و نے دام و ایں قدر دانم
زپائے تا بہ سرم ہرچہ ہست دربند است

سرمایۂ عمر جاودانی غمِ تو
بہتر زہزار شادمانی غمِ تو
گفتی کہ چنیں والہ و شیدات کہ کرد
دانی غمِ تو دگرنہ دانی غمِ تو

ملا شیری

دریائے بیاس کے کنارے کوکووال ایک گاؤں ہے۔ ملا شیری یہیں کے رہنے والے تھے۔ فارسی میں شعر پاکیزہ کہتے تھے۔ طبیعت میں شوخی تھی جو عام گفتگو کے علاوہ اشعار سے بھی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی۔ اکبر کی شان میں قصیدے بھی بہت لکھے ہیں۔ لیکن جب مذہب کی توہین اور الحاد کی گرم بازاری کا ہنگامہ برپا ہوا تو ایک قطعہ لکھا۔ جس کے پانچ اشعار درج ذیل ہیں:

تا بر آید ہر زماں کشور برانداز آفتے
فتنہ در کوئے حوادث کتخدا خواہد شدن
باعقابِ قرضخواہ و خنجر اربابِ شرک
بارِ سر از ذمۂ گردن جدا خواہد شدن
فیلسوف کذب را خواہد گریباں پارہ شد
خرقہ پوش زہد را تقویٰ روا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلے
کز خلایق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
پادشہ امسال دعوائے نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

گدائی

شیخ گدائی کمبوہ شیخ جمال کے بیٹے تھے۔ شیخ جمالی سکندر لودھی کے زمانے میں بڑے شاعر شمار ہوتے تھے۔ اور خود سکندر لودھی بھی ان سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ شیخ گدائی خان خاناں کے رفیقوں میں سے تھے۔ نمونہ کلام

یہ ہے

گہے جاں منزل غم شد گہے دل
غمت را می برم منزل بہ منزل
مشو غافل ز حالِ دردمندے
کہ از حالِ تو یکدم نیست غافل
دلِ دیوانہ در زلفِ تو بستم
گرفتارم باآں مشکیں سلاسل
گدائی جاں بہ ناکامی برآید
نشد کامم ز لعلِ یار حاصل

جہانگیر

شاعری۔ مصوری۔ موسیقی اور انشا پردازی کے نقاد کی حیثیت سے جہانگیر تمام مغل بادشاہوں میں امتیاز رکھتا ہے۔ اس کی کتاب توزک جہانگیری سادگی، سلاست اظہار اور قوت مشاہدہ کے اعتبار سے خودنوشت سوانح عمریوں میں بہت کم مثالیں رکھتی ہے۔ اس میں خوبصورت پرندوں، پھولوں اور خوشنما نظاروں کا ذکر جس خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے اس سے جہانگیر کے شاعرانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا۔ نمونے کے طور پر دو شعر درج ذیل ہیں

مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہِ وصال
فریاد ازاں زماں کہ مرا ایں خبر رسد
از من متاب دل کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستنِ تو بصد خون برابر است

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ جہانگیر کا مذاق شعر نہایت نقادانہ اور سلجھا ہوا تھا اور اس نے کسی شاعر کے کلام کے متعلق جو رائے بھی ظاہر کی ہے وہ تنقید کے اعتبار سے حرف آخر ہے۔ اس نے عرفی، نظیری اور ابوطالب کلیم کے منتخب اشعار کی ایک بیاض مرتب کی تھی جس سے اس کے ذوق صحیح اور حسن انتخاب کا ثبوت ملتا ہے۔

جہانگیر کی ملازمت میں جو شعرا حاضر دربار تھے۔ اور اکثر انعامات و عواطف سے مالا

مال ہوتے رہتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔

بابا طالب اصفہانی، ملا نظیری نیشاپوری، ملا محمد صوفی مازندرانی، ملک الشعرا طالب آملی، سعیدائے گیلانی زرگر باشی، میر معصوم کاشی، تولشورہ کاشی، حیدر حصائی، شیدا۔[۱۱۱]

نظیری کے کمال سخنوری کی شہرت دور و نزدیک پھیل چکی تھی اور وہ گجرات میں بسلسلۂ تجارت مقیم تھا۔ جانگیر نے اس کو خلعت و خرچ بھیج کر طلب کیا۔ چنانچہ وہ حاضر ہوا۔ اور انوری کے قصیدہ "باز ایں چہ جوانی و جمالست جہاں را"

کے تتبع میں جہانگیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ گزارا، جس پر ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت مرحمت ہوا۔[۱۱۲] اور نظیری شعرائے دربار میں شامل کیا گیا۔

مغربی

جہانگیر لکھتا ہے کہ مغربی سلطان سنجر کا مداح اور ملک الشعرا تھا۔ میں نے اس کا ایک قصیدہ سنا جو بہت سلیس و ہموار تھا۔ مطلع ہے

اے آسماں مسخرِ حکم روانِ تو
کیوانِ پیر بندۂ بختِ جوانِ تو

سعیدائے زرگر باشی نے اس قصیدے پر ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ جو مجھے بہت پسند آیا اور میں نے حکم دیا کہ سعید کو سونے میں تلوا دیا جائے۔ اس قصیدے کے چند اشعار درج ذیل ہیں

اے نہ فلک نمونہ از آستانِ تو
دورانِ پیر گشتہ جواں در زمانِ تو
بخشد دل توفیض تجوید سبب چو مہر
جانہا ہمہ فدائے دل مہربانِ تو
از باغ قدت است فلک یک ترنج سبز
انداختہ بروے ہوا باغبانِ تو
بادا جہاں بکام تو اے بادشاہِ عہد
در سایہ تو خورم شاہِ جہانِ تو[۱۱۳]

طالب آملی

چودھویں جشنِ نو روز کے دن طالب آملی کو خلعت ملک الشعرائی عطا ہوا۔ جہانگیر لکھتا ہے طالب اصلا آمل کا رہنے والا ہے۔ کچھ مدت اعتماد الدولہ کے ساتھ رہا۔ جب اس کے کمال سخن کا رتبہ سب سے بلند ہوگیا تو شعرائے پایۂ تخت کی سلک میں منسلک کرلیا گیا۔ یہ چند اشعار اسی کے ہیں۔

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

عشق در اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع
ایں شرابے ست کہ ہم پختہ وہم خام خوش است

دو لب دارم یکے در مے پرستی
یکے در عذر خواہی ہائے مستی[۱۱۴]

جہانگیر کی یہ حالت تھی کہ جہاں کسی کی زبان سے اچھا شعر سنتا وہیں اس کو اپنی بیاض میں لکھ لیتا۔ حسینی پسر سلطان قوام اور معتمد خاں کی زبان سے دو رباعیاں سنیں۔ بے حد پسند کیں اور بیاض میں لکھ لیں۔

گردے کہ تر از طرف داماں ریزد
آب از رخ سرمہ سلیمان ریزد
گر خاک درت امتحاں بفشارند
از وے عرقِ جبین شاہاں ریزد

زہرم بفراق خود چشانی کہ چہ شد
خوں ریزی و آستیں نشانی کہ چہ شد
اے غافل ازاں کہ تیغ ہجر تو چہ کرد
خاکم بفشار تا بہ دانی کہ چہ شد[۱۱۵]

شاہ جہاں کی توجہ اگرچہ زیادہ تر تعمیرات پر مرتکز رہی اور اس فن لطیف کی خدمت میں اس کی ناموری بے مثال ہے۔ لیکن ادبا و شعرا کی سرپرستی اور قدردانی میں بھی وہ اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر گامزن رہا۔

قدسی مشہدی

حاجی محمد جان قدسی مشہدی ۱۰۴۲ھ میں ہندوستان آیا اور دربار شاہ جہانی میں باریاب ہوا۔ پہلا قصیدہ جو اس نے پیش کیا وہ یہ تھا

اے قلم بر خود ببال از شادی و بکشا زباں
در ثنائے قبلۂ اقبال خاقان زماں
جوہر اول شہاب الدین محمد کز ازل
کہ برائے خدمتش زوچرخ دامن برمیاں

شاہ جہاں نے اس قصیدے پر قدسی کا منہ سات مرتبہ جواہر سے بھروایا، اس کے بعد بھی گرانقدر انعامات سے سرفراز کیا۔ اور ایک مرتبہ چاندی میں تلوایا۔ ساڑھے پانچ ہزار روپے کی چاندی ہوئی جو قدسی کو عطا کی گئی۔

قدسی اپنی اس پاکیزہ نعت کے لیے تمام ہندو پاکستان میں مشہور ہے جس کا مطلع ہے

مرحبا سیدؐ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

قدسی ۱۰۵۶ھ میں فوت ہوا۔ ابو طالب کلیم نے اس کا مرثیہ لکھا۔ جس کے اس مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے

دُور ازاں بلبل قدسی چمنم زنداں شد

کلیم کا ورُود

ابو طالب کلیم ہمدان میں پیدا ہوا۔ زیادہ تر کاشان میں رہا۔ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا۔ لیکن ۱۰۲۸ھ میں واپس ایران چلا گیا۔ اس موقع پر لکھتا ہے

بہ ایراں می رود نالاں کلیم از شوق ہمراہاں
بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

کچھ مدت بعد ہندوستان آ کر دکن میں رہا۔ آخر دربار شاہ جہاں میں پہنچا۔ اور خلعت ملک الشعرائی سے سرفراز ہوا۔ جب تخت طاؤس بن کر تیار ہوا اور شاہ جہاں نے ۱۰۴۴ھ میں اس پر جلوس فرمایا تو کلیم نے یہ قصیدہ لکھا

خجستہ مقدم نوروز و غرہ شوال
فشاندہ اندچہ گلہائے عیش برسر سال

شہنشاہ نے حکم دیا کہ کلیم کو چاندی میں تول دیا جائے اور وہ چاندی اس کو عطا کر دی جائے۔ کلیم شہنشاہ کے ساتھ کشمیر گیا تو وہاں کے مناظر زیبا کو دیکھ کر وہیں مقیم ہو گیا۔

جب قیصر روم نے شاہ جہاں کے دربار میں سفیر بھیجا اور یہ اعتراض ارسال کیا کہ آپ تو صرف ہندوستان کے بادشاہ ہیں پھر اپنے آپ کو ''شاہ جہاں'' کیوں کہتے ہیں اس موقع پر کلیم نے توجیہ کی

''ہند'' و ''جہان'' ز روئے عدد ہر دو چوں یکے است
شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن است!

یعنی ''ہند'' اور ''جہان'' دونوں کے عدد (۵۹) برابر ہیں۔ لہٰذا ''شاہ ہند'' ''شاہ جہان'' کہلا سکتا ہے۔ شاہ جہاں نے اس توجیہ کو پسند کیا۔ اور کلیم کو انعام فراواں عطا کیا۔ کلیم ۱۰۶۰ھ میں فوت ہو گیا۔ غنی کشمیری نے تاریخ وفات کہی

گفت تاریخ وفاتِ او غنی
طور معنی بود روشن از کلیم

دورِ شاہجہانی کے دوسرے شعرا امیر ظفر خاں احسن، میرزا محمد طاہر آشنا، میرزا امان اللہ امانی (پسر مہابت خاں)، سلطان شادمان، شیخ محمد محسن فانی، (استاد ملا طاہر غنی کشمیری)، محمد حسین آشوب، صائب تبریزی، امّی شیرازی، حکیم رکنا، شیدا، مسیح کاشی، سعیدائے گیلانی، میرزا رضی دانش وغیرہم تھے۔

برہمن

اور خاص طور پر قابلِ ذکر لاہور کا ہندو شاعر چندر بھان برہمن[۱۱۲] ہے جس کا یہ شعر مشہور ہے۔

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

یعنی اس وقت ہندو بھی فارسی میں شاعری کرنے لگے تھے اور ''اٹھارھویں صدی میں اس کی مقدار اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ بچھمی نرائن شفق نے اس پر ایک مستقل تذکرہ موسوم بہ ''گل رعنا'' ترتیب دیا۔ اس بنا پر ڈاکٹر سید عبداللہ جنھوں نے اس موضوع (یعنی ہندوؤں کے فارسی ادبیات) کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام پر فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ اپنے مسلمان ہم وطنوں کے برابر تھا۔[۱۱۷]

دورِ عالمگیری

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اگرچہ بڑے شعرا پیدا نہ ہوئے تھے جو فیضی، عرفی، نظیری، کلیم، قدسی اور طالب کی طرح ادبیاتِ فارسی کے لیے مایۂ افتخار ہوتے۔ لیکن نعمت خاں عالی، عاقل خان رازی، سعید اشرف مازندرانی، روشن ضمیر ایرانی، رفیع خاں باذل، محمد طاہر اصفہانی، عبدالباقی صہبائی، میرزا محمد علی ماہر اکبر آبادی اور محمد افضل سرخوش دورۂ عالمگیری کے خوش فکر شعرا شمار کیے جاتے ہیں۔

عالمگیر خود تو شعر نہ کہتا تھا لیکن شعر سے بے حد دل بستگی رکھتا تھا۔ اساتذۂ فارسی کے دواوین کا مطالعہ کر کے ان کے عمدہ اشعار بیاض میں قلمبند کرتا تھا۔ چنانچہ ''رقعاتِ عالمگیری'' میں جابجا نظام گنجوی، سعدی، حافظ اور نظیری کے اشعار نہایت برمحل استعمال کیے ہیں جس سے اس کے ذوق کی پاکیزگی کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر غلام سرور لکھتے ہیں کہ انھوں نے اوچ (ریاست بہاولپور) کتاب خانہ گیلانی میں مثنوی مولانا روم کا ایک انتخاب دیکھا ہے جس کے اشعار خود عالمگیر نے منتخب کیے ہیں۔

عالمگیر کا رجحان زیادہ تر تفسیر، حدیث اور فقہ کی طرف تھا۔ وہ مبالغہ، تملق اور مدح سرائی کی شاعری کو پسند نہ کرتا تھا۔ لہٰذا جن شعرا نے اپنی شاعری کو واسطۂ معیشت قرار دے رکھا تھا انھیں اپنے دربار میں نہ رکھتا تھا چنانچہ دربار عالمگیری سے ''ملک الشعرائی'' کا منصب حذف کر دیا گیا تھا۔

شہنشاہ عالمگیر کے متعلق تمام مؤرخ متفق ہیں کہ وہ خاندانِ مغلیہ کا سب سے بڑا

تاجدار تھا جس کے عہد میں حدودِ قلمرو کی وسعت انتہا کو پہنچ گئی۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی زوال شروع ہوگیا۔ کوئی ڈیڑھ سو سال کی مدت میں گیارہ بادشاہ تخت پر بیٹھے اور جنگ و جدال، فساد و خون ریزی، بغاوت و کشمکش کے طویل دور کے بعد صدہا سال کی یہ جمی ہوئی سلطنت ۱۸۵۷ء میں ختم ہوگئی۔

اس دوران میں زبان اردو اپنی ابتدائی حالت سے گزر کر ادب و شعر کی زبان بن گئی۔ مغلوں کا بارہواں بادشاہ محمد شاہ خود بھی اردو کا شاعر تھا اس کے دربار میں فارسی کے جو شعرا موجود تھے انہوں نے زمانے کا رنگ دیکھ کر اردو میں بھی شعر کہنا شروع کردیا۔ قزلباش خاں امید، سراج الدین علی خاں آرزو، میرزا علی قلی خاں ندیم، میرزا مرتضیٰ قلی فراق اور مرزا عبدالقادر بیدل ایسے ہی شعرا میں تھے۔ بعض صرف اردو ہی میں شعر کہتے تھے۔ مثلاً شاہ حاتم، میر ضاحک، عبدالحی تاباں، مرزا مظہر جان جاناں، جعفر زٹلی، خواجہ ناصر عندلیب، نواب انجام، نواب شاکر، نواب راسخ، جعفر علی خاں۔

مرزا عبدالقادر بیدل

محمد شاہ کے بعد جتنے مغل بادشاہ آئے وہ سب اردو میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نہایت نامور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اگرچہ انگریزوں کے نفوذ کی وجہ سے فارسی کمزور ہوچکی تھی لیکن اس زمانے میں بھی چند نہایت جلیل القدر شعرا آسمان ہند پر روشن ستاروں کی طرح درخشاں ہوئے۔ ان میں سے ایک مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی تھے۔ اگرچہ کچھ مدت دربار شاہی کے ساتھ وابستہ رہے لیکن طبیعت کے اعتبار سے فقیر منش اور درویش تھے۔ فقر و درویشی میں زندگی بسر کی۔ دیوان غزلیات کے علاوہ ''محیط اعظم''، ''طلسم حیرت''، ''طورِ معرفت''، ''گلگشت حقیقت'' اور نکات و رقعات کے مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ ان کا فکر سراپا متصوفانہ تھا اور عمیق روحانی واردات و تصورات کو نظم کرنا ان کی امتیازی خصوصیت تھی۔ افغانستان و ترکستان کے لوگ بطور خاص کلام بیدل کے شیفتہ ہیں اور مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ان کا احترام کرتے ہیں۔ موسیقی سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ بعض غزلیں نہایت مترنم بحروں میں لکھی ہیں۔ جن کے بعض اشعار زبان زدِ عام ہیں۔ مثلاً

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

ایک مشہور غزل کا مطلع ہے

ہمہ عمر باتو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنارِ ما بہ کنارِ ما

میرزا بیدل کا انتقال ۱۱۳۴ھ میں ہوا۔

شیخ علی حزیں کی آمد

دوسرے شیخ محمد علی حزین تھے جو اصفہان میں پیدا ہوئے اور غالباً وہ آخری ایرانی شاعر تھے جو ہندوستان میں وارد ہوئے۔ جب ۱۱۳۵ھ میں اصفہان افغانوں کے حملے سے برباد ہوا تو شیخ علی حزیں بھاگ کر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں بھی مدت تک آوارۂ روزگار رہے۔ بالآخر بنارس میں مقیم ہوگئے۔ ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا۔ ان کے دو شعران کی لوحِ مزار کی زینت ہیں

زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمے دانم
ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا
حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ بربالین آسائش رسید اینجا

کلیاتِ حزیں بمبئی کے ایک مطبع نے دو جلدوں میں چھاپ دی ہے۔ حزیں نے دیوانِ غزلیات کے علاوہ ''شرح حال'' اور ''تذکرۃ المعاصرین'' دو اور کتابیں بھی لکھیں جن میں اپنے زمانے کے احوال اور معاصر شعرا کا تذکرہ قلمبند کیا۔ حزیں کا کلام سلاست اور سہل ممتنع کا دلاویز نمونہ ہے۔ جس میں محبت کے جذبات کو نہایت مؤثر سادگی سے نظم کیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے وائے بر اسیرے کزیاد رفتہ باشد
دردام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد
از آہِ درد ناکے سازم خبر دلت را
روزے کہ کوہِ صبرم برباد رفتہ باشد
آواز تیشہ امشب از بیستوں نیاید
گویا بخوابِ شیریں فرہاد رفتہ باشد

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی
گو مشتِ خاک ماہم برباد رفتہ باشد
پرشور از حزیں است امروز کوہ و صحرا
مجنوں گزشتہ باشد فرہاد رفتہ باشد

مرزا غالب

اس دور کے آخری اور عظیم ترین فارسی شاعر اسد اللہ خاں غالب دہلوی تھے۔ جو حزیں کے انتقال کے چار سال بعد ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۲۸۶ھ میں رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ یہ عالی پایہ شاعر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں خوب شعر کہتا تھا۔ اور نثر اردو کا بھی مجدد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو غزلیات کا دیوان تو زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ سو اشعار پر مشتمل ہے لیکن کلیات فارسی خاصی ضخیم ہیں۔ اور غالب کو زیادہ تر اپنے فارسی کلام ہی پر وثوق اور غرہ تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں

فارسی بیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگور از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

ایک اور جگہ کہتے ہیں

بیا ورید گر ایں جابود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مرزا غالب نے ہندوستان میں مسلم حکومت کی تباہی کا آخری منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب سے بھی گزرے۔ آخری بادشاہ کی اسیری، شہزادوں اور شہزادیوں کے قتل اور دہلی کی ویرانی کا نظارہ بھی کیا۔ لیکن محض نالہ و ماتم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید حالات سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش بھی بدرجہ اتم کی اور مستقبل کے متعلق امید افزا خیالات ظاہر کیے۔ ایک غزل میں لکھتے ہیں

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند
گہر از رایت شاہانِ عجم بر چیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند
بسخن ناصیۂ فرِ کیا نم دادند
گوہر از تاج گستند و بہ دانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

غالب کے بعد اقبال نے ہمیں امید کا جو پیغام دیا اس کے ابتدائی ''جراثیم'' غالب کے فارسی کلام میں بھی ملتے ہیں۔ مرزا غالب کے فکرِ سیاسی کا انداز یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''مسلمانوں کی سلطنت جاتی رہی بہت افسوس ہے لیکن جب علم وفن کا خورشید طلوع ہو رہا ہو تو ٹمٹماتی ہوئی شمع کو گل ہی ہو جانا چاہیے۔ بلاشبہ ہم سے حکومت چھن گئی۔ لیکن علم وفن کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ چنانچہ اب ہم اس شعبے میں سربلند ہوں گے۔'' اس کے علاوہ کلام غالب ''انقلابی دعوت'' سے بھی خالی نہیں۔ مثلاً اس قسم کے اشعار محض ''رندانہ'' نہیں ہیں۔ ان میں شاعر کے فکر کا انقلابی رخ بھی ظاہر ہے۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
اگر زشحنہ بودگیر و دارنند یشیم
وگرز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
بہ جنگ باج ستانانِ شاخسارے را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
کہ آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

کلیاتِ فارسی اور دیوان اردو کے علاوہ غالب نے اردوئے معلّیٰ، عودِ ہندی، مہر نیمروز، دستنبو اور دوسری متعدد چیزیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور موجودہ نسل نظم ونثر اردو میں غالب کو اپنا امام تسلیم کرتی ہے لیکن اہل نظر کے نزدیک اس کی عظمت کا بلند ترین مینار اس کا فارسی کلام ہی ہے۔

غالب کے بعد جالندھر کے مولانا غلام قادر گرامی، مولانا عبیداللہ بسمل لکھنوی کے خواجہ عزیز الدین درابو کاشمیری، مولانا شبلی اور متعدد دوسرے بزرگوں نے فارسی شاعری میں اظہار کمال کیا۔

لیکن انقلاب زمانہ اور اقتدار فرنگ کی وجہ سے فارسی نہ ملک کی علمی و ادبی زبان رہی نہ سرکار دربار میں اس کا کوئی وقار رہا۔ ہمارے دور میں علامہ اقبال نے فارسی زبان کی شاعری کو جو ہمارے ملک میں جاں بلب ہو رہی تھی اپنے انفاس مسیحائی سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز لکھ کر بے شمار نوجوانوں کو شعر فارسی کا لذت گیر بنا دیا۔ آپ نے افغانستان، ترکستان، ایران، عراق بلکہ مصر و حجاز تک اپنا حیات افروز پیغام صرف فارسی شاعری کی مدد سے پہنچایا۔

ساتویں فصل: اخبار نویسی

مشرق میں اخبار نویسی نہایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ حکمرانوں کی طرف سے اعلانات و احکام عوام تک پہنچانا اور عوام کے حالات سے حکمرانوں کو خبردار رکھنا ہمیشہ ہی سے معاشرے کا دستور العمل رہا ہے۔ اس کا اولین طریق یہ تھا کہ طول طویل کتبے کھودے جاتے تھے جو مدت دراز تک اشاعت اخبار و اعلانات کا کام دیتے تھے۔ مثلاً فراعنۂ مصر کے احکام و قوانین۔ ان کے جشنوں اور تیوہاروں کے حالات قدیم عراق میں حمورابی کے قوانین اور ہندوستان میں اشوک کے احکام کتبوں کی صورت میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان سب سے مقصود یہ تھا کہ عوام اپنے حکمرانوں کے احکام سے مطلع رہیں۔

یورپ میں رومتہ الکبریٰ نے سب سے پہلے ایسی تحریر کو رواج دیا جو آج کل کے اخبار سے کچھ مختلف نہ تھی۔ یعنی بہت سے محرر مقرر کیے جو حکومت کے اعلانات کو احکام و ضبطِ تحریر میں لا کر شہر کے چوراہوں میں سناتے اور ان کی نقول سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی بھیجتے۔ چین میں بھی زمانۂ قدیم ہی سے اس ذریعۂ اشاعت پر عمل کیا جا رہا تھا۔

روزنامہ نویس

اسلام سے قبل ایران میں خبریں بہم پہنچانے کا کام بے شمار آدمیوں کے سپرد کیا جاتا تھا جو عام طور پر ''چشم و گوش شہریاران'' کہلاتے تھے۔ اور ہر اہم واقعہ کی اطلاع بادشاہ کو پہنچاتے تھے۔ ایک ایرانی صحافی نے ''صفحہ ای از تاریخ جریدہ نگاری ایران'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ:

لفظ ''روزنامہ'' ایران میں زمانۂ قبل اسلام سے چلا آ رہا ہے۔ بادشاہ، وزیر اور امیر بعض

ایسے آدمیوں کو ملازم رکھتے تھے جو ملکی واقعات قلمبند کرتے۔ ممالک غیر کے نامہ نگاروں کی بھیجی ہوئی اطلاعات بھی لکھ لیتے۔ پھر مستند ذرائع سے ان کی تصدیق و توثیق کرنے کے بعد انھیں باقاعدہ محفوظ رکھتے تاکہ مؤرخین اور حکام دونوں کے لیے ذخیرۂ معلومات فراہم رہے۔ ان اخبار و اطلاعات کے مؤلف جریدہ نگار یا ''روزنامہ نویس'' کہلاتے تھے۔[۱۱۸]

برید

اسلام میں سب سے پہلے باقاعدہ ڈاک اور خبر رسانی کا انتظام امیر معاویہ نے قائم کیا۔ عرب مؤرخ فخری کا بیان ہے کہ اس انتظام کو ''برید'' کہتے تھے اور اس کے مرکزی محکمے کا نام دیوان البرید تھا۔ اموی خلیفہ عبدالملک نے دمشق اور مراکز ولایات کے درمیان مراسلت کی غرض سے باقاعدہ ڈاک کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ محکمہ سرکاری مراسلات پہنچانے کے علاوہ خبروں کی فراہمی کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ صاحب البرید یعنی پوسٹ ماسٹر کا فرض تھا کہ دوسرے امورِ منصبی کے علاوہ اپنے مفوضہ علاقے کے حالات و واقعات کی اطلاع بھی خلیفہ کی بارگاہ میں باقاعدہ ارسال کرے۔

عباسیوں کے اکثر ادارات ساسانیوں سے ماخوذ تھے۔ اس لیے انہوں نے خبر رسانی کے کام کو بھی قبل اسلام کے ایرانی نمونے پر منظم کیا۔ خلیفہ ہارون رشید کے ایرانی وزیر یحییٰ برمکی نے نظام برید کو بالکل نئی بنیادوں پر قائم کر کے اس کو زیادہ باضابطہ اور تیز رفتار بنا دیا۔ بغداد کو قلمرو کے دوسرے شہروں سے مربوط کرنے کی غرض سے سینکڑوں رستے تجویز کیے گئے جن پر گھوڑے ڈاک لے جایا کرتے تھے۔ بلکہ مسعودی نے تو یہ لکھا ہے کہ:

کبوتروں کو سدھا کر ان سے نامہ رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ معتصم کو بابک خرمی (باغی) کی گرفتاری کی خبر اس ذریعے سے دی گئی تھی۔[۱۱۹]

خفیہ نویسی

فلپ ہٹی نے مسعودی ہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ: پوسٹ ماسٹر جنرل جہاں شاہی ڈاک کی دیکھ بھال اور رسل و رسائل کے مختلف شعبوں کی نگرانی کرتا تھا، وہاں ایک نظامِ جاسوسی کا بھی رئیس اعلیٰ تھا۔ اور ڈاک کا سارا محکمہ اس نظام کے ماتحت تھا۔ اس حیثیت سے اس عہدے دار کا لقب تھا ''صاحب البرید والاخبار'' (یعنی ڈاک اور خبر رسانی کا حاکم اعلیٰ) گویا پوسٹ ماسٹر

جنرل کے علاوہ وہ مرکزی حکومت کے شعبہ اطلاعات خفیہ کا انسپکٹر جنرل بھی تھا۔ صوبے کا صاحب البرید اپنے صوبے کے سرکاری افسروں کے افعال و حرکات کی کیفیت لکھ کر پوسٹ ماسٹر جنرل کو یا براہ راست خلیفہ کو لکھ بھیجتا تھا۔ اور اس خبر رسانی سے خود والی صوبہ بھی محفوظ نہ تھا۔ چنانچہ خلیفہ المتوکل کے پاس بغداد کے ایک والی کے خلاف یہ خبر بھیجی گئی کہ وہ مکہ معظمہ میں حج کرنے کے بعد ایک پری رُو لڑکی کو ساتھ لایا ہے۔ دوپہر سے لے کر آدھی رات تک اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا ہے اور امور سلطنت سے غافل ہو رہا ہے۔

مصر میں خلافت فاطمیہ اور مغرب میں حکومت اندلس نے بھی اسی نظام برید کو جاری رکھا۔

نظام اخبار و اطلاعات

ہندوستان میں خبر ناموں کے اس نظام کو متعارف کرانے والے غزنوی ہیں۔ جنھوں نے خبر ناموں کی ترتیب۔ ان کی نشر و اشاعت اور اطلاعات کی بہم رسانی کا سارا کام عباسیوں سے سیکھا تھا۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی سلطنت میں اخبار و اطلاعات کا ایک مستقل محکمہ قائم تھا۔

منہاج السراج اپنی مشہور تاریخ طبقاتِ ناصری میں بار بار لکھتا ہے کہ ''معتبر اشخاص فلاں واقعہ کے راوی ہیں۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ غزنویوں کا نظام اطلاعات ایرانی نمونے کا تھا۔ یعنی خبر نامے ایک تو بادشاہ کو تمام واقعات سے مطلع رکھتے تھے اس کے علاوہ مؤرخین کے لیے بھی مواد مہیا کرتے تھے۔ مثلاً جب غوریوں نے غزنی کو برباد کیا تو اس کی روداد غالباً خبر رسانوں نے مرتب کی ہوگی جس سے منہاج السراج نے استفادہ کیا ہوگا۔ یہ رپورٹ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے کے نامہ نگار بھی آج کل کے رپورٹروں سے کچھ مختلف نہ تھے۔

پھر فاتح نے شہر غزنی میں داخل ہوکر ہر طرف آگ لگا دی جو سات دن اور سات راتیں بھڑکتی رہی۔ نامہ نگاروں کا بیان ہے کہ ان سات دنوں کے دوران میں دھوئیں کے بادلوں نے فضا کو اس قدر تاریک کر رکھا تھا کہ دن پر رات کا گمان ہوتا تھا اور رات کے وقت شعلوں کی لپک اس قدر بلند ہوتی تھی کہ رات پر دن کا دھوکا ہوتا تھا۔ سات دن تک لوٹ مار، تباہی و بربادی اور قتل و خون کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہر مرد جو نظر آیا تہ تیغ کر دیا گیا۔ اور تمام عورتیں اور بچے

قیدی بنالیے گئے۔ فاتح کے فرمانِ قضا سامان پر محمود، مسعود اور ابراہیم کے سوا باقی تمام محمودی بادشاہوں کی لاشیں قبروں سے گھسیٹ کر باہر نکالی گئیں اور نذرِ آتش کر دی گئیں۔[۱۲۰]

قاصد

غزنویوں کے عہد میں قاصد دوقسم کے تھے۔ عام قاصد اور تیز رفتار قاصد۔ جب مسعود غزنوی کے بیٹے ابراہیم اور فرخ زاد قتل کیے جانے والے تھے ''بعض تیز رفتار قاصد یہ خبر لے کر آئے کہ ملعون طغرل جہنم رسید کیا جاچکا ہے۔'' چنانچہ انہی قاصدوں کی بروقت آمد سے ان دونوں کی جان بچی اور فرخ زاد تخت نشین ہوا۔

اخبار نویس

جب دہلی میں مسلم سلاطین کا دور دورہ شروع ہوا تو قلمرو کے ہر حصے میں اخبار نویس بطور خاص مقرر کیے جاتے تھے جن میں سے بعض خفیہ ہوتے تھے اور بعض علانیہ۔ ان لوگوں کا کام یہ تھا کہ مرکزی حکومت کی اطلاع کے لیے اپنے علاقوں کے واقعات باقاعدہ ارسال کرتے رہیں۔ سلطان ناصر الدین محمود، بلبن، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق اور شیر شاہ سوری نے اس نظام کی تکمیل میں خاص اہتمام کیا۔ اور اسے بے حد مفید و موثر بنایا۔

ان اطلاعات کی افادی حیثیت کے متعلق سلطان ناصر الدین محمود کے عہد کا ایک واقعہ مشہور ہے۔ فوج بیرونی مہمات پر دہلی سے باہر گئی ہوئی تھی۔ ان دنوں بعض ممتاز امرا نے بعض باغی سرغنوں کو خفیہ چٹھیاں لکھیں کہ اگر تم لوگ اس وقت دہلی پر دھاوا کرو گے تو دروازے اپنے لیے کھلے پاؤ گے اور اہل شہر تمہاری امداد کریں گے۔ لیکن دارالخلافہ کے بعض وفادار اخبار نویسوں نے اس سازش کی سن گن پا کر الغ خاں کو اطلاع دے دی۔ الغ خاں نے ان کے خبرنامے باہر سے دہلی میں بادشاہ کو بھیج دیے اور لکھا کہ فلاں فلاں امرا سازش کر رہے ہیں۔ آپ فوراً ان کو جن کی جاگیریں نواحِ دہلی میں ہیں حکم دے دیجیے کہ وہ اپنی جاگیروں پر چلے جائیں تاکہ خطرہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس مشورے پر عمل کیا اور اس کا تاج و تخت محفوظ رہ گیا۔[۱۲۱]

سلطان بلبن کے متعلق برنی لکھتا ہے کہ عدل و انصاف کے تقاضے سے سلطان نے تمام جاگیروں میں اپنی قلمرو کے تمام گوشوں میں بڑے بڑے شہروں اور اہم اور دور دست قصبوں میں خفیہ برید مقرر کیے اور ان کے لیے زیادہ وسیع علاقے معین نہ کیے تاکہ وہ اپنے فرائض دیانت

اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ ان اخبار نویسوں کی معرفت سلطان کو جو معلومات حاصل ہوتیں ان پر وہ لازماً توجہ کرتا اور عدل و انصاف کی مصلحت کے سامنے کسی بڑے سے بڑے نالائق شخص سے بھی رو رعایت نہ کرتا۔ امرا و حکام ان اخبار نویسوں سے بے حد خوف کھاتے اور انھیں یا ان کے فرزندوں اور متوسلوں کو اس امر کی کبھی جرأت نہ ہوتی کہ کسی بے گناہ کو ستائیں۔[۱۲۲]

یہاں تک کہ بلبن نے بریدوں کو اپنے شہزادے بغرا خاں کی حرکات وسکنات پر بھی نگاہ رکھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اور اس کے متعلق پوری اور تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کرتا تھا۔

تجارتی خبریں

علاء الدین خلجی نے بازاروں اور منڈیوں کی اطلاعات کو جس خوبی سے منظم کر رکھا تھا اس کا ذکر تاریخ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ اس بادشاہ نے گویا ''تجارتی خبروں'' کا صیغہ مکمل کر دیا تھا۔ برنی نے ''قاعدہ ۷'' کے عنوان سے لکھا ہے:

سلطان کی حضور میں منڈیوں کے نرخوں اور خرید و فروخت کے متعلق تین مختلف ذرائع سے اطلاعات موصول ہوتی تھیں۔ اول مہتمم بازار کے نرخوں اور لین دین کے متعلق اپنی رپورٹ بھیجتا تھا۔ دوم برید یعنی اخبار نویس اپنے طور پر علیحدہ انھی امور کے متعلق اطلاع مہیا کرتے تھے۔ سوم جاسوس اپنی رپورٹ الگ پیش کرتے تھے۔ اگر ان تینوں قسم کی خبروں میں کہیں کوئی اختلاف ہوتا تو مہتمم کو سزا دی جاتی۔ منڈی کے مختلف اہلکار خوب آگاہ تھے کہ منڈی کے تمام حالات اور واقعات تین ذرائع سے سلطان کے علم میں لائے جا رہے ہیں لہٰذا وہ منڈی کے قواعد وضوابط سے ذرا سا انحراف کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

ایک اور موقع پر لکھا ہے:

فراہمی اخبار کا اہتمام ایسا تھا کہ کوئی نیک و بدعمل سلطان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔ کوئی شخص اس کے علم کے بغیر جنبش نہ کر سکتا تھا۔ امرا و اکابر اور حکام کے گھروں میں جو کچھ ہوتا تھا اس کی اطلاع اخبار نویسوں کے ذریعے سے سلطان تک پہنچ جاتی تھی۔ ان اطلاعات سے ذرا بھی چشم پوشی نہ کی جاتی۔ اور برابر جواب طلبیاں ہوتی رہتیں۔ خبر رسانی کا یہ نظام اس قدر مکمل تھا کہ امرا اپنے بڑے بڑے محلوں میں بھی بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے تھے۔ اور بعض

اوقات محض اشاروں سے بات کیا کرتے تھے۔[۱۲۳]

برنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب کبھی کوئی بڑی خبر عوام تک پہنچانی ضروری ہوتی، بے شمار مراسلے مساجد کے منبروں پر پڑھ کر سنائے جاتے اور تمام حلقوں میں شائع کیے جاتے۔ بعض وقت منادی ڈھول بجا کر شہر بھر میں وہ خبر پکار پکار کر سنا دیتا۔

ہندوستان میں برید

محمد بن تغلق کے عہد میں خبر رسانی کا نظام اور بھی مکمل اور تیز رفتار ہوگیا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں بیان کیا ہے کہ سیوستان سے ملتان تک دس دن اور ملتان سے دہلی تک پندرہ دن کا رستہ ہے۔ لیکن اخبار نویس جو خبر نامہ ڈاک سے بادشاہ کی خدمت میں روانہ کرتا تھا، وہ صرف پانچ دن میں دہلی پہنچ جاتا تھا۔ اس ملک میں ڈاک کو برید کہتے ہیں اور برید دو قسم کی ہوتی ہے ایک سوار برید، دوسری پیدل برید۔ پیدل برید کا نظام کچھ اس طرح کا ہے ہر گاؤں کے باہر ایک برجی ہوتی ہے جس میں ہرکارے تیار رہتے ہیں۔ ہرکارے کے پاس دو گز لمبی ایک لاٹھی ہوتی ہے جس کے ایک سرے پر گھنٹی یا گھنگھرو بندھا ہوتا ہے، ہرکارہ ایک ہاتھ میں ڈاک اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی لیے نہایت تیز رفتاری سے دوسری برجی کو دوڑتا ہے اور گھنٹی یا گھنگھرو برابر بجاتا چلا جاتا ہے۔ گھنٹی یا گھنگھرو کی آواز سن کر اگلی برجی والا ہرکارہ ہوشیار ہو جاتا ہے۔ جونہی ڈاک اس برجی تک پہنچتی ہے نیا ہرکارہ جھٹ اس کو لے کر اسی طرح اگلی برجی کو دوڑ جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ منزل مقصود تک جاری رہتا ہے۔

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اس کے ملتان پہنچنے کی خبر پانچ دن میں دہلی پہنچ گئی تھی۔ حالانکہ اصل سفر پچاس دن کا تھا۔ ملتان کا اخبار نویس سمرقند کا رہنے والا تھا اور ابن بطوطہ کی اس سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔

خاص ڈاک

اگرچہ شمس سراج عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں فیروز شاہ تغلق کے نظام اخبار و اطلاعات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ لیکن چونکہ یہ نظام اب سلاطین کے محکمہ ہائے سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کا بطور خاص ذکر کرنا غالباً اس مؤرخ کے نزدیک ضروری نہ ہوا۔ ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ فیروز شاہ تغلق جیسا عظیم الشان بادشاہ اخبار نویسوں کی مدد کے بغیر اتنی مدت

سلطنت کر جاتا۔ شمس سراج عفیف نے ایک "سپیشل ڈاک" کا ذکر ضرور کیا ہے۔ ایک دفعہ جب فوج چھ مہینے کے لیے ایک ہی جگہ جا کر مقیم رہی اور دہلی سے اس کا تعلق بالکل منقطع رہا تو سلطان فیروز شاہ تغلق نے فوج میں اعلان کیا کہ تم اپنے متعلقین کو خطوط لکھو۔ چنانچہ چھٹیوں کا ایک بارِ شتر دہلی بھیجا گیا۔

سکندر لودی کے متعلق تاریخ داؤدی نے بتایا ہے کہ سلطان نے اپنی قلمرو میں منڈیوں کے نرخ اور دوسرے حالات و واقعات معلوم کرنے کے لیے خبر رسانی کا باقاعدہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ اگر کہیں ذرا سی خرابی بھی بادشاہ کے علم میں آتی تو اس کی تحقیقات کا حکم فوراً صادر کیا جاتا۔ عباس خاں سروانی کی تاریخ شیر شاہی کے ترجمے میں ایلیٹ اور ڈاؤسن نے ایک جگہ حاشیہ پر لکھا ہے کہ سکندر لودی ڈاک چوکیاں شیر شاہ سے پہلے بھی قائم کر چکا تھا۔

شیر شاہ سوری کو سڑکوں کے بنانے اور خبر رسانی کا انتظام مکمل کرنے میں دوسرے سلاطین پر وجہ فضیلت حاصل ہے۔ اس نے اپنے بنا کردہ قلعہ رہتاس (پنجاب) سے سونار گاؤں (بنگال تک)، شہر آگرہ سے برہان پور (یعنی قلمرو دکن کی حد تک)، آگرے سے جودھپور اور چتوڑ تک اور شہر دہلی سے رہتک، ہانسی، سرسہ سے ملتان تک اور شہر لاہور سے ملتان تک سڑکیں بنائیں اور ہر دو کوس کے فاصلے پر ڈاک چوکی اور ہر بارہ کوس کے فاصلے پر ایک اچھی آرام دہ سرائے تعمیر کی۔ مختلف سڑکوں پر کل سترہ سو سرائیں بنائیں۔ ہر سرائے اور ڈاک چوکی میں دو دو گھوڑے رکھے جاتے تھے تاکہ خبریں جلد سے جلد روانہ کی جا سکیں۔[۱۲۴]

ایلیٹ اور ڈاؤسن نے "تاریخ خان جہان" کا یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ "یہ اہتمام اس لیے کیا گیا تھا کہ ہر روز بلاناغہ نیلاب، آگرہ اور ممالک بنگالہ کی آخری حدود سے اخبار و اطلاعات سلطان کی خدمت میں پہنچتی رہیں۔"

غفلت کی سزا

اس میں شک نہیں کہ اخبار نویسی اور اخبار رسانی کا نظام سلاطین کی ذاتی توجہ کے باعث بے حد مکمل اور قابل اعتبار تھا۔ لیکن کبھی کبھی تقاضائے بشریت کی وجہ سے غفلت و بدعنوانی بھی ہو جاتی تھی جس کا نتیجہ ہولناک ہوتا تھا۔ برنی لکھتا ہے:

سلطان بلبن کا ایک منظور نظر جاگیردار ملک بکبک بدایوں میں تھا۔ ایک دن شراب میں

بدمست ہو کر اس نے اپنے ایک خانگی ملازم کو اس قدر پٹوایا کہ وہ مر گیا۔ کچھ مدت بعد سلطان بلبن بدایوں گیا تو مظلوم کی بیوہ فریادی ہوئی۔ سلطان نے فی الفور حکم دیا کہ ملک بکبک کو اس بیوہ کے سامنے اسی طرح بیدردانہ زدوکوب کر کے ہلاک کر دیا جائے۔

جو اخبار نویس بدایوں کی جاگیر پر نگاہ رکھنے اور خبریں بھیجنے پر مامور تھے انہوں نے اس واقعہ کی کوئی اطلاع حضور سلطانی میں نہ بھیجی تھی چنانچہ ان کو شہر بدایوں کے دروازں پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔

مغلوں نے جہاں ثقافت کے دوسرے شعبوں کو چار چاند لگائے، وہاں اخبار نویسی اور اخبار رسانی کے سلسلے میں بھی بیش بہا اضافے کیے۔ تو زک بابری سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے معتمد شیخ زین (صاحب طبقات بابری) نے ایک شاندار جنگ کے واقعات کے متعلق جو مراسلہ مرتب کیا وہ بابر کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے لفظ بلفظ توزک میں شامل کر لیا۔ خود شیخ زین نے جو کتاب ''طبقات بابری'' کے نام سے لکھی اس میں لکھتا ہے کہ مظفر و منصور افواجِ شاہی کے کان ہر وقت سلطان ابراہیم والی جنگ کے واقعات پر لگے ہوئے تھے کیونکہ خبریں پے در پے موصول ہو رہی تھیں۔''

امیر اخبار

ہمایوں کے دور میں خوند امیر سب سے بڑا اخبار نویس اور مؤرخ گزرا ہے۔ چنانچہ اس کا لقب بھی ''امیر اخبار'' تھا۔ اس کی کتاب ''ہمایوں نامہ'' دور ہمایونی کے حالات کا دلاویز مرقع ہے اور صرف ہمایوں نامہ ہی نہیں بلکہ شیخ زین کی طبقات بابری اور جوہر کی تذکرۃ الواقعات بھی چونکہ ایک مختصر سے دور پر حاوی ہیں۔ اس لیے ان کا انداز اخبار نویسانہ معلوم ہوتا ہے اور زیادہ تر اخبار نویسوں کے خبر ناموں پر مبنی ہے۔

وقائع نگار

اکبر کے زمانے میں یہ اخبار نویس واقعہ نویس یا وقائع نگار کہلاتے تھے۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں بتایا ہے کہ شہنشاہ ہر ضلع میں واقعہ نویس مقرر کرتا تھا۔ یہ واقعہ نویس اپنے اپنے علاقے کے اہم واقعات کی روداد لکھ کر بھیجتے تھے اور انھی رودادوں کے مطابق حضور شہنشاہ سے فیصلے صادر ہوتے تھے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ''برید و اخبارات'' کے

ماتحت چار ہزار ہرکارے ملازم تھے۔ پانچ پانچ میل پر ڈاک چوکیاں تھیں۔ یہ ہرکارے ان چوکیوں پر متعین تھے۔ ہر چوکی پر تیز رفتار گھوڑے موجود رہتے تھے۔ پیادہ ہرکارے آگرہ سے احمد آباد تک کا فاصلہ (سات سو میل) دس دن میں طے کرتے تھے لیکن شاہی ڈاک پانچ دن میں پہنچ جاتی تھی۔

خبروں کا دائرہ نوعیت کے اعتبار سے خاصا وسیع ہوتا تھا۔ شہنشاہ اور امرا کے احکام و فرامین، ان کے مشاغل دربار و شکار کی تفصیلات، کہانیاں، لطیفے، حکمت و دانائی کی باتیں۔ مالیہ اراضی کی معافی کے اعلانات، عرضیوں پر احکام، افسروں اور اہلکاروں کے تقرر اور تبادلے کے فرمان، رخصت کی منظوریاں، صلح و جنگ کی خبریں، ایسی شخصیتوں کے انتقال کی خبریں جن سے شہنشاہ واقف ہوتا تھا۔ فوجی گھوڑوں کی ہلاکت کی اطلاعات، رحم کی درخواستوں اور جاں بخشی کی عرضیوں پر احکام، دربار عام کی رودادیں، آفاتِ ارضی و سماوی، فصلوں کی حالت وغیرہ۔

داروغہ ڈاک چوکی

ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ بے حد اہم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بڑے افسر کو ''داروغہ ڈاک چوکی'' کہتے تھے۔ سب شاہی واقعہ نویس اسی کے ماتحت کام کرتے تھے۔ اس محکمے کے کارکن صوبوں میں بھی مقرر تھے۔ جب کبھی کسی صوبے دار کا دربار منعقد ہوتا تو اسی محکمے کا افسر اس دربار کی روداد قلمبند کر کے شہنشاہ کو بھیجتا۔ اور اس طرح شہنشاہ پوری قلمرو کے حالات و واقعات سے باخبر رہتا۔

واقعہ نویس کو تقرر کے وقت جو ہدایات دی جاتی تھیں وہ بھی قابل ذکر ہیں:

ہمیشہ سچ بات لکھو، ایسا نہ ہو کہ شہنشاہ کو دوسرے ذرائع سے حقیقتِ حال معلوم ہو جائے اور تم سزا پاؤ۔ تمہارا کام بڑا نازک ہے۔ تم کو دونوں طرف کی خدمت کرنی ہے۔ گہری دانشمندی اور مصلحت بینی سے کام لینا ہوگا۔ اکثر حکام اعلیٰ کے حلقوں میں ایسے کام ہو رہے ہیں جو ممنوع ہیں۔ اگر تم ان کی صحیح صحیح اطلاع دو گے تو ایسے حکام ذلت و رسوائی کا شکار ہو جائیں گے۔ اگر صحیح اطلاع نہ دو گے تو تمہاری شامت آجائے گی۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ حلقے کے رئیس اعلیٰ سے کہہ دو کہ آپ کے حلقے میں فلاں ممنوع باتیں ہو رہی ہیں ان کو روک دیجیے۔ اگر وہ تم کو ڈانٹ دے تو تم حلقے کے کوتوال کو دھمکی دو کہ اطلاع اوپر بھیج دی جائے گی۔ اس کی اطلاع رئیس حلقہ کو مل جائے

گی۔ اگر چہ اس سے خرابی دور نہ ہوگی لیکن اگر کوئی شخص اس کی اطلاع شہنشاہ کو دے گا تو تم جواب دے سکو گے کہ میں نے بروقت رئیس حلقہ اور کوتوال کو آگاہ کر دیا تھا۔ ہر معاملے میں سچ کہو۔ لیکن جہاں تک ہو سکے امرا کو ناراض نہ ہونے دو۔ ہر بیان پوری تصدیق کے بعد قلمبند کرو۔ [۱۲۵]

نکولا منوچی وینس کا سیاح تھا جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں چند سال ہندوستان میں مقیم رہا۔ اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مغلوں کا یہ پختہ دستور ہے کہ "واقعہ نویس" اور "خفیہ نویس" ہفتے میں ایک بار نہایت اہم واقعات قلمبند کر کے بھیجتے ہیں۔ شام کو نو بجے کے قریب محلِ سلطانی کی بعض عورتیں یہ اخبار شہنشاہ کو پڑھ کر سناتی ہیں۔ تاکہ اس کو قلمرو کے واقعات معلوم ہو جائیں۔ وہ جاسوس ان کے علاوہ ہیں جو دوسرے اہم امور کے متعلق ہفتہ وار اپنی روداد بھیجتے ہیں۔ اور بیشتر شہزادگان و امرا کی حرکات و سکنات کا حال لکھتے ہیں۔ شہنشاہ نصف شب تک اس کام میں مصروف رہتا ہے۔ [۱۲۶]

حفظِ معلومات

معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نویس اپنے تمام اخباروں کا دفتر باقاعدہ رکھتے تھے۔ اور بعض اوقات سابقہ تحریروں سے قیمتی معلومات بھی مہیا کر سکتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ جہانگیر نے حکم دیا کہ سن شعور کو پہنچنے سے لے کر اب تک میں نے جو جانور اور پرندے دورانِ شکار میں مارے ہیں ان کی تفصیل مہیا کی جائے۔ چنانچہ محکمہ شکار کے اہلکاروں اور اخبار نویسوں نے دن رات محنت کر کے مطلوبہ یادداشت تیار کر دی جس سے معلوم ہوا کہ ۹۸۸ھ سے لے کر جب جہانگیر کی عمر بارہ سال تھی، وقتِ تحریر تک اس نے ۲۸۵۳۲ جانوروں اور پرندوں کو ہلاک کیا۔ [۱۲۷]

غیر سیاسی خبریں

اخبار نویس غیر سیاسی خبریں بھی لکھتے تھے۔ مثلاً "بادشاہ نامہ" ناقل ہے کہ ۲۳ ربیع الاول کو ٹھٹھہ سے خطوط پہنچے۔ جن سے معلوم ہوا کہ ساحلِ بحر کے قریب قصبوں اور قریوں میں چھتیس گھنٹے مسلسل بارش ہوتی رہی۔ بہت سے مکانات اور عمارتیں برباد ہوگئیں اور بے شمار انسان اور حیوان ڈوب گئے۔ آندھی اس قدر شدت کی تھی کہ درخت جڑ سے اکھڑ گئے اور سمندر کی لہروں نے بے شمار مچھلیوں کو خشکی پر پھینک دیا۔ سمندر کی تیزی و تندی کے باعث کوئی ایک ہزار لدے ہوئے اور خالی جہاز غرق ہوگئے اور جہازوں کے مالک مفلس و نادار ہوگئے جس علاقے پر سمندر

کی لہریں پھر گئیں وہ نمک سے بھر گیا اور اراضی نا قابل کاشت ہوگئی۔[۱۲۸]

خبر نامے

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اخبار نویسوں کا کام بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ اس زمانے کی کتابوں میں واقعہ نویسوں کے لکھے ہوئے خبر نامے ''اخبار'' کہلانے لگے۔ مثلاً منتخب اللباب میں خوانی خاں لکھتا ہے ''شہنشاہ کو احمد آباد کے اخباروں'' سے معلوم ہوا کہ شہزادہ محمد مراد بخش نے اپنے نام کا سکہ و خطبہ رائج کردیا ہے۔'' یہ خبر بھی اخبار ہی سے معلوم ہوئی کہ جب سلیمان شکوہ ہر دوار پہنچ رہا تھا اس نے سنا کہ اس کے مقابلے پر ایک فوج بھیجی گئی ہے۔ چنانچہ وہ سری نگر کے پہاڑوں کو بھاگ گیا۔ خبروں کی اشاعت کا ایک طریقہ خوانی خان سے سنو ''اِن معافیوں کے نفاذ کے لیے ان کے احکام چوب داروں اور اَحدیوں کے ہاتھ تمام صوبوں میں بھیج دیے گئے تاکہ پکار کر سنا دیے جائیں۔''

تاریخ کی کتابوں میں ان اخبار نویسوں اور ان کے اخباروں کا تذکرہ جابجا پایا جاتا ہے۔ خصوصاً مغلوں کے عہد میں تو خبروں کی فراہمی، بہم رسانی اور اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا۔ مطبع ابھی ایجاد نہ ہوا تھا اس لیے یہ اخبار ہاتھ سے لکھے جاتے تھے اور صرف بالائی طبقے کے امرا و حکام کو بھیجے جاتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں قلمی اخبارات کی اشاعت کا پتہ بھی چلتا ہے جو افواجِ شاہی کو مہیا کیے جاتے تھے۔ جہاں تک خبروں کی اشاعت کا تعلق ہے شہنشاہ نے پریس کو بڑی آزادی عطا کی تھی۔ جس کا ثبوت اس واقعے سے بھی ملتا ہے کہ بنگال کے ایک اخبار نے جب شہنشاہ اور اس کے پوتے مرزا عظیم الشان کے تعلقات پر سخت تنقید کی تھی تو اخبار سے کوئی باز پرس نہ کی گئی۔[۱۲۹]

دکن میں اخبار نویسی

چونکہ مغلوں کے زوال کے بعد دولتِ آصفیہ ہی اس ملک میں اس قدیم دور کی نمائندہ تھی اس لیے آج سے ساٹھ ستر سال قبل تک دکن میں بھی اخبار نویسی کا یہ پرانا نظام جاری تھا جو زمانے کے انقلاب کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ پریس کی ایجاد کے بعد اس ملک میں انگریزی، بنگالی، فارسی اور اردو کے بے شمار اخبار جاری ہوگئے۔ لیکن کثرت فارسی کے اخباروں کی تھی۔ کیونکہ یہی زبان ہزار سال سے ملک کی علمی و ثقافتی زبان چلی آرہی تھی۔ ان اخباروں کے مالک اور ایڈیٹر

زیادہ تر مسلمان تھے۔ لیکن عیسائیوں، ہندوؤں اور دوسری قوموں نے بھی ملک کے مختلف حصوں میں بہت سے اخبارات جاری کیے۔

ہندوستان میں اخبار نویسی کی تاریخ لکھنا میرا مقصود نہیں ہے۔ مجھے تو اس فصل میں یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ صحافت جو آج ہمارے معاشرے کا سب سے زیادہ مؤثر آلۂ اظہار ہے، اس ملک میں کوئی نئی چیز نہیں۔ مسلمانوں نے اس ملک میں داخل ہوتے ہی اخبار و اطلاعات کی نشر واشاعت کا کام زمانے کے حالات کے مطابق شروع کر دیا تھا۔ اور موجودہ صحافت اسی عمل کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔

حواشی

[۱] تاریخ گزیدہ، ایلیٹ سوم ۶۳
[۲] فرشتہ جلد اول صفحہ ۹۱
[۳] فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۶-۶۷
[۴] فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۱۳-۱۱۴
[۵] روضۃ الصفا، میر خوند، ایلیٹ چہارم، ۱۳۸-۱۳۹
[۶] دیباچہ بر ''الہند'' از سخاؤ۔
[۷] فرشتہ (بحوالہ جامع الحکایات)، اول، ۱۳۷
[۸] تاج المآثر، حسن نظامی، ایلیٹ دوم، ۲۱۵
[۹] فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۰۰
[۱۰] طبقات ناصری، صفحہ ۵۵۲
[۱۱] فتوحات فیروز شاہی ایلیٹ سوم ۳۸۳
[۱۲] طبقات ناصری ریورٹی صفحہ ۶۳۷
[۱۳] ابن بطوطہ ایلیٹ سوم ۵۹۳
[۱۴] طبقات ناصری صفحہ ۶۷۸-۶۷۹
[۱۵] فرشتہ جلد اول صفحات ۲۵۱-۲۵۲۔ ۲۵۸-۲۵۹
[۱۶] فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۵۲۔ ۲۵۸
[۱۷] تاریخ فیروز شاہی، برنی، ایلیٹ سوم ۱۱۰، فرشتہ جلد اول ۲۶۵-۲۶۷
[۱۸] فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷۱
[۱۹] فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷۱

[۲۰] عبدالحق حقی دہلوی ایلیٹ ششم ۴۸۵
[۲۱] فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۶
[۲۲] عبدالحق حقی دہلوی ایلیٹ ششم ۴۸۴
[۲۳] فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۷
[۲۴] مسالک الابصار ابوالعباس احمد ایلیٹ سوم صفحہ ۵۸۰
[۲۵] عفیف ایلیٹ سوم ۳۱۷
[۲۶] عفیف ایلیٹ سوم صفحہ ۳۴۰
[۲۷] برنی ۵۶۲-۵۶۶
[۲۸] فرشتہ، ایلیٹ ششم ۲۲۷
[۲۹] عفیف، ایلیٹ جلد دوم ۳۳۵
[۳۰] فرشتہ جلد اول ۵۸۱
[۳۱] واقعات مشتاقی ایلیٹ چہارم ۴۵۱
[۳۲] فرشتہ جلد دوم ۲۹۶
[۳۳] فرشتہ جلد دوم ۳۴۹-۳۵۰
[۳۴] فرشتہ جلد دوم ۳۶۵ سے ۳۸۸ تک۔
[۳۵] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۵۱۰-۵۱۱
[۳۶] تاریخ ہند میڈوز ٹیلر ۱۸۵۔
[۳۷] فرشتہ جلد دوم ۵۱۴۔
[۳۸] فرشتہ سوم ۸-۳۰-۳۱
[۳۹] فرشتہ سوم ۲۰۶-۲۰۷
[۴۰] فرشتہ سوم ۴۸۳
[۴۱] فرشتہ چہارم ۱۹۶-۱۹۷
[۴۲] فرشتہ چہارم ۲۳۶-۲۳۷
[۴۳] فرشتہ چہارم ۲۸۶۔
[۴۴] فرشتہ دوم ۱۰۰
[۴۵] عبدالحق حقی۔ ایلیٹ چہارم ۴۸۷۔
[۴۶] مآثر رحیمی۔
[۴۷] جونپور نامہ خیر الدین الہ آبادی۔
[۴۸] تذکرۃ العلماء

[۴۹] فرشتہ چہارم ۳۸۵
[۵۰] مآثر رحیمی
[۵۱] تاریخ بنگال سٹوارٹ ۱۱۱
[۵۲] تاریخ بنگال سٹوارٹ ۴۰۸
[۵۳] سیرالمتاخرین انگریزی دوم ۶۱۔۷۰
[۵۴] تاریخ مظفری۔محمد علی خاں انصاری۔مخطوطہ ۱۴۔۱۵
[۵۵] ایلیٹ چہارم ۱۴۱۔۱۴۳
[۵۶] توزک بابری ارسکین ۵۰۔۵۱
[۵۷] منتخب التواریخ عبدالقادر بدایونی رینکنگ ۴۴۹۔
[۵۸] فرشتہ دوم ۷۰۔۷۱۔
[۵۹] اکبرنامہ اول ۳۰۹ توزک جہانگیری ۲۱
[۶۰] منتخب التواریخ (رینکنگ) اول ۶۱۰
[۶۱] سی سٹیفن آثار قدیمہ دہلی ۳۰۷
[۶۲] منتخب التواریخ اول ۴۶۶۔تاریخ شیر شاہی ایلیٹ چہارم ۳۱۱۔
[۶۳] منتخب التواریخ اول ۵۰۷۔ ۵۰۸
[۶۴] توزک جہانگیری راجندر بیوریج صفحہ ۳۳
[۶۵] واقعات جہانگیری ۴۴۔۴۵
[۶۶] فرشتہ دوم ۱۹۳۔۱۹۴۔
[۶۷] اکبرنامہ بیوریج اول صفحہ ۵۱
[۶۸] آئین اکبر (بلوکمین)
[۶۹] تراجم کتب کی یہ تمام تفصیلات منتخب التواریخ (ملا عبدالقادر بدایونی) اور آئین اکبری ابوالفضل) سے ماخوذ ہیں۔
[۷۰] منتخب التواریخ۔ ایلیٹ پنجم ۵۴۸
[۷۱] اخبار الاخیار عبدالحق ۳۵۷
[۷۲] منتخب التواریخ ایلیٹ پنجم ۴۹۴
[۷۳] منتخب طبقات اکبری
[۷۴] مندرجہ بالا معلومات کا ماخذ ''مآثر رحیمی'' ہے۔
[۷۵] منتخب التواریخ دوم ۲۷۸
[۷۶] واقعات جہانگیری ایلیٹ ششم ۳۱۵۔۳۶۰

[۷۷] منتخب اللباب خافی خاں اول ۲۴۹

[۷۸] اقبال نامہ جہانگیری۔ ۳۶۰

[۷۹] آثار الصنادید باب سوم ۶۹

[۸۰] نرندر ناتھ لا۔ ۱۸۶

[۸۱] مراۃ احمدی محمد علی خاں اول ۳۶۳۔

[۸۲] خلاصۃ التواریخ سوجان رائے۔

[۸۳] یہ تمامتر معلومات مآثر عالمگیری۔ عالمگیر نامہ (منشی محمد کاظم) اور جادو ناتھ سرکار سے ماخوذ ہیں۔

[۸۴] تاریخ فرخ آبادی۔ محمد ولی اللہ ۲۲۷۔

[۸۵] آثار قدیمہ دہلی۔ سٹیفن ۳۶۹

[۸۶] عبرت نامہ فقیر خیر الدین محمد ایلیٹ ششم ۲۰۹۔

[۸۷] فرشتہ چہارم ۲۳۶

[۸۸] ہمایوں نامہ گلبدن بیگم صفحہ ۷۶

[۸۹] آئین اکبری (بلاک مین) ۳۰۹

[۹۰] فتح پور سیکری سمتھ اول ۸

[۹۱] پریچنگ آف اسلام آرنلڈ۔

[۹۲] تاریخ اولیائے گجرات۔

[۹۳] آب کوثر۔ شیخ محمد اکرام۔ صفحہ ۴۷

[۹۴] آب کوثر۔ محمد اکرام ۵۱

[۹۵] آب کوثر۔ محمد اکرام۔ ۵۳۔ ۲۵۴۔

[۹۶] کناش کسی خاص کتاب کا نام نہیں۔ ہر جامع طبی کتاب کو کناش کہتے تھے۔ چنانچہ عہدِ عباسیہ میں تقریباً سات کناشات کا سراغ ملتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

[۹۷] اریبین میڈیسن، ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل، صفحہ ۶۵-۶۶

[۹۸] اریبین میڈیسن، ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل، ۷۸

[۹۹] انگریزی ترجمہ، چہار مقالہ، ۱۵۵

[۱۰۰] اریبین میڈیسن، ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل، ۶۹

[۱۰۱] طب اسلامی حکیم محمد یحییٰ خاں، ۱۵۷ سے (ملخصاً)

[۱۰۲] تاریخ فرشتہ، ۱۳۳

[۱۰۳] فتوحاتِ فیروز شاہی

[۱۰۴] آثارِ خیر، ۸۹

[۱۰۵] آثارِ خیر، ۹۱

[۱۰۶] تاریخ الاطبا، ۴۸۴

[۱۰۷] آثار الصنادید، صفحہ ۹۶

[۱۰۸] الشاہیر، ۲۲۹۔طب العرب، ۴۳۷ [۱۰۹] رموز الاطبا، جلد اوّل، ۳۰
[۱۱۰] طب العرب (واسطی)، ۴۳۷-۴۳۸ [۱۱۱] دیباچہ توزکِ جہانگیری، صفحہ ۱۹
[۱۱۲] توزکِ جہانگیری، صفحہ ۹۱ [۱۱۳] توزکِ جہانگیری، ۲۴۰
[۱۱۴] توزکِ جہانگیری، ۲۸۶ [۱۱۵] توزکِ جہانگیری، ۲۸۶
[۱۱۶] عہد شاہ جہانی کے شعرا کا حال ماخوذ از مقالہ پروفیسر غلام سرور، در ''ہلال'' جلد دوم، شمارہ دوم۔
[۱۱۷] شیخ محمد اکرام، ثقافتِ پاکستان، ۱۹۲ [۱۱۸] پریس اِن مسلم ورلڈ، ۱۹۵۴ء
[۱۱۹] مسعودی بحوالہ فلپ ہٹی [۱۲۰] طبقاتِ ناصری، منہاج السراج
[۱۲۱] طبقاتِ ناصری، منہاج السراج [۱۲۲] تاریخ فیروز شاہی، برنی
[۱۲۳] تاریخ فیروز شاہی، برنی [۱۲۴] عباس خان سروانی، تاریخ شیر شاہی
[۱۲۵] آئینِ اکبری، ابوالفضل [۱۲۶] سٹور یا ڈوموگر، منوچی۔
[۱۲۷] توزکِ جہانگیری۔ [۱۲۸] بادشاہ نامہ، عبدالحمید لاہوری
[۱۲۹] ''اُردو صحافت''، بحوالہ انڈین پریس، از مارگریٹ بارنس۔

پانچواں باب

فنون لطیفہ

پہلی فصل : باغات

ہندو اور پھول

بابر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں پھول باغ نہیں ہیں۔ اور یہاں کے باشندے وحشی اور غیر مہذب واقع ہوئے ہیں۔ جہاں تک پھولوں کا تعلق ہے بابر کا یہ قول مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہندو ازمنۂ قدیمہ سے پھولوں کے دلدادہ چلے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ مہا بھارت میں جا بجا پھولوں اور پھول باغوں کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی و معاشرتی رسوم میں پھول اب تک ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی دیوی دیوتا کی پوجا پھولوں کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں پھول برابر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مرنے والے کی ارتھی پر پھول اور پھولوں کے ہار رکھے جاتے ہیں۔ نئی دلہنوں کی سیجیں پھولوں سے آراستہ کی جاتی ہیں۔ تقریبوں پر پھولوں کے سہرے، ہار اور گجرے گوندھے جاتے ہیں۔ اور ہندو عورتیں ہمیشہ پھولوں کا گہنا پہنتی رہی ہیں اور یہ رواج یہاں تک عام ہوگیا ہے کہ مسلمان عورتیں بھی اب پھولوں کے گہنے بڑے شوق سے پہنتی ہیں۔

مسلم سلاطین اور باغات

حقیقت یہ ہے کہ بابر جس زمانے میں واردِ ہند ہوا۔ اور اس ملک کے جس حصے میں اس کو رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت ہندوؤں کے باغات زیادہ تر ویران ہو چکے تھے۔ بلکہ مسلم سلاطین کے لگائے ہوئے باغ بھی بے توجہی کی نذر ہو رہے تھے۔ ورنہ امیر خسرو اور ملک محمد جائسی نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کے پھولوں اور پھول باغوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا

ہے۔[۱] امیر خسرو نے جن پھولوں کا ذکر کیا ہے ان میں بنفشہ، یاسمین اور نسرین کے علاوہ جو ایران سے آئے تھے ہندوستانی پھولوں مثلاً بیلا، کیوڑہ، چمپا، مولسری، سیوتی، ڈمرا، کرنا اور لونگ کے نام بھی شامل ہیں۔ پھر گلِ کوزہ، گلِ صد برگ اور کرن پھل (قرنفل یعنی لونگ) بھی مذکور ہیں۔ جن کے نام مسلمانوں نے رکھ لیے لیکن حقیقت میں وہ ہندوستانی پھول تھے۔ بلکہ خسرو ہندوستانی پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر یہی پھول روم و شام میں ہوتے اور ان کے نام عربی یا فارسی میں ہوتے تو ان کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہو جاتا۔''دیول رانی خضر خاں'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

چہ بینی ارغوان و لالہ خنداں
کہ رنگے ہست و بوئے نیست چنداں

گل مارا بہندی نام زشت است
وگرنہ ہر گلے باغ بہشت است

گر ایں گل خاستے در روم یا شام
کہ بودے پارسی یا تازی اش نام

شدے معلوم تا مرغانِ آں بوم
چساں غلغل زوندے در روے روم

کدامیں گل چنیں باشد کہ سالے
دہد بو دور ماندہ از نہالے[۲]

مغلوں سے پہلے جو سلاطین ہندوستان میں برسرِ حکومت رہے۔ انہوں نے یہاں کے باغات کو ترقی دی۔ کیقباد دوسرے اعتبارات سے ایک نکما بادشاہ تھا لیکن اس نے دہلی سے چند کوس دور کالوگڑھی میں ایک عظیم الشان باغ لگایا۔ اور جب جلال الدین خلجی نے دہلی میں داخل ہونے سے پہلے اس مقام پر سکونت اختیار کی تو وہاں نئے باغات لگوائے اور شاندار روشیں بنائیں۔ فیروز شاہ تغلق نے کوئی بارہ سو باغات دہلی کے آس پاس اسّی سلورا کے کنارے اور چوالیس چتوڑ میں لگائے۔ چتوڑ کے علاوہ دھول پور، گوالیار، جودھ پور اور دوسرے مقامات پر باغات میں بے حد اضافہ ہوا۔[۳]

اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے خود مختار بادشاہوں نے بھی اپنی اپنی سلطنتوں میں

شاندار باغات لگائے۔ گولکنڈہ، گجرات، بدایوں اور بعض دوسرے مقامات پر ایسے باغات مرتب کیے گئے جن کی تعریف یورپین سیاحوں نے بھی نہایت فیاضی سے کی ہے۔[۴]

مغلوں کی آمد

اس میں شک نہیں کہ مغلوں کے ورود کے بعد ہندوستان میں ہر ثقافتی سرگرمی نے ایک بالکل نیا رنگ اختیار کیا اور وسط ایشیا کے ان مہذب اور ترقی یافتہ لوگوں نے باغات کی ترتیب و تہذیب میں بھی انقلابی تبدیلیاں کردیں۔ انہوں نے باغات کے پرانے خاکے کو بدل کر ان میں درختوں، پھلواڑیوں، فواروں، آبشاروں اور سرو وشمشاد کی قطاروں کو سمیلپن اور آرائش کے ساتھ مرتب کیا۔ ان کے باغوں میں چنار اور سرو وصنوبر کے جو درخت لگائے گئے ان میں سے اکثر آج تک موجود ہیں۔ فی الحقیقت مغلوں نے اس ملک میں باغ کے تصور کو بالکل نئی شکل دے دی۔[۵]

ہندوستان کے پھول

ابوالفضل نے ہندوستان میں تین قسم کے پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ جو اپنی بھینی بھینی اور مست کن خوشبو کے لیے مشہور ہیں۔ دوسرے وہ جو رنگ کے اعتبار سے نظر فریب ہیں اور تیسرے وہ جو ایران وتوران سے لاکر یہاں لگائے گئے۔ پہلی فہرست میں یہ پھول شامل ہیں:

سیوتی، بھول سری، چمبیلی، رائے بیل، مونگرا، چمپا، کیتکی، کوزہ، پدل، جوہی، نیواری، نرگس، کیوڑہ، گلال، تسبیح گلال، سنگار ہار، بنفشہ، کرنا، کپور بیل، گلِ زعفران۔

دوسری فہرست یہ ہے:

گلِ آفتاب یعنی سورج مکھی، گل کنول، جعفری، گودھل، رتن منجنی، کیسو، سمیبل، رتن مالا، سون زرد، گلِ مالتی، کرن پھل، کریل، کنیر، کدم، ناگ کیسر، سورپن، چمپلا، لاہی، گل کروندہ، دھنتر، گلِ حنا، دوپہریا، بھون چمپا، سدرشن، کنگائی، سرس، سَن۔

ایران وتوران کے بے شمار پھولوں میں سے اس نے ان پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ گلِ سرخ، نرگس، یاسمن کبود، سوسن، ریحان، رعنا، زیبا، شقائق، تاجِ خروس، قلغہ، نافرمان، خطمی۔[٦]

بابر اور ہمایوں

بابر نے جو باغ لگائے۔ ان میں کابل کے باغ وفا، اور باغ کلاں اور آگرہ کے رام

باغ اور زہرا باغ قابلِ ذکر ہیں۔اس کے بیٹے کامران نے جو لاہور کا حاکم تھا۔ راوی کے کنارے سب سے پہلا مغل باغ لگایا جو اب نابود ہے۔صرف اس کی بارہ دری کے کھنڈر موجود ہیں جن سے دریائے راوی کی لہریں اپنا سر پھوڑتی ہیں۔ ہمایوں نے ایک جدت کی کہ دریائے جمنا پر ایک ''تیرتا ہوا باغ'' لگایا جو تمام تر لکڑی کے تختوں پر مرتب کیا گیا تھا۔[۷] اکبر کے عہد میں فتح پور سیکری بالکل باغوں کا شہر بن گیا تھا۔کشمیر میں ہری پربت کے قلعہ کی تعمیر ۱۵۹۷ء میں مکمل ہوئی۔جس پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔اس کے بعد اکبر نے جھیل ڈل کے کنارے نسیم باغ کی بنیاد رکھی۔ اکبر اور جہانگیر نے کشمیر میں جو باغ تعمیر کیے ان کا سرسری تذکرہ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لیے ان کا کسی قدر تفصیلی ذکر کیا جائے گا تاکہ پڑھنے والے مغل بادشاہوں کے حسن مذاق کا اندازہ کرسکیں۔

ثقافتی اہمیت

حقیقت میں یہ باغات بہت بڑی ثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔مغلوں نے یہ باغات صرف اپنے لیے اپنے امرا اور اپنی بیگمات ہی کے لیے نہیں بنائے تھے بلکہ انہوں نے عام ناظرین کو حسن فطرت سے آشنا کرنے اور پھلوں اور پھولوں، درختوں، اور نظر فریب نظاروں کی قدر کرنے کا اہل بنانے کے لیے یہ بہشت سجائے تھے جن کی سیر سے شعر و ادب، مصوری و موسیقی، روحانیت اور خدا شناسی کے میلانات کو تقویت پہنچتی تھی۔ شاعر، مصور اور صوفی یکساں طور پر ان باغوں سے تخیل، تصور اور تصوف کے اثرات اخذ کرتے تھے۔گویا ان باغوں کی افادیت کتب خانوں اور مدرسوں سے ہرگز کم نہ تھی۔ یہ نکتہ اربابِ ذوقِ سلیم کے غور کے قابل ہے جس طرح مغلوں کی عمارتوں میں ان کا ایک خاص انداز نمایاں ہے اور کسی عمارت کو دیکھ کر آسانی سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ یہ مغلوں کی بنائی ہوئی ہے یا نہیں۔ اسی طرح مغلوں کے باغات بھی ایک خاص ہیئت رکھتے ہیں۔ چاروں طرف بلند دیواریں۔ باغ کے وسط میں صاف شفاف پانی کا ایک پایاب حوض۔ باغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک چھوٹی سی پایاب نہر جس میں برابر برابر فاصلے سے فوارے لگے ہوئے آس پاس پھولوں کی کیاریاں۔ ان کے پیچھے وسیع سبزہ زار جن میں چنار اور صنوبر کے اونچے اور گھنے درخت تعمیر میں حسن و جمال اور علم ہندسہ کے مطابق صحیح و درست ہم آہنگی اور سمیلپن۔ یہ خصوصیتیں مغلوں کے ہر باغ میں نظر آئیں گی۔ باغ آرائی کے

اس طریقے کو ''خیابان بندی'' کہتے تھے۔

نسیم باغ

کشمیر میں ڈل کے کنارے سب سے پرانا باغ ''نسیم باغ'' ہے جس کو اکبر نے بنایا۔ اب اس کی فصیل ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ اور مغل باغ کی دوسری خصوصیتیں بھی معدوم ہو چکی ہیں۔ البتہ بے شمار چنار کے درخت موجود ہیں۔ جن کے متعلق مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ شاہجہان کے زمانے میں لگائے گئے تھے۔ کیوں کہ اس بادشاہ کے مشہور انجینئر علی مردان خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں چنار کو سب سے پہلے اس نے رائج کیا۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ نے لکھا ہے کہ نسیم باغ شاندار چناروں کی قطاروں کا ایک سلسلہ ہے جو ایک دوسرے سے زاویہ قائمہ بناتی چلی گئی ہیں۔ اور ہر قطار کوئی تین سو گز لمبی ہے۔ ان درختوں کے نیچے نرم اور سبز گھاس کا فرش بچھا ہے اور یہ جگہ پانی سے کوئی بیس تیس فٹ اونچی ہے۔ پھولوں کی کیاریاں نہیں ہیں۔ لیکن یہاں ڈیرے لگائے جاسکتے ہیں اور موسم گرما میں بہت سے ہاؤس بوٹ یہیں لنگر انداز ہوتے ہیں۔ چناروں کی چھاؤں میں سے جھانک کر دیکھو تو دوسری طرف شالا مار باغ نظر آتا ہے۔ جس کے پیچھے وادی دچگنگ اور اوپر مہادیو کی برف پوش چوٹی دکھائی دیتی ہے۔ باغ کے مقابل کی سمت پر جھیل سے علیحدہ ہو کر نظر ڈالو تو وادیٔ کشمیر سے پرے پیر پنجال اور سلسلۂ کاغان کے پہاڑوں کی برف نظر آتی ہے۔[۸]

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے جو ۱۸۹۷ء میں کشمیر آئے تھے لکھا ہے کہ اب نسیم باغ میں نہ کوئی عمارت باقی ہے، نہ فوارے ہیں، نہ پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ اور اب یہ باغ صرف ان لوگوں کے لیے سکون بخش ہے جو زندگی کے مرحلہ شباب سے گزر کر شامِ زندگی کی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔

نگین باغ:

سری نگر سے کوئی چھ میل کے فاصلے پر نگین باغ واقع ہے۔ اب اس باغ میں صرف پرانی روشیں اور چنار کے شاندار درخت ہی باقی ہیں۔ ڈاکٹر سنہا نے لکھا ہے کہ اس باغ کی عمارتیں، اس کے بُرج، اس کی نہریں سب غائب ہو چکی ہیں۔ اس کے ایک حصے میں دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ چوں کہ یہ باغ ایک چھوٹی سی جھیل کے گرد واقع ہے۔ اس لیے اس میں نہانے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس کے سامنے تختِ سلیمان، قلعہ ہری پربت، پیر پنجال اور مہادیو

کی چوٹی کے مناظر اب بھی بے حد دلفریب ہیں۔

شالامار باغ

کشمیر کے مغل باغات میں سب سے زیادہ خوبصورت اور مشہور باغ یہی ہے جس کو جہانگیر اور اس کی محبوب ملکہ نور جہاں بے حد پسند کرتے تھے۔ ایک داستان مشہور ہے کہ سری نگر کے بانی راجا پرواسینا نے (۷۹ء تا ۱۳۹ء) جھیل ڈل کے کنارے ایک محل بنایا۔ جس کا نام شالامار (یعنی مقامِ محبت) رکھا۔ اس کے پاس ہی چشمہ ہاروَن پر راجا کے روحانی گرو سوامی سکھرام کا بسیرا تھا۔ راجا گرو کی سیوا میں حاضری دینے کے بعد اپنے اس محل میں آرام کرتا تھا۔ یہ محل اور اس کے باغات تو امتدادِ زمانہ سے ناپید ہوگئے لیکن ان کے کھنڈروں پر شالامار ہی کے نام سے ایک گاؤں آباد ہوگیا۔ جہانگیر نے اسی مقام کو باغ کے لیے منتخب کیا۔ اور ۱۶۱۹ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔

شالامار کی ساخت بالکل ایک شاہی محل کی سی ہے۔ باغ کا احاطہ سیر گاہِ عام تھا۔ جس میں اب ایک پختہ سڑک بنی ہوئی ہے۔ اصل باغ جھیل ڈل کے شمال مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ اس میں پہنچنے کا راستہ ایک نہر ہے۔ جو تقریباً ایک میل لمبی اور بارہ گز چوڑی ہے۔ دونوں کناروں پر سبزہ زار اور چنار اور بید مجنوں کے درختوں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ ایک اور سڑک جو نو میل لمبی ہے سرینگر سے شالامار تک جاتی ہے۔ یہ باغ تین الگ الگ حصوں میں منقسم ہے۔ بیرونی باغ شہنشاہی باغ اور زنانہ باغ۔ تینوں میں سے آخری حصہ بے حد خوبصورت ہے۔ بیرونی باغ ''دیوان عام'' پر ختم ہوتا ہے۔ ایک نہر اس عمارت میں بہتی ہوئی نیچے تالاب میں گرتی ہے۔ اس کے آغاز میں آبشار ہے اور آبشار کے اوپر سیاہ مرمر کا تخت اب تک موجود ہے۔ کبھی کبھی یہ باغ عوام کے لیے بھی کھول دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ شہنشاہ کا دیدار کرسکیں۔ دوسرا باغ ذرا زیادہ وسیع ہے۔ اس کے مرکز میں دیوانِ خاص ہے۔ یہ عمارتیں اب نابود ہوچکی ہیں لیکن ان کی سنگین بنیادیں ایک نفیس چبوترہ اور فوارے اب بھی موجود ہیں۔ اس احاطے کی شمال مغربی حد پر شاہی حمام واقع ہیں۔

یہ باغ ۵۹۰ گز لمبا اور ۲۶۷ گز چوڑا ہے۔ صرف ایک مرمریں شامیانے کے سوا باقی تمام عمارتیں کھنڈر ہوچکی ہیں۔ نہر، تالاب اور فوارے موجود ہیں۔ آس پاس کے کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ باغ زیادہ وسیع اور فراخ ہوگا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر کیپٹن جان نائٹ نے جو ۱۸۶۱ء میں یہاں آیا۔ برنیئر نے جو اورنگ زیب کے عہد میں کشمیر وارد ہوا۔ اور ہمارے زمانے میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ نے شالا مار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے اس باغ کی شوکتِ رفتہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

نشاط باغ

اگرچہ نشاط باغ کی پرانی خوبصورتی اور شان و شوکت افسانۂ پارینہ ہو چکی ہے لیکن اب بھی وہ اپنے منظر کے اعتبار سے کسی طرح شالا مار باغ سے کم نہیں۔ اس باغ کا خاکہ نور جہاں بیگم کے بھائی آصف خاں نے تیار کیا تھا۔ اس کے بارہ تختے ہیں۔ جو ڈل کے کنارے سے شروع ہو کر پس منظر میں پہاڑ تک ختم ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں اس باغ تک پہنچنے کے لیے ایک پل بنایا گیا تھا۔ یا جھیل ڈل میں سے شکاروں پر سوار ہو کر پہنچتے تھے۔ ایک نہر پورے باغ کے درمیان بہتی ہے جس کا پانی آبشاروں، فواروں اور تالابوں میں بہار دکھاتا ہے۔ رنگا رنگ پھولوں کے تختے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ صنوبر کے عظیم درخت کھڑے ہیں اور سبزہ زار عجیب و غریب ترتیب اور خوشنمائی کے سرمایہ دار ہیں۔ یہ باغ ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ جو سری نگر کے گرداگرد پھیلا ہوا ہے۔ ایک پل اس کو ڈل کے وسط میں ایک مصنوعی جزیرے سے ملاتا ہے۔ جس پر چار نہایت خوبصورت چنار کھڑے ہیں۔ اس میں ایک سنگین شامیانہ ''چہل ستون'' کے انداز میں بنا ہوا ہے۔ لیکن محرابیں چینی اندازِ تعمیر سے مشابہ ہیں۔

نشاط باغ ۵۹۵ گز لمبا اور ۳۶۰ گز چوڑا ہے۔ آصف خاں کا باغ ہونے کی وجہ سے یہ شہنشاہی باغ نہیں۔ لیکن یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک مردانہ دوسرے زنانہ۔ اس کے گرد بھی اونچی فصیل کھچی ہوئی ہے تاکہ بیگمات کے لیے پردے کا انتظام رہے۔ فصیل کے چاروں طرف ہشت پہلو برج بنے ہوئے ہیں۔ جن میں ٹیڑھے میڑھے زینے ہیں۔ تاکہ بالائی منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ تیسرے تختے پر ایک دو منزلہ شامیانہ سا ہے۔ جو کشمیری عمارتوں سے ملتا جلتا ہے۔ اور پرانی عمارت کی بنیادوں پر بعد میں بنایا گیا ہے۔ مسز سٹوارٹ لکھتی ہیں کہ زیریں منزل کا طول ۵۹ فٹ اور عرض ۴۸ فٹ ہے۔ اور دونوں طرف چوبی جالی کی کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں۔ درمیان میں چودہ فٹ لمبا، چودہ فٹ چوڑا اور تین فٹ گہرا ایک ذخیرۂ آب ہے۔ جس میں پانچ سنگین فوارے ہیں۔ جن میں سے صرف وسطی فوارہ سلامت ہے۔ آخری سرے پر بیگمات کا

حصہ ہے جو بے حد خوبصورت بنا ہوا ہے۔ لیکن اس کی اندرونی عمارتیں اب قریب قریب کھنڈر ہو چکی ہیں۔

ہبک باغ

نسیم باغ کے شمال میں ایک اور باغ کے کھنڈر واقع ہیں۔ جس کو ہبک باغ کہتے ہیں۔ کشمیر کے ایک مغل گورنر سیف خاں نے ایک ایسا باغ بنانے کا ارادہ کیا جو شالا مار اور نشاط سے بھی بہتر ہو۔ اس نے ایک ندی سندھ سے ایک نہر کاٹی۔ تاکہ اس سے باغ کے فوارے اور آبشار رواں ہو سکیں۔ ابھی اس نے باغ کے تخت ہی تعمیر کیے تھے کہ اس کو دربار آگرہ سے بلاوا آ گیا اور اس باغ کی تکمیل کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ اگر یہ باغ سیف خاں کے منصوبے کے مطابق مکمل ہو جاتا تو بلاشبہ شہنشاہی باغات کا مقابلہ کرتا لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔ بہر حال اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ کی مثال نے ان کے امراء و حکام کو بھی اس قدر خوش ذوق اور عالی ہمت بنا دیا تھا کہ وہ ان سرگرمیوں پر روپیہ اور توجہ صرف کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

داراشکوہ کا باغ

اورنگ زیب کے بھائی داراشکوہ نے کشمیر میں جہلم کے کنارے ایک باغ لگایا جو قصبہ بیج بہاڑہ کے بالمقابل واقع ہے اس کا نقشہ بھی دوسرے مغل باغات سے ملتا جلتا ہے۔ اور اس میں بھی ایک دوسری کو قطع کرتی ہوئی روشوں کے آس پاس چناروں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ مور کرافٹ جو انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر آیا تھا، لکھتا ہے کہ اس باغ میں چنار کے بڑے بڑے شاندار درخت ہیں۔ وسط میں تالابوں کی ایک قطار ہے جو ایک نہر سے باہم ملے ہوئے ہیں۔ اور ایک چھوٹے سے کوشک کے کھنڈر بھی موجود ہیں۔ اس عمارت کے نیچے ایک دریائی تختہ ہے۔ جس کے بالمقابل جہلم کے دوسرے کنارے پر بھی اسی نمونے کا تختہ بنا ہوا ہے اور درمیان میں ایک سنگین پل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دریا کے دونوں کناروں پر ایک ہی نمونے کے دو باغ لگانا مقصود تھا۔ اس باغ کی آبیاری کے لیے لِدرندی سے ایک نہر کاٹی گئی تھی۔ مور کرافٹ نے بتایا ہے کہ وسط میں ایک بڑا تالاب تھا جس کے اردگرد نہایت عریض پھلواڑیاں تھیں۔ اور تالاب کے درمیان ایک خوبصورت بارہ دری بنائی گئی تھی۔ باغ کی فصیل ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ لیکن ہشت پہلو برجوں کے کھنڈر اس کی بنیادوں کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ اس باغ کو وزیر باغ

بھی کہتے ہیں۔ اور برنیئر کا بیان ہے کہ یہ شاہ جہاں کے ایما سے تعمیر کیا گیا تھا۔

داروغہ باغ

سری نگر سے کوئی اٹھارہ میل دور ایک نہایت خوبصورت جھیل منسابل کے نام سے مشہور ہے۔ شدید گرمی کے موسم میں بھی اس کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا رہتا ہے۔ اور آس پاس کے مناظر بھی بے حد دلفریب ہیں۔ اس جھیل کے شمال مشرقی کنارے پر بہت سے مغل باغات کے کھنڈر موجود ہیں۔ جن میں سب سے بڑا ''داروغہ باغ'' ہے۔ یہ ایک شاہی محل ہے جو نور جہاں بیگم کے لیے بنایا گیا تھا۔ اب اس کو لالہ رخ باغ بھی کہتے ہیں۔ اس کی فصیل اور اس کے برج اب بھی جھیل کے کنارے کھڑے ہیں۔ جھیل منسابل کے بالائی سرے پر ایک اور مغل باغ کے آثار موجود ہیں۔ جو اکبر نے بنایا تھا۔ اکبر کے دیگر باغات کا تذکرہ بھی ابوالفضل کی آئین اکبری اور اکبر نامہ میں ملتا ہے۔ لیکن اب ان باغات کا کوئی نشان تک باقی نہیں۔

چشمہ شاہی

پروفیسر آلدوس ہکسلے نے اپنے مشہور سفر نامے میں لکھا ہے کہ سری نگر کے قریب جو باغات ہیں۔ ان میں فن تعمیر کے اعتبار سے دلکش ترین باغ چشمہ شاہی ہے۔ ۱۶۳۲ء میں شاہ جہاں نے یہاں ایک بارہ دری بنائی اور ایک باغ لگا کر اس میں فوارے اور آبشار بنوائے۔ یہ باغ بھی دوسرے مغل باغات کی مانند تختہ در تختہ ہے۔ اس چشمے کا پانی مسلمہ طور پر کشمیر کے تمام چشموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اوپر کی بارہ دری میں ایک سنگین ساخت کے اندر یہ چھوٹا سا چشمہ ابل رہا ہے اور یہاں سے اس کا پانی بہہ کر زیریں تختوں کی طرف جاتا ہے۔ اس بارہ دری کے سامنے کوئی ایک ایکڑ کے مستطیل میں ایک خوش نما باغ بنا ہوا ہے جس کے دو تختے ہیں۔ دوسرے تخت کے وسط میں ایک حوض ہے جس میں صرف ایک فوارہ لگا ہے۔ اور یہاں سے پانی تیسرے تختے کی طرف رواں رہتا ہے۔ یہ باغ کشمیر کے تمام مغل باغات میں چھوٹا ہے۔ لیکن اس کی دلفریبی میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔ بالائی عمارتوں میں افغان اندازِ تعمیر جھلکتا ہے۔ بہر حال یہ عمارتیں پرانی سنگین بنیادوں ہی پر اٹھائی گئی ہیں۔

ویری ناگ باغ

سری نگر سے پچاس میل دور درہ بانہال کے نیچے چشمہ ویری ناگ واقع ہے۔ پہلے یہ

چشمہ محض ایک جوہڑ کی شکل میں تھا۔ جس کا پانی اِدھر اُدھر پھیل جاتا تھا۔ جہانگیر نے ۱۶۰۹ء میں چشمے کے گرد ایک ہشت پہلو سنگین حوض تعمیر کرایا۔ جس کے گرداگرد محراب دار رواقیں بنائیں۔ اس باغ کے پہلے تختے کی چوڑائی میں چھوٹی چھوٹی محرابیں بالائی عمارت کو سنبھالے کھڑی ہیں جس کی صرف ایک منزل باقی ہے۔ ایک پختہ سڑک اور ناتراشیدہ پتھروں کی ایک دیوار نے اس تختے کو اور نہر کے چوبی پل کو نظروں سے اوجھل کر کے اس مقام کے حسن کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اصل نہر کوئی تین گز چوڑی ہے جس میں ایک اور نہر آ کر ملتی ہے۔ اور وہ براہِ راست عمارت کے نیچے بہ رہی ہے۔ حوض کے گرد بے شمار چھوٹے چھوٹے طاق ہیں جن میں غالباً چراغ جلائے جاتے ہوں گے۔ جیسے مثلاً لاہور کے شالامار باغ کے ایک مرمریں حوض میں اب بھی چراغاں کیا جاتا ہے۔ اس وقت باغ کی رونق قابلِ دید ہوگی۔ شاہ جہاں نے ۱۶۲۷ء میں اس چشمے کے سامنے ایک خوش نما باغ لگایا جس میں نہریں، آبشار اور فوارے بھی مہیا کیے۔ اب صرف اس باغ کا پہلا تختہ باقی ہے۔ لیکن حمام، چبوترا اور دوسری عمارتوں کے کھنڈر اس کی وسعت و عظمت کا پتا دیتے ہیں۔ ویری ناگ باغ کے سیب آج بھی کشمیر بھر میں بہترین سمجھے جاتے ہیں۔

اچھابل باغ

کشمیر کے قدیم صدر مقام اسلام آباد سے کوئی سات میل دور اچھابل کے چشمے پر بھی مغلوں کا ایک باغ موجود ہے جس کے تین تختے تھے۔ اور تینوں میں علیحدہ علیحدہ آبشار، تالاب اور فوارے نصب تھے۔ زیریں تختہ زمانۂ حاضر میں ختم ہو چکا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک سڑک بنا دی گئی ہے۔ اس لیے یہ باغ اصل سے بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ پہاڑی کے نیچے سے چشمہ اچھابل کا پانی ابلتا اور اچھلتا ہوا نکلتا ہے اور اس کی صفائی، تازگی اور صحت بخشی ہر زمانے کے ماہرینِ طب کے نزدیک مسلّم رہی ہے۔ باغ کی نہر اور اس کے تالاب میں ستر اسّی فوارے لگے ہوئے ہیں۔ اور آس پاس کے سبزہ زاروں کے ساتھ روشوں کے کنارے کنارے سیب، ناشپاتی، خوبانی اور دوسرے پھلوں کے بے شمار درخت لگے ہیں۔ چناروں کی قطاریں دوسرے مغل باغات کی طرح یہاں بھی بہار دکھا رہی ہیں۔ پھولوں کے تختے بھی دلفریب ہیں۔ عمارتوں میں سے صرف حرم کے کمرے اور حمام باقی ہیں۔ اور ان کی حالت بھی خراب ہے۔ بارہ دری کے دونوں طرف ایک سنگین چبوترا چناروں کی چھاؤں میں موجود ہے۔ رنبیر سنگھ ڈوگرے نے اس عمارت کی جگہ کشمیری

انداز کی ایک عمارت کھڑی کر دی۔ لیکن وہ مغل تعمیر کا کیا مقابلہ کرتی۔

پری محل باغ

جھیل ڈل کے جنوبی پہلو پر چشمہ شاہی سے کوئی ڈیڑھ میل دور ایک بہت بڑی قدیم عمارت کے کھنڈر نظر آتے ہیں جس کو پری محل کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عمارت شہزادہ داراشکوہ نے فلکیات کے مطالعہ کے لیے بطور رصد گاہ تعمیر کرائی تھی۔ بیرونی فصیل، کچھ زیبائشی محرابیں اور ایک بلند گنبد دار چھت اب بھی موجود ہے۔ پرانے زمانے میں اس رصد گاہ کے ساتھ بھی چھ اوپر تلے کے تختوں کا ایک باغ تھا۔ لیکن اب اس کے کھنڈر بھی نظر نہیں آتے۔

جس طرح شاہ جہاں کو عمارتیں بنانے کا شوق حد سے زیادہ تھا۔ اسی طرح جہانگیر اور نور جہاں کو باغ لگانے سے بے حد شغف تھا۔ چنانچہ کشمیر کے نشاط باغ، شالامار باغ، اچھا بل باغ، اور ویری ناگ باغ کا ذکر آچکا ہے۔ جو اسی بادشاہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اودے پور کا شاہی باغ، شاہدرہ لاہور میں باغِ دل کشاء اور بادامی باغ، آگرہ میں مقبرہ اعتماد الدولہ کا باغ اور حسن ابدال میں واہ باغ سب کے سب جہانگیر کے حکم سے معرضِ وجود میں آئے۔ جہانگیر کا مقبرہ باغ دل کشا میں تعمیر کیا ہوا ہے۔ امراء و وزراء بھی بادشاہ کے ذوق کی پیروی میں باغات لگاتے تھے۔ چنانچہ کشمیر میں آصف خاں کا نشاط باغ اور سیف خاں کا ہبک باغ اس کے شاہدِ عادل ہیں۔

لاہور کا شالا مار باغ

شاہ جہاں عمارت پسند تھا۔ لیکن مغل عمارتیں علی العموم باغ کے بغیر نہ ہوتی تھیں۔ اس لیے اس بادشاہ نے بھی قلعہ دہلی کے باغات، آگرہ میں تاج محل باغ، دہلی میں شالامار باغ اور لاہور میں شالا مار باغ تعمیر کرائے۔ لاہور کا شالامار باغ بھی ہوبہو مغلوں کے دوسرے باغات کا نمونہ ہے۔ وہی سبزہ زار، وہی قدیم اور شاندار درخت، وہی نہر، وہی تالاب، وہی فوارے، وہی بارہ دریاں، حمام اور حرم سرا اور تین اوپر تلے کے تختے۔ اس باغ کی داغ بیل ۱۶۳۷ء میں ڈالی گئی تھی۔ اگرچہ پنجاب کی دوسری شاہی عمارات کی طرح یہ عمارت بھی سکھوں کی دست برد اور زمانے کے امتداد کی وجہ سے اپنی اصلی شان و شوکت کھو چکی ہے۔ لیکن اب بھی اس کی دلفریبی میں کوئی کلام نہیں۔ شالامار باغ کا طول ۱۶۵۰ فٹ اور عرض ۷۳۰ فٹ ہے۔ تین تختے ہیں۔ سطح

کے اعتبار سے پہلا تختہ دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے بلند ہے۔

ہم نے اوپر کشمیر کے مغل باغات کا تفصیلی تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ مغلوں کی باغ آرائی کا بہترین مظاہرہ کشمیر ہی میں ہوا ہے۔ مقامی ماحول کی دلکشی، فطرت کا انتہائی جمال۔ زمین کا بے پناہ جوشِ نمو۔ یہ چیزیں میدانوں میں میسر نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ گو ملک بھر میں اعلیٰ درجے کے بے شمار باغات موجود تھے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی کشمیر کے نشاط اور شالامار کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔

اورنگ زیب کتنا ہی خشک مزاج سہی لیکن آخر مغل بادشاہ ہی تھا۔ اس نے بھی بے شمار باغ لگائے۔ جن میں بادشاہی مسجد لاہور کا باغ، دہلی کا روشن آراء باغ، لاہور کا چوبرجی باغ اور بعض دوسرے باغ قابلِ ذکر ہیں۔

مغلوں کو مناظر قدرت سے گہری وابستگی تھی اور جمالیاتی حِس کے معاملے میں وہ اہل ہند سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس ملک کے ہر ثقافتی مشغلے میں جان ڈال دی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے باشندوں کو قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دینے کی انتہائی کوشش کی۔ اس تربیت کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ بڑے بڑے باغات لگائے جائیں۔ جن میں پھولوں کے تختوں، پھلوں کے درختوں، نہروں، فواروں، آبشاروں، بارہ دریوں اور عمارتوں کا اجتماع مہیا کر کے لوگوں کو دعوت دی جائے کہ آؤ اور قدرت کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرو۔

شاہانِ مغل کا بار بار کشمیر کا دشوار گزار سفر اختیار کرنا، وہاں جاکر مہینوں رہنا اور اس وادی کے جنگلی حسن کو شہری شائستگی کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے چشموں اور باغوں کی ترتیب و تہذیب میں مصروف ہونا بھی اسی امر کا ثبوت ہے کہ وہ اس ملک کے لوگوں کو حسنِ مذاق کی نعمت سے مالا مال کرنا چاہتے تھے۔ جو ہر تہذیب و ترقی کی شرط اولین ہے۔

دوسری فصل: فنِ تعمیر اور معمار

مسلمانوں کے ورود سے قبل ہندوستان میں فنِ تعمیر کے بڑے بڑے شاہکار موجود تھے۔ لیکن وہ زیادہ تر ہندوؤں اور بودھوں کے مندروں اور مٹھوں کی شکل میں تھے اور ان کی کثرت جنوبی ہند میں تھی۔ چوں کہ ہندوؤں کی عمارتیں زیادہ تر مذہبی تھیں۔ اس لیے انہیں فنِ

تعمیر، قدیم روایات اور مذہبی ضروریات کی پیروی کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ ان کے مندروں کا انداز یعنی ان کا تعمیری خاکہ اور ان کی ساخت قریب قریب یکساں ہوتی تھی۔

فنِ تعمیر اور خصائصِ قومی

فنِ تعمیر کسی قوم کی نفسیاتی، معاشرتی اور مذہبی خصوصیات کا بہت بڑا مظہر سمجھا جاتا ہے، اور ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعمیرات کے درمیان جو تفاوت نمایاں ہے وہ ان دونوں قوموں کی طبعی خصوصیات کو نہایت وضاحت سے ظاہر کرتا ہے۔ ہندوؤں کے مندروں میں تنگ مکانی، پراسراریت، تاریکی اور چتر کاری کی تفصیلات نمایاں ہیں۔ مندر میں جہاں دیوی یا دیوتا کی مورتی قائم کی جاتی ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا تاریک اور پراسرار کمرا ہوتا ہے۔ جس میں مورتی کے خدوخال دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ اور پجاری ایک ایک کر کے اس کمرے میں داخل ہوکر آرتی اتارتے اور پوجا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مندروں کے اردگرد خاصی وسیع عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ مَعْبد کا حصہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ محض پجاریوں اور یاتریوں کے قیام و آرام کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں۔ اصل مَعْبد وہی ہوتا ہے جہاں مورتی براجمان ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی مسجد فراخی، روشنی، وسعت، عظمت، بلندی، اور ہواداری کے محاسن رکھتی ہے جن سے توحید پرست قوم کے خصائص طبعی واضح ہوتے ہیں۔ مسلمان باجماعت نماز پڑھتے ہیں اور ان کے ہاں کوئی پروہت یا پجاری نہیں ہوتے جو خدا کے گھر کو خواہ مخواہ پراسرار بنا کر بھولے بھالے نمازیوں سے ٹکے بٹورنے کی کوشش کریں۔ غور سے دیکھیے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مکانات اور ان کے حکمرانوں کے محلات میں بھی یہی کیفیت نظر آئے گی۔ ہندوؤں کے مکانات میں فراخی اور ہواداری کی بجائے کوٹھڑیوں اور کولکیوں کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ اور مسلمانوں کے مکان فراخ اور ہوادار ہوتے ہیں۔ ہندو چونکہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں اور ان کے پھول دریاؤں میں بہا دیتے ہیں۔ اس لیے فنِ تعمیر کا ایک شعبہ یعنی مقبرہ ان کے ہاں بالکل ہی معدوم ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تعمیرات میں عظیم الشان مقبرے دنیا بھر کے فنِ تعمیر میں خاص مقام رکھتے ہیں۔

ماحول کا اثر

ڈاکٹر اشتیاق قریشی لکھتے ہیں:

''روحانی اعتبار سے اسلامی تہذیب وتمدن کا نشو ونما ایسے علاقوں میں تھا۔ جہاں وسیع اور گھنے جنگل نام کو نہ تھے۔ جہاں صحرا کے وسیع اور نیم بنجر زمینوں کے مقابل ہر چیز بڑی صاف اور واضح نظر آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی صناعی اور فنِ تعمیر میں بھی صفائی اور حسنِ صوری کی خوبیاں خاص طور پر نمایاں رہیں۔ جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے، یہ ان سرزمینوں میں پھلا پھولا جو بڑے بڑے گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور جہاں پتوں کی باریک باریک لکیروں اور پھولوں کے حصوں میں جزئیات کی نزاکت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ جہاں آنکھ ہر ہر پتی اور ہر ہر پھول کا الگ الگ نظارہ تو کرتی ہے لیکن پورے درخت کو بہت کم دیکھتی ہے اور سارے جنگل کو تو کبھی دیکھتی ہی نہیں۔ اس لیے ہندو آرائش کی باریکیوں پر جان دیتے ہیں۔ لیکن بالکل صاف اور واضح تصویری سائے پیدا کرنے کے شوقین نہیں۔'' [۹]

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عمارتیں بھی آرائش سے محروم نہیں ہیں۔ لیکن ہندوؤں کی آرائش اور مسلمانوں کی آرائش میں بڑا فرق ہے ہندو باریک تفصیلات میں بقول اشتیاق قریشی وہی پھولوں اور پتوں کی باریکیاں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان اپنی عمارتوں کو رنگ وخط، ابھرواں نقاشی، کاشی کاری اور خطاطی سے آراستہ کرتے ہیں اور کسی حالت میں توازن واعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

غزنی میں عمارات

جنوبی ہند میں عرب کے مسلمان تاجروں نے اور سندھ میں محمد بن قاسم کے بعد حکومت کرنے والے والیوں اور بادشاہوں نے عمارتیں تو ضرور بنائی ہوں گی لیکن وہ امتدادِ زمانہ سے نابود ہوگئیں۔ اور آج ہم ان کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ سلطان محمود غزنوی نے جس حملے میں متھرا کو فتح کیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غزنی میں سنگِ مرمر اور سنگ خارا کی ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ایک دارالعلوم کی عمارت بھی بنوائی۔ سلطان کے ذوقِ تعمیر سے اس کے امراء بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں یہ شہر عظیم الشان مسجدوں، فواروں، حماموں اور محلوں کے اعتبار سے مشرق کا بہترین شہر بن گیا۔ [۱۰] غزنی کے کھنڈروں میں ایک دو مینار اب بھی نظر آتے ہیں۔ جو کمالِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور جو غالباً کسی فتح کی یادگار میں تعمیر کیے گئے تھے۔ افسوس کہ یہ شہر علاء الدین جہانسوز کے جوشِ انتقام کے

اثر سے بے نشان ہوگیا۔ ورنہ آج دنیائے اسلام کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا۔ سلطان محمود غزنوی کے مقبرے کی عمارت کے متعلق ماہرین کی قطعی رائے یہ ہے کہ اس کے دروازوں کی چتر کاری اور عمارت کے اسلوب میں اس زمانے کے ہندو فنِ تعمیر کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ فتح میناروں کا بھی یہی حال ہے۔

مسلم فنِ تعمیر کی خصوصیات

ہندوستان میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر نے جو نئی چیزیں پیدا کیں۔ ان سے ہندو بالکل بے خبر تھے۔ مثلاً ایک تو ہندوستان کے معمار چونے کا استعمال نہ جانتے تھے۔ مسلمانوں نے انھیں عمارت کو جوڑنے والے مسالے سے شناسا کیا۔ مینار، محراب، گنبد، لداؤ والی چھتیں، نصف گنبد والے دہرے پھاٹک، نقاشی، پچیکاری، کاشی کاری، منبت کاری اور سب سے بڑھ کر خطاطی۔ یہ تمام خصوصیات مسلمان معماروں اور فنکاروں نے پیدا کیں۔ انھوں نے ہندو طرز تعمیر کی بعض خوبیاں بھی اختیار کیں۔ اور ان کو اپنے فن میں ایسا سمویا کہ وہ اسی فن کا جزو لاینفک ہو کر رہ گئیں۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا ممزوج فن تعمیر ''مسلم فنِ تعمیر'' ہی قرار پایا۔ اور ماہرین نے اس کو دنیائے اسلام کے فنِ تعمیر میں ایک خاص سکول کی حیثیت دے دی۔

مسجد قوت الاسلام

قطب الدین ایبک نے دہلی میں مسجد قوۃ الاسلام تعمیر کرائی جس میں زیادہ تر ہندو عمارتوں کا مسالہ صَرف ہوا۔ اور ہندوستانی معماروں اور کاریگروں کی مدد سے یہ عمارت وجود میں آئی، مسجد کی ضروری خصوصیات تو اس میں موجود ہیں یعنی صحن، مسقف دالان اور رواقیں۔ لیکن ہندوستانی معماروں نے تفصیلات میں اپنا ملکی فن استعمال کیا۔ محراب سے وہ ناواقف تھے۔ پتھر کی ڈاٹ کو جانتے نہ تھے۔ جب مسجد بن کر تیار ہوئی تو سلطان کے لیے اس کی ہیئت بہت اجنبی معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے وسطی دالان کے آگے ایک منقش جالی لگوائی۔ اور اس میں آیاتِ قرانی بخطِ طغرا ثبت کرائیں۔ لیکن ساتھ ہی ہندوستانی گل بوٹے بھی بنا دیے گئے۔ اس کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے اس میں بہت سے اضافے کیے اور ایسی توسیع اور آرائش کا انتظام کیا کہ مسجد مسجد نظر آنے لگی۔

قطب مینار

لیکن ''قطب مینار'' کی تعمیر خالصتاً اسلامی ہے۔اس کی تعمیر کا آغاز قطب الدین ایبک کے عہد میں ہوا۔ التمش نے اس کو مکمل کیا۔ فیروز شاہ اور سکندر لودی کے زمانے میں اس کی مرمت ہوئی۔ اس کا نام ''قطب مینار'' حضرت قطب شاہ اوشی رحمتہ اللہ علیہ کے مقدس نام پر رکھا گیا۔ اس مینار کا اسلوب تعمیر، اس کی نقاشی و خطاطی اور اس کی عظمت و مہابت اس کے خالص اسلامی تعمیر ہونے کے شاہد ہیں۔مشہور ماہرِ آ ثارِ قدیمہ سر جان مارشل نے بعض ایسے ہندو مصنفین کی تردید میں جو قطب مینار کو اصلاً ہندوانی تعمیر قرار دے رہے تھے لکھا ہے کہ ''اس مینار کی تعمیر کا پورا تخیل اس کی ساخت اور آرائش کی ہر تفصیل قطعاً اسلامی ہے۔'' سر جان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''یہ عظیم و استوار عمارت مسلمانوں کی قوت و شوکت کے اظہار کا نہایت موزوں اور مرعوب کن نشان ہے اور اس کے کتبوں کا ضبط و نظم اور حسن و جمال حقیقت میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔[۱۱]

یہ مینار مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے۔فرش پر اس کا قطر ۴۸ فٹ چار انچ ہے اور بلندی ۲۲۴ فٹ۔ اس میں اوپر تلے بڑے بڑے چھجے یا شاہ نشین ہیں۔ پہلا ۹۷ فٹ پر۔ دوسرا ۱۴۸ فٹ پر۔ تیسرا ۱۸۸ فٹ پر اور چوتھا ۲۱۴ فٹ پر واقع ہے۔[۱۲]

لوہے کی لاٹھ

مسجد کے صحن میں ایک لوہے کی لاٹھ کھڑی ہے جو صرف بیس انچ زمین کے نیچے ہے اور لاٹھ کی بلندی ۲۲ فٹ ہے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ لاٹھ ڈیڑھ ہزار سال پرانی ہے۔اور اس کی حقیقت کی شاہد ہے کہ ہندو اس زمانے میں بھی لوہے کے استعمال میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ انھوں نے اتنی بڑی لاٹھ ڈھال لی۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پندرہ صدیاں گزر جانے پر بھی بادو باراں کے ہزاروں طوفانوں کے باوجود اس کو زنگ نہیں لگ سکا اور اس کا کتبہ بدستور پڑھا جاتا ہے۔ غالباً یہ لاٹھ بھی کسی پرانے راجا نے اپنی کسی فتح کی یادگار میں قائم کی ہوگی۔

مقبرہ التمش

مسجد کے شمال مغربی گوشے کے پیچھے سلطان التمش کا مقبرہ واقع ہے۔ اگرچہ اس کی چھت غائب ہو چکی ہے لیکن تعمیر کے حسن میں کوئی کلام نہیں۔ یہ غالباً ہندوستان میں سب سے

پرانا مقبرہ ہے۔ التمش کا انتقال ۱۲۳۵ء میں ہوا تھا۔

علائی دروازہ

حسنِ تعمیر کا ایک اور نمونہ علائی دروازہ ہے جو ۱۳۱۰ء میں علاء الدین خلجی نے تعمیر کیا تھا۔ یہ دہلی میں پٹھانوں کے طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ہندوستانی معمار اپنے نئے آقاؤں کے تعمیری تخیل کو سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ اس میں ہندوستانی تصور کے آثار بہت کم ہیں۔

اڑھائی دن کا جھونپڑا

اجمیر میں تاراگڑھ پہاڑی کے نیچے ایک عظیم الشان مسجد سلطان التمش نے تعمیر کرائی جس کو ''اڑھائی دن کا جھونپڑا'' کہتے ہیں۔ مرہٹوں کے زمانے میں یہاں اڑھائی دن کا ایک میلہ لگتا تھا۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کے دالانوں میں قوۃ الاسلام کی طرح ستونوں کی بہتات نہیں۔ گنبد اور ستون موزوں اور متناسب ہیں چھت کی نقاشی بھی بہت خوبصورت ہے۔ صحن کے آگے سات محرابیں ہیں۔ مرکزی محراب بائیس فٹ دو انچ چوڑی ہے۔ ان محرابوں پر کوفی اور طغرا کی جو آرائش ہے وہ دور دور تک مثال نہیں رکھتی۔[۱۳]

مقبرہ خواجہ بہاء الدین ملتانی

اس کے بعد تغلق خاندان کا نمبر آتا ہے۔ اس خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق ملتان کا حاکم تھا۔ خواجہ بہاء الدین ملتانی رحمتہ اللہ علیہ کا مقبرہ اسی کے عہد میں تعمیر ہوا جس کی ڈھلواں دیواریں دیکھنے والوں پر مضبوطی اور استحکام کا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ اندازِ تعمیر اس کے بعد مدت تک مقبول عام رہا۔ غیاث الدین نے بادشاہ بن کر ایک نئی دہلی تعمیر کی جس کو تغلق آباد کہتے ہیں۔ اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ تغلق آباد کی عمارتوں کی نمایاں خصوصیات سادگی ہے۔ لیکن جس زمانے میں تغلق شاہ کی حکومت تھی۔ اور تغلق آباد کے شاہی محلات کے گنبدوں پر طلائی کام ہو رہا تھا۔ اس وقت ابن بطوطہ اس کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جب آفتاب بلند ہوتا تھا تو تغلق شاہی محلات کی چمک دمک اور درخشانی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اس پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔[۱۴] غیاث الدین تغلق کا مقبرہ اس کے بیٹے محمد بن تغلق نے تعمیر کرایا۔ اس کی

دیواریں بھی بہاء الدین ملتانی کے مقبرے کی طرح ڈھلواں ہیں اور اس پر بڑے بڑے برج بنائے ہیں۔ یہ عمارت سادہ، متناسب اور دلکش ہے اور اس میں سنگ مرمر سے منقش سرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔

تغلق تعمیرات

محمد تغلق اگرچہ ہر نوع کی قابلیت رکھتا تھا لیکن اندرونی بدنظمیوں نے اس کو فنون کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ تاہم اس نے عادل آباد کا قلعہ تعمیر کیا۔ ایک شہر ''جہاں پناہ'' کی بنیاد رکھی جس میں اپنے لیے ایک محل بنایا جس کا نام ''ہزار ستون'' رکھا۔ ابن بطوطہ نے اس کی تفصیل لکھی ہے۔[۱۵] فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں بے شمار مسجدیں، محلات، مقبرے بنوائے نہریں کھدوائیں۔ اس کی تعمیرات زیادہ تر مقامی سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں لیکن طلا کاری اور آرائشی نقاشی کا سراغ بھی ملتا ہے۔ امتدادِ زمانہ اور مسالے کے نقص کی وجہ سے اس کی عمارتیں زیادہ تر ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں۔ مثلاً ''حوضِ خاص'' کے پاس کا دارالعلوم اور فیروز شاہ کا کوٹلہ۔ کوٹلہ کے محلات بہت شاندار تھے۔ عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان کا حال لکھا ہے لیکن اب صرف جامع مسجد اور خان خاناں کا مقبول مقبرہ یہی دو عمارتیں باقی ہیں۔ ''کوشک زریں مینار'' بھی بڑی مضبوط عمارت ہے۔ جس کے اوپر اشوک کی لاٹھ نصب ہے۔

لوہے کی دو لاٹھیں

فیروز شاہ تغلق کو آثار قدیمہ سے بہت شغف تھا۔ چنانچہ جب اس نے سنا کہ اشوک کے زمانے کی ایک لاٹھ موضع توپرہ ضلع انبالہ میں اور ایک میرٹھ کے پاس موجود ہے تو اس نے حکم دیا کہ یہ دونوں لاٹھیں نہایت حفاظت اور اہتمام سے دہلی لائی جائیں۔ کہتے ہیں کہ فوج شاہی کے سپاہیوں اور آس پاس کے باشندوں کو جمع کیا گیا۔ صدہا من ریشم جمع کر کے لاٹھ کو آس پاس بچھا دیا گیا۔ تاکہ جب زمین کھودنے سے لاٹھ گرے تو اس کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔ جب لاٹھ اکھڑ آئی تو اس کو سرکنڈوں اور جانوروں کی کچی کھالوں میں لپیٹا گیا۔ بیالیس پہیوں کی ایک گاڑی بنائی گئی اور ہر پہیے کو رسوں سے باہم پیوست کیا گیا۔ اس کے بعد لاٹھ کو گاڑی پر رکھ کر ہزاروں آدمیوں نے کھینچا اور جمنا کے کنارے پہنچا دیا۔ وہاں بڑی بڑی کشتیاں تیار تھیں جن پر ہزاروں من غلہ بار ہوا کرتا تھا۔ ان کشتیوں کو باندھ کر ان پر لاٹھ رکھی گئی اور فیروز آباد پہنچا دی گئی۔ یہاں

اس کو نہایت اہتمام سے ایک خاص عمارت میں رکھا۔ اور برہمنوں کو حکم دیا کہ اس کے کتبے کو پڑھیں لیکن وہ نہ پڑھ سکے۔ دوسری لاٹھ بھی اسی طرح ''کوشک شکار'' تک پہنچائی گئی۔[۱۶]

شیر شاہ کا مقبرہ

سپری (ریاست گوالیار) میں اور خیر پور (پرانی دہلی) میں دو غیر معلوم مقبرے ہیں۔ جن کے حالات اور خاکے فرگوسن نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ ان سے پٹھانوں کے طرز تعمیر کا ارتقاء محسوس ہوتا ہے۔ سادات اور لودھیوں نے اس طرزِ تعمیر کو اور زیادہ ترقی دی۔ اب مقبرے ہشت پہلو ہوتے تھے۔ درمیان میں اونچا اور نمایاں گنبد ہوتا۔ مقبرے کے اردگرد چھتریاں اور کنگرے تعمیر کیے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ طرزِ تعمیر ترقی کرتے کرتے سہسرام میں شیر شاہ کے مقبرے تک پہنچا۔ یہ مقبرہ دنیا کی عظیم ترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑے تالاب کے وسط میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی بنیادوں کا خاکہ ہشت پہلو ہے۔ ہر پہلو کی لمبائی ۵۶ فٹ ہے اور عمارت کا قطر ۱۳۵ فٹ ہے۔ گیلری دس فٹ دو انچ چوڑی اور گنبد کا قطر ۷۱ فٹ ہے۔ کننگھم اس مقبرے کو آگرہ کے تاج محل پر بھی ترجیح دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''یہ بھورے پتھر کی ایک شاندار عمارت ہے جو مردانہ طاقت اور ابدی سکون کی آئینہ دار ہے۔'' شیر شاہ کی ''مسجد کلاں'' وہ ہے جو اس نے اپنے لیے قلعہ میں تعمیر کرائی تھی۔ اس کی روکار میں پانچ محرابیں ہیں جن میں پچی کاری اور دوسری آرائشوں نے عمارت کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔[۱۷]

جونپور کی تعمیرات

۱۳۹۵ء میں جونپور کے صوبیدار خواجہ جہان نے مرکز سے علیحدہ ہوکر آزادی اختیار کرلی اور تقریباً ایک صدی تک اس کے خاندان نے خود مختاری کا ڈنکا بجایا تا آنکہ اکبر نے اس صوبے کو قلمرو مغلیہ میں شامل کرلیا۔ اس دوران میں جونپور علم وفن کا مرکز رہا اور اس میں بے شمار مسجدیں، مقبرے اور محل تعمیر ہوئے۔ ایک قلعہ اور ایک پل بھی بنایا گیا۔ دہلی میں تو مغل فنِ تعمیر تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ لیکن صوبجات میں ابھی اسلامی اور ہندوانی طرزِ تعمیر کے امتزاج کا عمل جاری تھا۔ جونپور کی عمارتیں اس امتزاج کی مظہر ہیں۔ جن میں شہتیری (Trabeate) اور محرابی اسلوبِ تعمیر ملے جلے نظر آتے ہیں۔

جونپور کی قدیم ترین مسجد قلعہ میں ہے۔ اس مسجد کو فیروز شاہ تغلق کے جرنیل ابراہیم نائب باربک نے تعمیر کرایا تھا۔شہر میں تین بڑی مسجدیں اب تک موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑی جامع مسجد ہے جس کو شاہ ابراہیم نے شروع کیا۔ اور حسین شاہ نے مکمل کیا۔ سب سی چھوٹی مسجد لال دروازہ کہلاتی ہے۔ ان مسجدوں میں بنیادی اصول تعمیر تو وہی مدنظر رکھے گئے ہیں۔ جو اسلامی معیاروں اور ضرورتوں کے اعتبار سے لازمی تھے۔ لیکن بعض تفصیلات یقیناً ہندوانی ہیں کیونکہ ان کے نومسلم معماروں نے دینی ضروریات کے سوا باقی امور میں اپنے آبائی اور وطنی مذاق سے انحراف ضروری نہیں سمجھا۔ ایک اور مسجد ''اٹالہ مسجد'' کے نام سے مشہور ہے جو زیب و زینت اور خوشنمائی کے اعتبار سے دوسری مسجدوں پر فضیلت رکھتی ہے۔

گجرات کی تعمیرات

گجرات جینیوں کا ملک تھا۔ اور مسلمانوں کے تسلط سے پہلے اس کی ہندو سلطنت بھی متعدد مقامات پر ایسے مندر تعمیر کر چکی تھی جو جین طرزِ تعمیر کے شاندار نمونے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں اسلامی تخیل کی وسعت کو جینی ذوقِ آسائش سے مخلوط کر کے ایک ایسا اسلوب قائم کیا جو آج تک ماہرین آثار قدیمہ اور سیاحوں کے لیے سرمایۂ حیرت بنا ہوا ہے۔
گجرات میں مسلمانوں کا پہلا پایہ تخت انہلواڑہ تھا۔ اس کے بعد احمد شاہ نے احمد آباد تعمیر کیا اور اس میں بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ جن میں ممتاز ترین عمارت جامع مسجد ہے جو سعت و جسامت کے اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن حسن و جمال کے لحاظ سے مشرق کی نہایت خوشنما عمارتوں میں سے ہے۔[۱۸] اس کے علاوہ حلقہ مرزا پور میں رانی روپ ونتی کی ''رانی مسجد'' اور بعض دوسری مسجدیں بھی ہیں۔ جن کا طرز تعمیر جامع مسجد سے کسی قدر مختلف اور زیادہ مقامی واقع ہوا ہے۔ احمد آباد سے پانچ میل دور سرکھیج کے مقام پر محمد شاہ نے ۱۴۴۶ء میں اپنے باپ کے مشیر احمد گنج بخش کا مقبرہ تعمیر کرایا جس کے سامنے سولہ ستونوں کا ایک نہایت خوبصورت سائبان بنا ہوا ہے جس کے ستون گنبد اور کنگرے حسن تناسب کا نمونہ ہیں۔
چھوٹی مسجدوں میں مسجد محافظ خاں اور مسجد رانی سپری قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر مسجد کے مینار بھی اب تک سلامت ہیں۔ حالاں کہ احمد آباد کی مساجد کے مینار عام طور پر غائب ہو چکے ہیں۔ ان مسجدوں میں بھی جین طرز تعمیر کا اثر نظر آتا ہے۔ مسجد سدی سید کی ایک کھڑکی کی جالی

اس قدر کمال فن سے تراشی گئی ہے کہ اکثر ماہرین آثار نے اپنی کتابوں میں اس کی تصویریں دی ہیں اور لکھا ہے کہ آگرہ اور دہلی کی بعض منقش مرمری جالیاں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

ان مسجدوں کے علاوہ میر ابوتراب کا مقبرہ، سید عثمان کا مقبرہ، محمود بیگرہ کے ایک وزیر مبارک شاہ کا مقبرہ، احمد آباد کے پاس ایک موضوع بٹوا میں حضرت قطب العالم کا مقبرہ۔ پھر کھمبایت کی جامع مسجد۔ اس کے بانی عمر بن احمد لگاوزونی کا مقبرہ۔ بھڑوچ کی مسجد اور چمپانیر کی عظیم جامع مسجد صوبۂ گجرات کی مایۂ ناز عمارتیں ہیں۔

مالوہ

۱۵۶۹ء میں مالوہ کو اکبر نے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ اس سے پیشتر کوئی ڈیڑھ سو سال تک سلاطین مالوہ خودمختار رہے۔ ۱۴۰۱ء میں سلطان دلاور غوری نے شاہی کا لقب اختیار کیا۔ اس کے جانشین ہوشنگ نے مانڈو کو بے حد ترقی دی۔ یہ سلطنت ۱۵۳۰ء میں گجرات سے ملحق کر دی گئی۔ بالآخر کوئی چالیس سال بعد قلمرو مغلیہ کا صوبہ بن گئی۔ اس سلطنت کا اصلی صدر مقام دھار تھا جو مانڈو سے چوبیس میل شمال میں واقع تھا۔ خودمختاری کے بعد پایۂ تخت مانڈو قرار پایا۔ دھار میں دو مسجدیں ہیں جو زیادہ تر ہندو عمارتوں کے مسالے سے تیار ہوئی ہیں۔ اور ان کے ستون بالکل ہندوانی طرز کا پتا دیتے ہیں۔ ایک جامع مسجد۔ دوسری لاٹ مسجد (کیونکہ اس میں ایک پرانی لاٹھ گڑی ہوئی ہے)۔

مانڈو میں ہوشنگ شاہ کی بنائی ہوئی جامع مسجد سادگی اور عظمت کا نمونہ ہے۔ اس کو محمود شاہ اول نے ۱۴۵۴ء میں مکمل کیا تھا۔ مانڈو کے محل اس کی مسجدوں سے بھی زیادہ شاندار ہیں۔ ایک ''جہاز محل'' ہے جو دو بڑے بڑے تالابوں کے درمیان جہاز کی طرح کھڑا ہے۔ یہ بہت بڑی عمارت ہے۔ اس کا مشرقی روکار تین سو ساٹھ فٹ لمبا اور چالیس فٹ اونچا ہے۔ جس کے درمیان سنگ مرمر کا ایک محرابی دروازہ ہے۔ محل کے مختلف حصے اس کے شہ نشین اور اس کے دریچے اگرچہ مغل عمارتوں کی سی نفاست و نزاکت نہیں رکھتے۔ لیکن ایک خودمختار اور جنگجو پٹھان سردار کے مسکن کی شان اس کے چپے چپے سے ظاہر ہے۔

ایک اور محل ''باز بہادر کا محل'' کہلاتا ہے جس کو ناصر الدین خلجی نے ۱۵۰۹ء میں تعمیر کرایا۔ یہ محل زیادہ تر کھنڈر ہو چکا ہے لیکن اوپر پہاڑی پر ''روپ متی کی چھتری'' اب بھی زیادہ تر

سلامت ہے۔ جامع مسجد مانڈو کے شمال میں ایک ''ہنڈولہ محل'' ہے جو ایک مضبوط و مستحکم عمارت ہے۔ اس سے آگے ''نہار جھروکا محل'' اور دلاور خاں غوری کی مسجد واقع ہیں۔ ان کے علاوہ مانڈو میں اور یادگاری عمارتیں بھی موجود ہیں جو اپنے بانیوں کی ہمت اور اولوالعزمی کی افسانہ خواں ہیں۔

بنگال

قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۳ء میں دہلی پر قبضہ کیا۔ اور اسی سال محمد بختیار خلجی نے بنگالہ پر حملہ کر کے لکھنوتی (یا گوڑ) کو اپنا صدر مقام بنایا۔ بنگال کے گورنر عام طور پر نظم و نسق میں خود مختار ہوتے تھے۔ ۱۱۹۴ء سے ۱۵۳۵ء تک گوڑ نے کئی گورنر اور متعدد انقلابات دیکھے۔ آخر بہار کے افغان حکمران شیر خاں نے گوڑ پر حملہ کر کے اس کو تاخت و تاراج کیا۔ اور اس قدیم پایہ تخت کی عظمت خاک میں مل گئی۔ ۱۵۷۶ء میں اکبر نے اس کو قلمرو مغل میں شامل کر لیا۔

بنگال میں پتھر کمیاب ہے۔ اس کی عمارتیں عام طور پر اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ گوڑ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی ہندوؤں کی مشہور راجدھانی کا مرتبہ رکھتا تھا۔ اور اس میں سین اور پال خاندانوں کے راجاؤں نے بے شمار مندر، محلات اور عمارتیں بنا رکھی تھیں۔ یہاں ایک خاص قسم کا کالا پتھر ملتا ہے جو ستونوں کے لیے کام دیتا تھا۔ باقی تعمیر اینٹوں سے کی جاتی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اہل بنگال ہندوستان کے دوسرے حصوں کے معماروں کی طرح شہتیری اسلوب کے قائل نہ تھے۔ بلکہ ڈاٹ اور محراب کو جانتے تھے۔ اور اینٹوں سے محراب سازی کا کام خوب لیتے تھے قلعہ گوڑ کے جنوبی مشرقی دروازے پر ''قدمِ رسول'' کے نام کی ایک مسجد ہے جو اینٹوں کی بنی ہوئی ہونے کے باوجود نہایت مستحکم و استوار عمارت ہے اور اس کی چھت خمدار ڈاٹوں کی بنی ہوئی ہے۔

گوڑ میں سونا مسجد (یا بارہ دروازہ) بہت خوبصورت ہے جس کا روکار پتھر کا ہے۔ ایک اور ''بارہ سونا مسجد'' قلعہ کے باہر شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس کو نصرت شاہ نے ۱۵۲۶ء میں تعمیر کرایا۔ پانڈوا میں ایک آدینہ مسجد ہے جس کو سکندر شاہ نے چودھویں صدی کے وسط میں تعمیر کرایا۔ یہ بہت بڑی مسجد ہے جس کا طول ۵۰۷ فٹ اور عرض ۲۸۵ فٹ ہے۔ اس سے دو میل جنوب مغرب میں ''ایک لاکھی مسجد'' ہے جس کے متعلق اب تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ یہ مسجد ہے یا مقبرہ۔ اس پر کوئی کتبہ نہیں جس سے حقیقتِ حال معلوم ہو سکے۔ یا اس کی تاریخِ تعمیر ہی معین کی

جاسکے۔

گوڑ میں ان کے علاوہ اور بھی قابلِ دید عمارتیں ہیں۔ مثلاً اس کے متعدد دروازے نہایت شاندار ہیں جن میں داخلی یا سلامی دروازہ اور کوتوالی دروازہ بہت خوبصورت ہیں۔

راجشاہی میں چھوٹا سونا مسجد، ڈھاکا میں مقبرہ بی بی پری دختر شائستہ خاں مرشد آباد، رنگپور، راج محل، مالدا کی بے شمار عمارتیں بنگال کے خاص اسلوبِ تعمیر کی مظہر ہیں۔ اس معاملے میں بنگال نے اپنی انفرادیت کو ہندوستان کے دوسرے تمام حصوں سے ممتاز و ممیّز رکھا ہے۔

گلبرگہ

۱۳۴۷ء میں حسن گانگو بہمنی نے گلبرگہ (دکن) میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے جانشینوں نے اس سلطنت کو برار سے دریائے کرشنا تک اور وارنگل سے بحیرۂ عرب تک وسیع کر دیا۔ اور وارنگل اور وجے نگر کے ہندو راجاؤں کو اپنا باج گزار بنایا۔ گلبرگہ میں بہت سی عمارتیں بنائی گئیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ ذکر ایک مسجد ہے جس کی ایک خصوصیت پورے ملک میں ممتاز ہے۔ کہ یہ مسجد قرطبہ کی طرح ساری کی ساری مسقّف ہے۔ اور صحن موجود نہیں۔ چھت تریسٹھ چھوٹے چھوٹے گنبدوں پر مشتمل ہے اور مسجد کے درمیانی رقبے پر بڑا گنبد ہے جس کا قطر چالیس فٹ ہے۔ چار صدیاں گزر جانے کی وجہ سے اس کی حالت بگڑ چکی ہے ایک آدھ دفعہ مرمت کی کوشش بھی کی گئی لیکن کوئی معتد بہ نتیجہ نہ نکلا۔ بہرحال یہ مسجد اپنے انوکھے طرز تعمیر کی وجہ سے کم از کم ہندوستان میں نظیر نہیں رکھتی۔[۱۹]

گلبرگہ میں ۵۷۰ فٹ لمبا اور ساٹھ فٹ چوڑا ایک بازار بھی ہے۔ جس کے دونوں طرف ۶۱ محرابیں بنی ہوئی ہیں اور دونوں سروں پر خوبصورت عمارتیں کھڑی ہیں۔ یہ بازار بھی مسلمانوں کی عمارتوں میں نظیر نہیں رکھتا۔ شہر گلبرگہ میں درگاہ خواجہ بندہ نواز کے سامنے ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ اور شہر کے مشرق میں سلاطین بہمنی کے عظیم اور ڈھلواں دیواروں والے مقبرے واقع ہیں۔

بیدر

احمد شاہ اول نے ۱۴۲۸ء میں بہمنی پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر میں منتقل کر دیا۔ اور یہاں بہت سی عمارتیں بن گئیں۔ جن میں ممتاز ترین خواجہ محمود گاواں کا عظیم الشان مدرسہ ہے۔ جو

۱۴۸۱ء میں مکمل ہوا۔ اور اس زمانے میں اپنی قسم کا ایک ہی مدرسہ تھا جو ہر اعتبار سے مکمل اور کامیاب کہا جاسکتا ہے۔[۲۰] یہ عمارت اپنی وسعت و عظمت، محرابوں کی کثرت، سقفی گنبدوں کی افراط اور رُوکار کی کاشی کاری کے اعتبار سے یادگارِ زمانہ تھی۔ افسوس کہ اب زیادہ تر کھنڈر ہوچکی ہے۔

بہمنی اور برید شاہی سلاطین کے بہت سے مقبرے بھی شہر کے آس پاس موجود ہیں۔

بیجاپور

ایک ترک یوسف عادل خاں جس کو بعض لوگ ترکی سلطان مراد ثانی کا بیٹا بتاتے ہیں۔ بیدر میں امیر برید کے باڈی گارڈ میں ملازم تھا۔ یہ اپنی ہمت اور اولوالعزمی سے اس قابل ہوگیا کہ اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کرکے بیجاپور میں خاندان عادل شاہی کی بنیاد رکھی۔ پہلے پچاس ساٹھ سال تک تو اس خاندان کو جنگ و پیکار سے اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ تعمیرات کی طرف متوجہ ہوتا۔ لیکن علی عادل شاہ کے زمانے سے عمارتیں بننے لگیں۔ (۱۵۵۷ء) عادل شاہیوں سے پہلے بھی بعض مسلمان فاتحین نے بیجاپور میں ایک دو مسجدیں تعمیر کیں۔ لیکن ان کا انداز وہی ہندوانی تفصیلات رکھتا تھا۔ جو پٹھانوں کے ابتدائی اسلوب تعمیر میں نمایاں ہے۔ لیکن عادل شاہیوں کے زمانے میں بیجاپور نے تعمیری اعتبار سے اتنی ترقی کی کہ اس کی عمارتیں دہلی و آگرہ سے لگا کھانے لگیں۔ ایک تو یہ سلاطین ترکی نسل سے تھے۔ دوسرے شیعہ ہونے کی وجہ سے ایران کے ساتھ گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ اور بہت سے ایرانی باکمالوں کو اس دربار میں پناہ مل گئی تھی۔ اس لیے بیجاپور کی تعمیرات ہندو اثر سے علی العموم پاک ہیں۔

علی عادل شاہ نے ایک جامع مسجد کی تعمیر شروع کی جس کو اس کے جانشینوں نے جاری رکھا۔ لیکن تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ خاندان محروم اقتدار ہوگیا۔ یہ مسجد اگر مکمل ہوجاتی تو ۳۳۱ فٹ لمبی اور ۲۵۷ فٹ چوڑی ہوتی۔ اس کی چھت میں بھی بے شمار چھوٹے گنبد ہیں۔ اس کے بنیادی خاکے میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ لیکن تفصیلات کی خوشنمائی اور آراستگی کے اعتبار سے یہ مسجد ہندوستان کی بہترین مسجدوں میں شمار کی جاتی ہے۔

علی عادل شاہ کا مقبرہ

تورانیوں میں یہ عجیب رسم ہے کہ عام طور پر ہر بادشاہ اپنا مقبرہ خود ہی تعمیر کرلیتا ہے۔

اور بعض اوقات وہ اس کی زندگی میں مکمل نہیں ہو پاتا۔ اور اس کے جانشین اس کو مکمل کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔علی عادل شاہ نے اپنا مقبرہ بنایا۔ جو نامکمل رہ گیا۔اس کے بھتیجے ابراہیم ثانی نے اپنا مقبرہ چھوٹے پیمانے پر شروع کیا۔ چونکہ اس کو کافی مہلت مل گئی اس لیے اس نے اس کی آرائش و زیبائش پر بہت توجہ صرف کی۔ اسی مقبرے میں اس کی والدہ، اس کی بیٹی زہرا سلطانہ، اس کی ملکہ تاج سلطانہ اور دو بیٹوں کی قبریں بھی ہیں۔ اس مقبرے کے ساتھ ایک شاہی باغ فواروں اور کوشکوں سے آراستہ ہے۔ بیرونی حصے میں مسافروں کے لیے سرائیں بنی ہوئی ہیں اور اندر ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔

اس کے جانشین محمد شاہ کا مقبرہ اپنی بعض تعمیری خصوصیتوں کی وجہ سے ہمیشہ ماہرینِ آثار کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس کا اندازہ بھی جامع مسجد ہی کا ہے۔لیکن اس کی ساخت عظیم تر ہے۔فرش سے ۵۷ فٹ کی بلندی پر اس کے عظیم و جسیم گنبد کا قطر۱۲۴ فٹ پانچ انچ ہے۔ اندرونی پیائش کے اعتبار سے یہ گنبد فرش سے ۱۷۸ فٹ اور خارجی لحاظ سے بیرونی چبوترے سے ۱۹۸ فٹ اونچا ہے۔ گنبد کی موٹائی آغاز میں دس فٹ اور چوٹی پر نو فٹ ہے۔ یہ پیائش اس قدر مرعوب کن ہے کہ بے اختیار بیجاپور کے باکمال معماروں کے بلند تخیل اور بے نظیر مہارتِ فن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔گنبد کی جسامت کے علاوہ اس عمارت کے فنِ تعمیر کی رو سے بعض دوسرے کمالات بھی ماہرینِ آثار کے لیے مرکزِ توجہ رہے ہیں جن کا ذکر ان کی کتابوں میں موجود ہے۔[۲۱]

دوسری عمارتیں

بیجاپور کی حکومتی تعمیرات میں بھی اسی جرأت تصور اور مہارتِ تکمیل کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً "دلگن محل" ایک دربار کا ہال ہے جس کو ایوانِ عام کہنا چاہیے۔ آثار مبارک (آثار محل) "سات منزلہ" بہت شاندار عمارتیں ہیں۔ بخارا مسجد، محمد شاہ کے مقبرے کی ملحقہ مسجد، عدالت محل، سورج محل، یاقوت دَبلی کا محل، خواص خاں کا مقبرہ، چھوٹا چینی محل، عرش محل بہت نفیس عمارتیں تھیں جن کو حکومتِ بمبئی نے دفاتر میں منتقل کر دیا ہے۔[۲۲]

خاندیش

اسی طرح خاندیش کے فاروقیوں کا پایہ تخت برہان پور اور قطب شاہیوں کا صدر مقام

گولکنڈہ بھی مسلمان سلاطین کی تعمیر کردہ مسجدوں اور مقبروں سے پٹے پڑے ہیں۔ سر سالار جنگ نے ان میں سے بعض کی مرمت بھی کرائی تھی۔ لیکن دوسری عمارتیں روز بروز دستبردِ زمانہ کی نذر ہوتی جارہی ہیں۔

بہرحال دکن بھی مسلمانوں کے کمالاتِ تعمیر کے اعتبار سے کسی طرح شمالی ہندوستان سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ بیجاپور نے تو اپنا ایک علیحدہ تعمیری دبستان قائم کیا۔ اور ترکی و ایرانی اور ہندوستانی تخیل کے امتزاج سے حیرت انگیز تعمیری کارنامے انجام دیے۔

سندھ میں ٹھٹھہ کی عمارات

بنگال میں تو بارش کی کثرت اور زمین کے جوشِ نمو کی وجہ سے بعض قدیم عمارتوں میں کہیں کہیں روئیدگی ہوجاتی ہے جو عمارتوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کے علاوہ عمارتوں کے گرد گھنے جنگل نمودار ہوجاتے ہیں اور وہ ان میں چھپ جاتی ہیں۔ سندھ کی کیفیت یہ ہے کہ بنگال کی طرح اس کی قدیم عمارتوں میں بھی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں کیونکہ پتھر کمیاب ہے۔ اس علاقے میں روئیدگی کی کثرت نہیں۔ لیکن ناقص قسم کے پلستر اور زمین کے شور کی وجہ سے اینٹیں اکھڑ جاتی ہیں۔ اور دیہاتی عوام ان کو لے جاکر اپنے مکانوں میں لگا لیتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سندھ میں پرانی عمارتیں کم ہیں۔ جو چند عمارتیں ہیں وہ شہر ٹھٹھہ کے پاس واقع ہیں جو ایک زمانے میں مسلمانوں کے اقتدار اور ان کے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ غالباً سندھ میں سب سے پرانی عمارت جام نظام الدین کا مقبرہ ہے۔ جو ۱۵۰۸ء میں تعمیر کیا گیا۔ مسجد دگبیر ۱۵۰۹ء میں بنائی گئی۔ امیر خلیل خاں کا مقبرہ ۱۵۷۲ء میں تعمیر ہوا۔ اسی سال اکبر نے جام خاندان کو سندھ سے بے دخل کرکے اس کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا تھا۔ نواب شرفا خاں امیر خاں والی سندھ (عہد شاہ جہاں) کا وزیر تھا۔ اس کا مقبرہ ۱۶۴۰ء میں تعمیر ہوا۔ ٹھٹھہ کی عمارتوں میں کاشی کاری عام ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صوبہ ایران سے قریب تر واقع ہوا ہے۔ کاشی کاری عمارت کی خوبصورتی میں یقیناً اضافہ کردیتی ہے۔ لیکن سندھ کی آب و ہوا میں زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔

مغلوں کا فنِ تعمیر

اسلامی ہندوستان کا فنِ تعمیر مغلوں کے عہد میں کمال کو پہنچا۔ وہ تیمور کی نسل سے تھے جو اپنی جنگجوئی اور خونریزی کے باوجود علم و فن کا بڑا قدردان تھا اور جس کے عہد میں سمرقند اعلیٰ

درجے کی عمارات کا ایک عجائب خانہ بن گیا تھا۔ مغل ایرانی فنون کے وارث تھے۔ اور اپنی رواداری کی وجہ سے ہندوستانی فنِ تعمیر اور ہندوستانی معماروں سے بھی اخذ محاسن کے معاملے میں سرگرم تھے۔ وہ ہندوستان بھر کے وسائل پر قبضہ رکھتے تھے۔ ایک اشارے سے ملک بھر کے کامل الفن استادوں کو ایرانی و تورانی معماروں کی امداد کے لیے فراہم کر سکتے تھے۔ انہیں ہر قسم کے تعمیری مسالے کی جمع آوری میں بھی کوئی دقت نہ ہوتی تھی اور اس کے علاوہ دہلی، آگرہ، فتح پور سیکری اور لاہور کی آب و ہوا میں بھی بنگال یا سندھ کے نقائص موجود نہ تھے۔ یہی وجوہ تھے جن کی بنا پر مغلوں نے بے نظیر تعمیری شاہکار پیش کیے جو اب تک ان کی شان و شوکت کے افسانہ خواں ہیں۔

بابر

بابر کو بڑی عمارتیں بنانے کی مہلت نہیں ملی۔ لیکن تعمیر میں اس کی مصروفیت توزک بابری سے ظاہر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ صرف آگرہ میں اسی شہر کے جو سنگتراش میرے محلوں میں کام کرتے تھے ان کی تعداد ۶۸۰ تھی اور آگرہ، سیکری، بیانہ، دھول پور، گوالیار اور کول میں روزانہ ۱۴۹۱ سنگتراش میرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔[۲۳] آگے چل کر ان کاموں کی کچھ تفصیل بھی لکھی ہے۔ مثلاً قلعہ آگرہ میں ایک عظیم الشان باؤلی کھودی گئی تھی۔[۲۴] یہ ۱۵۲۶ء کا ذکر ہے۔ اور بابر پانچ سال تک ان کاموں میں مصروف رہا۔ ہمایوں نے بھی اپنی حکومت کے ابتدائی دس سال پایہ تخت میں عمارتیں بنانے پر صَرف کیے۔ جن میں ایک ہفت ایوان محل بھی تھا۔ جس میں سات ایوان سات ستاروں سے منسوب کیے تھے۔ اور ہر روز مقربین کو اسی دن کے منسوب ایوان میں باریابی کا شرف عطا کیا کرتا تھا۔[۲۵]

شیر شاہ اور اس کے خاندان کی تعمیرات کا ذکر اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے۔ دہلی کا پرانا قلعہ، آگرہ میں ایک محل۔ بعض مساجد اور قلعہ سلیم گڑھ اسی خاندان کی تعمیرات تھیں جو امتداد زمانہ سے کھنڈر ہو گئیں۔ البتہ سہسرام میں شیر شاہ کا مقبرہ اب تک قائم ہے۔

مغل دبستانِ تعمیر

تعمیر کا مغل دبستان حقیقت میں اکبر سے شروع ہوا۔ جس نے اسلامی و ایرانی فنِ تعمیر اور ہندوستانی اسالیب کو سمو کر اپنی رواداری کا ثبوت بھی دیا۔ اور ایک نئے فن کی بنیاد بھی رکھی۔ اکبر کی پہلی تعمیر ہمایوں کا مقبرہ ہے جو بعد کی عمارتوں کے مقابلے میں کوئی زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

لیکن تاہم یہ ایک شاندار عمارت ہے۔ اس کی محرابیں سنگ مرمر کی پچی کاری سے مزین ہیں۔ بادشاہ کی قبر ایک ہشت پہلو کمرے میں ہے اور گوشوں کے کمروں میں حاجی بیگم مریم مکانی اور نو دوسرے افراد خاندان مدفون ہیں۔ اس کی بالائی منزل میں جو گنبد کے اردگرد واقع ہے، ایک زمانے میں ایک بڑا مدرسہ قائم تھا جو اب نابود ہو چکا ہے۔

گوالیار

اسی زمانے میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا روضہ گوالیار میں تعمیر ہوا۔ اس کی ساخت زیادہ تر شیر شاہ کے مقبرے سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن یہ مرمر کی جالیوں اور نقاشی کے کمالات سے مزین ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس عرصے میں فن تعمیر پٹھانی تصورات سے کسی قدر آگے بڑھ چکا تھا۔ دوسری یہ کہ سہسرام میں کاریگروں اور سامان تعمیر کی دستیابی اتنی آسان نہ تھی جتنی گوالیار میں تھی۔ کیوں کہ گوالیار مدت سے اچھے فن کاروں کا مرکز چلا آتا تھا۔

قلعہ آگرہ

اکبر کی عمارتوں میں قلعہ آگرہ کا پرانا محل بھی قابل ذکر ہے۔ اس کو لال محل بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ تمام تر سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے گو یہ جہانگیری محل کہلاتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر اکبر کے زمانے میں شروع ہوگئی تھی۔ یہ محل ۲۴۹ فٹ لمبا اور ۲۶۰ فٹ چوڑا ہے۔ عمارت بہت بڑی ہے لیکن انداز ہندووانہ ہے۔ کیوں کہ زیادہ تر شہتیری اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ محرابیں نہیں ہیں۔ اور دیکھنے والوں کو پہلی نظر ہی میں گوالیار کے بعض ہندوانی محلوں کی خصوصیات نظر آجاتی ہیں۔

فتح پور سیکری

آگرہ سے بائیس میل جنوب مغرب میں فتح پور سیکری واقع ہے۔ یہ مقام اکبر کی تعمیری مصروفیتوں کا مرکز رہا ہے اور اس کو بے تکلف اکبری شہر کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس کی ابتدا اسی نے کی تھی۔ اور اس کے بعد اس کے جانشینوں نے اس شہر کو بالکل نذر تغافل کردیا۔ فتح پور سیکری میں سب سے پہلے "محل خاص" تعمیر ہوا۔ جو آگرہ کے لال محل سے زیادہ بڑا تھا۔ اس میں بعض بڑے بڑے ایوانوں کے علاوہ دیوان خاص اور دفتر خانہ بھی تھا۔ مریم زمانی کا محل، بیربل کا محل،

سنہلا مکان، رومی سلطانہ کا محل، سلطانہ رقیہ بیگم (دختر مرزا ہندال) کا محل اسی عمارت کے خوبصورت حصے ہیں جو اکبر نے مختلف رانیوں اور بیگموں کی خاطر بنوائے تھے۔

فتح پور سیکری کی مسجد ہندوستان بھر میں بے نظیر مسجد سمجھی جاتی ہے۔ (طول ۵۴۴ فٹ۔ عرص ۴۷۴ فٹ) اس کے صحن میں دو روضے ہیں۔ ایک حضرت سلیم چشتی کا اور دوسرا سلام خان کا۔ یہ روضے بلاشبہ بہت شاندار ہیں۔ لیکن مسجد کا جنوبی دروازہ جو "بلند دروازہ" کہلاتا ہے۔ اس قدر عظیم اور مرعوب کن ہے کہ ان روضوں کی عظمتِ تعمیر اس کے سامنے دب سی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی کسی مسجد کا دروازہ فتح پور سیکری کے اس بلند دروازے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

الہ آباد بھی اکبر کو بہت پسند تھا۔ لیکن اس کے قلعے اور محل پر انگریزوں نی قبضہ کرلیا اور اس کی تمام زینت وشوکت معدوم ہوگئی۔ اب کہیں کہیں کوئی کھنڈر نظر آ جاتا ہے جس سے عمارت کی عظمت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

سکندرہ

آگرہ سے پانچ میل شمال مغرب میں ایک موضوع سکندرہ واقع ہے یہاں اکبر نے اپنے لیے مقبرہ بنوانا شروع کیا جس کی نچلی منزل کا طول ۳۲۰ فٹ اور عرض بھی اتنا ہی ہے۔ کونوں کے برج اس طول وعرض سے الگ ہیں۔ اس سے مقبرے کی وسعت وعظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ گنبد کو ملا کر مقبرے کی عمارت ایک سوتیں فٹ بلند ہے۔ چاروں طرف دس دس بڑی محرابیں ہیں۔ صدر دروازہ مرمر کی منبت کاری سے مزین ہے۔ مسٹر فرگوسن کی رائے یہ ہے کہ اس عمارت کی عمومی ہیئت بودھوں کے اسلوب تعمیر کی نقل معلوم ہوتی ہے۔

جہانگیر

جہانگیر نے اپنے باپ دادا کے مقابلے میں بہت کم عمارتیں بنوائیں لیکن پھر بھی قلعہ آگرہ کا جہانگیری محل اسی سے منسوب ہے۔ جالندھر سے سولہ میل دور نور محل کی سرائے کا دروازہ بھی ۱۶۲۰ء میں تعمیر ہوا۔ سری نگر کے قریب شالامار باغ وغیرہ ۱۶۲۴ء میں تعمیر کیے گئے۔ لاہور میں انارکلی کا مقبرہ بھی اسی زمانے کا ہے۔ لاہور کے قلعہ اکبری میں جہانگیر نے خواب گاہ اور موتی مسجد کا اضافہ کیا۔ آگرہ میں نور جہاں کے والد اعتماد الدولہ کا مقبرہ جہانگیر نے نہیں بلکہ ملکہ نے خود تعمیر اکرایا۔ اور ۱۶۲۸ء میں مکمل ہوا۔ یہ سنگ مرمر کی عمارت ہے جس میں قیمتی پتھروں کی پچی

کاری ہو رہی ہے۔ درمیان میں لداؤ کی چھت ہے۔ اور گوشوں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ آرائش کا کام خوبصورت اور نازک ہے۔

لاہور سے چھ میل شمال کی طرف شاہدرہ میں جہانگیر کا مقبرہ واقع ہے جو نور جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مقبرہ ساٹھ ایکڑ کے ایک باغ کے درمیان میں ہے۔ اس کے چاروں گوشوں پر بلند مینار ہیں۔ اس عمارت میں سرخ پتھر پر مرمر کی پچی کاری کی گئی ہے۔ مقبرے کے مغرب میں "شاہدرے کی سرائے" ہے جس کے آخر میں آصف خاں کا مقبرہ اور ریلوے لائن کے پار نور جہاں کا مقبرہ ہے۔ سکھوں نے ان دونوں مقبروں کو سنگ مرمر اور آرائشی سازوسامان سے محروم کر دیا۔

بنگال میں جہانگیر نے گوڑ کے بجائے ڈھاکا میں ایک شاندار نیا دارالخلافہ تعمیر کیا۔ جو جہانگیر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس میں بہت سی عمارتیں بنائی گئیں۔ جو اب علی العموم کھنڈر ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کی تعمیر کی خوبی کا سراغ اب بھی لگایا جا سکتا ہے۔

شاہ جہاں

شاہ جہاں کا شوق تعمیر اس کی متعدد عظیم الشان عمارتوں سے ظاہر ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے عہد میں مغل اسلوبِ تعمیر میں نمایاں انقلاب ہو گیا۔ اکبر کی عمارتوں میں مردانہ عظمت اور روز افزوں اُپج پائی جاتی ہے۔ اور شاہ جہاں کی عمارتیں نفاست و نزاکت کے اعتبار سے نسائیت کی مظہر معلوم ہوتی ہیں۔ آگرہ کے قلعہ میں شاہ جہاں نے حرم شاہی کی عمارتوں کا جو اضافہ کیا وہ اکبر اور جہانگیر کی بنائی ہوئی عمارتوں کے مقابلے میں نفاست کا پیکر معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کی مسلسل محرابیں اور سنگ مرمر میں قیمتی رنگین پتھروں کی منبت کاری بے حد دلکش ہے۔ آگرہ کے قلعہ میں ایک انتہائی پاکیزہ عمارت موتی مسجد ہے جو پوری کی پوری سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر تین قمقمہ نما گنبد ہیں جو اس وقت تک مغل عمارتوں میں عام طور پر مروج ہو چکے تھے۔

لال قلعہ

دہلی کا قلعہ شاید دنیا بھر کے شاہی محلوں میں نظیر نہیں رکھتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ قلعہ ایک سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے مطابق بیک وقت تعمیر ہوا ہے۔ اور اس میں

مختلف بادشاہوں کے اضافے نہیں ہیں۔ اس کا طول ۳۲۰۰ فٹ اور عرض ۱۶۰۰ فٹ ہے۔ بیرونی دروازے اس رقبے سے علیحدہ ہیں۔ دستبردِ زمانہ اور فرنگیوں کی فوجی بدتمیزیوں کی وجہ سے اب اس قلعہ میں صرف داخلہ کا ایوان، نوبت خانہ، دیوان عام، دیوان خاص اور رنگ محل کی عمارتیں باقی ہیں۔ بلاشبہ یہ عمارتیں مغلوں کی شوکت وعظمت اور ان کی تعمیرات کی نفاست کی بہترین نمائندہ ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے درمیانی صحنوں اور غلام گردشوں کا نشان باقی نہیں رہا۔ اس لیے پورے محل کی ہیئت کا تصور کرنا مشکل ہے۔ اس کے دیوانِ عام اور دیوانِ خاص خوبصورتی اور وسعت کے اعتبار سے خود شاہ جہاں کی عمارتوں میں بھی خاص درجہ رکھتے ہیں۔ دیوانِ خاص کے جنوب میں اس دیوان اور رنگ محل کے درمیان ثمن برج، شمالی سرے پر شاہ برج اور جنوب میں اسد برج واقع ہیں۔ جنوبی عمارتوں کے مرکزی سلسلے کے درمیان اور مشرق میں بازار تک کا پورا رقبہ جو دونوں طرف سے ایک ایک ہزار فٹ ہوگا۔ حرم سلطانی اور ایوانہائے ذات ہمایونی سے معمور ہے۔ اس میں بے شمار صحن تھے جن کا اب سراغ نہیں ملتا۔ اور ان کی جگہ انگریزوں کی فوجی بارکیں بنی ہوئی ہیں۔ قلعہ سرخ پتھر کی ایک شاندار فصیل سے محصور ہے اور اسی وجہ سے لال قلعہ کہلاتا ہے۔

جامع مسجد دہلی

دہلی کی جامع مسجد ۱۶۴۲ء میں شروع ہوئی۔ اور ۱۶۵۸ء میں جا کر مکمل ہوئی۔ یہ سنگ سرخ کی ایک نہایت خوبصورت عمارت ہے جس میں سنگ مرمر کی پچی کاری کی گئی ہے۔ یہ مسجد قلعہ دہلی کے دہلی دروازے کے سامنے ایک اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ اس کا طول ۲۰۱ فٹ اور عرض ۱۲۰ فٹ ہے۔ دو مینار ہیں جو ۱۳۰ فٹ اونچے ہیں۔ تین گنبد ہیں جو سنگ سرخ کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر سنگ مرمر کی لہریا دار پٹیاں بے حد خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ جامع مسجد کی تعمیر میں ماہرین کے نزدیک سب سے زیادہ حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عظمت، استحکام اور نزاکت کی خوبیاں جمع ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک دفعہ اس مسجد کے متعلق کہا تھا کہ یہ عمارتوں میں ''بیگم'' معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ان کا مقصد اس کی نفاست اور اس کے بانکپن کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

تاج محل

شاہ جہاں کی عمارتوں میں جو عمارت گل سرسبد کا حکم رکھتی ہے اور جو دنیا بھر کے تعمیری

عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔ آگرہ کا روضہ تاج محل ہے۔ شاہ جہاں نے اپنی ملکہ ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کی محبت کی یادگار کے طور پر یہ عظیم الشان روضہ تعمیر کرایا۔ اور مرنے کے بعد خود بھی اسی میں مدفون ہوا۔ یہ سنگ مرمر کی عمارت ہے جو نہ صرف حسن و نفاست، اقلیدسی صحت اور تعمیری مسالے کی عمدگی کے اعتبار سے بے مثال ہے بلکہ ڈیزائن کی پیچیدگی میں بھی نظیر نہیں رکھتی۔ جس چبوترے پر یہ عمارت کھڑی ہے۔ وہ اٹھارہ فٹ اونچا اور ۳۱۳ فٹ مربع ہے۔ اس چبوترے کے چاروں گوشوں پر ۱۳۳ فٹ اونچے چار مینار ہیں۔ جن کا حسن اور تناسب ہندوستان بھر میں مثال نہیں رکھتا۔ چبوترے کے وسط میں روضہ ہے۔ جو ۱۸۶ فٹ مربع ہے۔ روکار کی بلندی چبوترے سے ۹۲ فٹ ۳ انچ ہے۔ گنبد کا قطر کوئی ساٹھ فٹ اور چبوترے سے ۱۹۱ فٹ بلند ہے۔ عمارت میں جابجا سنگ مرمر پر قیمتی پتھروں کی منبت کاری زینت و آرائش کے کمال کی مظہر ہے۔ تاج محل اور لال قلعہ کی تعمیر کا شرف لاہور کے ایک باکمال معمار احمد لاہوری کو حاصل ہے۔ جس سے بڑا ماہر تعمیر ہندوستان میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔

مغل عمارتوں کی خصوصیات

مغلوں کے مقبروں۔ ان کی بارہ دریوں اور دوسری عمارتوں کی بعض خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو مقبروں میں اصل قبر تعویذ سے بہت نیچے تہ خانے میں پیوند زمین ہوتی ہے۔ جس کے عین اوپر مقبرے کے گنبد کے نیچے تعویذ تعمیر کر دیا جاتا ہے۔ بعض مقبروں کے تہ خانوں میں متوفّی کی میت کا تابوت زنجیروں سے آویزاں ہوتا ہے اور اس کے عین اوپر قبر کا تعویذ بنایا جاتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان عمارتوں کے گرد باغات لگائے جاتے ہیں۔ مغلوں کے نزدیک اس قسم کی عمارتیں سرو و شمشاد کی قطاروں اور اچھلتے فواروں اور گھنے درختوں کے بغیر کچھ معنی ہی نہ رکھتی تھیں۔ فرگوسن لکھتا ہے کہ یہ عمارتیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ جہاں یہ ہوں وہاں لچک، نزاکت، چمک، دمک فواروں کی پھوار اور مرغان خوش الحان کا ہونا لازمی ہے۔ لاہور کا شالامار اور کشمیر کے شالامار، نشاط اور دوسری عشرت گاہیں تو بہرحال باغات ہی تھیں۔ مغلوں کے مقبرے اور قلعے اور محل بھی باغات کے بغیر مکمل نہ ہوتے تھے۔

شاہی مسجد لاہور

اورنگ زیب عالمگیر اپنی مذہبیت کی وجہ سے تعمیرات میں اسراف کا قائل نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے بنارس میں بشیشر کے مندر کی جگہ ایک خوبصورت مسجد بنائی۔ جو آج بھی جلال وعظمت اسلام کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ لاہور کی بادشاہی مسجد جو سنگ سرخ اور مرمر کی عظیم الشان عمارت ہے، اسی بادشاہ کی تعمیر کی ہوئی ہے۔ اس کی نگرانی فدائی خاں کوکہ کے سپرد تھی۔ یہ ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے تین بڑے بڑے مرمریں گنبد ہیں۔ جن کا بانکپن اس بات کا پتا دیتا ہے کہ اس زمانے تک مغل گنبد اپنی نفاست میں کمال حاصل کر چکا تھا۔ مسجد کا روکار جامع مسجد دہلی سے ملتا جلتا ہے۔ اور چار گوشوں پر ہشت پہلو مینار کھڑے ہیں۔ جن کی چھتریاں ایک زلزلے سے ٹوٹ جانے کی وجہ سے اتار لی گئی تھیں۔ لیکن اب پھر تعمیر کر دی گئی ہیں۔ ہر دو میناروں کے درمیان ۱۷۵ گز کا فاصلہ ہے۔ اس سے مسجد کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اورنگ زیب نے لال قلعہ (دہلی) میں بھی کچھ اضافے کیے جن میں چھوٹی سی موتی مسجد بھی شامل ہے۔

اورنگ زیب خود خلد آباد دکن کے ایک بزرگ شیخ زین الدین کے مقبرے کے صحن میں مدفون ہے۔ اس عمارت کے تقدس میں کلام نہیں لیکن تعمیری اعتبار سے اس کی حیثیت بالکل معمولی ہے۔

میسور

میسور میں حیدر علی اور ٹیپو کی عمریں لڑتے بھڑتے گزر گئیں لیکن اس کے باوجود سرنگا پٹم میں ''دریا دولت'' اور دوسرے محل بنائے گئے اور حیدر علی کا مقبرہ بھی تعمیر کیا گیا۔ جو آگرہ اور دہلی کی عمارتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم سادگی اور عظمت کا سرمایہ دار ہے۔

لکھنؤ

سلاطین اودھ نے لکھنؤ میں بہت سی عمارتیں بنوائیں جن میں مسجدیں، مقبرے، امام باڑے اور شاہی محل شامل ہیں۔ سعادت علی خان کا فرحت بخش۔ نصیر الدین حیدر کا چھتر منزل۔

واجد علی شاہ کا قیصر باغ۔ بیگم کوٹھی وغیرہ اچھی عمارتیں ہیں۔ لیکن فنِ تعمیر کے اعتبار سے اسلامی۔ اطالوی اور مقامی اسالیب کا نمونہ واقع ہوئی ہیں۔ اور ماہرین آثار قدیمہ کو ان میں وہ خصوصیات نظر نہیں آئیں جنھوں نے ہندوستان میں تعمیر کے مغل دبستان کو دنیا کا ایک مسلمہ فنِ لطیف بنا دیا تھا۔

چوبی تعمیرات

کشمیر میں مغلوں کے باغات بلاشبہ سیاحوں اور ماہرین آثار کے لیے مطالعہ کا دلچسپ سامان ہیں۔ لیکن مقامی فن تعمیر کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ جامع مسجد سری نگر اور مسجد شاہ ہمدان اب تک موجود ہیں اور وہ کلیتاً لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ مسجد شاہ ہمدان اگرچہ جامع مسجد کے مقابلے میں چھوٹی ہے لیکن تفصیلی آزمائش کے اعتبار سے دلچسپ ہے اور اس کو دیکھ کر مارتنڈ کے مندر اور بودھی اثرات کا احساس ہوتا ہے۔

بہرحال ''چوبی تعمیر'' کے یہ نمونے بجائے خود ملک بھر میں عدیم المثال ہیں۔ اور ان کی چتر کاری اگرچہ کہنہ و فرسودہ ہو چکی ہے۔ تاہم اس سے کاریگروں کی صناعی کا پتا چلتا ہے۔

تیسری فصل: مصوّری و خطاطی

مصوّری

ہندوستان کی چتر وِدّیا

ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود سے قبل فن مصوری نے خاصا عروج حاصل کر لیا تھا۔ جس کی ابتدا ابھوج پتر اور کھالوں پر تصویر کشی سے ہوئی اور انتہا اجنتا اور باغ کی دیواری تصاویر کی صورت میں منصۂ شہود پر آئی۔ ہندوؤں کے مندروں اور راج محلوں کی دیواروں پر بڑے بڑے باکمال مصور تصویریں کھینچتے تھے۔ اور یہ فن چتر وِدّیا کہلاتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چتر وِدّیا کے شاہکار زیادہ تر جنوبی ہند میں تھے۔ وادیٔ گنگا اور وادیٔ سندھ (یو۔پی اور مغربی پاکستان) میں اس فن کی ترقی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بلاشبہ متھرا اور گجرات میں سلطان محمود غزنوی نے ہندوؤں کے فنی اور تعمیری کمالات کا مشاہدہ بھی کیا اور مندروں اور محلوں میں سونے اور جواہرات کے مسرفانہ صَرف پر حیرت بھی ظاہر کی۔ لیکن اس نے بھی دیواری تصاویر (میورل پینٹنگ) کا کوئی

خاص ذکر نہیں کیا۔ صرف دوسرے شواہد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان عمارتوں میں تصاویر بھی ہوں گی۔ گوفنی اعتبار سے وہ جنوبی ہند کے بودھ آرٹ کے مقابلے میں ہیچ ہی ہوں۔

مسلمان اور دیواری تصاویر

البتہ اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد دیواری تصاویر بنوائیں۔ اور مصوروں کی ہمت افزائی کے لیے کافی روپیہ صَرف کیا۔ التمش کے زمانے کا ایک مؤرخ تاج رضا لکھتا ہے۔ کہ جب دہلی میں خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کا سفیر سلطان کے لیے خلعت لے کر آیا تھا تو اس کی پذیرائی کے لیے شہر کو آراستہ کیا گیا اور اس سلسلے میں بہت سی دیواری تصویریں بھی کھچوائی گئیں۔ کلکتہ آرٹ گیلری میں ایک مصور شاہ پور خراسانی کی کھینچی ہوئی ایک تصویر موجود ہے جس میں سلطان محمد بن تغلق کے دربار کی ایک مجلس موسیقی کا منظر دکھایا گیا ہے۔ زمانۂ حال کے ایک نقادفن نے اس تصویر کے متعلق لکھا ہے کہ ''اس میں حسن فطرت سے سادہ مسرت حاصل کرنے اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صمیمانہ خواہش پائی جاتی ہے۔ اور یہ وہ خوبی ہے جس سے اجنتا کی تصاویر اور پور بندر کے مجسمے مالا مال ہیں۔[۲۶] مصور کا بیان ہے کہ یہ تصویر حقیقت میں اصل تصویر کی ''نقل'' ہے۔ غالباً اصل تصویر دہلی میں کھینچی گئی ہوگی۔ جس کو خراسانی مصور نے نقل کیا۔

فیروز شاہ تغلق

فیروز شاہ تغلق اپنی کتاب ''فتوحات فیروز شاہی'' میں لکھتا ہے کہ میں نے محلوں کی دیواروں پر جانداروں کی تصاویر کھینچنے کی ممانعت کردی۔ اور حکم دیا کہ ان کی جگہ باغات وغیرہ کی تصویریں بنائی جائیں۔ اس کا بیان ہے کہ سابق بادشاہ جو خلعت عطا کیا کرتے تھے ان پر اور سازو یراق خیموں، پردوں، برتنوں اور فرنیچر پر بھی تصاویر کھینچنے اور کاڑھنے کا رواج عام تھا۔[۲۷] عفیف نے بھی اس زمانے کی دیواری تصویروں اور پیتل، تانبے، چاندی اور سونے کی چیزوں کی منقوشات کا ذکر کیا ہے۔ شاہی خیموں کے پرچم بھی گوناگوں تصاویر سے مزین کیے جاتے تھے[۲۸] اور محلوں کی دیواری تصویروں کا سراغ تو خاندان غزنویہ کے سلاطین کے عہد میں بھی ملتا ہے۔[۲۹]

کتابی تصاویر

یعنی جہاں تک تیرھویں صدی تک کی ہندوستانی مصوری کا تعلق ہے۔ مسلمان سلاطین و امراء نے زیادہ تر ہندوستانی انداز ہی کو آگے بڑھایا اور دیواری تصاویر کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر بعض سلاطین نے احکام شریعت کی بنا پر جانداروں کی تصاویر کو ممنوع قرار دیا۔

ایرانی مصوری

لیکن مسلمانوں نے ہندوستان کی مصوری کو جو لازوال تحفہ عطا کیا ہے وہ ''کتابی تصویر'' ہے، جسے انگریزی میں Miniature کہتے ہیں۔ اس میں اگرچہ جزئیات دقیق نہیں ہوتیں لیکن منظر دور نما ہوتا ہے۔ قریبی نہیں ہوتا۔ مسلمان یہ فن ایران سے لائے۔ تیرھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک مسلمانوں نے اس فن میں کمال پیدا کیا۔ اور بے شمار کتابیں تیار کیں۔ جن کے ایک ایک صفحے پر نقاشی و خطاطی اور مصوری کے کمالات کا اظہار کیا۔ جو شہر اس فن کی مہارت میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں بغداد، بصرہ اور واسط۔ پندرھویں صدی میں سمرقند، بخارا اور ہرات۔ اور سولھویں صدی میں تبریز، قزوین، اصفہان اور شیراز تھے۔ اگرچہ بظاہر ان شہروں میں چار ایسے ہیں جو آج ایران میں واقع ہیں۔ اور باقی عراق، ترکستان اور افغانستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ولادتِ مسیح کی پہلی صدیوں میں ساسانیوں کا پرچم اقبال دجلہ سے لے کر جیجوں تک لہراتا تھا۔ اور یہ تمام شہر قلمروِ ایران میں شامل تھے۔ اس لیے اگر عالمِ اسلام کے فن مصوری کو بعض نقاد ''ایرانی مصوری'' سے موسوم کرتے ہیں تو ان کا یہ رویہ بڑی حد تک حق بجانب ہے۔

منگولوں سے پہلے تیرھویں صدی کے وسط تک عراق میں جو فنِ مصوری موجود تھا اور جس کو بعض خلفائے عباسی کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کی نوعیت بالکل ابتدائی تھی۔ گو اس میں زندگی اور توانائی کے وہ عناصر نمایاں تھے جو عربوں کے ذہن کی خصوصیات ہیں[۳۰] اس کے بعد ۱۲۵۰ء سے ۱۳۵۰ء تک منگولوں کا اثر غالب رہا۔ اور ان کی وساطت سے چین کے فن مصوری کے بعض عناصر یہاں راہ پا گئے۔ اس کی بعد تیموریوں کا زمانہ آیا۔ جو ۱۳۷۵ء سے ۱۵۰۰ء تک سمرقند، بخارا اور ہرات میں کوس اقتدار بجاتے رہے۔ تیموری فن آہستہ آہستہ صفویوں کے فن سے مخلوط ہو گیا جس کا مرکز تبریز تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں خاندان صفویہ کے ماتحت یہ فن عین الکمال

تک پہنچ گیا۔[۳۱]

تیموریوں کی فن پروری

تیمور کی تبارہ کاری تو صحیح ہے۔ لیکن یہ امر بھی مسلّم ہے کہ وہ اپنے پایۂ تخت سمرقند میں اہل علم وفن کی قدر دانی بدرجۂ اتم کرتا تھا۔ اور اس کی اولاد بھی اس معاملے میں اسی کے نقش قدم پر گامزن رہی۔ مثلاً اس کے بیٹے اور جانشین شاہ رخ نے ہمیشہ اپنے دربار میں مصوروں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا پایۂ تخت ہرات تھا۔ اور اس کی حکومت پورے ایران پر مسلط تھی۔ ۱۴۱۹ء میں اس نے چین کو ایک سفارت بھیجی۔ جس کا ایک معزز رکن غیاث الدین خلیل نامور مصور تھا۔ اس طریق سے گویا چین سے وہ تعلق دوبارہ قائم ہوگیا جو منگولوں کے زمانے میں ترویج فن مصوری کا باعث ہوا۔ شاہ رخ کے ایک بیٹے نے استر آباد میں چالیس مصور اور نقاش مقرر کیے جو اس زمانے کے نامور نقاش مولانا جعفر کے ماتحت مسودات کتب کی نقل اور نقاشی میں مصروف تھے۔ بخارا بھی علم وفن کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اور اس میں مصوری نے ایسا عروج حاصل کیا کہ وہاں کے مصورین کا ایک مخصوص دبستان قرار پاگیا۔

سلطان حسین مرزا اور بہزاد

لیکن ایشیا کے فن مصوری کا نقطۂ کمال خراسان میں سلطان حسین مرزا کا دربار تھا۔ یہ بادشاہ تیمور کے بیٹے عمر شیخ مرزا کا پڑپوتا تھا۔ جامی اور ہاتفی جیسے شعرا۔ میر خواند اور خوند میر جیسے مؤرخین اسی کے دربار کی زینت تھے۔ لیکن گل سرسبد کی حیثیت بہزاد کو حاصل تھی جو آج تک ایشیا کا بہترین کلاسیکی مصور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور جس نے اپنے زمانے کے تمام مصوروں کو اپنے کمال فن سے متاثر کیا۔ آغا میرک، سلطان محمد اور مرزا علی اس کے نہایت چابک دست شاگرد تھے۔ لیکن اپنے استاد کے کمال کو نہ پہنچتے تھے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ مغلوں کے زمانے میں شبیہ کشی اور کتابی تصویرکشی کے جو معجزات ظہور میں آئے۔ ان کا ماخذ بہزاد اور اس کے تلامذہ کا فن تھا۔ پرانے مصور کسی کی شبیہ کھینچتے تھے تو اس کے خدوخال نمایاں نہ ہوتے تھے اور محض لباس اور داڑھی وغیرہ سے اندازہ کیا جاتا تھا کہ یہ فلاں شخص کی شبیہ ہے۔ لیکن بہزاد نے اس فن میں انقلاب پیدا کردیا۔ اس نے اور اس کے شاگردوں نے بادشاہوں اور امیروں کی جو شبیہیں تیار کیں وہ اپنے خدوخال میں حیرت انگیز طور پر اصل سے مشابہ تھیں۔ بہزاد کے فنی کمال کے بہترین نمونے ''

ہیں۔ بوستان کا وہ نسخہ جو مصر کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔ اور خمسہ نظامی جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

بہزاد کے شاگرد

۱۵۰۶ء میں سلطان حسین مرزا کا انتقال ہوگیا اور بہزاد نے شاہ ایران اسمٰعیل صفوی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد سلطان محمد اور میرک نے ایک نہایت پرتکلف اور مرصع نقاشی کا اسلوب اختیار کیا جس میں عشق و محبت اور عیش و عشرت کے مناظر نمایاں تھے۔ اور زوال و انحطاط کا رجحان رکھتے تھے۔ آخر سترھویں صدی کے نصف اول میں تبریز کے ایک مصور علی رضا عباسی نے فن کی سابقہ تنومندی، سادگی اور صحت وری کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ۱۶۴۵ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور احیا و تجدید کی کوشش بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔

بابر

بابر سولھویں صدی کے اوائل میں ہندوستان آیا اور صرف چار پانچ سال زندہ رہ کر رخصت ہوا۔ اس کو جنگ و پیکار اور استحکام مملکت کے کاموں سے فرصت ہی نہ ملی۔ ورنہ وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح فن مصوری کی سرپرستی اور قدر دانی کرتا۔ اگرچہ وہ بالفعل مصور نہ تھا لیکن بالقوہ ضرور تھا۔ اس لیے کہ ایک تو وہ ترکی کا اتنا بڑا شاعر تھا کہ نقاد اسے صرف علی شیر نوائی سے کم سمجھتے ہیں اور باقی سب پر فوقیت دیتے ہیں۔ دوسرے وہ اپنی کتاب تو زک بابری میں جہاں جہاں باغوں، سبزہ زاروں، کوہساروں اور چشمہ ساروں کا حال بیان کرتا ہے اس کا قلم بلاشبہ مصوری کے پھول بکھیرتا ہے۔ اور اس کی اس نثر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ نقش و تصویر کے معاملے میں کس قدر باریک بین جمالیاتی نظر رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے تیموری آباء و اجداد کے کتب خانے سے فن مصوری کے بہترین شاہکار فراہم کیے اور انھیں اپنے ساتھ ہندوستان لے آیا۔ (یہ تصاویر نادر شاہ دہلی پر حملہ کر کے واپس ایران لے گیا تھا) نقش و تصویر کے ان شاہکاروں نے ہندوستان کے فن تعمیر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ [۳۲]

ہمایوں ایران میں

اس کے بعد ہمایوں کا زمانہ آتا ہے۔ چند سال حکومت کرنے کے بعد اس نے شیر شاہ

سے شکست کھائی اور بھاگ کر ایران پہنچ گیا۔ جہاں اس نے جلاوطنی کے پندرہ سال شاہ طہماسپ صفوی کی مہمان نوازی اور مسافر پروری کے زیر سایہ گزارے۔ اگرچہ ہمایوں کے ایران پہنچنے سے پہلے کمال الدین بہزاد کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے جلیل القدر شاگرد آغا میرک، سلطان محمد اور مظفر علی فن کی بلندیوں پر پرواز کر رہے تھے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے درجے کے مصوروں سے تو سارا ملک بھرا پڑا تھا۔ شاہ طہماسپ کی خوش ذوقی نے ہمایوں کو اجازت دے دی کہ وہ ملک کے مختلف شہروں میں جا کر وہاں کے اہل علم و فن سے ربط ضبط پیدا کرے۔ چنانچہ جب وہ اپنی سیاحت کے دوران میں تبریز پہنچا تو وہاں اس کی ملاقات میر سید علی سے ہوئی۔ جو ایک نامور مصور تھا۔ اور ''خمسہ نظامی'' کے ایک شاندار مسودے کی تصویریں تیار کرنے والے چند باکمالوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ اور اس کا باپ میر منصور بدخشانی دونوں بہزاد کے شاگرد تھے۔ اس وقت اسی شہر میں شیراز کا ایک مصور خواجہ عبدالصمد بھی مقیم تھا۔ وہ بھی ہمایوں کی خدمت میں باریاب ہوا۔ یہ شخص مصور بھی تھا اور خطاط بھی۔ اور شاہ شجاع حاکم شیراز کے وزیر کا بیٹا تھا۔

داستانِ امیر حمزہ

جب ۱۵۵۰ء میں ہمایوں نے دوبارہ فتح ہندوستان پر کمر ہمت باندھی اور کابل کو چلا تو ان دونوں مصوروں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمایوں اور اس کا ننھا بیٹا اکبر دونوں اس زمانے میں نقاشی اور مصوری سیکھ رہے تھے اور ان فنون لطیفہ سے بے انتہا شغف رکھتے تھے۔[۳۳] یہاں ہمایوں نے میر سید علی تبریزی کو ایک نہایت عظیم کام پر مامور کیا۔ یعنی اس کو حکم دیا کہ داستان امیر حمزہ کو مصور کرے۔ اس کام کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کو بارہ سو صفحوں میں مکمل کرنا تھا۔ اور ہر صفحے پر ایک تصویر کھینچنی تھی۔ اس کتاب کے صفحے کی پیمائش "۲۲×" ۱/۴ ۲۸ تھی۔ شاید اتنی بڑی کتابی تصویریں اور اتنی کثیر تعداد میں کبھی تیار نہ کی گئی ہوں گی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کام میں خواجہ عبدالصمد شیرازی اور بعض دوسرے مددگار مصور بھی میر سید علی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔[۳۴] ہمایوں نے ہندوستان پر بھی حملہ کیا۔ لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن یہ مصور اپنے کام میں مصروف رہے۔ خدا کی قدرت یہ کام ابھی تکمیل کو پہنچنے نہ پایا تھا کہ ہمایوں کوٹھے سے گر کر جاں بحق ہو گیا۔ اور کلانور (ضلع گورداسپور) کے مقام پر اکبر کی تخت نشینی عمل میں آئی۔

مغل دبستان مصوری

ان تصریحات سے واضح ہوگیا ہوگا کہ کتابی تصویر کا فن صفوی دبستان سے ہندوستان میں آیا۔ اور بہزاد کے شاگردوں نے اپنے شاہکاروں سے ہندوستانی مصورین کی رہنمائی کی۔ اس کے بعد اکبر کے دور میں مغل دبستان وجود میں آیا۔ جس کے کارناموں کے بیان سے پہلے چند ضروری نکات پیش کرنا ضروری ہے۔ اکبر چونکہ ایرانی باکمالوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی فنکاروں کی بھی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے بعض ہندو مصورین کو بھی ایرانی دبستانی سے آشنا کیا۔ ان مصورین کے موضوعات علی العموم ''ملکی'' تھے۔ لہٰذا مغل دبستان کے ماتحت ایک ذیلی دبستان ''راجپوت یا راجستھانی سکول'' کے نام سے بھی نمودار ہوا۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں ایک ہی تھے۔ ان میں تفاوت صرف اس قدر ہے کہ مسلمان اور غیر ملکی مصورین دربار شاہی اور امرا و حکام کی شان و شوکت، ان کی مصروفیتوں اور انہی سے متعلق بعض تاریخی واقعات کو اپنا موضوع فن بناتے تھے۔ اور ہندو یعنی ''راجپوت سکول'' کے مصوّر علی العموم اپنے ممدوح راجاؤں اور اپنے معبود دیوتاؤں سے تعلق رکھنے والے موضوعات اختیار کرتے تھے۔ اور ایرانی دبستان کے علاوہ جنوبی ہند کے بودھ آرٹ سے بھی کسب توفیق کرتے تھے۔ مغل دبستان اور راجپوت سکول بعض تصادیر میں اس قدر مخلوط اور گڈمڈ نظر آتے ہیں۔ کہ نقاد ان کے اسلوب کا تعین کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر نقادوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ان دونوں میں فرق صرف موضوع کا ہوسکتا ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے راجستھانی تصاویر بھی ایرانی مصوری ہی سے مستفید معلوم ہوتی ہیں۔

کاغذ مسلمان لائے

مغل دبستان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصور اور خطاط دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مغلوں کی تیار کرائی ہوئی کتابوں میں نظم و نثر خوشنویس لکھتا تھا۔ اور تصاویر مصور بناتا تھا۔ یعنی فن تصویر کے ساتھ ہی ساتھ فن خوشنویسی ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا ایسی بلندیوں پر پہنچ گیا کہ شاید دنیا کی کسی زبان کا رسم الخط آج تک ان بلندیوں کو نہیں چھو سکا جن پر عربی اور فارسی خطاطی کو ہمارے باکمال خوشنویسوں نے پہنچا رکھا ہے۔ یہ دونوں فن صرف کاغذ کی وجہ سے ترقی پذیر ہوئے۔ اور ہندوستان میں کاغذ درآمد کرنے والے صرف مسلمان تھے۔ ہندوؤں کی قدامت

پرستی کا تو یہ حال تھا کہ جس زمانے میں ایشیا کے اکثر ممالک کاغذ استعمال کر رہے تھی۔ ہندو اپنا وہی بھوج پتر لیے بیٹھے تھے۔ پندرھویں صدی تک بھی ہندوستان میں کاغذ کا رواج کالعدم تھا۔ صرف مغربی ساحل کے گجراتی تاجر سمندر پار کے تاجروں کے ساتھ کاروبار کرنے کی وجہ سے کاغذ استعمال کر رہے تھے۔[۳۵] ظاہر ہے کہ کاغذ کے بغیر مصوری اور خطاطی ترقی کے رستے پر قدم نہ بڑھا سکتی تھیں۔ اور چھال اور کھال اور بھوج پتر کاغذ کا کام نہ دے سکتے تھے۔

کارخانہ کتاب سازی

اکبر نے اپنے کارخانہ جات شاہی میں ایک خاص شعبے کا اضافہ کیا۔ جس میں کتاب سازی کے تمام متعلقہ فنون مثلاً مصوری، خطاطی، نقاشی، جلد بندی، اور آرائش و زیبائش کے کام سکھائے جاتے تھے۔ سر ٹامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ اس کارخانے میں ایک سو گیارہ تو صرف مصور ہی تھے۔ اور بے شمار نقاش اور خطاط ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۶۴۱ء تک کتب خانہ شاہی میں چوبیس ہزار ایسے قلمی نسخے فراہم ہوگئے جوانہی باکمالوں کی محنت اور فن کاری کے شاہکار تھے۔

اکبر کی دیواری تصاویر

اکبر نے فتح پور سیکری کی تعمیر کے وقت دیواری تصویر کے فن کو بھی زندہ کر دیا۔ جو صدہا سال سے جنوبی ہند کی یادگاری عمارات اور شمالی ہند کے بعض راج محلوں ہی کی زینت چلا آرہا تھا۔ اور جس کی ترقی ''کتابی تصویر'' اور ایرانی دبستان کی مقبولیت عامہ کے باعث رک گئی تھی۔ فتح پور سیکری کی عمارتوں کے اندر دیواروں پر بعض تصاویر کے مناظر خالص ایرانی ہیں اور صفوی دبستان سے متاثر ہیں۔ لیکن بعض تصاویر خالص ہندوستانی موضوعات سے بھی متعلق ہیں۔ جن کے بنانے والے یقیناً وہ ہندو مصورین تھے جنھوں نے میر سید علی اور عبدالصمد شیرازی کے زیر نگرانی شاہی کارخانے میں تربیت حاصل کی تھی اور ایرانی و ہندوستانی مصوری سے یکساں بہرہ حاصل کیا تھا۔

فن مصوّری اور اکبر

ابو الفضل لکھتا ہے کہ اکبر کو اوائل عمر ہی میں فن مصوری ... شغف ہو گیا تھا۔ اس نے

ہمیشہ اس فن کی حوصلہ افزائی کی اور اس کو مطالعہ وتفریح کا موجب خیال کیا۔ ابوالفضل نے اکبر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔ کہ "بعض لوگ مصوری سے نفرت کرتے ہیں میں ایسے لوگوں کو ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصور کو معرفتِ الٰہی کا ایک خاص وسیلہ حاصل ہے۔ کیوں کہ جب وہ کسی جاندار کی تصویر کھینچتا ہے اور یکے بعد دیگرے اس کے اعضا کی تشکیل کرتا ہے۔ تو لازماً یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس میں جان نہیں ڈال سکتا۔ چنانچہ وہ مجبور ہوتا ہے کہ زندگی بخشنے والے خدا کی خدائی کو تسلیم کرے۔" ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں اشیاء کی شکلوں کا مشاہدہ کرنا اور ان کی شبیہ تیار کرنا جو بعض لوگوں کے نزدیک لاحاصل اور بے سود ہے۔ ایک تربیت یافتہ دماغ کے لیے سرچشمۂ دانش ہے اور زہر جہالت کا تریاق ہے۔ قوانین شریعت کے محض الفاظ کی پابندی کرنے والے متعصب لوگ فن مصوری کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن اب صداقت ان کی آنکھوں پر بھی روشن ہو رہی ہے۔[۳۶]

بے شمار مصور اور بے شمار کتابیں

داستانِ امیر حمزہ کو مصور کرنے کا ذکر ہو چکا ہے۔ ہمایوں کے عہد میں یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔ لیکن اکبر نے اس کو تکمیل پر پہنچایا۔ اور بارہ جلدوں میں چودہ سو تصاویر تیار کرائیں۔ یہ تصاویر کپڑے پر کھینچی گئی تھیں۔ ان میں سے صرف پچاسی تصاویر محفوظ ہیں۔ ساٹھ انڈسٹریل میوزیم ویانا میں اور پچیس وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم (ہندوستانی سیکشن ساؤتھ کینسنگٹن) میں۔[۳۷] باقی خدا جانے کہاں گئیں۔ اگر پوری مصور داستان امیر حمزہ محفوظ رہتی تو شاید دنیا بھر میں فن مصوری کا بہترین کارنامہ تسلیم کی جاتی۔ اس کے علاوہ اکبر کے عہد میں چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اقبال نامہ، رزم نامہ (مہا بھارت) (مارٹن کا قول ہے کہ اس پر اکبر نے جو روپیہ صرف کیا، اس کی مالیت چالیس ہزار پاؤنڈ ہوتی تھی۔ یہ مسودہ اس وقت جے پور میں ہے)، بابر نامہ، تیمور نامہ، داراب نامہ، شاہ نامہ، بہارستان جامی، خمسۂ نظامی، اکبر نامہ، انوار سہیلی، رامائن، نل دمیتی، کلیلہ دمنہ (پنچ تنتر) اور عیار دانش بھی مصور کرائی گئیں اور ان کے حواشی پر بے حد پر تکلف نقاشی کی گئی۔ ہر ہفتے داروغہ ہائے کارخانہ ہر مصور کا کام اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کرتے۔ اور وہ سب کو علیٰ قدر قابلیت انعامات و ترقیات سے مالا مال کرتے۔ درباری مصورین میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے۔ میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیریں قلم شیرازی، دسونت (ایک پالکی بردار کا بیٹا)، کیسو،

لال، مکند، مشکیں، فرخ قلماق، مادھو، بساون، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولہ، رام، ہری بنس۔ خاندان شاہی کے علاوہ دربار کے امرا و حکام کی تصاویر بھی انہی مصوروں نے تیار کی تھیں۔ جو ایک بڑے مرقع کی صورت میں جمع کردی گئی تھیں۔ یہ مرقع اب ناپید ہے۔[۳۸]

عہد جہانگیری

غرض اکبر نے ہندوستان میں ایرانی مصوری کو مقامی اثرات سے مخلوط کر کے مغل دبستان مصوری کی بنیاد بھی رکھی اور اُسے درجۂ کمال کو بھی پہنچایا۔ اس کے عہد کے آخری دور میں ایران سے دو نئے مصور وارد ہوئے۔ ایک فرخ قلماق۔ دوسرا آقا رضا۔ اول الذکر تو دربار شاہی سے وابستہ ہوا۔ آخر الذکر کو شہزادہ سلیم (جہانگیر) نے ملازم رکھ لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آقا رضا سلیم کی ولی عہدی کے زمانے میں فوت ہوگیا۔ کیوں کہ جہانگیر نے خود لکھا ہے کہ میرے دربار کا ایک مصور ابوالحسن ہے جس کا باپ آقا رضا ہراتی میرے زمانۂ ولی عہدی میں میرا ملازم ہوا تھا۔[۳۹] ابوالحسن کو جہانگیر نے ''نادر الزمان'' کا خطاب دیا تھا۔ جہانگیری عہد کا ایک مصور منصور پرندوں اور پھولوں کی تصاویر بنانے میں کمال رکھتا تھا۔ اس کو ''نادر العصر'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ بشن داس مراد، اور منوہر بھی اسی عہد کے باکمال مصور تھے۔ بشن داس شبیہ سازی میں بے نظیر تھا۔ اور شاہ طہماسپ اور اس کے دربار کی تصویریں بنانے کے لیے ایران بھی بھیجا گیا تھا۔[۴۰]

جہانگیر اور بابر

نقادانِ فن کی رائے ہے کہ جہانگیر کی طبیعت میں اکثر ایسی خصوصیات تھیں جن کے لیے اس کا پڑدادا بابر مشہور ہے۔ سیر و سیاحت، کھیل تماشے، پھولوں، باغوں اور دل فریب نظاروں سے دونوں کو انتہائی وابستگی تھی۔ دونوں علم و فن کے شوقین اور شعر و موسیقی کے رسیا تھے۔ اور دونوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمریاں تیار کیں۔ یہ اور بات ہے کہ بابر سخت کوش، مہم پسند اور جنگجو تھا اور جہانگیر کے خصائص اس کے بالکل متضاد تھے۔ اور یہ اثر محض حالات اور ماحول کا تھا۔ لیکن جہاں تک ذوق ادب و فن کا تعلق ہے، ان دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ جہانگیر کی یہی فطرت پرستی تھی جس کی وجہ سے مغل دبستان مصوری میں فطرت کا رنگ غالب آگیا۔ عہد جہانگیری میں ادب قدیم کی کتابوں کی خیالی تصاویر بنانے کا شیوہ قریب قریب متروک ہوگیا۔ اب تصور کی جگہ اصل نے لے لی۔ مردوں اور عورتوں کے خدوخال ممیز ہوگئے۔ پیکر انسانی کا

تناسب صحیح ہونے لگا۔ درخت، پہاڑ، بادل، پرندے، پھول، حیوانات اپنی اصلی شکل میں نظر آنے لگے۔ تیز اور شوخ رنگوں کی جگہ ہلکے اور سموئے ہوئے رنگ استعمال ہونے لگے۔ جنگ و پیکار کی بجائے دربار اور شکار کے مناظر اور مشاغل کی تصویریں تیار ہونے لگیں۔

سر طامس رو

انہی دنوں سر طامس رو سفیر انگلستان دربار مغلیہ میں باریاب ہوا۔ وہ مغل مصوری کا بہت مداح تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ہاں کی ایک تصویر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ جہانگیر کے درباری مصور نے کہا کہ میں اس کی نقل تیار کرسکتا ہوں۔ جب چند روز بعد سر طامس رو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس کو چھ تصویریں دکھائیں جو ہو بہو باہم ملتی تھیں۔ وہ سب کی سب اس قدر متماثل تھیں کہ شمعوں کی روشنی میں سر طامس رو اصل اور نقل کی کوئی تمیز نہ کرسکا۔ آخر بڑی مشکل سے اس نے اپنی پیش کی ہوئی تصویر الگ کر کے دکھائی اور کہا کہ مجھے درباری مصور سے اس کمال کی توقع ہرگز نہ تھی۔[۴۱]

مقرب خان بندرگاہ گوا سے چند جانور لایا تھا جن کی تصویریں بادشاہ نے "جہانگیر نامہ" کے لیے تیار کرائیں۔[۴۲]

اساتذہ قدیم کے شاہکار

جہانگیر اساتذہ قدیم کی تصاویر کا بہت قدر دان تھا۔ چنانچہ بہزاد اور اس کے شاگردوں کی تصویریں بڑی قیمت دے کر خرید لیا کرتا تھا۔ ایسی چار تصویروں کے لیے جو ۱۴۹۰ء میں تیار کی گئی تھیں اس نے پندرہ سو روپے ادا کیے۔ ایک دفعہ "یوسف زلیخا" کا ایک مسودہ ہاتھ آیا۔ جو ایک عظیم خطاط ملا میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اور اسی پائے کے ایک مصور نے اس کی تصویریں تیار کی تھیں۔ اس کی قیمت ایک ہزار طلائی مہروں میں ادا کی گئی۔ ایک تیموری مصور خلیل مرزا کی ایک نایاب تصویر جس پر دو صدیاں گزر چکی تھیں۔ جہانگیر کے مجموعۂ تصاویر کا گلِ سرسبد تھی جو بڑے جتن سے ہاتھ آئی تھی۔

جہانگیر کی تنقیدی مہارت

جہانگیر کو مصوری اور مصورین کے نقد و نظر میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ چنانچہ توزک

میں خود لکھتا ہے کہ

''اب فنِ مصوری سے میرے لگاؤ اور شناخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی تصویر میرے سامنے لائی جائے۔ خواہ وہ کسی متوفّی مصور کی ہو یا زندہ کی۔ اور مجھے اس کا نام نہ بتایا جائے تو میں ایک لمحے میں بتاؤں گا کہ یہ فلاں مصور کے مُوقلم سے ہے۔ اور اگر کسی تصویر میں بہت سی شبیہیں شامل ہوں اور ہر شبیہ کا چہرہ الگ الگ مصوروں نے کھینچا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ کون سا چہرہ کس مصور نے کھینچا ہے۔ اور اگر کسی دوسرے مصور نے صرف چشم وابرو ہی بنائے ہوں تو میں بتا دوں گا کہ اس تصویر کا چہرہ کس کے قلم سے اور چشم و ابرو کس نے بنائے ہیں۔''

شاہ جہاں

شاہ جہاں اگرچہ عمر بھر عمارات بنانے میں مصروف رہا۔ لیکن فنِ مصوری نے اس کو بھی بڑا لگاؤ تھا۔ اس کے زمانے میں کتابی تصاویر کے بعض نقائص جو ایرانی زمانے سے چلے آرہے تھے، دور کردیے گئے۔ مثلاً چہرے تین چوتھائی کی بجائے یک رُخی بننے لگے۔ اور آنکھیں بادامی شکل کی کھینچی جانے لگیں۔ شبیہ سازی کمال کو پہنچ گئی۔ بادشاہ، شہزادوں اور امیروں کی بے شمار تصویریں تیار ہوئیں اور ان کے شاندار مرقعے کتب خانوں میں محفوظ کیے گئے۔ بشن داس مصور کی ایک تصویر بہت مشہور ہے۔ جس میں شاہ جہاں ایرانی سفیر کو باریابی عطا کررہا ہے۔ فقیر اللہ خان دربار شاہ جہانی کا سب سے بڑا مصور تھا۔ اور محمد نادر سمرقندی، میر ہاشم، اور بچتر اس سے دوسرے درجے پر تھے۔

اورنگ زیب

اورنگ زیب بلاشبہ پابندی شریعت میں سخت تھا۔ لیکن اس کے عہد میں بھی مصوری برابر ترقی کرتی رہی کیونکہ بادشاہ اور امرا مصوروں کی قدردانی اور سرپرستی برابر کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس زمانے میں فن روبہ تنزل ہوتا گیا۔ لیکن یہی حالت دوسرے فنون کی بھی تھی۔ مثلاً اورنگ زیب کے درباری شعرا کو اکبر و جہانگیر کے فیضی، عرفی اور نظیری سے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ لیکن فن نابود نہیں ہوا ~~نہیں~~ نشتم پشتم چلتا ہی رہا۔

مختلف علاقوں کے قلم

زوال مغلیہ کے بعد درباری مصورین مختلف راجاؤں اور نوابوں کے ہاں چلے گئے۔ چنانچہ فن مصوری کے متعدد مقامی اسلوب پیدا ہو گئے۔ مثلاً دہلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، حیدرآباد، جے پور، کانگڑہ وغیرہ میں آرٹ کے گوناگوں اسالیب نے جنم لیا۔ ان مقامی اسالیب کو ''قلم'' کہتے تھے۔ مثلاً ''کانگڑہ قلم''، ''لکھنؤ قلم'' گویا فن پورے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا اور ''کتابی تصویر'' پورے ہندوستان کا فن قرار پا گیا۔

شاہکاروں کی تباہی

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے مصوری کے فن کو جس اوج کمال تک پہنچایا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے اب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں بعض تصاویر کے مجموعے موجود ہیں۔ اور انہی کی بنا پر بعض نقادانِ فن نے بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ لیکن اہم حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ مجموعے اصل ذخیرے کا عشر عشیر بھی نہیں۔ مغل تصاویر کا عظیم ذخیرہ جنگ و پیکار کے فتنوں اور لوٹ مار کے ہنگاموں کی نذر ہو چکا ہے۔ خصوصاً اٹھارھویں صدی تو ہمارے کلچر کے حق میں قیامت کی صدی تھی۔ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں دہلی کو تاخت و تاراج کیا۔ اور زر و جواہر کے علاوہ مغلوں کے شاہی کتب خانہ سے ہزاروں مصور کتابیں اور بڑے بڑے فنکاروں کے نتائج قلم کو سمیٹ کر ایران لے گیا۔ جہاں سے یہ جواہر پارے قسطنطنیہ اور اس کے بعد لندن، پیرس، برلن، ماسکو اور ویانا میں پہنچ گئے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو ان کو دیکھے یورپ میں دل ہوتا ہے سیپارہ
غنیؔ روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

نادر شاہ کے حملے سے کوئی تیس بتیس سال بعد روہیلوں کی جنگ نے دہلی کے ثقافتی ذخیرے کو شدید نقصان پہنچایا۔ پھر مرہٹے آ گئے۔ اور رہی سہی کتابیں اور تصویریں ستارا کے راجاؤں اور پونا کے پیشواؤں کے پاس پہنچ گئیں۔ اس کے بعد جو کچھ باقی رہ گیا تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں تلنگوں کی لوٹ مار اور گوروں کی تباہ کاری کی نذر ہو گیا۔ اور ہندوستان اور

انگلستان کے بازاروں میں ہزاروں روپے کی مالیت کے جواہر ادب وفن دو دو روپے میں بک گئے اور پھر خدا جانے کہاں معدوم ہوگئے۔ اگر یہ سارا خزانہ محفوظ رہتا تو آج دنیا کا کوئی ملک اپنی تاریخ ثقافت کی باقیات پر برعظیم ہندوپاک سے زیادہ فخر نہ کرسکتا۔

لیکن اس تمام تباہی و بربادی کے باوجود برعظیم اور یورپ کے شہروں میں ہمارا اتنا ثقافتی سرمایہ موجود ہے جس سے ہر نقاد بآسانی اندازہ کرسکتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستانی ثقافت کو ثروت مند بنانے میں کس قدر شاندار حصہ لیا ہے۔

۲:—— خطاطی

کتابی تصویر کے فن کی تکمیل کے لیے خطاطی اشد ضروری تھی۔ اس لیے کہ ہر کتاب کی نظم و نثر لازماً خطاط ہی لکھتے تھے۔ اور مصورین تصویریں کھینچتے تھے جس طرح ہندوستان میں فن مصوری کی تجدید و ترویج کا سہرا مغلوں کے سر ہے۔ اسی طرح خطاطی، نقاشی اور خوشنویسی کو رواج دینے اور کمال کو پہنچانے کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔

کوفی سے نستعلیق تک

عربی کا پرانا رسم الخط ''کوفی'' کہلاتا ہے جو تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں ایجاد ہوا۔ اور پانچ صدیوں تک مروج رہا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط سلاطین زمانہ کو لکھے وہ خط کوفی ہی میں ہیں۔ ساتویں آٹھویں صدی میں بعض خوشنویسوں نے خطِ نسخ ایجاد کیا۔ خط کوفی میں نقطے مفقود تھے۔ نسخ میں باقاعدہ نقطے دیے جاتے تھے۔ یہ خط عربی لکھنے کے لیے آج تک مستعمل ہے۔ تیرھویں صدی کے اواخر میں ایرانیوں نے خط نستعلیق ایجاد کیا جس کی خوبصورتی اور نوک پلک چھ سو سال سے اہلِ نظر کے لیے فردوسِ چشم بنی ہوئی ہے۔ نستعلیق کو جلدی اور تیزی سے لکھنے کے لیے شکستہ و شفیعا کے خط ایجاد کیے گئے جن کا موجد مرزا شفیعا ہراتی تھا۔ چونکہ دفتروں اور عدالتوں کے کاغذات اسی خط میں لکھے جاتے تھے اس لیے اسے خط دیوانی بھی کہتے ہیں۔ اس کو ترقی دینے والے کفایت خاں اور درایت خاں تھے۔ چنانچہ یہ خط انہی کے ناموں سے موسوم ہے۔

خواجہ میر علی تبریزی نے جو تیمور کا ہم عصر تھا۔ نسخ اور تعلیق دو خطوں کو ملا کر خط نستعلیق ایجاد کیا۔ ۷۹۸ء میں اس نے خواجوے کرمانی کا پورا دیوان اپنے ہاتھ سے لکھا۔ جو برٹش میوزیم

میں موجود ہے اور جس پر ''میر علی بن الیاس التبریزی الباورچی'' کے دستخط ثبت ہیں۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ میر علی تبریزی نستعلیق کا موجد نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ خط تیمور سے پہلے بھی موجود تھا۔ واللہ اعلم۔

بہرحال ابھی نستعلیق ابتدائی حالت میں تھا جس کو میر علی کے شاگردوں نے بہت ترقی دی۔ ان میں مولانا جعفر تبریزی اور مولانا اظہر مشہور ہیں۔ مولانا سلطان علی مشہدی مولانا اظہر کے شاگرد تھے۔ اور سلطان حسین مرزا کے مقرب درباریوں میں شامل تھے۔ جہاں امیر شیر علی نوائی وزیراعظم نے ملا جامی اور ملا ہاتفی جیسے جلیل القدر بزرگوں کو جمع کر رکھا تھا۔

سلطان علی مشہدی کے شاگردوں میں چھ بہت مشہور ہیں۔ سلطان محمد خاندان سلطان محمد نور، علاء الدین ہراتی، زین الدین نیشاپوری، عبدی نیشاپوری اور محمد قاسم شادی شاہ۔ ہرات میں بے شمار دوسرے خطاط اور کاتب بھی موجود تھے جن میں سے اکثر انہی استادوں کے شاگرد تھے۔ مثلاً میر علی مولانا زین الدین نیشاپوری کا شاگرد تھا۔ جس نے بڑا نام پیدا کیا اور جس کے مسودے آج بڑے بڑے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ دسویں صدی ہجری کے وسط میں جو مشہور خطاط گزرے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ شاہ محمود نیشاپوری، محمود اسحاق، شمس الدین کرمانی، جمشید معمائی، سلطان حسین خجندی، عیسیٰ ابن عشرتی، عبدالصمد غیاث الدین اور محمد حسین تبریزی۔

سلاطین اور خطاطی

ہندوستان میں سلطان ابراہیم غزنوی جو محمود کا پوتا تھا۔ خود بہت اچھا خوشنویس تھا۔ اور بعض سابقہ اور آئندہ سلاطین کی طرح فرصت کے اوقات میں قرآن مجید کی کتابت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے قرآن مجید کے دو نسخے اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیجے تھے۔[۴۳] سلطان ناصر الدین محمود پادشاہ ہونے کے باجود ایک گوشہ نشین زاہد کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور کتابیں لکھ لکھ کر ان کی اجرت سے معاش حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کے زمانے سے کوئی ایک سو سال بعد قاضی کمال الدین نے ابنِ بطوطہ کو قرآن مجید کا ایک نسخہ دکھایا جو نہایت نفیس اور خوشخط تھا۔ اور جس کو سلطان ناصر الدین محمود نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔[۴۴]

بابر

مغل پادشاہ تمام فنونِ لطیفہ کے مربی اور سرپرست تھے۔ پھر خطاطی ان کی توجہ سے

کیونکر محروم رہتی۔ بابر خود خطاطی کا بڑا قدر دان تھا۔ بلکہ خود بھی اس فن میں مہارت رکھتا تھا۔ اور ایک خاص نئے خط کا موجد بھی تھا۔ جس کو "خط بابری" کہتے تھے۔ بابر نے اسی خط میں قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا تھا۔[۴۵]

بابر اپنی توزک میں اساتذہ نستعلیق میں سے سلطان علی مشہدی کا ذکر کرتا ہے جو سلطان حسین اور اس کے وزراء کے لیے کتابیں لکھا کرتا تھا۔ اور ان کتابوں کی تصویریں بہزاد اور شاہ مظفر تیار کیا کرتے تھے۔ بابر بہت سے مصوروں، خطاطوں اور معماروں کو اپنے ساتھ ہندوستان لایا جو سلطان حسین بایقراہی کی درباری روایت سے مالا مال تھے۔ بابر نے آگرہ میں اپنی توزک مکمل کی جس کا فارسی ترجمہ شیخ زین خوافی نے کیا۔ اور جس کی کتابت ۹۳۷ھ میں ہمایوں کی فرمائش سے "علی الکاتب" نے کی۔ توزک کا یہ نسخہ ریاست الور میں محفوظ ہے اور خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔

ہمایوں

ہمایوں ۹۳۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے درباری خطاطوں میں دو نام بہت ممتاز ہیں۔ شہاب معمائی اور ملا بقائی۔ آگرہ کی مسجد کے کتبے اول الذکر ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ ہمایوں ایران سے واپسی کے وقت میر علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی شیریں قلم کو ساتھ لے آیا تھا جو مصوری، نقاشی اور خطاطی میں کمال رکھتے تھے۔

اکبر

اکبر کے دربار میں وہ خوشنویس بھی موجود تھے جو ہمایوں کی زیر سرپرستی کام میں مصروف تھے۔ لیکن اکبر نے نستعلیق کے ساتھ ساتھ مختلف اسالیب خط کی سرپرستی بھی کی۔ اور آرائشی خطوط میں سے ثلث، توقیع، محقق، ریحان، نسخ، رقاع، غبار، طغرا اور کوفی کے باکمالوں کو بھی جمع کیا۔ لیکن چونکہ نستعلیق فارسی کا مسلمہ خط قرار پاچکا تھا اور مقبول عام تھا اس لیے طبعاً اس کی طرف توجہ خسروانہ زیادہ مبذول تھی۔ دربار اکبری کے بڑے بڑے خوشنویس یہ تھے محمد حسین کاشمیری "زریں قلم"، ملا میر علی اور اس کا بیٹا ملا باقر، محمد امین مشہدی، میر حسین کولنکی، مولانا عبدالحی، مولانا نظام دوری اور ان کا لڑکا بایزید کاتب الملک، مولانا عبدالرحیم عنبریں قلم، میر عبداللہ، نظامی قزوینی، علی چمن کاشمیری، سلطان نصر اللہ قاسم ارسلاں۔[۴۶]

محمد حسین کاشمیری زریں رقم نے آئین اکبری کی ایسی نفیس کتابت کی کہ آئین کا یہ نسخہ خطاطی کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ نسخہ پہلے رسالہ اجین میں تھا۔ اب لندن میں ہے۔ مولانا عبدالرحیم ''عنبریں قلم'' نے خمسۂ نظامی کی کتابت کی تھی۔ سندھ کے مشہور مؤرخ میر معصوم بھکری علاوہ فن تاریخ کے خطاطی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ چنانچہ فتح پور سیکری کی عمارتوں کے کتبے اکثر انہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ محمد اصغر اشرف خاں ہفت قلم مشہور تھا۔ کیوں کہ نسخ کے علاوہ چھ دوسرے خطوں میں بھی مشاق تھا۔ ہندو خطاطوں میں پنڈت جگن ناتھ۔ رائے منوہر لال اور راجا ٹوڈرمل ممتاز تھے۔

جہانگیر

جہانگیر بھی خطاطی کی سرپرستی میں اپنے باپ سے پیچھے نہ تھا۔ چنانچہ اس کے عہد میں میر عبداللہ تبریزی ایک باکمال خوشنویس تھا جسے اکبر نے ''مشکیں رقم'' کا خطاب دیا تھا۔ مرزا محمد حسین ماہر خط شکستہ محمد بن اسحاق ہراتی (کاتب دیوان مرزا کامران)، احمد علی ارشد طغرا نویس عہد جہانگیری کے نامور خطاط گزرے ہیں۔

میر عماد اور دیلمی

میر عماد ایک نہایت نامور خطاط تھا۔ اور شاہ جہان کو اس کے نستعلیق سے اس قدر شیفتگی تھی کہ جو کاتب میر عماد کے طرز پر لکھتے تھے ان کو وہ ''صد سواری'' منصب دے دیتا تھا۔ خود شاہ جہاں کو بھی فن خوش نویسی میں خاصا شغف تھا۔ عبدالرشید دیلمی میر عماد کا بھتیجا تھا جب میر عماد قتل کردیا گیا تو دیلمی دربار شاہ جہانی میں آکر ملازم ہوگیا۔ اور شہزادہ داراشکوہ کو خطاطی سکھانے پر مامور کیا گیا۔ عبدالرشید دیلمی عام خوشنویسوں کے نزدیک امامِ فن ہے۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ نستعلیق خواجہ میر علی تبریزی سے شروع ہوا۔ اور عبدالرشید دیلمی پر ختم ہوگیا۔

عبدالباقی ماہرِ نسخ شہزادہ اورنگ زیب کا اتالیق تھا۔ اس نے تیس ورق میں پورے قرآن مجید کی کتابت کرکے یہ نسخہ شاہ جہاں کو پیش کیا اور یاقوت رقم خطاب پایا۔ سید علی خاں تبریزی بھی شاہ جہان ہی کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اور اورنگ زیب کو کتابت سکھانے پر مامور ہوا۔ بادشاہ نے اس کو ''جواہر رقم'' خطاب عطا کیا۔ یہ میر عماد اور دیلمی کے اسلوب پر لکھتا تھا۔ اسی کا ایک شاگرد سید ہدایت اللہ زریں قلم تھا۔ جس کا ذکر رقعات عالمگیری میں موجود ہے۔ خود

اورنگ زیب کو نسخ اور نستعلیق دونوں میں دستگاہ حاصل تھی اورنگزیب کے عہد میں پنڈت لکشمی رام، لالہ سکھرام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل رائے مشہور ہندو خوشنویس گزرے ہیں۔

تذکرۂ خوشنویساں

اگر ہندوستان میں فن خطاطی کے متعلق مزید معلومات مطلوب ہوں تو غلام محمد ہفت رقم کی کتاب "تذکرۂ خوشنویساں" کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں گزرا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ دولت مغلیہ کے دورِ زوال یعنی فرخ سیَر، شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں بھی نسخ و نستعلیق کے ماہرین موجود تھے۔[۴۷] خود بہادر شاہ ظفر بہت مشاق خوشنویس تھے ان کی خطاطی کے نمونے زینت محل دہلی، حکیم احسن اللہ خاں کے حمام اور عجائب خانہ دہلی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ امیر رضوی (میر پنجہ کش) اسی عہد میں گزرے ہیں۔

غرض خوشنویسی و خطاطی اور نقاشی کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں ثقافت کی جو خدمت ہوئی۔ وہ تمام تر مسلمانوں ہی کی کوشش و محنت کی شرمندۂ احسان ہے۔

چوتھی فصل: موسیقی اور موسیقار

اس سے پیشتر کہ ہم مسلمان پادشاہوں اور بزرگوں کی ان مساعی کا تفصیل سے ذکر کریں جو انھوں نے موسیقی کے فن لطیف کی ترقی و تہذیب کے سلسلے میں انجام دیں۔ ہم ہندوستانی موسیقی کے ساتھ مسلمانوں کے عمومی شغف کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "غبار خاطر" کا ایک اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں:

"اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے تغافل برتتے۔ چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں امیر خسرو جیسے مجتہدین کا پیدا ہونا اس حقیقت حال کا واضح ثبوت ہے۔ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ غالباً مسلمان بادشاہوں سے پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کردی تھی۔ ملتان، ایودھن گور اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت اور قبولیت کے لیے اپنا اپنا جوہرِ کمال پیش کرتے تھے۔ خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدر دانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود

ہیں۔ لیکن جس شاہی خاندان نے موسیقی سے بحیثیت فن کے خاص اعتنا کیا۔ وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان تھا۔ اسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں کا اور پھر بیجاپوری بادشاہوں کا ذوق شوق نمایاں ہوتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ تو بقول ظہوری اس اقلیم کا جگت گرو تھا۔ اور اس کے شوق موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد وسماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے

مروت کردہ شبہا بر تو سیر بام . و در لازم

نمی باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

مالوہ، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی دونوں کے سرپرست تھے...... مالوہ کے باز بہادر کو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا اور موسیقی کا ماہر بھی۔ آج تک مالوہ کے گھروں سے اس کے دُہروں کی نوائیں سنی جا سکتی ہیں۔ اکبر کی قدر شناسیوں سے اس فن کو جو عروج ملا۔ اس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے جو فتح پور اور آگرہ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں جابجا ایسے اشارے کیے ہیں جن سے اس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت ملتا ہے...... امرا و شرفا کی اولاد کی تربیت کے لیے جس طرح تمام فنون مدارس کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ملک کے ہر حصے میں باکمالانِ فن کی مانگ تھی اور دہلی اور آگرہ، لاہور اور احمد آباد کے گویے بڑی بڑی تنخواہوں پر امرا و شرفا کے گھروں میں ملازم تھے...... اس عہد کے کتنے ہی مقدس علما ہیں جن کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ موسیقی کے اشتغال سے وہ دامن بچاتے رہے۔ لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ ملا مبارک (ابوالفضل اور فیضی کے والد) کے حالات میں خصوصیت سے اس کی تصریح ملتی ہے کہ وہ ہندوستانی موسیقی کا عالم اور ماہر تھا۔ اکبر بادشاہ نے تان سین کا گانا سنوایا تو صرف اتنی داد ملی کہ "ہاں گا لیتا ہے" ملا عبدالقادر بدایونی جیسا متشرع اور متصلب شخص بھی بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اور فیضی نے ضروری سمجھا کہ اکبر کی خدمت میں اس کی سفارش کرتے ہوئے اس کی مشاقی کا ذکر کر دے۔ علامہ سعد اللہ شاہجہانی جن کی فضیلتِ علمی اور ثقاہت طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں، موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے۔ ان کے استاد ملا

عبدالسلام لاہوری تھے...... ان کے ذوق موسیقی کا یہ حال تھا کہ جس طرح ہدایہ اور بزودی کے مقامات حل کرتے تھے۔ اسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ معالی خاں جو مُلّا طاہر پٹنی محدث گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی کے پوتے تھے۔ ان کے حالات میں صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے۔ ملا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانشمند خاں کہ سرآمد علمائے عصر تھا...... ہندوستان میں آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہوگیا کہ وقت کے باکمالان فن کو اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا...... شیخ علاء الدین جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گزرے ہیں ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلات موسیقی کے غیر معمولی مشاق تھے۔ شیخ جمالی صاحب سیَر الاولیا اور ان کے لڑکے شیخ گدائی دونوں کا فنِ موسیقی میں توغل مشہور ہے۔ دورِ آخر میں مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد فن موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کیا کرتے تھے۔ اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمال فن کی سند تصور کرتے۔ شیخ عبدالواحد بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے۔ سلوک و تصوف میں ان کی کتاب ''سنابل'' مشہور ہوچکی ہے بدایونی ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے...... شاہ نواز خاں صفوی کے حالات میں صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ:

''شیفتہ موسیقی بودہ خوانندہ ہا و سازندہ ہا کہ پیش خود جمع کردہ بود نظیر نہ داشتند''

زین خاں کوکہ کا علوم درسیہ میں شغف معلوم ہے۔ اس کے حالات میں لکھتے ہیں:

''بہ کتب و راگ شغفے داشت و سازہا بہ کمال حسن و خوبی می نواخت۔'' اس کا لڑکا مغل خاں بھی اس باب میں اپنے باپ کا جانشین تھا۔ خان زماں میر خلیل نے جو عین الدولہ آصف خاں کا داماد تھا (جس کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ تھی) اس فن میں اتنی مہارت پیدا کی کہ لوگ اپنے اختلافات اس کے آگے فیصلے کے لیے پیش کرتے۔ سرس بائی جو شہزادہ مراد کی محبوبہ تھی۔ خیال گانے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی مگر خود شہزادہ کی فن دانی کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ اس کی شاگردی پر ناز کرتی۔

موسیقی کے متروک گرنتھ

ہندوستانی موسیقی پر پہلی کتاب بنگال کے نامور شاعر جے دیو نے ''گیتا گووندا'' کے نام سے لکھی۔ یہ بارھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس کے بعد تیرھویں صدی عیسوی میں پنڈت سارنگ دیو نے ''سنگیت رتناگر'' تصنیف کی۔ لیکن باوجودیکہ ان کتابوں کی متعدد شرحیں اور تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن ہندو اور یورپین مصنفین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کتابوں کو سمجھنے والا کوئی آدمی موجود نہیں۔ لہٰذا ان باکمالوں کی محنت رائیگاں گئی۔ جو کتابیں سمجھ میں آنے والی ہیں وہ سب کی سب تیرھویں صدی کے بعد لکھی گئیں۔ اور ان سب میں موسیقی کی وہ صورت نمایاں ہے جو اس نے امیر خسرو کے بعد اختیار کی۔

اگر چہ سندھ میں عرب حکومت کے ماتحت موسیقی کے چرچے اور اس کی ترقی کے متعلق معتد بہ معلومات دستیاب نہیں ہوسکیں۔ لیکن بنوامیہ کے زمانے کے خلفاء اور امراء کے ذوقِ موسیقی کو کون نہیں جانتا۔ کتاب الاغانی اور دوسری معاصر تصنیفات میں اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ محمد بن قاسم اور اس کے رفقاء اور اس کے بعد مقرر ہونے والے عرب گورنر یقیناً عربی و عجمی موسیقی کے رسیا ہوں گے۔ ہندوستانی موسیقی بھی سنتے ہوں گے اور دونوں کے درمیان امتزاج کا غیر محسوس سا عمل مدت تک جاری رہا ہوگا۔

امیر خسرو

لیکن سلاطین دہلی کے ذوق وشوق کی داستانوں سے تو تاریخ کی کتابیں لبریز ہیں۔ غزنوی، غوری خاندانوں کو تو چھوڑ دیجیے۔ اس لیے کہ یہ ملک گیری اور کشور کشائی کا دور تھا۔ لیکن سلطان بلبن کے عہد میں جب امیر خسرو کے زیر صدارت فنونِ ادب کی ترقی کے لیے مجلسیں قائم ہوئیں اور شہزادہ محمد نے ان کی سرپرستی اختیار کی تو سلطان کے دوسرے فرزند قرا خاں بغرا نے اپنے محل میں ایک مجلس کا آغاز کیا جس میں قصہ گو، رقاص اور موسیقی دان شامل ہوتے تھے اور اس مجلس کی مقبولیت سے متاثر ہوکر امرائے دربار نے بھی شہر میں ایسی کئی مجلسیں برپا کردیں۔ [۴۸]

جلال الدین خلجی کے زمانے میں بھی امیر خسرو شعر ونغمہ کی تحریک کی قیادت کررہے تھے۔ اور مجالس سلطانی میں علم وفضل کے ساتھ ہی ساتھ موسیقی کا چرچا بھی رہتا تھا۔ اس زمانے کے بہترین گانے والی امیر خاصہ اور حامد راجا تھے۔ اور سازندوں میں محمد چونگی، فتو خاں، ناصر خاں

اور بہروز نہایت باکمال اور نامور تھے۔ امیر خسرو ہر مجلس میں اپنا کلام یا نغمہ سناتے اور ہر دفعہ انعام پاتے۔[۴۹]

یہ زمانہ موسیقی میں تجدید و اجتہاد کا زمانہ تھا۔ اور مجتہد امیر خسرو تھے جنھوں نے ہندوستانی موسیقی میں عجم کا پیوند لگا کر اسے حیات تازہ بخشی۔ اور گزشتہ چھ سات سو سال کے دوران میں جو موسیقی ہندوستانی موسیقی کے نام سے مشہور زمانہ چلی آ رہی تھی۔ اس میں غالب حصہ امیر خسرو کے اجتہاد سے متاثر ہے۔ خسرو قصبہ پٹیالی میں پیدا ہوئے جو سرکار قنوج میں گنگا کے کنارے واقع تھا۔ ان کا سن ولادت ۱۲۵۳ء ہے۔ والد ایک ممتاز ترک خاندان کے شمع و چراغ تھے۔ سیف الدین شمس نام تھا چنگیز خاں کے حملے کے وقت بلخ سے ہندوستان ہجرت کر آئے تھے۔ خسرو ابھی نو سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے نانا عماد الملک نے کہ غیاث الدین بلبن کے دربار میں عالی مرتبہ رکھتے تھے خسرو کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ چونکہ عماد الملک کے ہاں ماہرین موسیقی کی بہت قدر دانی ہوتی تھی اس لیے خسرو ابتدائی عمر ہی میں ہندوستان کی قدیم موسیقی سے بخوبی آشنا ہوگئے۔ جب ہوش سنبھالا تو شاعری اور موسیقی کے حیرت انگیز کمالات اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے دربار سلطانی میں پہنچ گئے۔ انھوں نے ۱۲۷۷ء سے لے کر سات بادشاہوں کا عہد دیکھا۔ محمد سلطان بلبن، کیقباد، جلال الدین فیروز شاہ، علاء الدین خلجی، قطب الدین، غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق۔ خسرو ہر دربار میں نمایاں اور معزز خدمات پر ممتاز رہے۔ اور انھیں سب سے بڑی سعادت یہ نصیب ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید ہوگئے۔ حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ چونکہ شعر و موسیقی کے نہایت عالی پایہ اندازہ دان تھے اور خسرو کی طبیعت کے سوز ساز سے بھی آگاہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے اس باکمال مرید پر خاص توجہات مبذول فرمائیں۔ اور خسرو نے بھی حضرت کے والہانہ عشق میں اپنے آپ کو فنا کردیا۔ اس دربار پُر انوار میں باریاب ہونے کے بعد خسرو نے کسی دوسرے دربار کا رخ نہ کیا اور ۱۳۲۵ء میں وفات پائی۔

شاعری اور موسیقی

امیر خسرو ہندوستان کے فارسی شاعروں میں بلند ترین مرتبہ رکھتے تھے۔ اور فصحائے ایران نے ہمیشہ اس ~~ساحر~~ ہندی کا لوہا مانا ہے۔ ان کی شاعری کے مفصل ذکر کا یہ موقع نہیں۔

انھوں نے تحفۃ الصغر، وسط الحیوۃ، غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ کے ناموں سے اپنی نظموں اور قصیدوں کے مجموعے مرتب کیے۔ ابھی پہلی تین کتابیں مکمل ہوئی تھیں کہ غرۃ الکمال میں فرماتے ہیں۔

نظم را کردم سہ دفتر در بہ تحریر آمدے
علم موسیقی سہ دیگر بود اربا در بود

یعنی ان کے نزدیک علم موسیقی میں ان کی مہارت ان کے کمال شاعری سے ہرگز کم نہ تھی۔ اور اس میں کسی شک و ریب کی گنجائش نہیں کہ علم موسیقی میں ان کے کارنامے کمالات شاعری کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ کم نہیں۔ وہ ہندی کے شاعر بھی تھے۔ بلکہ ان کی طبیعت اردو میں بھی بند نہ تھی۔ ان کی پہیلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دو سخنے اور دوہے اردو میں نہیں تو اور کس زبان میں ہیں۔ اور جب انھوں نے اپنے مرشد طریقت حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ کی تربت کو دیکھ کر انتہائی درد سے یہ شعر پڑھا

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چلو خسرو گھر اپنے رَین بھئی سب دیس

تو گویا انھوں نے اردو شاعری کی داغ بیل ڈال دی۔

خسرو کے کمال کا اعتراف

موسیقی میں امیر خسرو نے جو اجتہادات کیے ان کا تفصیلی تذکرہ تو کسی ماہر موسیقی ہی کا کام ہے جو ہندی و عجمی دونوں قسم کی راگنیوں کے پیچ وخم اور سر تال سے باخبر ہو۔ ہمیں تو صرف یہ بتانا ہے کہ جن مسلمان، ہندو اور یورپین مصنفین نے ہندوستانی سنگیت پر مستند کتابیں لکھی ہیں۔ وہ بالاتفاق شاہد ہیں کہ امیر خسرو نے اپنے اجتہادات سے اس فن کو کمال تک پہنچا دیا۔ بلکہ اس کی ہیئت کو بدل کر اسے ایسے دل فریب راستے پر ڈال دیا کہ پورا ہندوستان کلاسیکی موسیقی کو بھول کر شمالی ہند کے اس سنگیت کا والہ وشیدا ہوگیا جس کی تخلیق کا تاج امیر خسرؔ و کے سر پر ہے۔

مرزا محمد وحید ایم اے نے اپنی کتاب ''لائف اینڈ ورک آف امیر خسرؔ و'' میں لکھا ہے:

''امیر خسرؔ و کو موسیقی میں جو انہاک اور کمال حاصل تھا اس کا سراغ خود ان کی اپنی تصانیف سے بھی ملتا ہے۔ ان کی تیزی طبع اور آزادیٔ تخیل نے ہمیشہ قدیم و فرسودہ روایات سے روگردانی کرکے نئے نئے اسالیب تلاش کیے۔ نہایت افسوس ہے کہ اگرچہ ہندوستان کی جامد اور

قدیم موسیقی میں امیر خسرو کی ذہانت و قابلیت کا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس پر بھی بعض متعصب مصنفین ان کی منفرد شخصیت کے کمالات کا اعتراف نہیں کرتے۔"

پروفیسر رانا ڈے نے اپنی کتاب "ہندوستانی میوزک" اور ہربرٹ پوپلے نے اپنی کتاب "ہندوستان کی موسیقی" میں خسرو کے کمال اجتہاد کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی سنگیت کے فن کو جِلا دی اور اس میں مزید امکانات پیدا کر دیے۔

حکیم محمد اکرم امام خاں (نامور ماہر موسیقی) نے شاہان اودھ کے زمانے میں اپنی کتاب معدن الموسیقی لکھی۔ جس میں امیر خسرو کے متعلق لکھا:

حضرت امیر خسرو کو مقامات فارسی میں اسی قدر کامل اور راگھائے ہند میں بھی بخوبی مہارت حاصل تھی۔ ہر صغار و کبار ان کو نائک زمانہ تصور کرتے تھے۔ آپ نے طفلان تیز دست و خوش آواز اور عقیل و فہیم کا انتخاب کر کے ہر ایک کو علیٰ قدرِ لیاقت کسی کو گانا، کسی کو بجانا تعلیم کیا۔ اول بعوض پکھاوج ڈھولک نکالی۔ سترہ تالیں بعوض وزن بحور فارسی مقرر کیں۔ اور بعوض بین کے ستار نکالا۔ جس قدر لڑکے خوش آواز تھے، ان کو گانا سکھایا۔ بجائے دھرو، رہوا، ماٹھا، چھند، پرسند، دھرپد چھ چیزیں قول، قلبانہ، نقش، گُل، ترانہ اور خیال ایجاد کیا۔

اختراعات

خسرو سے پہلے فارسی اشعار بارہ مختلف ایرانی اسالیب پر گائے جاتے تھے۔ اور یہی راگوں کی تخلیقی اساس تھے۔ مثلاً راست، بزرگ، صفحہ، زنگلہ، حسنائی، نواب وغیرہ۔ ہر اسلوبِ سُر کی خفیف سی تبدیلی سے دو راگوں پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس طریق سے چوبیس راگ پیدا ہوتے تھے جو رات اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں مختلف اوقات پر گائے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ نو رس عرب، نو رس عجم، مبارک، ہمایوں وغیرہ وغیرہ۔ موسیقی کا یہ سارا نظام "نقش" کہلاتا تھا۔ خسرو نے ان ایرانی راگوں کو بعض مروج ہندوستانی دھنوں اور راگنیوں سے ممزوج کر کے ایک نئی اور نادر چیز پیدا کر دی۔ اس طریقے سے جو راگ پیدا ہوئے ان میں سے ایمن (یمن) غارہ، زیلف، سرپردہ، سازگیری آج کل بھی بڑے ذوق شوق سے گائے جاتے ہیں۔ خسرو کے جو راگ متروک ہو چکے ہیں وہ یہ ہیں۔ موافق (ہندی ٹودی کی ایک شکل) محیر (ہندی بیراری سے ماخوذ) حجاز (جس میں اساوری کی آمیزش ہے) اور عشاق (جو سارنگ اور دیوگیری کا

مرکب ہے) سُرود کے بعض نئے انداز بھی خسرو نے قائم کیے۔ مثلاً قول، ترانہ، صوت معروفی، بسیط، دو بہار، چہار اصول، غزل۔ امیر نے بعض تالیں بھی ایجاد کیں۔ مثلاً ساوری فرودست پشتو، قوالی وغیرہ جو اب تک رائج ہیں۔ ستار بھی خسرو ہی کی ایجاد ہے۔ جو سہ تار یعنی ابتداءً تین تاروں کا ساز تھا۔ بعض محققین کے نزدیک اس میں کلام ہے۔ لیکن اکثریت نے اس کی ایجاد کو خسرو ہی سے منسوب کیا ہے۔

سید ناصر نذیر فراق (مضامین فراق) میں پکھاوج کی ایجاد بھی امیر خسرو ہی سے منسوب کرتی ہیں۔ ترانہ جس میں بولوں کو بانٹا جاتا ہے امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے۔ یہ وہی رباعی ہے جسے دو بیتی و چہار بیتی کہتے ہیں۔ صاحب قابوس نامہ جو غزنوی عہد کے لگ بھگ ہوئے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی دو بیتی امیر خسرو کے زمانے سے پہلے موجود تھی۔ لیکن حقیقت میں اس کو رونق امیر ہی نے دی۔ امیر خسرو نے جو راگنیاں اختراع کیں ان میں ایک بدیع بہار راگنی بھی ہے جس کے بول انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی مدح میں لکھے ہیں

حضرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال

علاء الدین خلجی کے دربار میں جگت گرو نائک گوپال وارد ہوئے جو اس زمانے میں ہندی موسیقی کے شہنشاہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ دربار میں امیر خسرو خم ٹھونک کر جگت گرو کو نیچا دکھانے پر تل گئے اور دھرپد کے مقابلے میں اتنی بے شمار اختراعیں پیش کیں کہ جگت گرو نائک گوپال ان کے کمال طباعی سے مرعوب ہو کر ان کا شاگرد ہو گیا۔

قوالی

قول یا قوالی حضرت امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے۔ جس سے آج تک ہماری فقرا و صوفیہ کی محفلیں آباد ہیں۔ علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ ہندی موسیقی نے ''مشرف باسلام'' ہو کر قوالی کی صورت اختیار کی ہے۔ اب تک حال و قال کی محفلوں میں ہزاروں اہل دل قوالی کے ولولہ انگیز اسلوب سے متاثر ہو کر وجد و رقص کر چکے ہیں بلکہ متعدد ایسے مقامات بھی کتابوں میں درج ہیں کہ یہ تواجد اس حد تک پہنچ گیا کہ سامع کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ قوالی ہماری موسیقی کا نہایت نادر، دل کش اور قابلِ فخر اسلوب ہے جس کی ایجاد امیر خسرو نے کی اور حوصلہ افزائی حضرت نظام الدین اولیا نے فرمائی۔

امیر خسرو کے کمالات موسیقی اور ان کے اجتہادات پر ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اور بعض اہل علم نے اس موضوع پر کتابیں لکھی بھی ہیں۔ محض مختصر اشارات امیر کے فن کی عظمت کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ تو سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اگر خسرو جیسا طباع اور کامل الفن شخص پیدا نہ ہوا ہوتا تو ہندوستانی موسیقی صرف جنگلوں کے جوگیوں ہی کے پاس رہ جاتی۔ اور یہ فن عوام میں تو درکنار سرکاروں درباروں میں بھی فروغ نہ پاسکتا۔

سلاطین تغلق

فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں ہر جمعہ کو نماز کے بعد کوئی تین ہزار موسیقار، داستان گو اور جسمانی کرتب دکھانے والے قصر سلطانی کے سامنے جمع ہوا کرتے تھے۔ اور سلطان انھیں انعامات سے نوازتا تھا۔[۵۰]

''بادشاہوں کے درباروں میں ہندوستانی گویے اور گانے ناچنے والی رنڈیاں موجود رہا کرتیں۔ مگر ان کا افسر اعلیٰ کوئی عجمی موسیقار ہوا کرتا جو ان کی موسیقی پر اپنا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالتا تھا۔ محمد تغلق کے عہد میں دربار کا سب سے بڑا گویا امیر شمس الدین تبریزی تھا۔ اور کل زن و مرد اربابِ نشاط اس کے زیرِ حکم تھے۔ انہی دنوں دیوگڑھ یعنی دولت آباد کے متصل اربابِ نشاط کی ایک پوری بستی آباد تھی۔ جو ''طرب آباد'' کہلاتی تھی۔[۵۱]

بیجاپور کے سلاطین

بیجاپور کے سلطان عادل شاہ کا ذوق موسیقی سب مؤرخین کے نزدیک مسلّم ہے۔ وہ بہت سے ماہرینِ موسیقی کو وظائف و انعامات سے مالا مال کرتا تھا۔ لیکن اکثر کے مقابلے میں خود زیادہ ماہر تھا۔ اور دو تین ساز خوبی و خوش اسلوبی سے بجالیتا تھا۔ اس کے دربار میں ہندوستانی موسیقاروں کے علاوہ ایران، ترکستان اور روم تک سے اہلِ فن آتے اور شاہی قدر دانی سے مستفیض ہوتے۔ اسماعیل عادل شاہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ خود بھی گانے بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا اور باکمال کی قدر بھی کرتا تھا۔[۵۲]

سلطان حسین شرقی

امیر خسرو کے بعد ہندوستانی موسیقی کا بہت بڑا ماہر اور بہت بڑا محسن جونپور کا سلطان

حسین شرقی تھا۔ جس نے موسیقی میں گراں قدر اضافے کیے۔ اور مختلف راگ راگنیوں کے تال میل سے نئے نئے راگ اور راگنیاں اختراع کیں۔ مثلاً کانڑے کی دو قسمیں سلطان حسین شرقی نے ایجاد کیں۔ کلیان کی مشہور شاخ شام کلیان کی کوئی دس قسمیں سلطان ممدوح نے قائم کیں۔ یعنی شام کلیان کو مختلف راگوں کے ساتھ ملا ملا کر گورشام، بھوپال شام، گمبھیر شام، پوربی شام، بسنت شام وغیرہ پیدا کیں۔ حجاز کے ساتھ یمن کو ملا کر ایک اور راگ بنایا۔ ٹوڈی کے ساتھ دوسرے راگوں کو ملا کر کوئی چودہ قسمیں ایجاد کیں۔ مثلاً ٹوڈی جونپوری، ٹوڈی رسولی وغیرہ۔ اسی طرح شدھ بھیردیں بھی سلطان حسین ہی کی ایجاد ہے۔ اس نے دھرپد کی جگہ خیالوں کو رواج دیا۔

دُھرپد اور خیال

دُھرپد اور خیال کے فرق کو واضح کرنے کے لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ شاہد احمد دہلوی کے ایک مضمون ''پاکستانی موسیقی'' سے دو پیراگراف نقل کر دیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''دُھرپد: جب گانے میں الفاظ داخل ہوئے تو تال اور لے کی قید سے کلامِ موزوں وجود میں آیا۔ اور ترقی پا کر دھورو، چھند، پد، رُبت اور دوہا کہلایا۔ موسیقی نے جب ترقی کی تو گانے میں شاعری بھی داخل ہوگئی۔ مجلسوں اور درباروں میں پہنچنے کے بعد فنی خوبیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ عام گانوں نے خاص خاص روپ دھارنے شروع کر دیے۔ چنانچہ دھورو اور پد کے امتزاج سے دُھرپد پیدا ہوا۔ اور اگلے زمانے کے استادوں نے اس کے علمی اصول مقرر کیے۔ دُھرپَد کے چار تُک یا حصے ہوتے ہیں۔ استھائی، انترہ، سنچائی اور ابھوگ۔ اس کے لیے تالیں بھی مخصوص ہیں۔ مثلاً چوتالہ، سول فاختہ، جھپ تالہ وغیرہ۔ دُھرپد ایک خاص قسم کا مردانہ گانا ہے جس میں حمد و ثنا اور شجاعت کے کارنامے یا دیوتاؤں کی توصیف بیان کی جاتی ہے۔ جب دُھرپد جھپ تال میں گایا جاتا ہے تو ساورہ کہلاتا ہے۔ اور جب دھمار میں گایا جاتا ہے تو ہوری کہلاتا ہے۔ دھرپد کی ترقی اکبر اعظم کے زمانہ میں ہوئی۔ تان سین، بلاس خاں، درنگ خاں، لعل خاں وغیرہ نے اس کو چار چاند لگائے۔ شاہجہاں کے دَورِ سلطنت تک دُھرپد کا عروج رہا۔ سورج خاں چاند خاں اور کم وبیش دو سو موسیقاروں نے اس صنف میں اپنے اپنے کمالات ظاہر کیے۔

خیال

پندرھویں صدی عیسوی میں جونپور کے شاہانِ شرقیہ میں سے سلطان حسین شرقی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا۔ اور اس کا نام خیال رکھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت امیر خسرو نے منجملہ دیگر اختراعات کے خیال ایجاد کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ امیر خسرو ہی نے وضع کیا ہو۔ مگر خیال کی ترویج کا سہرا سلطان حسین شرقی ہی کے سر ہے۔ خیال کو شروع میں دُھرپد ہی کے کینڈے پر بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہی چار تک یا حصے رکھے گئے تھے جو دُھرپد کے ہوتے ہیں۔ بعد میں صرف استھائی اور انترہ باقی رہ گیا۔ اور سنچائی اور ابھوگ کو خارج کردیا گیا۔ اس کے علاوہ دھرپد اور خیال میں نمایاں فرق تانوں کا رکھا گیا۔ دُھرپد میں تانیں نہیں ہوتیں۔ تان کی صرف ایک شکل دھرپد میں ہوتی ہے اور وہ گمک کہلاتی ہے۔..... خیال کے لیے نئی نئی تانیں وضع کی گئیں۔ اور ان کی تعداد اتنی بڑھی کہ شمار سے باہر ہوگئی۔ آج کل کے رواج میں صرف بارہ تانیں ہیں۔

خیال کے عروج کا زمانہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کا زمانہ ہے۔ ایجاد ہو جانے کے باوجود خیال کا چراغ تین سو سال تک دھرپد کے آگے نہ جل سکا۔ آخر محمد شاہ کے دو درباری فن کاروں نے خیال کو اتنا فروغ دیا کہ دھرپد ماند پڑ گیا۔ شاہ سدا رنگ اور شاہ ادارنگ کی بنائی ہوئی چیزیں آج بھی فخر کے ساتھ گائی جاتی ہیں۔ بلکہ راگ کی صداقت میں بطور سند پیش کی جاتی ہیں۔[۵۳]

سات نائک

ہندوستانی موسیقی میں علم وفن کے استاد کو پنڈت کہتے ہیں اس کے بعد گنی کا درجہ ہے جو اس سے بڑھے اس کو گندوپ یا گندھرب کہتے ہیں۔ پھر گائن اور پھر نائک کا رتبہ ہے جو کمالاتِ موسیقی کا بلند ترین رتبہ ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تان سین کو بھی نائک کا مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ وہ گندھرب سمجھا جاتا ہے۔[۵۴] اس کے علاوہ بعض کی رائے یہ ہے کہ اب تک ہندوستانی موسیقی میں سات نائک گزرے ہیں۔ اول امیر خسرو۔ دوم سلطان حسین شرقی، سوم چنچل سین، چہارم باز بہادر فرمانروائے مالوہ، پنجم سورج خان قوال، ششم چاند خاں کبیر، ہفتم غلام رسول لکھنوی۔ یعنی سات باکمال نائکوں میں صرف ایک ہندو اور باقی سب کے سب مسلمان

ہیں۔[۵۵]

ہمایوں

اس کے بعد فنِ موسیقی کو شاہانِ مغل کے زمانوں میں جو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے تذکرے اور تعریف میں سب مؤرخین رطب اللسان ہیں۔ بابر کا زیادہ وقت قسمت کے نشیب و فراز میں گزرا لیکن اسے بھی نغمہ وسُرود سے بے حد شغف تھا۔ توزک میں جابجا اپنی مجالس موسیقی اور گانے والوں کا ذکر کرتا ہے۔ ہمایوں بھی ماہرین موسیقی کا مرتبہ دان تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقربین کے تین طبقے تجویز کیے تھے۔''اہل سعادت'' میں علما و مشائخ اور ماہرین علوم ''اہل دولت'' میں امرا وشہزادگان اور ''اہل مراد'' میں شاعر اور موسیقار شامل تھے۔ اور باشاہ ان سب باکمالوں کو اپنی توجہ اور قدر دانی سے نوازتا رہتا تھا۔

اکبر

شہنشاہ جلال الدین اکبر کا عہد فنون لطیفہ کے حق میں ایک زرّیں عہد تصور کیا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کو فن موسیقی سے بے حد شغف تھا اور اس نے اپنے دربار میں بڑے بڑے باکمال موسیقاروں کو جمع کر رکھا تھا۔ اس کے عہد میں باز بہادر حاکم مالوہ موسیقی کا عاشق اور باز خانی اسلوب سرود کا موجد تھا۔ اودے پور کی رانی میراں بائی مشہور شاعرہ اور مغنیہ تھی۔ ملہار راگ کی ایک قسم ہے جسے میراں بائی ملہار کہتے ہیں۔ اسی رانی کی اختراع ہے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر موسیقی کے بے حد شیفتہ ہیں۔ دربار میں گانے والوں اور گانے والیوں کا کوئی شمار نہیں۔ ان میں ہندو، مسلمان، ایرانی، تورانی، کشمیری زن و مرد سب پائے جاتے ہیں۔ میاں تان سین گوالیاری دربار اکبری کا سب سے بڑا گویا تھا۔ جس کے متعلق ابوالفضل کی رائے یہ ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال سے ہندوستان میں ایسا باکمال گویا پیدا نہیں ہوا۔ یہ شخص ریاست ریوا کے کسی برہمن کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ ٹامس ولیم بیلی اپنی کتاب ''بایوگرافیکل ڈکشنری'' میں لکھتا ہے کہ تان سین راجا رام چندر کے دربار میں ملازم تھا۔ راجا نے اکبر کی فرمائش پر اسے دربار شاہی میں بھیج دیا۔ اس کا گرو پنڈت ہری داس سوامی تھا جو موسیقی میں سرآمد عصر تھا۔ اور جمنا کے کنارے ایک کٹیا میں رہتا تھا۔ تان سین بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ جلوس اکبری کے چونتیسویں سال ۱۵۸۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ گوالیار میں اس کا

مزار گویوں اور سازندوں کا مرجع عقیدت بنا ہوا ہے۔ ایک اور گویا رام داس بھی دربارِ اکبری میں موجود تھا۔ جو تان سین ثانی کہلاتا تھا۔ اور اس کو ایک موقع پر مرزا خان خاناں نے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا تھا۔[۵۶]

اگرچہ تان سین نے بہت سے راگوں میں اپنی جدت پسندی اور جودت طبع کو کام میں لاکر دل فریب اختراعات کیں۔ لیکن اس کے مخصوص راگوں میں درباری بے حد مقبول اور پسندیدہ عام ہے۔ اس راگ کی ابتدا تو کرناٹک میں ہوئی تھی۔ اور ہندوستانی موسیقار اسے کانڑا کہتے تھے۔ لیکن شہنشاہ اکبر کو یہ ثقیل نام پسند نہ آیا۔ چوں کہ دربار کا پسندیدہ راگ تھا۔ اس لیے اسے درباری کہنے لگے۔ لیکن بنیادی طور پر درباری کانڑا ہی کی ایک قسم ہے۔ کتابوں میں کانڑا کی جو قسمیں لکھی ہیں ان میں ایک درباری بھی ہے۔[۸۷] مسٹر پوپلے کی تحقیق ہے کہ ہمارا مشہور ساز رباب تان سین ہی کی ایجاد ہے۔ میاں کا ملہار، میاں کی ٹوڈی، میاں کا سارنگ تان سین کے مشہور راگ ہیں۔

تان سین کے علاوہ درباری اکبری کے ممتاز موسیقار یہ تھے۔[۵۸]

سبحان خاں گوالیاری، ہری گیان خاں گوالیاری، چاند خاں گوالیاری، بچتر خاں برادر سبحان خاں گوالیار، محمد خاں ڈھاڑی، داؤد ڈھاڑی، سرود خاں گوالیاری، میاں لال گوالیاری، تان ترنگ خاں پسر تان سین۔ بلاس خاں پسر تان سین۔ (بلاس خاں کا ذکر بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری میں ہے) ملا اسحاق ڈھاڑی، نانک جرجو گوالیاری، سورداس پسر رام داس، چاند خاں گوالیاری، رنگ سین آگرہ، رحمت اللہ برادر ملا اسحاق، پیرزادہ۔

یہ تو گانے والے تھے۔ اب چند باکمال سازندوں کے نام ملاحظہ ہوں:

بیر منڈل خاں گوالیاری (ساز: سُرمنڈل)، شہاب خان اور پوربین خاں (ساز: بین)، استاد دوست مشہدی (ساز: نَے)، شیخ دیوان ڈھاڑی (ساز: کرانائے)، استاد یوسف ہراتی، استاد ہاشم مشہدی، استاد محمد امین، استاد محمد حسین (ساز: طنبورہ) میر سید علی مشہدی، بہرام قلی ہراتی (ساز: غچک)، تاش بیگ قبچاقی (ساز: قابوض)

قاسم جس نے قابوض اور رباب کی آمیزش سے ایک نیا ساز تیار کیا۔

اُستاد شاہ محمد (ساز: سُرنائے)، میر عبداللہ (ساز: قانون)

نہ صرف گانے بجانے بلکہ موسیقی ... دوسرے

باکمال ماہرین بھی موجود تھے اور ان کے قدر دانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ شاہ نواز خاں صفوی کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور شیخ مبارک کے کمالات مولانا ابوالکلام آزاد کے اقتباس سے واضح کیے جاچکے ہیں۔ فیضی کے متعلق بدایونی نے لکھا ہے کہ "وقوف درنغمۂ ولایت و ہندی و مشق ہین بقدر کردہ"۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ فیضی کے کتب خانے میں طب، نجوم، نظم اور موسیقی پر بے شمار کتابیں موجود تھیں۔

اسلام خاں

مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ اسلام خاں فاروقی چشتی جو اکبر کے مرشد حضرت سلیم چشتی کے پوتے اور ابوالفضل کے بہنوئی تھے۔ جہانگیر کے عہد میں بنگال کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ یہ صاحب بے حد درویش طبع اور زاہد آدمی تھے۔ صرف جوار کی روٹی اور ساٹھی کا خشکہ ساگ پات کے ساتھ کھاتے اور کسی دوسرے کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ عمر بھر جامۂ خاصہ کے نیچے گاڑھے کا کرتہ پہنتے رہے اور پگڑی کے نیچے بھی گاڑھے کی ٹوپی اوڑھتے۔ لیکن ان کا دستر خوان بہت وسیع تھا اور پرُ تکلف نعمتیں چنی جاتی تھیں۔ لیکن فن لطیف کی سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ اسّی ہزار روپے ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر صَرف کیا جاتا تھا۔

عہدِ اکبری کے مشہور و مقبول گانے والوں میں شیخ منجھو قوال مشہور ہیں۔ شیخ ادھن جونپوری کے مرید تھے۔ وضع صوفیانہ و درویشانہ رکھتے تھے۔ اکبر ان کے کمال فن اور ان کی خدا پرستی کا بے حد معترف تھا ایک دفعہ بادشاہ نے ایک حوض میں ٹکے بھروا کر کہہ دیا کہ جتنے لے جاسکو لے جاؤ۔ شیخ منجھو صرف ایک ہزار کے ٹکے اٹھا کر لے گئے۔ زیادہ ٹکے لے جانے کی طمع نہیں کی۔

نظام الدین مدھو نائک

اس زمانے میں ایک بہت بڑے ماہر موسیقی سید نظام الدین مدھو نائک بلگرامی گزرے ہیں جنھوں نے اپنی بے نیازی اور خود داری کی وجہ سے دربار شاہی کے ساتھ کوئی رابطہ نہ رکھا۔ ان کو موسیقار عام طور پر میراں مدھو نائک کہتے ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، بھاشا کے عالم تھے۔ ہندی میں شعر بھی خوب کہتے تھے۔ نہایت زندہ دل، شگفتہ طبع اور محفل آرا آدمی تھے۔ موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی شہرت و ناموری کے باعث بعض اہل فن نے انھیں نائک

تسلیم کرلیا۔ ہندی موسیقی پر ان کی دو کتابیں بھی موجود ہیں۔ ''ناد چندریکا'' اور ''مدھنا تک سنگار''۔ ان کے کمال کی نسبت بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ ان کے میگھ راگ گانے سے عین خشک سالی میں بڑے زور کی بارش ہوگئی تھی۔ تان سین ان کے کمال کا شہرہ سن کر بلگرام آیا اور ان کے تبحر کا قائل ہوکر واپس گیا۔

مخدوم بہاء الدین برناوی

اس زمانے کے ایک صوفی بزرگ مخدوم بہاء الدین برناوی مشہور ہیں۔ جنھوں نے اپنی زندگی کا گرانقدر حصہ موسیقی کے ذوق و اشتغال میں صرف کیا۔ انھوں نے اپنی زیادہ تر عمر اکبر کے عہد میں بسر کی۔ اور اس کے بعد جہانگیر کے عہد کا ابتدائی دور بھی دیکھا۔ پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں کہ مسلمانان ہند میں دو نامور فنکار مسلم الثبوت قرار پاگئے ہیں۔ جنھوں نے ہندوستانی موسیقی کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ امیر خسرو اور مخدوم بہاء الدین۔

مخدوم صاحب کے کچھ حالات فقیر اللہ سیف خاں نے راگ درپن میں لکھے ہیں۔

انھوں نے دو ساز بھی ایجاد کیے تھے۔ ''ساز خیال'' اور ''کھٹ رس''۔ ساز خیال کی شکل ایک چوبی قلمدان کی تھی۔ جس کا ڈھکنا بند رہتا تھا۔ جب ڈھکنا کھولا جاتا تو یہ قلمدان سات تاروں کا ایک ساز نظر آتا۔ ''کھٹ رس'' بھی تاروں ہی کا ایک ساز تھا۔ جو کمانچہ اور مضراب کی مدد سے بجایا جاتا تھا اور ہاتھ سے ڈھولک پر تال دی جاتی۔ جب یہ ساز بجتا تو طبلہ، رباب، بین اور سارنگی کا مجموعہ معلوم ہوتا۔ مخدوم بہاء الدین کے ایک شاگرد لڈن چوکھ نے جو شاہ جہانگیر کا درباری گویا تھا۔ دربار میں ''ساز خیال'' بجا کر بھی دکھایا تھا۔ اس عہد میں خیال گانے کا ایک بہت بڑا ماہر میر علاول بھی تھا۔[۵۹]

یہ معلوم ہے کہ خیال کے اسلوب کو سب سے پہلے سلطان حسین شرقی جونپوری نے رواج دیا تھا۔ لیکن اس کے اسلوب کے دقائق کا وسیع علم مخدوم بہاء الدین ہی کو حاصل تھا۔ انھوں نے ہندی میں بعض نہایت نفیس خیال مرتب کیے۔ اور بعض درباری گویوں کو ان کی تربیت بھی دی۔ شیخ بوچو اور محبت خاں قوال انہی گویوں میں سے تھے۔ مخدوم صاحب نے چند ''ذکریہ'' بھی تصنیف کیے تھے۔ جن کو عوام جکری کہتے تھے۔ یہ گویا حمد و نعت اور شجرہ ہائے اولیا کے کچھ گیت اور زمزمے تھے۔ جو اس زمانے میں للت، بلاول، ٹوڈی اور کلیان کے راگوں میں گائے

جاتے تھے اور اہل حال کے لیے کیف و مستی کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔

جہانگیر

جہانگیر بھی موسیقی کی شیفتگی میں باپ سے کم نہ تھا۔ اقبال نامہ میں اس کے درباری موسیقاروں کے یہ نام لکھے ہیں۔ جہانگیر داد، پرویز داد، خرم داد، چتر خاں، ہمایوں داد، مکھو حمزہ۔ شاہ جہاں کے زمانے میں بھی جگن ناتھ (کوی راج) دارنگ خاں اور لال خاں بہت نامور گویے تھے۔ یہ لال خاں تان سین کے بیٹے بلاس خاں کا داماد تھا اور اس کو شاہ جہاں نے "گن سمندر" کا خطاب دیا تھا۔ شاہ جہاں خود بھی اچھا گا لیتا تھا۔ رام داس اور مہا پاتر اس کے ماہر ترین سازندے تھے۔[۶۰] اس نے ایک دفعہ جگن ناتھ اور لال خاں کو چاندی میں تلوا کر وہ چاندی ان کو عطا کر دی تھی۔

اگرچہ امرائے دربار علی العموم شعر و موسیقی کی قدردانی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور ہر چھوٹا بڑا دربار اہل فن کے لیے حصارِ عافیت بنا ہوا تھا۔ لیکن عبدالرحیم خان خاناں نے موسیقی کی قدردانی میں بادشاہوں کو مات کر دیا۔

تان سین کے بعد اس کے اسلوب کو اس کے جانشینوں مثلاً تان رس خاں، بلاس خاں، ممن خاں اور دوسروں نے زندہ رکھا۔ اور بادشاہوں اور والیان ریاست گوالیار کے درباروں میں قدر و عزت پاتے رہے۔ نواب ذوالقدر درگاہ علی خاں کی کتاب "دہلی بارھویں صدی ہجری میں" میں جہاں اربابِ طرب کا ذکر آیا ہے۔ وہاں پچاس کے قریب نامور گویوں اور سازندوں کا تذکرہ موجود ہے۔ مثلاً نعمت خاں بین نواز، غلام محمد سارنگی نواز، رحیم سین (از احفاد تان سین) شجاعت خاں کلاونت، بولے خاں کلاونت، سوار خاں گویا، گھانسی رام پکھاوجی، حسین خاں ڈھولک نواز، نور بائی، چمن امیر بیگم وغیرہ۔ یہ محمد شاہ (رنگیلے) کا زمانہ تھا۔

محمد شاہ

محمد شاہ کے زمانے میں فن موسیقی کی مقبولیت اور شاہی قدردانی کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اس زمانے میں مذکورہ بالا کمالوں کے علاوہ ایک جلیل القدر فن کار سدا رنگ کا طوطی بولتا تھا۔ جس نے خیال کو بے حد فروغ دیا۔ اور بہت سی راگنیوں میں بہت پیارے بول تجویز کیے جو آج تک مقبول عام ہیں۔ مثلاً اس کی کامود کے بول

محمد شاہ تم سدا رنگیلے مینہا برسے بوند بوند

اور:

اپنے پیا کو جانے نہ دوں گی

بہادر شاہ

بہادر شاہ ظفر اگرچہ محض نام کے بادشاہ تھے۔ لیکن ان کے دربار میں بھی موسیقی کا خاصا چرچا تھا۔ سب سے بڑے موسیقار تان رس خاں تھے۔ نام قطب بخش تھا۔ تان رس کا خطاب بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کے خاندان میں دُھرپد کا رواج تھا۔ لیکن تان رس خاں نے ''قوال بچوں'' کے مشہور خاندان کے ایک کامل الفن میاں اچپل کی شاگردی اختیار کر کے خیال رنگ کا آغاز کر دیا۔ اور بہت ناموری حاصل کی۔

موسیقی اودھ میں

یہ تو معلوم ہے کہ سلطنت دہلی کے ضعف و انتزاع کے بعد ہر فن کے اہل کمال نے لکھنؤ کا رخ کر لیا تھا۔ جہاں سلاطین اودھ قدر دانی فن کی وہ روایات جو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں سے مخصوص تھیں، قائم رکھے ہوئے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ہندوستان بھر کے ماہرین موسیقی اودھ میں جمع ہو گئے تھے۔ دہلی کے باکمال موسیقاروں اور تان سین سکول کے استادوں نے یہاں موسیقی کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ایک کتاب ''اصول النغمات الآصفیہ'' تصنیف کی گئی جس کے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر کی رائے یہ ہے کہ ''ہندوستان کے فن موسیقی پر اس سے بہتر کوئی کتاب آج تک تصنیف نہیں ہو سکی۔'' لیکن یہ کتاب چھپ نہ سکی اور خدا جانے اس کی دو چار نقلیں بھی ہندوستان کے کتب خانوں میں موجود ہیں یا نہیں۔ مولانا شرر اپنے ایک دوست اسد اللہ خاں کوکب [۶۱] کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں موسیقی کا ایک بہت بڑا کامل و اکمل شخص حیدری خاں گزرا ہے۔ اس کی وارفتہ مزاجی کے ایک دو دلچسپ قصے بھی بیان کیے ہیں۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے زمانے پابندئ شریعت اور ثقاہت کے زمانے تھے۔ یہاں تک کہ جان عالم واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے ان کا عہد اگرچہ ہندوستان میں مسلم ثقافت کا دم واپسیں تھا۔ لیکن ان کی خوش ذوقی اور قدر دانی کی وجہ سے بے شمار باکمالان موسیقی لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے۔ رامپور کے قطب

الدولہ ستار نوازی میں مثال نہ رکھتے تھے۔ پیار خاں، جعفر خاں، حیدر خاں، باسط خاں، میاں تان سین کے خاندان کی یادگار تھے۔ اور ان کے کمالِ فن میں کوئی شبہ نہیں۔

ٹھمریوں کا دَور

یہی دور تھا جس میں موسیقی کا فن اپنی شاہانہ اور استادانہ بلندیوں سے اتر کر جمہوری انداز اختیار کر گیا۔ ایک تو ''نسائیت'' کے غلبے کی وجہ سے مردانہ گانے زیادہ تر متروک ہوگئے۔ اور ان کی جگہ ٹھمریوں نے لے لی۔ جو خالص عورتوں کا گانا ہے۔ اس کی ساخت تو خیال ہی کی مانند ہے یعنی اس میں استھائی اور انترہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے گانے کا ڈھنگ جداگانہ ہے اور اس میں نرت بھاؤ اور اداکاری کا بڑا حصہ ہے۔ کدر پیا کی ٹھمریاں لکھنؤ میں بے انتہا مقبول ہوئیں۔ خود جان عالم واجد علی شاہ فن موسیقی میں باسط خاں کے شاگرد تھے اور انہوں نے فن کو اعلیٰ پیمانے پر حاصل کیا تھا۔ لیکن مذاق عامیانہ ہونے کی وجہ سے خود بھی ٹھمریاں تصنیف کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے طرز میں نئی راگنیاں مرتب کیں۔ جن کے نام جوگی کنٹر جوہی، شاہ پسند وغیرہ رکھے۔[۶۲] واجد علی شاہ نے اور ان کے عہد کے بعض موسیقاروں نے موسیقی میں عام پسند دھنوں اور راگنیوں کا جو اضافہ کیا۔ اس اعتبار سے وہ موسیقی کی پوری تاریخ میں بے مثال ہیں۔ اسی زمانے میں میاں شوری نے ٹپے کا آغاز کیا۔ یہ چیز انھیں پنجاب اور سرحد سے ملی جس کو انھوں نے بہت رونق بخشی۔ اور ہندوستانی موسیقی میں ایک نئی شاخ کا اضافہ کردیا۔ ٹپہ مقبول تو بہت ہوا۔ لیکن خیال کی عظمت کے سامنے یہ چھوٹا سا تانوں کا گلدستہ زیادہ فروغ نہ پاسکا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے ماہرینِ فن نے ایسی بانکی اور تیکھی ٹھمریاں تصنیف کیں اور ان کو اپنے کمال فن سے ایسے طریق پر پیش کیا کہ ٹھمری ہندوستان بھر میں مقبول ہوگئی۔ خود واجد علی شاہ نے اپنی کتاب ''بنی'' میں اس کے متعلق تفصیلات پیش کی ہیں۔

سوز خوانی

اودھ میں موسیقی کی ایک اور شاخ پیدا ہوئی جس کو سوز خوانی کہتے ہیں۔ شیعوں کی مجالس عزا میں اس سے قبل بھی نوحے ترنم سے پڑھے جاتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں ان کو فن کے اعتبار سے باقاعدہ ترقی دی گئی۔ حیدری خاں اور بعض دوسرے باکمالوں نے موسیقی کی ہزاروں دھنوں میں سے وہ دھنیں منتخب کیں جو اظہارِ حزن و ملال اور بَین کے لیے مناسب ہوں۔ اور وہ

دھنیں سیکڑوں سوزوں میں قائم کی گئیں۔ حیدری خاں نے سوز خوانی کا فن سید میر علی کو سکھایا۔ اور پھر تان سین کے خاندان کے ایک گویے ناصر خاں نے ایک بیوہ سیدانی پر ترس کھا کر اس کے دو بچوں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوز خوانی کی تعلیم دی جو اس فن سوز خوانی میں بے عدیل اور بے نظیر ثابت ہوئے۔ اور انھوں نے سوز خوانی کو اعلیٰ درجے کا راگ بنا دیا۔ اس کے بعد منجھو صاحب اور بعض دوسرے لوگوں نے اس فن میں شہرت حاصل کی۔[۶۳]

ساز

موسیقی کے جتنے ساز ہندوستان میں مقبول ہوئے۔ ان میں کثرت ان سازوں کی ہے جن کو یا تو مسلمان باہر سے اپنے ساتھ لائے۔ یا جن کی اختراع انھوں نے بعد میں کی۔ عرب ایرانی ساز رباب، چنگ، غچک، طنبورہ، شہرود، قانون، عود، نَے، دف، نقارہ، شہنائی، بربط وغیرہ تھے۔ ستار، جل ترنگ، طاؤس، دلربا، طبلہ، یہاں کے مسلمانوں نے اختراع کیے۔ بین، مردنگ، ہندوؤں کے ساز ہیں۔ چوں کہ بین، ستار اور طنبورہ بعض ماہرین کے نزدیک انسانی گلے کا پورا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے محمد شاہ (رنگیلے) کے دربار کے ایک مغنی سارنگ نے سارنگی ایجاد کی۔ جس نے تمام سازوں کو پرے بٹھا دیا۔ اور رقص و سرود کی محفلوں میں ایسا رسوخ حاصل کیا۔ کہ آج تک سارنگی اور طبلے کے بغیر موسیقی کی کسی دلکش محفل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ استاد بُندو خاں دہلوی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ سارنگی نوازی کے فن میں مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سارنگی میں بھی بعض خوش آئند ترمیمیں کیں۔ بین میں عبدالعزیز خاں بین کار نے ترمیم کر کے وچتر بین اختراع کی۔ جو تمام پرانی بینوں سے بڑھ گئی۔

گھرانے

جس طرح فنون لطیفہ میں مختلف اسالیب کے لیے ''دبستان یا سکول'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح موسیقی میں مختلف مسالک کے علم بردار مختلف گھرانے ہوتے ہیں۔ جو ابتداءً کسی کامل استاد کی وجہ سے قائم ہوتے ہیں اور پھر اس کے جانشینوں اور شاگردوں کی وجہ سے ایک مستقل ''سکول'' کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً دلی والوں کا گھرانا، آگرہ والوں کا گھرانا، گوالیار والوں کا گھرانا، پٹیالہ والوں کا گھرانا، تلونڈی والوں کا گھرانا، کولہاپور والوں کا گھرانا، کرانے والوں کا گھرانا، بہرام خاں کا گھرانا، دہلی میں تان رس خاں، آگرہ میں استاد

فیاض خاں، گوالیار میں ہدّو حسّو خاں، پٹیالہ میں فتح علی اور علی بخش، کولہا پور میں اللہ دیئے خاں، بہرام خاں والوں میں بُندے اور ذاکر الدین، رام پور والوں میں مشتاق حسین خاں، اشتیاق حسین خاں بڑے بڑے باکمال ہوئے اور یہ امر قابل غور ہے کہ پورے اور غیر منقسم ہندوستان میں بھی موسیقی کے جتنے بڑے گھرانے موجود ہیں ان کی عظیم اکثریت مسلمان گھرانوں کی ہے۔

اگرچہ شیر خاں لودھی کی مراۃ الخیال، عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی، فقیر اللہ سیف خاں کی راگ درپن، خلاصۃ العیش (ترجمہ کتاب سید نظام الدین مدھنائک)، رسالہ امیر خسرو، رسالہ تان سین، حکیم محمد اکرم خاں کی معدن موسیقی، رضا خاں کی نغمات آصفی اور بے شمار دوسری کتابوں میں موسیقی کے متعلق مسلمان سلاطین و امرا اور عام شائقین کے ذوق شوق کی داستانیں قلمبند ہیں اور ہزاروں باکمالوں کا ذکر موجود ہے۔ لیکن گزشتہ ایک سو سال میں جو بے شمار موسیقار، سازندے اور استادانِ فن مسلمانوں نے پیدا کیے، ان کا مفصل تذکرہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ بہرحال یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ آج کل جناب شاہد احمد دہلوی، جناب انصار ناصری، سید عابد علی عابد، پروفیسر خادم محی الدین اور جناب رفیق غزنوی جیسے حضرات موجود ہیں۔ جو ضروری معلومات کے علاوہ تحریر و تصنیف کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ اور آخر الذکر کے متعلق تو سنا ہے کہ وہ "سویرا" میں اپنے مقالے ہی پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ ایک مستقل کتاب کے مواد کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق روزی فرمائے۔

پانچویں فصل: شعرا کی قدر دانی

بعض متعصب مؤرخین جن سلاطین کو خونریزی و سفاکی کا الزام دیتے ہیں۔ اور انھیں حسیات لطیفہ سے خالی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی علم دوستی اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی تاریخ کے صفحات سے اس قدر روشن و مبرہن ہے کہ ان کے حالات پڑھ کر کوئی منصف مزاج شخص ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین و امرا میں وحشت و بربریت کا شمہ تک بھی تھا۔ گزشتہ فصلوں سے واضح ہوگیا ہوگا کہ علم کی قدر دانی اور تعلیم و تدریس کی ہمت افزائی ان بادشاہوں کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اور وہ دانش و فرہنگ کی خدمت کو لازمۂ پادشاہی سمجھتے تھے۔ اس فصل میں مختصراً یہ بیان کیا جائے گا کہ شعر اور شعرا کے متعلق ان سلاطین کا رویہ کیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ہر سال چار لاکھ دینار علوم و فنون کی ترقی

پر صرف کرتا تھا۔ اس نے اس زمانے کے نامور ترین فلسفی اور شاعر عنصری کو غزنی یونیورسٹی کا معلّم اعلیٰ اور ادبیات کا محتسب مقرر کیا۔ کوئی چار سو طلباء و شعرا عنصری کے شاگرد تھے۔ [۶۴] جن میں عسجدی اور فرخی جیسے بلند پایہ استاد بھی شامل تھے۔ ایران کا ایک شاعر عزیری رازی محمود کے دربار میں موجود تھا۔ جس کو سلطان نے ایک مختصر مدحیہ پر چودہ ہزار درہم عطا کیے تھی۔ خراسان کا بلند پایہ شاعر اسدی طوسی فردوسی کا استاد تھا۔ سلطان نے اس کو بارہا شاہنامہ نظم کرنے کے لیے کہا۔ لیکن اس نے ہمیشہ ضعفِ پیری کے عذر سے اس عظیم کام کی ذمہ داری لینے سے معذوری ظاہر کی۔ لیکن جب فردوسی غزنی سے رخصت ہوگیا۔ تو سلطان نے چار ہزار اشعار کا ایک تتمہ لکھنے پر اسدی کو آمادہ کرلیا۔ بلخ کا ایک امیر منوچہر بھی سلطان کا درباری تھا۔ اور شعرا کی قدر دانی کے لیے مشہور تھا۔ [۶۵]

جب شاہنامہ کی ترتیب کے کام پر فردوسی طوسی مقرر کیا گیا تو سلطان نے اس کو معاش سے بالکل بے فکر کردیا۔ یہاں تک کہ وہ تیس سال تک اس کام میں مصروف رہا۔ خود لکھتا ہے۔

بسے رنج بردم دریں سال سی

عجم زندہ کردم بدیں پارسی

آخر میں جب وہ نارض ہوکر چلا گیا تو سلطان نے ساٹھ ہزار دینار کی گراں قدر رقم بھیجی۔ لیکن اس وقت فردوسی کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس کی بیٹی نے یہ رقم قبول نہ کی۔ اور کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کافی دولت ہے۔ چنانچہ سلطان نے طوس میں اس رقم سے ایک کاروان سرائے تعمیر کرادی کہ فردوسی کو اس کی تعمیر کی بڑی آرزو تھی۔ [۶۶]

محمود کی قدر دانی شعر کا ایک حیرت انگیز ثبوت اس وقت ملا۔ جب اس نے گوالیار کا قلعہ فتح کیا۔ عام حالات میں وہ اس قلعہ کو راجا کے حوالے کر صرف باج و خراج پر اکتفا کرلیتا۔ لیکن جب راجا نندا نے اس کی شان میں ایک ہندی قصیدہ لکھا اور ہندی کے اہل علم و ذوق نے اس قصیدے کی تعریف کی تو محمود نے پندرہ قلعے راجانندا کو عطا کردیے۔ جن میں کالنجر بھی شامل تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ شعر کے اس صلے کی کوئی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔

بیرام بن مسعود کے دربار میں شیخ نظامی صاحب مخزن الاسرار اور سید حسن غزنوی جیسے نامور اور بلند پایہ موجود تھے اور سلطان کے انعامات و وظائف سے مالا مال رہتے تھے۔ [۶۷]

شمس الدین التمش کے زمانے میں امیر کوہانی آئے۔ یہ بہت بڑے شاعر اور فلسفی

تھے۔ جب چنگیز خاں نے بخارا کو تاراج کیا تو پناہ لینے کے لیے دہلی آ گئے۔ التمش نے ان کی بے حد عزت کی۔ اور انھیں ہمیشہ بے فکر اور مطمئن رکھا۔

سلطان بلبن کے بڑے شہزادے محمد کو اچھے اشعار جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ اس نے اساتذہ فارسی کے کلام سے بیس ہزار منتخب اشعار کی ایک بیاض مرتب کر رکھی تھی۔ ہندوستان کا نامور شاعر امیر خسرو اس کا اتالیق مقرر ہوا۔[۶۸] یہ شہزادہ شاہ نامہ، دیوانِ سنائی، دیوانِ خاقانی، اور خمسۂ نظامی پڑھوا کر سنتا تھا۔ اور نقادانِ سخن اس کے سامنے اشعار کے حسن و قبح پر بحث کرتی تھے۔ اس شہزادے کی ادبی دلچسپی کے باعث شہر میں جابجا ادبی جلسے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ امیر حسن سجزی خسرو کے ہمراہ دربار میں تھا اس کو حسن کلام کی وجہ سے ''سعدی ہند'' کہتے ہیں۔[۶۹]

جلال الدین خلجی کے زمانے میں امیر خسرو کی بہت عزت افزائی ہوئی۔ وہ عارض الممالک کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اور اس کو مصحف بردار شاہی کا اعزاز بھی دیا گیا۔ یہ سلطان امیر خسرو کے علاوہ تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، موید دیوانہ، اختیار الدین یاغی اور دوسرے شعرا کو بھی ہمیشہ اپنے حضور میں مدعو کرتا تھا۔ اور ان کے کمالات شاعرانہ کی داد دیتا تھا۔ علاء الدین خلجی اگرچہ خود شعر سے چنداں شغف نہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کے عہد میں بھی دہلی بہت سے خوش گو شعرا کا مسکن بن گیا تھا۔ اور شعر و شاعری کی مجلسیں عام تھیں۔

محمد تغلق خود بھی ذی علم اور خوش ذوق شاعر تھا۔ اس کے دربار میں بدر چاچ جیسا شاعر موجود تھا۔ جس کے قصائد فارسی شاعری میں بہت عالی پایہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بدر چاچ نے تیس ہزار اشعار کا ایک شاہ نامہ بھی مرتب کیا تھا جس میں اپنے ممدوح کی مدح خوانی کی تھی۔ لیکن وہ تلف ہو گیا۔[۷۰]

''ریاض الطاہرین'' کا بیان ہے کہ جب مشہور مزاحی شاعر عبید زاکانی دہلی آیا۔ اور اس نے سلطان محمد تغلق کے سامنے اپنے قصیدے کا پہلا شعر پڑھا۔ تو سلطان نے چلا کر کہا۔ ''بس آگے نہ بڑھنا۔ کیوں کہ تمہارے سارے اشعار کا صلہ دینے کے لیے شاید خزانہ شاہی میں کافی روپیہ نہ ہو۔''[۷۱]

سلطنت بہمنی کا بادشاہ محمود شاہ بہمنی خود بھی شاعر تھا۔ اور میر فیض اللہ انجو اس کے دربار میں سب سے ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ محمود شاہ نے ایک دفعہ صرف ایک غزل پر اسے ایک ہزار دینار

انعام دے دیا تھا اور اس قسم کے عطایا سے انجو خاصا دولت مند ہو گیا تھا۔ جس طرح سلطان بلبن کے بیٹے نے شیخ سعدی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی (ملاحظہ ہو فصل ''علم و تعلیم'') اسی طرح محمود شاہ نے میر فیض اللہ انجو کی وساطت سے خواجہ حافظ کو تحائف بھیجے۔ اور ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ خواجہ حافظ نے وہ تحائف اپنے شناساؤں میں تقسیم کر دیے۔ اور خود ہندوستان جانے کے لیے رخت سفر باندھا۔ لیکن جب جہاز میں سوار ہوئے تو سمندر میں طوفان آ گیا۔ حافظ خوفزدہ ہو کر واپس ساحل پر آ گئے۔ اور معذرت کے طور پر چند اشعار لکھ کر بادشاہ کو بھیج دیے۔ اس پر محمود شاہ بہمنی نے ایک ہزار دینار گلبرگہ کے محمد قاسم مشہدی کے حوالے کیے اور کہا کہ ہندوستان کی بعض بہترین اشیا خرید کر بطور تحفہ ہماری طرف سے خواجہ حافظ کو پہنچا دو۔ [۴۷]

بیدر کا ایک امیر خواجہ محمود گاواں محمد شاہ بہمنی کا وزیر مقرر رہا۔ یہ شخص اپنی قابلیت، خوش ذوقی اور تدبر کی وجہ سے تاریخ میں نامور ہے۔ خود بھی شاعر تھا اور شعرا کی قدر دانی اور سرپرستی میں بھی مصروف رہتا تھا۔ بیجاپور کا بادشاہ عادل شاہ بھی شاعر تھا۔ گولکنڈہ کا محمد علی قطب شاہ خود فارسی اردو میں خوب شعر کہتا تھا اور اردو کے اولین شعرا میں شمار ہوتا ہے۔

شاہان مغل میں بابر ترکی اور فارسی کا بہت بڑا شاعر تھا۔ مرزا محمد حیدر دو غلات نے تاریخِ رشیدی میں لکھا ہے کہ ترکی شاعری میں بابر کا مرتبہ امیر علی شیر نوائی سے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا ہے۔ بابر نے خواجہ عبید اللہ احرار رحمتہ اللہ علیہ کے ایک رسالے کا منظوم ترجمہ کیا تھا اور ابوالفضل نے اس کی ایک فارسی مثنوی کا ذکر بھی کیا ہے۔

اکبر کے زمانے میں شاعری کو جو فروغ ہوا۔ اور شعرا کی جو قدر افزائی ہوئی اس سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ دربار میں فیضی جیسا ملک الشعرا موجود تھا جس کی نظیریں پوری تاریخ شاعری میں کمیاب ہیں۔ کلیات فیضی کے علاوہ نل دمن اس کی مشہور تصنیف ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں فارسی، ترکی، عربی اور ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اور ہندی شاعری میں تو وہ صف اول میں شمار ہوتا ہے۔ اس زمانے سے قبل ملک محمد جائسی نے ہندی میں پدماوت اور اکھراوٹ جیسی نظمیں تصنیف کیں۔ جو اب تک شائقین ہندی کے نزدیک مقبول ترین کتابوں میں سمجھی جاتی ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں ایران و خراسان کے بڑے بڑے شعرا زینت دربار شاہی ہوئے۔ جن میں ملک الشعرا طالب آملی، مُلا نظیری نیشاپوری، جمال الدین عرفی شیرازی، بابا طالب

اصفہانی، ملّا حیاتی گیلانی، ملا محمد صوفی مازندرانی، میر معصوم کاشی، سعیدائے گیلانی، فسونی کاشی، ملا حیدر خصالی اور شیدا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[۷۳] شاہ جہاں کی توجہ اگرچہ فنون لطیفہ میں زیادہ تر تعمیر کی طرف مبذول رہی۔ لیکن سید بخاری گجراتی، شیخ میر لاہوری، شیخ نظیری، میر القاسم ایرانی، ملا فاضل بدخشی، اس عہد کے منتخب شعرا تھے۔ اور یہ سب شاہ جہاں کے عواطف و اکرام سے بہرہ ور تھے۔[۷۴]

اورنگ زیب چونکہ علمِ دین اور علمائے شریعت کی خدمت و اعانت میں زیادہ مصروف رہتا تھا۔ اور فنونِ لطیفہ کی طرف کم متوجہ ہوتا تھا۔ اس لیے اس کے زمانے میں اعلیٰ درجے کے شعرا معدوم ہیں۔ لیکن اہل علم میں شعر وسخن کا ذوق بدرجۂ اتم پیدا ہو چکا تھا۔ اور نعمت خاں عالی، عاقل خاں رازی، سعید اشرف ماژندرانی، روشن ضمیر ایرانی، رفیع خاں باذل، محمد طاہر اصفہانی، غلام علی تحسین، عبدالباقی صہبائی اور محمد افضل سرخوش (صاحب تذکرہ)، دورِ عالمگیری کے شعرا میں شامل ہیں۔

مغل خواتین میں سلیمہ سلطانہ (ملکۂ اکبر) نور جہاں بیگم (ملکۂ جہانگیر) جہاں آرا بیگم (دختر شاہ جہاں) اور زیب النساء بیگم (دختر اورنگ زیب عالمگیر) کے متعلق تمام تاریخیں شاہد ہیں کہ وہ فارسی میں نہایت پاکیزہ شعر کہتی تھیں۔

حواشی

[۱] ملاحظہ ہو، دیول رانی، خضر خان، ۸۹-۱۰۶۔ قران السعدین، ص ۲۸۔

[۲] دیول رانی، ص ۱۰۹۔

[۳] تاریخِ فیروز شاہی، برنی اور جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، ۱۹۳۵ء، جلد اوّل، ص ۲۰۱۔

[۴] ٹریوریز کا سفرنامہ، جلد اوّل، ۱۲۴۔

[۵] آئینِ اکبری، جلد اوّل، ص ۹۳۔

[۶] آئینِ اکبری، ۸۱۔

[۷] قانونِ ہمایوں، ۶۱۔

[۸] کشمیر، سر فرانسس ینگ ہسبنڈ۔

[۹] ثقافتِ پاکستان، ۷۹۔

[۱۰] فرشتہ، (برگز)، جلد اوّل، ۶۱۔

[۱۱] کیمبرج، ہسٹری آف انڈیا، جلد ۳، ص ۵۷۹۔

[۱۲] فرگوسن، ص ۲۰۵۔

[۱۳] فرگوسن، ۲۱۲-۲۱۳۔

[۱۴] ابنِ بطوطہ، جلد سوم، ص ۲۱۴۔

[۱۵] ابنِ بطوطہ، جلد سوم، ص ۲۱۷-۲۲۰۔

[۱۶] شمس سراج عفیف، ایلیٹ، سوم، ۳۵۰۔

[۱۷] اشتیاق قریشی، ثقافتِ پاکستان، ص ۸۹۔

[۱۸] فرگوسن، ۲۳۰۔

[۱۹] فرگوسن، ۲۶۵-۲۶۶۔

[۲۰] فرشتہ (برگز)، جلد دوم، ۵۱۰۔

[۲۱] مثلاً فرگوسن، ہیول اور کمنگ کی کتابیں ملاحظہ ہوں۔

[۲۲] فرگوسن، ۲۷۸۔

[۲۳] توزک بابری ارسکین، ۳۳۴۔

[۲۴] توزک، ۳۴۱-۳۴۲۔

[۲۵] فرشتہ (برگز)، جلد دوم، ۷۱۔

[۲۶] ہیول کی ''ہندوستانی سنگتراشی اور مصوری''، ص ۱۹۰ و ۱۹۱۔

[۲۷] فتوحاتِ فیروز شاہی، ف ۳۰۲ ب، ۳۰۳ الف۔

[۲۸] عفیف، ۲۹۰-۲۷۴-۲۸۴۔

[۲۹] بیہقی، ص ۱۳۵۔

[۳۰] ایک مشہور مسودہ ''شیفر زحریری'' کے نام سے مشہور ہے۔ جو ۱۲۳۷ء میں تیار ہوا۔ اور ببلوتھک نیشونال (پیرس) میں موجود ہے۔

[۳۱] پرسی براؤن کی ''ہندوستانی مصوری''۔

[۳۲] مارٹن کی کتاب، جلد اوّل، ۹۷۔

[۳۳] تیمور نامہ (پبلک لائبریری، بانکی پور)۔

[۳۴] پرسی براؤن، ۵۴۔

[۳۵] پرسی براؤن، انڈین پینٹنگ، ص ۲۱۔

[۳۶] آئینِ اکبری، ابوالفضل۔

[۳۷] پرسی براؤن، ۵۴۔

[۳۸] آئینِ اکبری، بلوکمین، توزک جہانگیری، جلد ۲، ص ۲۰۔

[۳۹] توزک جہانگیری، جلد ۲، ص ۲۰۔

[۴۰] واقعاتِ جہانگیری، ایلیٹ چہارم۔

[۴۱] سر طامس رو کے پرچے، جلد چہارم، ۳۴۴۔

[۴۲] واقعاتِ جہانگیری، ایلیٹ چہارم، ۳۳۱۔

[۴۳] فرشتہ، جلد اوّل، ۱۳۷۔

[۴۴] ابنِ بطوطہ، ایلیٹ، جلد سوم، ۵۹۳۔

[۴۵] بدایونی (رینکنگ)، جلد اوّل، ص ۴۴۹۔

[۴۶] آئینِ اکبری، بلوکمین، ص ۱۰۳۔

[۴۷] تذکرۂ خوشنویساں، غلام محمد ہفت رقم۔

[۴۸] فرشتہ اوّل، ۲۵۲-۲۵۸۔

[۴۹] فرشتہ اوّل، ۲۹۲-۲۹۳۔

[۵۰] فرشتہ سوم، ۸-۳۰-۳۱۔

[۵۱] عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، ۱۶۵۔

[۵۲] فرشتہ، سوم، ۷۲۔

[۵۳] مضمون، پاکستانی موسیقی، شاہد احمد، استقلال ایڈیشن، ۱۹۵۶ء، روزنامہ جنگ، کراچی۔

[۵۴] غنچۂ راگ، نواب مراد علی خاں، مراد آبادی۔

[۵۵] راگ درپن، فقیر اللہ۔

[۵۶] بدایونی۔

[۵۷] تکمیلِ موسیقی، محمد افضل خاں۔

[۵۸] آئینِ اکبری۔

[۵۹] مضمون پروفیسر خادم حسین، محی الدین۔

[۶۰] حکایات، عالمگیر جدو ناتھ سرکار، ۱۷۳-۱۷۴۔

[۶۱] موسیقی کے ایک صاحبِ علم استاد تھے اور کلکتہ میں موسیقی کے پروفیسر مشہور تھے۔

[۶۲] گذشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر۔

[۶۳] گذشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر۔

[۶۴] تمہید البیرونی از سخاؤ۔

[۶۵] فرشتہ، اوّل، ۸۹۔

[۶۶] حبیب السیر، خوند میر، ایلیٹ، چہارم، ۱۹۰۔

[۶۷] فرشتہ، اوّل، ۱۴۹-۱۵۰۔

[۶۸] فرشتہ، اوّل، ۲۵۲۔

[۶۹] تاریخِ فیروز شاہی، برنی، ایلیٹ، سوم، ۱۰۹-۱۱۰۔

[۷۰] بدایونی، اوّل، ۲۴۱۔

[۷۱] ریاض الطاہرین، ۶۰۰۔

[۷۲] فرشتہ، ۳۴۷-۳۴۹۔

[۷۳] اقبال نامۂ جہانگیری، ۳۰۸۔

[۷۴] شاہ جہاں نامہ۔

چھٹا باب

بود و ماند و خورونوش

پہلی فصل: دربار، جشن، سیر وسفر

ہندوستان کے مسلمان سلاطین اور بادشاہ ایرانی رواج کے مطابق ہمیشہ اپنے دربار منعقد کیا کرتے تھے۔ ابتدا میں یہ دربار تقریباً روزانہ ہوا کرتے تھے۔ جن میں امرائے سلطنت کی شرکت بھی ضروری ہوتی تھی اور امور مملکت کے متعلق اہم فیصلے اور مقدمات کے تصفیے بھی یہیں کیے جاتے تھے۔ ان درباروں کے علاوہ بعض تقریبات پر مخصوص دربار بھی منعقد کیے جاتے۔ مثلاً بادشاہ کی تاج پوشی۔ کسی فتح کی یادگاری تقریب۔ کسی شہزادے یا شہزادی کی شادی یا پیدائش۔ کسی سلطنت کے سفیر یا کسی معزز سرکاری مہمان کی پذیرائی اس قسم کی تقریبات تھیں۔ جن پر دربار کا انعقاد ضروری ہوتا تھا پھر بعض قومی، مجلسی اور مذہبی تیوہاروں پر عظیم الشان جشن بھی ہوتے۔ جن پر دولت وثروت اور شان وشکوہ کے وہ مظاہرے کیے جاتے کہ دنیا بھر کی سلطنتوں کے درباروں میں ان کی مثال نہ مل سکتی تھی۔

آئین اکبری میں ابوالفضل نے ان درباروں اور جشنوں کے ساز وسامان اور شان و شوکت کا نقشہ کھینچا ہے۔ چوں کہ مغلوں کے زمانے خصوصاً اکبر کے عہد میں درباروں کی شان و شکوہ عین الکمال تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حال بیان کر دیا جائے۔[۱] جب بارگاہ جلال آراستہ ہوتی۔ زریں وسیمیں چبوترے پر تخت مرصع قائم ہوتا۔ جہاں پناہ اس پر رونق افروز ہوتے۔ تاج شاہی میں ہما کا پَر چتر جواہر نگار سر پر، زربفت کا شامیانہ، موتیوں کی جھالروں سے مزین سونے چاندی کے اِستادوں پر تنا، ریشمی قالینوں کے فرش، درودیوار پر شالہائے کشمیری، مخملہائے رومی، اطلس ہائے چینی لہراتے، امرائے عالی قدر دست بستہ دوطرف حاضر، چو[illegible]ں بردار، زرق برق لباس پہنے، سونے چاندی کے نیزوں اور عصاؤں

پر باناتی اور سقرلاطی غلاف چڑھائے ادھر ادھر اہتمام کرتے پھرتے تھے۔

بارگاہ کے دونوں طرف شہزادوں اور امیروں کے خیمے، باہر دونوں طرف سواروں اور پیادوں کی قطار، بادشاہ دومنزل راوٹی (جھروکے) میں آبیٹھتے شہزادے، امرا، سلاطین آتے۔ انہیں خلعت و انعام ملتے۔ منصب بڑھتے۔ روپے اشرفیاں سونے چاندی کے پھول اولوں کی طرح برستے۔ یکا یک حکم ہوتا کہ ہاں نور برسے۔ فراشوں اور خواصوں نے منوں بادلا اور مقیش کتر کر جھولیوں میں بھرلیا ہے۔ اور صندلیوں پر چڑھ کر اڑا رہے ہیں۔ نقار خانے میں نوبت جھڑ رہی ہے۔ ہندوستانی، عربی، ایرانی، تورانی اور فرنگی باجے بج رہے ہیں۔ دربار کے ساتھ ہی موجودات کا ہنگامہ بھی ہوتا۔ مقصود یہ تھا کہ ایک تو دربار کے شکوہ میں اضافہ ہو، دوسرے قوائے سلطنت کی نمائش ہو جائے۔ اور اگر کوئی کمی ہو تو برسرِ عام سامنے آجائے۔ موجودات کی ترتیب یوں تھی:

''نشان کا ہاتھی، اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار، پھر ماہی مراتب اور نشانوں کے ہاتھی، جنگلی ہاتھیوں کی فولادی پاکھریں، پیشانیوں پر ڈھالیں، بعض کی مستکوں پر دیوزادی نقش و نگار۔ بعض کے چہروں پر گینڈوں۔ ارنے بھینسوں اور شیروں کی کھالیں کلوں سمیت چڑھی ہوئی۔ ہیبت ناک صورت۔ ڈراؤنی مورت۔ سونڈوں میں گرز۔ برچھیاں۔ تلواریں لیے۔ سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سوسوکوس کے دم۔ گردن کھچی۔ سینے تنے جیسے لکا کبوتر۔ پھر گھوڑوں کی قطاریں عربی، ایرانی، ترکی، ہندوستانی آراستہ پیراستہ سازو یراق میں غرق۔ چالاکی میں برق۔ اچھلتے، مچلتے، کھیلتے، کودتے، شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے۔ پھر شیر، پلنگ، چیتے، گینڈے، بہتیرے جنگل کے جانور سدھے سدھائے شائستہ چیتوں کے چھکڑوں پر نقش و نگار، گل و گلزار، آنکھوں پر زردوزی غلاف۔ وہ اور ان کے بَیل کشمیری شالیں، مخمل و زربفت کی جھولیں اوڑھے۔ بَیلوں کے سروں پر کلغیاں اور تاج۔ سینگ مصوروں کی قلمکاری سے قلمدان کشمیر۔ پاؤں میں جھانجھن گلے میں گھنگھرو۔ چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے۔ اور شکاری کتے کہ شیر سے منہ نہ پھرائیں۔''

''پھر خاصے کے ہاتھی آتے۔ ان کی زرق برق کا عالم اللہ اللہ آنکھوں کو چکا چوندی آتی تھی۔ یہ خاص الخاص چہیتے تھے۔ ان کی جھلا بور جھولیں۔ موتی اور جواہر ٹنکے۔ زیوروں میں لدے پھندے قوی ہیکل سینوں پر سونے کی ہیکلیں لٹکتی۔ سونے چاندی کی زنجیریں سونڈوں میں ہلاتے۔ جھومتے جھامتے خوش مستیاں کرتے چلے جاتے تھے۔''

''سواروں کے دستے۔ پیادوں کے قشون (پلٹنیں) سپاہ ترک کے ترکی و تاتاری

لباس۔ وہی جنگ کے سلاح۔ ہندوستانی فوجوں کا اپنا اپنا بانا۔ کیسری دگلے۔ سورما راجپوت ہتیاروں میں اوپچی بنے۔ دکھنیوں کے دکھنی سامان، توپ خانے، آتش خانے، ان کی فرنگی و رومی وردیاں۔ سب اپنے اپنے باجے بجاتے۔ راجپوت شہنائیوں میں کڑکے گاتے۔ اپنے نشان لہراتے چلے جاتے تھے۔ امرا و سردار اپنی اپنی سپاہ کو انتظام سے لیے جاتے تھے۔ جب سامنے پہنچتے۔ سلامی بجالاتے۔ دمامے پر ڈنکا پڑتا۔ سینوں میں دل دہل جاتے۔"

جب بادشاہ کی سواری لشکر کے ساتھ چلتی تو پورے ایرانی و ترکمانی ساز و سامان ہمراہ ہوتے۔ مثلاً

"سایہ بان، بیضوی تراش، گز بھر بلند، دستہ چتر کے برابر۔ اور اسی طرح زربفت، مخمل اور زرباف سے سنگارتے تھے۔ جواہرات و مروارید ٹکے ہوئے چالاک خاص بردار رکاب کے برابر لیے چلتے۔ دھوپ ہوئی تو سایہ کر لیتے۔ اسے آفتاب گیر بھی کہتے تھے۔

کوکبہ۔ چند سونے کے گولے صیقل اور جلا سے مبارک ستاروں کی طرح دغدغاتے پیشگاہ دربار میں آویزاں ہوتے تھے۔ یہ چاروں بادشاہ کے سوا کوئی شہزادہ یا امیر نہ رکھ سکتا تھا۔

عَلَم۔ سواری کے وقت لشکر کے ساتھ کم سے کم پانچ عَلَم ہوتے تھے۔ ان پر بانات کے غلاف رہتے تھے۔ میدان جنگ میں کھل کر ہوا میں لہراتے تھے۔

چتر توغ۔ ایک قسم کا علم تھا، مگر عَلَم سے چھوٹا۔ کئی قطاس کے گپھے اس پر طرہ (قطاس سرا گائے یعنی پہاڑی گائے کی دم)۔

تمن توغ۔ اسے بھی چتر توغ ہی سمجھو۔ اس سے ذرا اونچا ہوتا تھا۔ یہ دونوں رتبے میں اونچے تھے۔ اور شہزادوں کے لیے خاص تھے۔

جھنڈا۔ وہی عَلَم پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے کا الگ ہوتا تھا۔ بڑا معرکہ ہو تو تعداد بڑھا دیتے تھے۔ نقارے کے ساتھ الگ ہوتا تھا۔

گورک۔ عربی میں دمامہ کہتے ہیں۔ ایک نقارے میں کم و بیش اٹھارہ جوڑیاں ہوتی تھیں۔

نقارہ۔ کم و بیش بیس جوڑیاں۔

دُھل۔ کئی ہوتے تھے۔ کم سے کم چار بجتے تھے۔

کرنا۔ سونے چاندی اور پیتل وغیرہ سے ڈھالتے تھے۔ چار سے کم نہ بجتی تھی

سرنا۔ ایرانی و ہندوستانی کم سے کم نُو نغمہ سرائی کرتی تھیں۔
نفیر۔ ایرانی، ہندوستانی، فرنگی ہر قسم کی نفیریاں نغمہ ریزی کرتی تھیں۔
سینگ۔ گائے کے سینگ کی وضع پر تانبے کا ڈھال لیتے تھے اور دو بجتے تھے۔
سنج۔ جھانج تین جوڑیاں بجتی تھیں۔"

فرودگاہ شاہی

جب بادشاہ دورے پر یا شکار پر روانہ ہوتا تو کمپ کی شان و شوکت کسی اعتبار سے قلعہ معلّٰی اور بارگاہ شہنشاہی سے کم نہ ہوتی۔ جہاں بادشاہ قیام فرماتے۔ ایک پورا شہر آباد ہو جاتا۔ آئین اکبری میں پوری تفصیل درج ہے۔ اور یورپ کے سیاحوں کے بیانات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ کمپ ہندوستان میں بالکل نئی چیز تھی اور اس کی شان و حشمت کو دیکھ کر سلطنت کا رعب و جلال قائم ہوتا تھا۔ "دربار اکبری" ہی کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جو زیادہ تر آئین اکبری سے ماخوذ ہے۔

گلال بار: یہ چوبی سراپردہ خرگاہ کی وضع کا ہوتا تھا۔ تسموں سے مضبوطی کی جاتی تھی۔ سرخ مخمل، بانات اور قالینوں سے سجاتے تھے۔ گرد عمدہ احاطہ ایک قلعہ تھا۔ اس میں مضبوط دروازہ قفل کنجی سے کھلتا تھا۔ سو گز یا سو گز سے زیادہ۔

بارگاہ: گلال بار کے شرقی کنارے پر ہوتی تھی۔ بیچ کے اِستادوں پر دو کڑیاں، ۵۴ کمروں میں تقسیم۔ ہر ایک کا ۲۴ گز طول ۱۴ گز عرض۔ دس ہزار آدمیوں پر سایہ ڈالتی تھی۔ ہزار پھرتیلے فراش ایک ہفتے میں سجاتے تھے۔ چرخیاں، پہیے وغیرہ جر ثقیل کے اوزار زور لگاتے تھے۔ لوہے کی چادریں اسے مضبوط کرتی تھیں۔

راوٹی: بیچ میں چوبی راوٹی دس ستونوں پر کھڑی ہوتی تھی۔ ستون تھوڑے تھوڑے زمین میں گڑے ہوئے۔ سب باہم برابر۔ مگر دو اونچے ان پر ایک کڑی۔ اوپر اور نیچے داسہ مضبوطی کرتا تھا۔ ان پر لوہے کی چادریں کہ نر مادگی انہیں وصل کرتی تھی۔ دیواریں اور چھتیں نرسلوں اور بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی۔ دروازے دو یا ایک نیچے کے داسے کے برابر چبوترہ۔ اندر زربفت و مخمل سجاتے تھے۔ باہر بانات سلطانی۔ ابریشمیں نواڑیں اس کی کمر مضبوط کرتی تھیں۔ گرد اور سراپردے۔

اس سے ملا ہوا ایک چوبیں محل دو منزلہ جس کو اٹھارہ ستون سر پر لیے کھڑے رہتے تھے۔ چھ گز بلند، چھت تختہ پوش، اِس پر چوگزے ستون، اس میں عبادت الٰہی کرتے تھے۔ اس کا نام ''دو آشیانہ منزل'' اور ''جھروکا'' تھا۔

زمین دوز طرح طرح کے ہوتے تھے۔ ایک کڑی بیچ میں یا دو۔ بیچ میں پردے ڈال کر الگ الگ گھر کر دیتے تھے۔

عجائبی: نو شامیانے چار چار ستونوں پر ملا کر کھڑے کرتے تھے۔ ۵ چوگوشے ۴ مخروطی اور یک لخت بھی ہوتے تھے۔ ایک ایک کڑی بیچ میں۔

منڈل: ۵ شامیانے ملے ہوئے چار چار ستونوں پر تانتے تھے۔ کبھی گرد کے چار کو لٹکا دیتے تو خلوت خانہ ہو جاتا۔ کبھی ایک طرف کبھی چاروں طرفیں کھول کر جی خوش کرتے تھے۔

اٹھ کھمبہ: سترہ شامیانے جدا اور ملے ہوئے سجاتے تھے آٹھ آٹھ ستونوں پر۔

خرگاہ: مختلف وضع کی ہوتی تھیں۔ ایک دری و دو دری۔

حرم سرا: بارگاہ کے باہر موزوں و مناسب ۲۴ چوبیں راوٹیاں دس گز طول چھ گز عرض۔ بیچ میں قناتوں کی دیواریں۔ اس میں بیگمات اترتی تھیں۔ کئی خیمے اور خرگاہ اور کھڑے ہو جاتے۔ جن میں خواصیں اترتی تھیں۔ آگے سائبان زردوزی، زربفتی، مخملی بہار دیتے تھے۔ اس سے ملا ہوا سرا پردۂ گلیمی کھڑا کرتے تھے۔ یہ ایسا دَل بادَل تھا کہ اس کے اندر کئی خیمے اور لگاتے تھے۔ اردابیگنیاں اور دوسری عورتیں ان میں رہتی تھیں۔

اس کے باہر دولت خانہ خاص تک سو گز عرض کا ایک صحن سجاتے تھے کہ مہتابی کہلاتا تھا۔ اس کے دونوں طرف بھی پہلی طرح سراچہ ساں باندھتا تھا۔ دو دو گز پر چھ گزی چوب کھڑی۔ گز بھر زمین میں گڑی۔ سروں پر برنجی قبے۔ اسے اندر باہر دو طنابیں تانے رہتی تھیں۔ چوکیدار برابر برابر پہرے پر حاضر۔ اس خوشی خانے کے بیچ میں ایک صفّہ (چبوترہ) اس پر چار چوبہ شامیانہ اس پر رات کو جلوس فرماتے تھے۔ خاصانِ درگاہ کے سوا کسی کو اجازت نہ تھی۔

گلال بار سے ملا ہوا تیں گز قطر کا دائرہ کھینچتے تھے۔ بارہ حصوں پر تقسیم کرتے تھے۔ گلال بار کا دروازہ ادھر نکالتے تھے۔ بارہ شامیانے بارہ گزے اس پر سائبانی کرتی تھے۔ اور قناتیں انہیں خوشنما تراش سے تقسیم کرتی تھیں۔ اس خلوت خانے کو آتچکی خانہ بھی کہتے تھے۔

[illegible] سے پرے مقام پر ایک صحت خانہ ہوتا تھا (یہ پائخانہ کو خطاب عطا ہوا تھا)۔

اس سے ملا ہوا ایک گلیمی سراپردہ۔ ڈیڑھ سو گز مربع۔ اس کی چوبیں بھی اسی طرح قبوں سے تاجدار۔ بیچ میں بارگاہ وسیع، ہزار فراش اسے سجاتے تھے۔ بہتر کمروں میں تقسیم۔ اوپر پندرہ گز کا شہتیر۔

اس کے اوپر قلندری کھڑی کرتے۔ خیمے کی وضع ہوتی تھی۔ اور موم جامہ وغیرہ۔ اس کے پچاس شامیانے بارہ گز کے دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ یہ دولت خانہ خاص تھا۔ اس کا دروازہ بھی قفل کنجی سے محفوظ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے امیر، سپہ سالار، بخشی بے اجازت نہ جاسکتے تھے۔ ہر مہینے اس بارگاہ کو نیا سنگار ملتا تھا۔ اندر باہر رنگیں، نقشیں، بوقلموں فرش اور پردے چمن کھلا دیتے تھے۔ اس کے گرد ۳۵۰ گز کے فاصلے پر طنابیں کھچی تھیں۔ تین تین گز پر ایک ایک چوب کھڑی ہوئی۔ جابجا پاسبان ہوشیار۔ یہ دیوان خانہ عام کہلاتا تھا۔ ہر جگہ پہرہ دار۔ اخیر میں جاکر بارہ طناب کے فاصلے پر ایک طناب ساٹھ گز کی نقار خانہ۔

اس میدان کے بیچ میں ''اکاس دیا'' روشن ہوتا تھا۔ اکاس دیئے کئی ہوتے تھے۔ ایک یہاں اور ایک سراپردے کے آگے کھڑا کرتے۔ چالیس گز کا طولانی ستون ہوتا تھا۔ اسے پندرہ طنابیں تانے کھڑی رہتی تھیں۔ دور تک روشنی دکھاتا تھا اور بھولے بھٹکے وفاداروں کو اندھیرے میں در دولت کا رستہ بتاتا تھا۔ اور اس کے دائیں بائیں کا حساب لگا کر اور امرا کے خیموں کے پتے لگا لیتے تھے۔

۱۰۰ ہاتھی، پانسو اونٹ، ایک سو کہار، پانسو منصب دار اور احدی ہزار فراش ایرانی، تورانی، ہندوستانی، پانسو بیلدار، ایک سو سقے، پچاس نجار، بہت سے خیمہ دوز، مشعلچی، تیس چرم دوز، ڈیڑھ سو حلال خور (خاکروب) اس آباد شہر کے ساتھ چلتے تھے۔ پیادے کا مہینہ چھ روپے سے تین روپے تک تھا۔

ڈیڑھ ہزار گز کے ہموار خوشنما قطعہ زمین پر بارگاہِ خاص کا سامان پھیلتا۔ تین سو گز گول فاصلے دے کر دائیں بائیں پیچھے پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ پشت پر بیچوں بیچ سو گز کے فاصلے پر مریم مکانی، گلبدن بیگم اور بیگمات، اور شہزادہ دانیال۔ دائیں پر شہزادہ سلطان سلیم (جہانگیر) بائیں پر شاہ مراد۔ پھر ذرا آگے بڑھ کر توشہ خانہ، آبدار خانہ، خوشبو خانہ وغیرہ تمام کارخانے۔ ہر گوشے پر خوشنما چوک۔ پھر اپنے اپنے رتبے سے امرا دونوں طرف۔ غرض لشکر اقبال اور بارگاہ جلال ایک چلتا ہوا شہر تھا۔ جہاں جاکر اترتا۔ عیش وعشرت کا میلا ہوتا تھا۔ جنگل میں منگل ہوجاتا

تھا۔ چار چار پانچ پانچ میل تک دو طرفہ بازار لگ جاتے تھے۔ سارا لاؤ لشکر اور سامان مذکور ایک طلسمات کا شہر آباد ہو جاتا۔ اور گلال بار بیچ میں قلعہ نظر آتا تھا۔ (دربار اکبری)

شاہی درباروں میں شہزادوں اور امیروں اور افسروں کے لیے نشستیں مخصوص ہوتی تھیں۔ ہر شخص اپنے مقام اور منصب پر حاضر رہتا۔ ان تمام رسوم و قواعد کا احاطہ کرنا تو بے حد دشوار ہے۔ جن پر دربار میں عمل کیا جاتا تھا۔ البتہ بعض مخصوص آداب بیان کیے جا سکتے ہیں۔ جو بارگاہ شاہی میں کسی شخص کے پیش ہوتے وقت ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ مثلاً کورنش، زمین بوس تسلیم، جن کے متعلق دربار کے نقیب اور چوبدار ہدایت و رہنمائی کے لیے موجود ہوتے تھے۔

کورنش تو سیدھا سادہ سلام تھا جس میں دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پیشانی پر رکھ کر سر جھکانا ہوتا تھا۔[۲]

تسلیم کا طریقہ یہ تھا کہ سلام کرنے والا پہلے دائیں ہاتھ کی پشت زمین پر رکھتا۔ پھر اس کو آہستہ آہستہ اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ اور اپنی ہتھیلی کو اپنے تالو پر رکھ لیتا۔ جس سے یہ اظہار مقصود تھا کہ میں اپنا سر قربان کرنے کو تیار ہوں۔[۳]

زمین بوس میں حضور شہنشاہی میں پہنچنے والا شخص اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتا اور تخت کی طرف قدم اٹھاتا۔ اور نقیب کی پکار کی تعمیل میں باقاعدہ وقفوں سے تین دفعہ جھک جھک کر سلام کرتا۔[۴]

بادشاہ کے سامنے پہنچ کر عجز و نیاز سے سجدہ کرتا اور شستہ و شائستہ الفاظ میں اپنی گزارش پیش کرتا۔ یہ اور اس قسم کے دیگر آداب و اوضاع کے متعلق برنی کی تاریخ فیروز شاہی، عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، سفر نامہ ابن بطوطہ، آئین اکبری اور سفر نامہ برنیر میں مکمل معلومات موجود ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کی رائے یہ ہو کہ آج کل کے زمانہ جمہوریت میں شاہی درباروں کی شان و شوکت اور بادشاہوں کی "خدائی و خداوندی" کا ذکر بے موقع ہے۔ لیکن راقم کتاب کا مقصود یہ ہے کہ اس ثقافت کے وسیع اثرات واضح کرے جو مسلمانوں نے اس ملک کو عطا کی۔ اوضاع و اطوار کی شستگی و شائستگی، تہذیب و تمدن کے ساز و سامان اور صنعت و فن کی وسیع اور شاہانہ حوصلہ افزائی جو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں منصۂ شہود پر آئی۔ اسی نے ہندوستان کو موجودہ ہندوستان بنایا۔ مسلمانوں کے ورود سے پیشتر ثقافت کے یہ اجزا اس ملک

میں بہت بڑی حد تک مفقود تھے۔

بادشاہان ہند کے محلوں اور قلعوں میں جو بے شمار کارخانے مختلف قسم کی صنعتوں کو روز افزوں فروغ دے رہے تھے ان کا ذکر پہلے کسی فصل میں کیا جاچکا ہے۔ درباروں اور جشنوں میں بھی دولت وحشمت کے جو مظاہرے ہوتے تھے ان سے ملک میں فنون و صنائع کو بے انتہا تقویت پہنچتی تھی۔ اور ایران وتوران او رروم و فرنگ کی مصنوعات کی نمائش سے ہندوستانی فنکاروں اور صناعوں کے کمال کو بہت مدد اور جلا بہم پہنچتی تھی۔

جشنِ نوروزی

مثلاً مغلوں کا جشن نو روزی صرف خوشی منانے کا جشن نہ تھا بلکہ ایک عظیم الشان سالانہ نمائش بھی تھی جس میں امرا اپنے اپنے ذوق کے مطابق عجائبات فراہم کرتے تھے۔ دیوان عام و خاص کے گرد ایک سو بیس عالی شان ایوان تھے۔ اکبر نے ایک ایک ایوان ایک ایک امیر کے سپرد کر کے حکم دیا کہ اپنی قابلیت اور عالی ہمتی سے اس کو آراستہ کرے۔ ایک طرف بادشاہ کا دولت خانہ خاص تھا۔ وہ خدام شاہی کے حوالے کیا گیا کہ اس کی آئین بندی کریں۔ تمام مکانات کے در و دیوار پر تگالی بانات، رومی و کاشانی مخمل، بنارسی زربفت و کمخاب، تاش تمامی گوٹے ٹھپے، پیمک مقیش سے آراستہ کیے گئے۔ کشمیر کی شالیں آویزاں کی گئیں۔ ایران اور ترکستان کے قالین بچھائے گئے۔ فرنگ اور چین کے رنگا رنگ پردے، نادر تصویریں، عجیب و غریب آئینے، شیشے اور بلور کے کنول، مردنگ، قندیلیں، جھاڑ، فانوس، قمقمے لٹکائے گئے۔ آسمانی شامیانے اور خیمے نصب کیے گئے صحنوں میں پھولوں کے تختے لگا کر دولت خانہ خاص رشکِ کشمیر بنا دیا گیا۔

امرا کی اولوالعزمی

خان خاناں اور خان اعظم عالی ہمت اور خوش ذوق امیر تھے جو فن کی جمالیاتی اقدار کے علاوہ افادیت کو بھی مدنظر رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایوانوں کو ملک ملک کے صنائع و بدائع سے سجایا۔ اور ہندوستانی صناعوں کو بلا بلا کر اپنے فراہم کردہ تحفوں کی خوبیاں واضح کیں۔ اکثر امرا نے ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے اسلحہ جنگ کے عجیب و غریب نمونے جمع کیے۔ شاہ فتح اللہ نے جن کا شغف علم ہیئت و ریاضی سے مسلّم ہے، اپنے ایوان میں ان علوم وفنون کی نمائش مرتب کی۔ علم ہیئت کے آلات، گھڑیاں اور گھنٹے، نظام فلکی کے نقشے، ربع مجیب اصطرلاب۔ جرثقیل کی

کلیں، علم کیمیا اور نیرنجات کے شعبدے دکھائے یورپی لوگوں نے ارغنون (آرگن باجا) کا صندوق پیش کیا۔ جو رنگا رنگ کے نغمے سناتا تھا۔ ممالک روم و فرنگ کی انوکھی دستکاریاں اور صنعتیں، جادو اور اچنبھے کا سماں پیش کرتی تھیں۔ ان تمام اشیاء کی نمائش اور ممالک عالم کے اہل کمال کی قدر افزائی سے محض شان وشوکت مقصود نہ تھی۔ بلکہ فنون و صنائع کی ترقی مدنظر تھی۔

آج کل کے زمانے میں وسیع پیمانے پر جو صنعتی نمائشیں ہو رہی ہیں اور مینا بازار لگائے جاتے ہیں یہ سب کے سب شاہان مغل کا ترکہ ہیں۔ زمانہ بلاشبہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ لیکن بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ زمانۂ حاضر کی نمائشیں ابھی تک اپنے حسن و جمال اور کمالات فن کے مظاہرے کے اعتبار سے مغلوں کے جشنوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔

درباروں کا ثقافتی وظیفہ

مسلمان بادشاہوں کے درباروں کی شوکت وحشمت امراو حکام کو تخت شاہی سے وابستہ رکھنے میں مدد دیتی تھی۔ رعایا کے دل میں اپنے بادشاہ کے عز و احترام کو قائم رکھتی تھی۔ اور مخالفین و منافقین کو خوف و ہیبت میں مبتلا رکھ کر شر و فساد کے سرچشموں کو بند کرتی تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان میں دربار بدستور زندہ رہے۔ صدہا والیان ریاست نے مغل درباروں کی شوکت اور ان کے آداب و اطوار کو قائم رکھا۔ یہاں تک کہ خود انگریزوں نے بے شمار دربار منعقد کیے۔ اور دربار کی افادی حیثیت کے قائل رہے۔ بلاشبہ جمہوریت میں درباروں کا کوئی مقام نہیں۔ لیکن تاریخی اداروں کی افادیت پر ازمنۂ ماضیہ کے حالات کے پیش نظر ہی غور کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر مؤرخ تسلیم کرے گا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں شاہی درباروں نے علوم وفنون، تہذیب و ثقافت اور عوام کی طمانیت و خوشحالی کی شاندار خدمت انجام دی ہے۔ یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ دربار شاہی صرف دہلی ہی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ امرائے دربار نے اپنے اپنے ہاں بھی اپنی ہمت و استطاعت کے مطابق دربار قائم کر رکھے تھے۔ صوبہ جات کے حاکموں اور صوبیداروں کے اپنے دربار تھے۔ اور یہ سب اپنے شہنشاہ کے نقش قدم پر چل کر تہذیب و تمدن کی آبیاری اور چمن آرائی میں مصروف رہتے تھے۔ پھر بادشاہی صرف دہلی ہی میں نہ تھی۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مالوہ، گجرات۔ بنگال۔ جونپور۔ دکن وغیرہ میں بھی خود مختار بادشاہوں کی سلطنتیں بڑے جاہ و جلال کے ساتھ قائم رہیں۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے

بھی اپنے درباروں کو علوم وفنون اور تہذیب وشائستگی کا سرچشمہ بنانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ گویا مسلمانوں نے اپنا ثقافتی وظیفہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں پوری قوت سے ادا کیا۔ اور صدہا سال تک ادا کرتے رہے۔

دوسری فصل: حیوانات کی پرورش اور مردانہ کھیل

تمدن کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ ملکی حیوانات کی نسلوں کی ترقی وتربیت پر توجہ کی جائے۔ اور غیر ممالک کے حیوانات جو ملک کی آب وہوا میں پنپ سکیں ان کی درآمد کر کے ان کی نسلیں بھی بڑھائی جائیں۔ سلاطین ہند اور تاجداران مغل ہاتھیوں اور گھوڑوں کی پرورش پر جو توجہ صرف کرتے تھے۔ اس کا ذکر تاریخ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ ہندوستان میں ہاتھیوں کی افراط تھی۔ اور وہ بادشاہوں اور امیروں کی سواری کی حیثیت سے موٹر کار کا اور لڑائیوں میں ٹینک کا کام دیتے تھے۔ ہر جنگ میں صدہا ہاتھی اور ہزارہا گھوڑے استعمال کیے جاتے تھے اور ہر فوج کی قوت کا اندازہ اس کے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی تعداد سے کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی گھوڑے پست قد ہوتے تھے۔ اور اس زمانے میں گوٹ یا ٹانگن کہلاتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں نے عراق، عرب، روم، ترکستان، بدخشاں، تبت وغیرہ سے اعلیٰ نسل کے گھوڑے درآمد کیے۔ اور مغلوں نے ان کی نسل کشی میں بے حد محنت کی۔ اکبر کے زمانے سے پیشتر اہل ہند انہی ملکی ٹٹوؤں پر سوار ہوتے تھے اور درآمد شدہ گھوڑے زیادہ تر فوج کے کام آتے تھے۔ لیکن اکبر نے عراقی وترکی گھوڑوں کے گلے کے گلے بعض جاگیرداروں کے سپرد کیے اور حکم دیا کہ ان کی نسل کشی کریں۔ چنانچہ تھوڑی مدت میں گھوڑے پیدا ہونے لگے۔ جو کسی اعتبار سے عربی وعراقی گھوڑوں سے کم نہ تھے۔ گھوڑوں کی خرید وفروخت اور ترقی ونمائش کے لیے اکبر نے جو انتظامات کیے۔ ان کو ابوالفضل نے آئین اکبری میں تفصیل سے لکھا ہے۔ خچر صرف پکھلی کے علاقے میں ہوتے تھے۔ لیکن لوگ ان کی سواری کو پسند نہ کرتے تھے۔ اکبر نے ان کی نسل کو بھی اس قدر ترقی دی کہ خچر کی قیمت ہزار روپے تک پہنچ گئی۔ اور لوگ شوق سے اس پر سوار ہونے لگے۔[۵]

اونٹ ہندوستان میں بالکل نہ ہوتے تھے۔ ضرورت کے لیے بیرونی ملکوں سے درآمد کیے جاتے تھے۔ اکبر نے اونٹوں کی نسل کشی کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا۔ اور نہایت عمدہ نسلیں تیار کرالیں۔ جو اجمیر، جودھ پور، ناگور، بیکانیر، جیسلمیر وغیرہ میں کثرت سے پھیلیں۔ ابوالفضل

آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ بعض مقامات پر ایک ایک شخص کے پاس دس دس ہزار اونٹ ہوتے تھے۔

ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کے علاوہ بیسیوں پالتو اور جنگلی جانوروں کی پرورش کی جاتی تھی۔ اکبر نے شیر، چیتے، گینڈے، نیل گائے، ہرن، بارہ سنگے وغیرہ ہزاروں جانور پالے۔ بعض جانور ایسے ہیں جو جنگل کے سوا بچے نہیں جنتے۔ مثلاً ہاتھی، شیر، چیتے، چکور، سارس وغیرہ۔ لیکن تربیت کے ذریعے سے ان کی عادات میں ایسا تغیر پیدا کیا گیا کہ گھروں میں ان کے بچے اور انڈے پیدا ہوئے۔ اکبر نے ایک دفعہ ہزار نر و مادہ چیتے جمع کیے تا کہ باہم جفت ہوں لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

جہانگیر کے تجربے

جہانگیر نے بھی ایک دو تجربے کیے۔ بالآخر کامیاب ہوا۔ نر و مادہ جمع ہوئے۔ ڈھائی ماہ کے بعد تین بچے پیدا ہوئے۔ اور بڑے بھی ہوگئے۔ جہانگیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرے عہد میں جنگلی جانور اس قدر رام ہوگئے ہیں کہ شیر اور چیتے قطار در قطار شہر میں چھوٹے پھرتے ہیں اور کسی کو نہیں ستاتے۔ اس کے علاوہ شیرنی، ہتھنی کے جننے اور چکور کے انڈے دینے کا حال بھی لکھا ہے۔[۶]

جہانگیر نے ایک بہت بڑا چڑیا گھر قائم کیا تھا۔ وہ اپنے کارندوں کو دور دراز صوبوں میں نئے جانوروں کے مہیا کرنے کے لیے بھیجتا تھا۔ ایک دفعہ مقرب خاں کو گوا میں بھیجا۔ وہ بہت سا روپیہ صَرف کر کے بعض یورپی جانور لایا۔ جن میں پیرو بھی تھا۔ ایک خاص قسم کا بندر لایا جو بندر سے چھوٹا اور لومڑی سے بڑا تھا، اس کے جسم پر بھیڑ کی سی اون تھی اور رنگ خاکستری تھا۔ کان کی لو سے ٹھوڑی تک سرخ پٹی تھی۔ اور کبھی کبھی ہرن کے بچے کی طرح آواز نکالتا تھا۔ ولایت زیرباد سے ایک عجیب پرندہ آیا۔ جو رات بھر درخت کی شاخ سے الٹا لٹکا ہوا چہچہایا کرتا تھا۔ پانی مطلق نہ پیتا تھا۔ اگرچہ پانی تمام جانداروں کے لیے مایۂ بقا ہے لیکن اس کے لیے زہر کا حکم رکھتا تھا۔[۷]

واجد علی شاہ کا چڑیا گھر

کی طرف منتقل ہوگئے تھے۔ اور چونکہ وہ اصلاً مرکزی حکومت ہی کے صوبیدار تھے اور اپنے آقایان ولی نعمت کی پیروی ہی کو لازمۂ شاہی سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے حیوانات کی پرورش اور دیکھ بھال کو بھی بدرجۂ کمال ترقی دی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے ''گزشتہ لکھنؤ'' کے عنوان سے ''ہندوستان میں مشرقی تمدن'' کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ اور مٹیا برج (کلکتہ) دونوں مقامات پر واجد علی شاہ نے بڑے وسیع پیمانے پر چڑیا گھر قائم کر رکھے تھے۔ نور منزل کے سامنے خوش نما آہنی کٹھرے سے گھیر کر ایک وسیع رمنا بنایا گیا۔ جس میں صدہا چیتل، ہرن اور وحشی چوپائے پھرتے تھے۔ سنگِ مَرمَر کے ایک تالاب میں شتر مرغ، کشوری، فیل مرغ، سارس، قازیں، بگلے، قرقرے، ہنس، مور، چکور اور صدہا قسم کے طیور اور کچھوے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ مجال کیا جو کہیں بیٹ یا کسی جانور کا پَر نظر آ جائے۔ تالاب کے ایک طرف کٹہروں میں شیر تھے۔ رمنے کے پاس ہی لکڑی کے سلاخوں دار خانے بے شمار تھے جن میں بیسیوں طرح کے بندر خدا جانے کہاں کہاں سے لا کر رکھے گئے تھے۔ تالابوں میں مچھلیاں بھی ہر قسم کی موجود تھیں۔ ایک مصنوعی پہاڑ میں دو دو تین تین گز لمبے ہزاروں سانپ چھوڑ دیئے گئے تھے۔ وہاں مینڈکیں چھوڑی جاتیں۔ سانپ دوڑ دوڑ کر انھیں پکڑتے۔ لوگ بالکل بلا خوف پاس کھڑے سیر دیکھتے۔ [۸]

معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے پیش نظر ایک مکمل چڑیا گھر (یا نیچرل ہسٹری میوزیم) تھا۔ کیوں کہ اس میں کوئی جانور رہ نہ گیا تھا۔ ان حیوانات اور پرندوں کے علاوہ شیر ببر، دیسی شیر، چیتے، تیندوے، ریچھ، سیاہ گوش، چرخ، بھیڑیے سب کٹہروں میں بند تھے۔ اور بڑی خاطر داشت سے رکھے جاتے تھے۔

واجد علی شاہ اپنے اس مشغلے پر بے انداز روپیہ خرچ کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا بیس ہزار روپے کو اور سفید مور کا جوڑا گیارہ ہزار روپے کو لیا تھا۔ زرافہ جو افریقہ کا عجیب جانور ہے اس کا بھی ایک جوڑا موجود تھا۔ دو کوہان کے بغدادی اونٹ ہندوستان میں کہیں نظر نہیں آتے۔ لیکن بادشاہ کے ہاں موجود تھے۔ کبوتروں کا انتظام بھی وسیع تھا۔ چوبیس پچیس ہزار کبوتر رکھے جاتے تھے۔ آٹھ سو سے زیادہ جانور باز نوکر تھے۔ تین سو کے قریب کبوتر باز، اسّی ماہی پرور، تیس چالیس مار پرور۔ جن کو دس روپے ماہوار سے چھ روپے ماہوار تک تنخواہیں ملتیں۔ افسروں کی تنخواہیں بیس سے تیس روپے تک تھیں۔ [۹] یہ تمام اہتمام مٹیا بُرج میں تھا۔

جہاں بادشاہ نظر بند تھے۔ اسی سے اندازہ کرلو کہ لکھنؤ میں اس اہتمام کی وسعت کس حد تک ہوگی۔

مغل بادشاہوں کا تہور

مسلمان بادشاہوں میں بعض عیاش طبع ضرور تھے۔ گو ان کی اکثریت نہایت فرض شناس رعایا پرور اور پابند مذہب تھی۔ لیکن ان میں بزدل کوئی نہ تھا۔ ذاتی شجاعت لازمۂ تاجداری سمجھی جاتی تھی۔ مغلوں سے زیادہ عیش وعشرت اور مسرت و اطمینان کے سامان کس کو میسر ہوں گے۔ لیکن مغل بادشاہوں کی بہادری ضرب المثل ہے۔ بابر کا تہور عدیم المثال تھا۔ ساری عمر یلغاروں میں بسر ہوگئی۔ دشوار گزار پہاڑوں اور گھاٹیوں میں اپنے رفقا کی تعداد سے زیادہ جرار لشکروں کا مقابلہ انتہائی جانفشانی سے کرتا۔ تیز و تند دریاؤں میں بے تکلف گھوڑا ڈال دیتا۔ جتنی رکاوٹیں زیادہ پاتا۔ اسی قدر اس کی ہمت بلند ہوتی۔ ہمایوں بلاشبہ راحت طلب تھا۔ لیکن جب بھی ضرورت پڑتی جان پر کھیل جانے میں تامل نہ کرتا۔ اکبر جب کابل میں تھا۔ اونٹ سے بڑا کوئی جانور دکھائی نہ دیتا تھا۔ اسی پر چڑھتا تھا۔ دوڑتا تھا۔ کبھی کتوں سے کبھی تیر و کمان سے شکار کھیلتا۔ کبھی باز اڑاتا۔ جب بادشاہی عین الکمال کو پہنچی تو ہاتھیوں کا شوق ہوا۔ اور اس شوق کو اس قدر بے جگری سے پورا کیا کہ دنیا عش عش کرگئی۔ سرشور اور مست ہاتھیوں پر ایسی سواری گانٹھتا کہ خود جانور مبہوت رہ جاتے۔ ایک ہاتھی سے دوسرے ہاتھی پر اچھل جاتا۔ نہ ہودہ نہ عماری نہ جھول نہ گدّی۔ کبھی ہاتھی کی گردن پر ہے، کبھی پشت پر۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ دو مست ہاتھی پہاڑوں کی طرح ٹکرا رہے ہیں اور اکبر ایک ہاتھی پر شیر کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اکبری ہاتھی مستی و سرشوری میں رسوائے زمانہ تھے۔ ایک کا نام ہوائی اور دوسرے کا رن باگھ۔ ان دونوں کی ٹکر اور اکبر کی خطرناک سواری کا حال جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے۔[۱۰] جس کو پڑھ کر دل دہل جاتا ہے اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس قسم کے بادشاہ لاؤ لشکر کے زور سے حکومت نہ کرتے تھے۔ بلکہ اپنی ذاتی شجاعت اور بے خوفی سے عملاً ثابت کردیتے تھے کہ وہ تمام امرا و احکام اور منافق مخالفین سے بدرجہا زیادہ مستحق حکمرانی ہیں۔ شکارگاہوں میں اور سیر وسفر کے دوران میں اکثر شیر ببر اس کے سامنے آئے اور اس نے تیغ و تفنگ سے تنہا مارے۔ اور کسی مددگار کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ یہی حال جہانگیر کا تھا۔ مؤرخ اسے کتنا ہی عیش پسند اور رنگین مزاج بتائیں لیکن اس کی ذاتی جرأت اور مردانہ کھیلوں اور شکار میں اس کی بے باکی اور شجاعت سے انکار نہیں کرسکتے۔

اکبر کو چیتے پالنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ سینکڑوں چیتے جمع کیے۔ کمخواب اور مخمل کی جھولیں پڑی ہوئی۔ گلے میں سونے کی زنجیریں۔ آنکھوں پر زردوزی چشمے چڑھے ہوئے بہلیوں میں سوار چلتے تھے۔ بادشاہ نے ان کے سدھانے پر بڑے بڑے ماہرین مقرر کر رکھے تھے۔ یہ چیتے شکار میں خوب کام دیتے تھے۔[۱۱]

مردانہ کھیل

مسلمان بادشاہ، ان کے درباروں کے امرا، صوبیدار اور حکام، جاگیردار اور باجگزار سبھی مردانہ کھیلوں کے عاشق تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ اس زمانے میں ''ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند'' کا عالم تھا۔ جنگ و پیکار میں صرف ذاتی شجاعت کام دیتی تھی۔ تفنگ بازی، چوگان بازی، تیراندازی، نیزہ بازی، شمشیرزنی، گھوڑ دوڑ بالائی طبقے کے کھیل تھے جو دہلی، صوبائی مرکزوں اور دوسرے بادشاہوں کے دارالخلافوں میں عام طور پر کھیلے جاتے تھے۔ عوام کے کھیل لکڑی، گتکا، پٹہ ہلانا، بانگ بنوٹ، کشتی، برچھا، بانا، کٹار، جل بانک تھے۔ جن کی ترویج میں ہندوستانی، تاتاری اور عرب تینوں قومیں شریک تھیں۔ دہلی میں ان فنون کے ماہرین کا کچھ شمار نہ تھا۔ اس کے بعد یہ فنون لکھنؤ میں پہنچے۔ سلاطین اودھ کے زمانے میں ان کے بڑے بڑے باکمال ماہرین پیدا ہوئے۔ تفصیل کے لیے مولانا عبدالحلیم شرر کی کتاب گزشتہ لکھنؤ (۱۲۷ تا ۱۳۸) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ فنون سپہ گری ہندوستان میں عام تھے۔ اور ابھی تیس چالیس سال پیشتر یوپی کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی خاندان ان فنون کے جاننے والوں سے خالی نہ تھا۔ اب چونکہ یہ فنون جدید قواعد جنگ و آلات حرب کے مقابلے میں بیکار ہو چکے ہیں۔ اس لیے روز بروز نابود ہوتے جاتے ہیں۔

درندوں کی لڑائیاں

سلطان واجد علی شاہ کے عہد میں ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ نہایت خوفناک درندوں کو آپس میں لڑانے کا رواج شروع ہو گیا تھا۔ بے شمار شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، اونٹ، گینڈے، جنگلی گھوڑے، لاکھوں روپے کے صرف سے پالے جاتے تھے اور پھر کبھی شیر کو ہاتھی سے، کبھی گینڈے کو تیندوے سے کبھی گھوڑے کو اونٹ سے لڑایا جاتا اور اس وحشیانہ خونریزی سے لطف اٹھایا جاتا۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''جب لوگوں کو ملک گیری اور صف آرائی سے فرصت ملی۔ اور میدان جنگ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگ جوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کے جانبازی و خونریزی کا تماشا دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق تو تھوڑا بہت ہر جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہلِ لکھنؤ کو ہوا۔ اس کی مثال نہیں۔''

مولانا شرر لکھتے ہیں کہ ''لکھنؤ میں غازی الدین حیدر بادشاہ کو غالباً ان کے یورپین دوستوں نے درندوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق لایا۔ بادشاہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ اور چند ہی روز میں شاہی دلچسپی ان خوفناک اور وحشیانہ لڑائیوں میں ایسی بڑھی کہ کوئی امکانی کوشش اٹھا نہیں رکھی گئی۔[۱۲]

درندوں کی لڑائی کے علاوہ بارہ سنگھوں، مینڈھوں، مرغوں، تیتروں، بٹیروں، گلاموں، لالوں، توتوں کی لڑائیاں کرائی جاتیں۔ خیر یہ مشاغل تو زیادہ تر لکھنؤ والوں کے تھے۔ لیکن کبوتر پالنے اور پتنگ اڑانے کا شوق دہلی اور لکھنؤ سے نکل کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا تھا۔ اور اب بھی ان مشغلوں کے شوقین ہر جگہ موجود ہیں۔

سلاطین و امرا اور دوسرے خوشحال لوگوں کا سب سے بڑا مشغلہ شکار تھا۔ جب تک بندوق ہندوستان میں نہ آئی تھی۔ شکار کے حربے صرف تیر و شمشیر تھے۔ اور شکار کھیلنا پھرتی، ہنرمندی اور جرأت کا متقاضی تھا۔ بہت سے سلاطین و امرا انہی حربوں سے شیر اور چیتے تک کا شکار کھیلتے تھے۔ نیل گائے، ہرن، پہاڑی بکری وغیرہ کا شکار عام تھا۔ پرندوں اور مچھلیوں کا کام چڑی ماروں اور ماہی گیروں کے سپرد تھا۔ کوئی شریف آدمی ان کے لیے جال لگا کر نہیں بیٹھتا تھا۔ بندوق کی ایجاد کے بعد شاہی شکارگاہوں کی رونق بہت بڑھ گئی۔

شکار قُمرغہ

مغل بادشاہ عام طور پر بڑے اہتمام سے شکار کھیلتے تھے۔ اور اکثر ''شکار قمرغہ'' کھیلتے تھے۔ یہ ایران و توران کے لوگوں کا قدیم شوق تھا کسی وسیع جنگل کے گرد درختوں کے بڑے بڑے تنوں اور لکڑوں سے احاطہ باندھتے۔ تیس تیس چالیس چالیس کوس سے ''ہانکا'' ہوتا جس سے بے شمار طرح طرح کے درندے، چرندے جمع ہو جاتے۔ احاطہ بالکل بند کر دیا جاتا۔ بیچ میں مچانیں بنائی جاتیں۔ جن پر ~~بادشاہ~~ شہزادوں اور امرا کی نشستیں ہوتیں۔ پہلے بادشاہ سوار ہو کر شکار مارتا،

پھر شہزادوں اور امیروں کو اجازت ہو جاتی۔ اور چند گھنٹے خوب شکار ہوتا۔ اس کو شکار جرگہ بھی کہتے تھے۔ اب تک ہندوستانی حکمرانوں کا طریقۂ شکار یہی ہے۔ جو مغل ایران و توران سے لائے تھے۔[۱۳]

محکمہ شکار

چونکہ شکار وسط ایشیا کے پادشاہوں اور امیروں کا ہمیشہ ہی سے شغل چلا آتا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے بھی اس کو بڑے اہتمام سے جاری رکھا۔ دہلی کے قریب چوبیس کوس کا ایک قطعہ زمین شکار گاہ شاہی کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اور ہر قسم کے حیوانات چرند پرند اس میں جمع کیے گئے۔ قریب قریب تمام سلاطین اور بادشاہ اپنی حکومت میں ایک محکمہ شکار قائم کرتے تھے۔ جس کا اعلیٰ افسر میر شکار کہلاتا تھا اور بہت معزز شاہی افسر سمجھا جاتا تھا اس کے ماتحت بہت سے عارضان شکار، خاصہ دار اور مہتر کام کرتے تھے۔ شکار کے خاص قواعد و قوانین تھے۔ جن کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

بعض کھیل اندرون خانہ بھی کھیلے جاتے تھے۔ جن میں چوسر، گنجفہ، نرد اور شطرنج عام تھے۔ لیکن زمانہ عروج میں مسلمان زیادہ تر بیرون خانہ اور مردانہ کھیلوں کے شوقین رہے جن سے ان کے جسموں میں پھرتی، چستی اور مستعدی قائم رہتی تھی اور شجاعت و بہادری کے اظہار کا موقع ملتا رہتا تھا۔

تیسری فصل: مکان ولباس

جب مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو چونکہ تعمیر مکانات اور آرائش خانہ میں ان کا مذاق اہل ہند سے بالکل مختلف تھا اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے ہر اعتبار سے ترقی یافتہ تھے۔ اس لیے اس ملک کے شہروں اور قصبوں میں ان کی بود و ماند ہندوؤں سے بالکل الگ اور ممتاز تھی۔ بلاشبہ ہندوؤں کے شہروں میں راجاؤں کے عالی شان محل۔ تیرتھ، مندر، تالاب وغیرہ موجود تھے۔ لیکن ہندوانی ذوقِ تعمیر وسعت وعظمت اور روشنی و ہوا کے نفوذ کے اعتبار سے بہت پست واقع ہوا تھا۔ مسلمانوں نے آتے ہی عالی شان مسجدیں تعمیر کیں۔ مدرسوں کی عمارتیں بنائیں۔ جن میں گنبد، محراب، بلند دروازے، اور مینار خصوصیت سے ممتاز تھے۔ شہروں اور قصبوں کی فصیلوں کو بھی جدید اسلوب سے تعمیر کیا۔ ان میں بے شمار برج اور گرگج بنائے۔ اور اپنی ان

جدتوں کی وجہ سے شہروں کی خوشنمائی میں اضافہ کیا۔

دارالخلافوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان اور خوبصورت عمارتیں قصر شاہی اور اس کے متعلقات، شاہی کارخانوں، حرم سراؤں اور مسجدوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اور تاجداروں اور ان کے امیروں کے محلوں میں محل سرائیں، دیوان خانے، باورچی خانے، غسل خانے، خواب گاہیں، کتب خانے، دالان، سائبان، برآمدے، تہہ خانے، نشست گاہیں اور خدا جانے کیا کچھ ہوتا تھا۔ ان کی چھتیں بلند اور نقشیں ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ روشن دان بنائے جاتے تھے۔ اور ان کے کمروں کے آس پاس کھلے صحن چھوڑے جاتے تھے۔ تاکہ روشنی اور ہوا کی کمی محسوس نہ ہو۔ محل کی اندرونی دیواروں پر ریشمیں اور مخملیں پردے اور کشمیری شالیں آویزاں کی جاتی تھیں، جن کے کناروں پر زربفت کے حاشیے اور جواہرات کی جھالریں ٹانکی جاتی تھیں۔ امیروں، منصب داروں اور بڑے افسروں کی حویلیاں بھی ان کی استطاعت کے مطابق محل شاہی کا چربہ ہوتی تھیں۔ کیوں کہ وہ لوگ اپنے ولی نعمت کی تقلید کو باعث سعادت سمجھتے تھے۔ ان محلوں اور حویلیوں میں حرم سراؤں کا حصہ خاص طور پر خوش ذوقی سے آراستہ کیا جاتا۔ اور بیگمات اپنے کمروں کی آرائش میں خاص سلیقے کا ثبوت دیتیں۔ ایسے محل اور ایسی حویلیاں بھی عام تھیں۔ جن کے ایک طرف نہایت صاف شفاف حوض و تالاب اور دوسری طرف میوہ دار درختوں کے چھوٹے چھوٹے باغ اور پھولوں کی باصرہ افروز کیاریاں نہایت سلیقے اور طریقے سے لگائی جاتیں۔

فرنیچر

ان مکانات کا فرنیچر بھی نہایت شاندار اور آرام دہ ہوتا تھا۔ پلنگ، کرسیاں، دیوان، مسہریاں، رومی و ایرانی قالین، گاؤ تکیے، پاانداز، تخت، مسند، گلدان، گلدستے، مرقعے، طغرے، ان کمروں کو آراستہ کرتے تھے۔ بستر کے سامان میں دری، لحاف، توشک، سوزنی، رضائی، پلنگ پوش، تکیے، گل تکیے، بوغبند، بستر بند کے الفاظ ہی شاہد ہیں۔ کہ ان کے مروج کرنے والے مسلمان تھے۔ ہندوستان میں روشنی کا سامان بہت ہی ناکافی اور کثیف تھا جس کا ذکر بابر نے اپنی توزک میں کیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے محلوں اور مکانوں میں شمع، شمعدان، قندیل، جھاڑ فانوس، دوشاخہ، سہ شاخہ، پنج شاخہ، قمقمہ، غرض روشنی کے بیسیوں سامان موجود ہوتے تھے۔ فرش فروش کے سامان میں بھی قالین، جاجم، شطرنجی، نمدے، گبّے، مسلمانوں کے لائے ہوئے ہیں۔ چاندنی جو

اب تک ہندوستان کے ہر دولت مند اور متوسط بلکہ غریب گھر میں مروج ہے۔ نور جہاں بیگم کی ایجاد ہے۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ:

چاندنی کہ نفس الامر عجب فرش ''عیب پوش خانۂ نامراد و گرد پوش فرش دولت مندان'' است و در شب ہائے مہتاب نمود خاص دارد وضع کردۂ ہمانست۔[۱۴]

متوسط الحال لوگ بھی اپنی توفیق و استطاعت کے مطابق اپنے گھروں کو کسی قدر ارزاں سامان آرائش سے آراستہ کر لیتے تھے۔ اور ان میں مسلمانوں کے گھروں کا سلیقہ خاص طور پر ممتاز تھا۔ غریب آدمیوں کے مکانات ویسے ہی تھے۔ جیسے دیہات میں آج کل بھی نظر آتے ہیں۔ کچی دیواروں کا مکان۔ جس پر پھونس کا چھپر یا بانس کی چھت۔ اس کے نیچے ضرورت کے مطابق ستون۔ کچا فرش جس پر گوبر کی لپائی۔ کچھ چارپائیاں اور کھانے پکانے کے برتن۔ گاؤں کے مکھیا، مقدم، نمبردار یا خوشحال زمیندار بھی زیادہ تر کچے مکانوں میں رہتے تھے۔ لیکن ان کا ساز و سامان عام کسانوں سے بہتر ہوتا اور مکان بھی فراخ اور دو منزلہ ہوتے۔ باہر کھلا صحن۔ اس میں ایک چبوترہ جس پر زمیندار بیٹھتا اور پنچایتیں جمع ہوتیں۔

شہروں کے اہل حرفہ اور تاجر دیہات کی آبادی کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھے۔ اس لیے کہ سلاطین و امرا، سرکاری حکام اور خوشحال شہری ہر وقت ان کی سرپرستی کرتے۔ اور حکومت کے بہترین اقدامات سے جو فلاح رعایا کے لیے کیے جاتے۔ براہ راست مستفید ہوتے۔ ان کے مکانات اکثر پختہ ہوتے اور ان میں سامان بھی بہتر ہوتا۔

ٹھنڈا پانی

مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''آسائش و آرام اور راحت کے جو ہزاروں سامان پیدا ہوئے ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں قدرتی تمام اشیاء پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن لوگوں کو ان سے کام لینا نہ آتا تھا۔ مسلمانوں کی خوش مذاقی اور جدت طلبی سے ہزاروں چیزیں کام میں آئیں۔ اور ایک نئی دنیا پیدا ہوگئی۔ شورہ خاص یہاں کی پیداوار ہے۔ لیکن کسی کو ہزاروں برس تک یہ خیال نہ آیا کہ اس سے پانی ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ٹھنڈے پانی کی ضرورت جس قدر ایسے گرم ملک میں ہوسکتی تھی، محتاج بیان نہیں۔ برف بھی پہاڑوں سے آسکتی تھی۔ لیکن یہاں کے لوگوں کو اپنی وحشیانہ زندگی میں

آبِ سرد کی ضرورت کیا تھی۔ لیکن مسلمان عجم سے آئے تو وہ ایسی زندگی کیونکر بسر کر سکتے تھے۔ اکبر نے شورے سے پانی سرد کرنے کو رواج دیا۔ پہاڑوں سے برف آکر بازاروں میں بکنے لگی۔ خس کی ٹٹی بھی اکبر ہی کی ایجاد ہے۔[۱۵]

کمروں کو سرد رکھنے کی تدبیریں مغلوں سے پہلے سلاطین نے بھی کی تھیں۔ اور مختلف قسم کے پنکھوں کو رواج دیا تھا۔ لیکن خس کی ٹٹیاں مغلوں نے لگائیں۔

کپڑا

لباس میں مسلمانوں کی جدت و اختراع کے کارنامے بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اگرچہ ہندوستان میں پارچہ بافی عام تھی اور ہزار دو ہزار جُلاہے ہر علاقے میں گاڑھا، گزی، کھیس، دوتہیاں، بُننے میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن اہل ہند باریک، نفیس اور اعلیٰ درجے کے کپڑوں سے علی العموم محروم تھے۔ ممکن ہے بعض راجاؤں کے لیے بنارس یا دوسرے مقامات پر پُرتکلف کپڑا بُننے کا اہتمام کیا جاتا ہو۔ لیکن مسلمانوں کے آنے سے قبل یہ ملک پارچہ بافی کی نفاست سے بالکل محروم تھا۔ البیرونی، بابر اور بعض دوسرے مؤرخین کی تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں کا زنانہ و مردانہ لباس صرف چادر، دھوتی، لنگوٹی اور انگیا وغیرہ پر مشتمل تھا۔ مسلمانوں نے آتے ہی ایران، عراق، روم و شام سے بہترین کپڑا درآمد کرنا شروع کیا۔ کچھ اس لیے کہ انھیں اس ملک میں عام پہننے کا کپڑا بھی دستیاب نہ ہوسکتا تھا۔ اور کچھ اس لیے کہ انھیں خلعت وغیرہ دینے میں پُرتکلف کپڑوں کی ضرورت پڑتی تھی جس کا مہیا ہونا ہندستان میں قریب قریب محال تھا۔ اس کے علاوہ فوجوں کے لیے ان کے اپنے قومی لباسوں کا مہیا کرنا ضروری تھا۔

ہندوستان میں پارچہ بافی

لیکن آگے چل کر مسلمان تاج داروں نے جہاں ملک کی دوسری صنعتوں کو ترقی دینے کی تدبیریں کیں۔ وہاں پارچہ بافی کو بھی بے حد فروغ دیا۔ یہاں تک کہ ملک میں جابجا سوتی، اونی اور ریشمی کپڑا کثرت سے بُننے لگا۔ اور بے شمار شاہی اور تجارتی کارخانے قائم ہوگئے۔ پہلے کسی جگہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ دہلی کے سلاطین اور تاج داروں نے اپنی نگرانی میں کارخانے جاری کررکھے تھے۔ جن میں خاندانِ شاہی، امرا اور درباریوں کے لیے بے اندازہ سوتی، اور ریشمی کپڑا

تیار کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان کارخانوں میں ہزاروں پارچہ باف کام کرتے تھے۔ محمد بن تغلق نے ان پارچہ بافوں کے علاوہ چار ہزار ایسے کاریگر ملازم رکھے تھے جو صرف زربفت و کمخاب اور زردوزی کے لیے گوٹا، مقیش اور زری تیار کرتے تھے۔[۱۶]

سلطنت دہلی کے علاوہ بعض دوسری خود مختار ریاستوں کے حکمران بھی صنعت پارچہ بافی کے بڑے سرپرست تھے۔ مثلاً گجرات اور بنگال کے کارخانوں میں ململ، دوسرا سوتی کپڑا، زردوزی ٹوپیاں، ریشمی رومال اس کثرت سے تیار ہوتے تھے کہ ملکی ضرورت کو پورا کرنے کے علاوہ دساور کو بھی بھیجے جاتے تھے۔ کھمبایت اور گجرات میں مخمل، قالین، ریشمی کپڑے اور چھینٹ کی صنعت کمال کو پہنچ گئی تھی۔ دکن میں بھی پارچہ بافی کے کئی مرکز تھے۔ ڈھاکا کی ململ اپنی نفاست اور باریکی میں مثال نہ رکھتی تھی۔ مشروع، گلبدن، سنگی، سوسی، اطلس، مخمل، کمخواب، مشجر، نیم زری، موج دریا، جامدانی، کامدانی، تن زیب، آبِ رواں، جامہ وار، طوس، شال اور بے شمار دوسری اقسام کے کپڑے ہندوستان میں تیار ہونے لگے تھے۔[۱۷]

اکبر نے دہلی، لاہور، آگرہ، فتح پور، احمد آباد، گجرات میں پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے جاری کیے اور ایران و چین سے کاریگر بلوا کر ہر قسم کے کپڑے بھی تیار کرائے اور مقامی کاریگروں کو تربیت بھی دلائی۔ ابوالفضل نے مندرجہ ذیل ریشمی کپڑوں کے نام اور قیمتیں بھی لکھی ہیں:

مخمل، زربفت، فرنگی، گجراتی، کاشی، ہروی، طاس، گجراتی مقیش، وارائی، شروانی، مشجر فرنگی، دیبائے فرنگی، دیبائے یزدی، خارا، اطلس خطائی، نوار خطائی، خز، مخمل، فرنگی، خانی، سہ رنگ، قطنی، کتان فرنگی، تافتہ، انبری، مطبق۔

سوتی کپڑے حسب ذیل تھے:

چوتار، ململ، نین سکھ، سری صاف، گنگا جل، بھیروں، سالور، بہادر شاہی، گریہ سوتی، شیلہ دکنی، مہرکل، سہن، جبونہ، محمودی، اساولی، بجتولہ، جبولہ، چھینٹ وغیرہ۔

کشمیر میں شالیں بنتی تھیں۔ اور دنیا بھر میں بے نظیر سمجھی جاتی تھیں۔ اکبر نے شال بافی میں بے شمار جدتیں پیدا کیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شال صرف کشمیر ہی میں بُنی جا سکتی ہے۔ لیکن اکبر نے اس صنعت کو ملک میں اس قدر فروغ دیا کہ صرف لاہور میں شال بافی کے ایک ہزار کارخانے جاری ہو گئے۔[۱۸]

مسلمانوں کا لباس

دہلی کے ابتدائی سلاطین سر پر کلاہِ تتری پہنتے تھے۔ جلال الدین خلجی دستار پہنتا تھا۔ سلاطین میں سے بعض کلاہ اور بعض دستار کے شوقین تھے۔ مغل بادشاہوں نے راجپوتوں کی کھڑکی دار پگڑی پر جیغہ و طرّہ اضافہ کرکے اس کو تاجِ شاہی قرار دیا۔ تن پر جامے اور قبائیں پہنی جاتی تھیں۔ جو موسم گرما میں ململ کی اور سرما میں گرم کپڑے کی ہوتی تھیں۔ اِنہی کو ترقی دے کر پیشواز اور انگے کی صورت دے دی گئی۔ سردی کے موسم میں یہ لوگ ایک روئی دار پُغہ پہنتے تھے۔ جس کو دگلہ کہتے تھے۔ یہ گویا اوورکوٹ کا کام دیتا تھا۔ فرغل بہت قیمتی چغہ تھا۔ جو بطور خلعت عطا کیا جاتا تھا۔ نادری ایک اور قبا تھی۔ جو جہانگیر نے اختراع کی تھی یہ بھی خلعت کے طور پر دی جاتی تھی۔ ابتدا میں جو عرب ہندوستان میں داخل ہوئے۔ وہ کرتے، تہمد اور عبائیں پہنتے تھے۔ لیکن ایران و توران سے آنے والوں کا زیریں لباس پاجامہ تھا۔ اور اس کی تراش غالبًا وہی تھی جس کو ہم شرعی پاجامہ کہتے ہیں۔ ہلکی شلواریں بھی عام طور پر پہنی جاتی تھیں۔

امرا علی العموم اپنے بادشاہ ہی کا لباس پہنتے تھے۔ لیکن درباروں کے موقع پر کلاہ تاتاری اور مخمل کی زردوزی قبا پہنتے اور سفید پٹی باندھتے۔ زیر جامہ اور لباس خواب پہننے کا رواج عام تھا۔ علما قبا و عمامہ اور درویش قلنسوہ (فقیری ٹوپیاں) پہنتے۔ معزز ہندو اکثر پگڑیاں اور دھوتیاں باندھتے۔ البتہ درباری ہندوؤں کو پاجامہ پہننا پڑتا تھا۔ مسلمانوں کا لباس وہی ٹوپی یا پگڑی، کرتا، شرعی پاجامہ تھا۔ سردیوں میں حسب استطاعت گرم کپڑے پہنتے۔ یا کمّل اور شالیں اوڑھتے۔ ہندو عوام نیم عریانی میں زندگی بسر کرتے اور صرف دھوتی یا لنگوٹی پر اکتفا کرتے۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ ہی ربط ضبط کا اثر تھا کہ اس ملک کے باشندوں نے شریفانہ کپڑے پہننا شروع کیے۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ دہلی میں دربار مغلیہ کا آخری لباس یہ تھا۔ سر پر پگڑی، بدن میں نیمہ جامہ (نیمہ کہنیوں تک آدھی آستینوں کا شلوکا تھا اور اس میں سینے پر گھنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔ اس پر جامہ جو عجمی قبا کو ترمیم کرکے بنایا گیا تھا۔ اس میں گریبان نہ ہوتا۔ بلکہ دونوں جانب کے کنارے ترچھے ایک دوسرے پر آجاتے۔ گویا نیمہ بند گلے کی واسکٹ تھی، اور جامہ کھلے گلے کا کوٹ)، ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پاجامہ، پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا، کمر میں جامے کے اوپر پٹکا۔

یہی کپڑے تھے جو ترقی کرتے کرتے انگرکھا، چپکن، اچکن، اور پھر شیروانی اور قمیص تک پہنچ گئے۔ اسی طرح پاجامے نے بھی مختلف شکلیں اختیار کیں، دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں لباس کی رنگا رنگ اختراعات یہاں تک پہنچیں کہ آج ٹوپی، شیروانی، تنگ مہری کا پاجامہ پورے برصغیر میں معزز ترین ہندوستانی و پاکستانی لباس سمجھا جاتا ہے۔

مسلمان خواتین کی اختراعیں

بالائی طبقے کی مسلمان عورتوں کا لباس مدت سے یہی چلا آتا ہے۔ شلوار، قمیض اور دوپٹہ۔ ان میں معمولی ترمیمیں ضرور ہوتی رہیں۔ لیکن اصلاً کپڑے تینوں ہی رہے۔ مغل شہزادیاں نیمہ اور پیشواز پہنتی تھیں۔ زنانہ لباس اور زیور میں نورجہاں بیگم نے نہایت قیمتی جدتیں اور اختراعیں کیں۔ ہندوؤں کا تو ذکر ہی نہیں خود مسلمانوں میں بھی نورجہاں سے پہلے زیورات اسی قسم کے بھدّے ناموزوں اور ان گھڑے ہوتے تھے۔ جیسے آج کل بعض دیہاتی ہندو عورتوں کے جسم پر دیکھے جاتے ہیں۔ دلی اور لکھنؤ کی بیگمات کے لباس کی تراش خراش اور زیوروں کی خوشنمائی اور سبکی اور نفاست تمامتر نورجہاں بیگم کی نفاست پسندی کی یادگاریں ہیں۔ ماٰثر الامرا میں لکھا ہے:

اکثر زیور و لباس و اسباب تزئین و تقطیع کہ معمول ہند است۔ اختراعی و ابداعی اوست مثل دو دامنی۔ جہت پیشواز و پنج تولیہ جہت اوڑھنی، بادلہ و کناری و عطر گلاب و چاندنی (فرش) ہمہ وضع اوست۔[۱۹]

خود جہانگیر کہا کرتا تھا کہ جب تک نورجہاں میرے گھر میں نہیں آئی میں گھر کی زیب و زینت سے واقف نہ ہوا۔[۲۰]

مسلمان عورتیں برقع بھی اوڑھتی تھیں۔ جو علی العموم سفید کپڑے کا ہوتا تھا۔ ہندو عورتوں میں چادر اوڑھنے کا رواج تھا۔ ساڑھی، چولی، انگیا، لہنگے، دوپٹے، اوڑھنیاں ملک کے مختلف حصوں میں پہنے جاتے تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی شہزادی زیب النسا نے ہندو عورتوں کی چولی اور ترکستانی بیگمات کی محرم کو ملا کر ''انگیا کرتی'' اختراع کی۔[۲۱] جو آج تک مقبول عام ہے۔ اگرچہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے مردانہ و زنانہ لباس میں کافی تغیرات واقع ہو چکے ہیں۔ لیکن مغلوں کے عہد کے کپڑے آج کل بھی بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کے جسم پر

نظر آتے ہیں۔ جس سے مسلم ثقافت کی قوت اور ہمہ گیری کا پتا چلتا ہے۔

مسلمان اور ہندو دونوں قوموں کی عورتیں سنگھار پر خاص توجہ صَرف کرتی تھیں۔ آنکھوں میں سُرمہ، مانگ میں سیندور، ابروؤں میں کاجل، ہاتھ پیروں میں حِنا، دانتوں میں مِسی اور دنداسہ، ہونٹوں کی لالی اور منہ کی خوشبو کے لیے پان۔ ترک، مغل اور پٹھان بیگمات اپنے ہاں کے بعض غازے اور سفیدے بھی استعمال کرتی تھیں۔

چوتھی فصل: خوراک

مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندو خوراک و پوشاک کے اعتبار سے بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے کھانے کے متعلق دو خصوصیتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے ان میں طعام کی لذت اور اس کی مجلسی حیثیت و اہمیت کا تصور فروغ نہ پاسکتا تھا۔ ان کی اکثریت گوشت سے پرہیز کرتی تھی۔ اور ان کے دولت مند اور متوسط الحال طبقے بھی چپاتی، پوری، کچوری، قسم قسم کی دال کھچڑی، کھیر وغیرہ ہی کو نعمت ہائے عظمیٰ سمجھتے تھے۔ سبزی ترکاری کی بھاجیوں اور سموسوں کا رواج بھی تھا۔ اور طرح طرح کی مٹھائیاں بھی شوق سے کھاتے تھے۔ دودھ، مکھن، گھی کی کمی نہ تھی۔ لسی، دہی، کھویا، ربڑی، ملائی خوب کھاتے تھے۔ مذہبی پابندیوں اور چھوت چھات کے قدیم تصورات نے انھیں ضیافت اور مہمان نوازی کے ان معیاروں سے بالکل بیگانہ رکھا تھا جو مسلمان معاشرے کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ہندوستان میں ایسے تناول خانے اور کھانے کی دکانیں بالکل نابود تھیں جن سے ہر قسم کی روٹیاں اور سالن اور پر تکلف کھانے دستیاب ہوسکتے۔ کیوں کہ ہندوؤں کے ہاں پکانے اور کھانے کے متعلق بعض قیود عائد تھیں۔ ہر گھر میں ''چوکا'' گائے کے گوبر سے لیپا جاتا۔ گھر کا ہر فرد اشنان کرنے کے بعد اس چوکے میں بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ اونچی جاتیوں کے لوگ اپنے سے مختلف جاتی کے ہاتھ سے کھانا نہ کھاسکتے تھے۔

گوشت اور خمیری روٹی

مسلمان تمام گوشت خور تھے۔ اور جات پات کے بندھنوں سے بھی کاملاً آزاد تھے۔ انھیں دوسروں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہندو عام طور پر فطیری روٹی یا چپاتی کھاتے تھے۔ لیکن مسلمان ایران و توران سے خمیری روٹی کھاتے ہوئے آئے تھے۔ چنانچہ خمیری روٹی (خصوصاً تنوری) کباب اور پلاؤ ان کی عام خوراک تھی۔ جب انھوں نے ہندوؤں کو روغنی

پوری تلتے ہوئے دیکھا تو پراٹھا ایجاد کرلیا۔ گائے، بکرے، دنبے، ہرن اور مرغ کا گوشت خمیری روٹی یا پراٹھے کے ساتھ کھاتے۔ اور مردانہ اور بہادارانہ مشاغل میں مصروف رہتے۔

پتّل اور دستر خوان

ہندو اور مسلمان دونوں فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ہندوؤں کے ہاں زیادہ تر پتّلوں کا رواج تھا۔ وہ اپنی دالیں اور بھاجیاں کھچڑیاں اور کھیریں زیادہ تر کیلے اور اروی کے یا دوسرے بڑے پتوں پر رکھ کر کھایا کرتے تھے۔ مسلمانوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ان کے ہاں دستر خوان بچھتا تھا۔ قالین یا چاندی کا فرش اس پر زیر انداز۔ زیر انداز پر تشت یا سیلاپچی۔ آدمی آفتابہ ہاتھ میں لے کر ہاتھ دھلواتا۔ اس کے بعد دستر خوان بچھایا جاتا۔ رنگ رنگ کے کھانے چنے جاتے۔ سینی، کشتی قاب، خوان، پیالے، بادیے، کاسے، رکابی، تشتری، چمچے، نمکدان سب سامان مہیا ہوتا۔ شرکائے طعام کھا چکتے تو پھر تشت سیلاپچی آفتابہ آجاتی بیسن سے ہاتھ دھوئے جاتے اور رومال سے پونچھے جاتے۔

مسلمانوں کے رنگا رنگ کھانے

سلاطین کے زمانوں میں مسلمانوں کے کھانے نسبتاً سادہ ہوتے پلاؤ اور کباب سب سے زیادہ مرغوب کھانے تھے۔ اور ان کی متعدد قسمیں تھیں ان کھانوں کی خصوصیت یہ تھی کہ محض لطافت کی غرض سے ان کو ترکیبوں کی پیچیدگی میں الجھایا نہیں جاتا تھا۔ بلکہ ان کی قوت بخشی کو قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مغلوں کے عہد میں دوسرے فنون کی طرح پخت و پز کے فن میں بھی جدید اختراعات کی گئیں۔ اور اس دور میں بڑے بڑے باکمال باورچی پیدا ہوئے۔ سادہ پلاؤ، بریانی، گلزار پلاؤ، نور پلاؤ، کوکو پلاؤ، موتی پلاؤ، چنبیلی پلاؤ، نارنج پلاؤ۔ غرض بیسیوں قسم کے پلاؤ پکتے۔ زردہ، متنجن، مزعفر، میٹھے، چاول، کھیر، فیرینی، ماقوت شیردار، روغنی روٹیاں، پراٹھے، شیرمال، کلچے، بادام کی روٹی، جبینی روٹی، بٹیری روٹی، نان جلیبی، باقر خانی اور دیگر اقسام کی روٹیاں، قورمہ، کوفے، نرگسی کوفتے، مرغ، بکرے، دنبے، ہرن کے بے شمار قسم کے کباب، تیتر، بٹیر اور بیسیوں پرندوں کے کباب۔ بے شمار مربے اور اچار۔ غرض مغلوں نے دستر خوان کو گلزار بنا دیا۔ ہزاروں روپے روز کی پُخت ہوتی تھی۔ اور بچا ہوا کھانا محل شاہی کے ملازمین و متوسلین سے لے کر خدمتگاروں اور فقیروں تک میں تقسیم ہوتا۔ اچار اور چٹنیاں ہندو مسلمان دونوں کو مرغوب تھیں۔

ہندو سرخ مرچ اور کھٹائی کے بہت شوقین تھے۔ بعد میں مسلمانوں کے کھانوں میں بھی سرخ مرچ پڑنے لگی۔ لیکن یہ شوق صرف ہندوستانی مسلمانوں ہی تک محدود رہا۔ بیرون ہند کے مسلمان اب تک سرخ مرچ سے نا آشنا ہیں۔

رفتہ رفتہ ہندوؤں کے ذوق غذا میں بھی تغیرات پیدا ہوئے اور انھوں نے کھانا پکانے کے مسلمانی طریقے اختیار کر لیے۔ گوشت کھانے والے ہندوؤں کی تعداد روز افزوں ہوتی گئی۔ اور ہندو امرا و رؤسا کے دستر خوانوں پر بھی مغل امرا کے دستر خوانوں کا گمان ہونے لگا۔ مسلمانوں کے ساتھ ربط اور اسلام کی تعلیم جمہوریت و مساوات نے آہستہ آہستہ "چوکے" اور "چھوت" وغیرہ کے عقائد و رسوم کو کمزور کر دیا۔ لیکن اس قوم کی قدامت پسندی اس قدر لاعلاج واقع ہوئی ہے کہ آج تک بھی شہروں کے سوا دیہات و مفصلات میں ہندوؤں کے گھروں کے طور طریقے وہی ہزار سال پرانے ہیں۔ بلکہ شہروں اور قصبوں میں بھی بعض گھرانے اب تک چھوا چھوت اور چوکے پر عامل اور گوشت سے محترز ہیں۔ لیکن جہاں تک مہذب، شائستہ، تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہندوؤں کا تعلق ہے۔ وہ اب ان اوہام کے قائل نہیں رہے۔

لکھنؤ کے باورچی

دہلی کے زمانہ انحطاط میں جہاں بعض دوسرے فنون کے اہل کمال نے سلاطین اودھ کی فن پروری سے استفادہ کرنے کے لیے فیض آباد اور لکھنؤ کا رخ کیا تھا۔ اسی طرح بڑے بڑے باورچی بھی وہاں ہجرت کر گئے تھے۔ پھر لکھنؤ والوں کی اپج نے اس فن میں مزید اختراعیں کیں۔ جن کا نہایت دلچسپ ذکر مولانا عبدالحلیم شرر کی کتاب "گزشتہ لکھنؤ" میں موجود ہے۔ اگرچہ مولانا بعض سنی سنائی کہانیاں بھی بے تکلف نقل کر دیتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کے بیانات صحت و استناد کے اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے مشاغل ان کے پروردہ اہل کمال کی ہنرمندیاں اور مسلم ثقافت کے بعض لطیف پہلو بچشم خود ملاحظہ کیے ہیں۔ اور اس کے علاوہ انھوں نے عمر بھر لکھنؤ میں رہ کر اس کے تمام طبقات کی تہذیب کو جو بلاشبہ ہندوستان بھر میں مسلم تہذیب و ثقافت کی آخری جلوہ فرمائی تھی۔ خود دیکھا اور برتا تھا۔ دہلی کے باورچیوں کے کمالات کا ذکر بعض کتابوں میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ لیکن شرر نے لکھنؤ کے بادشاہوں اور امیروں کے خاصے کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان

بادشاہوں اور امیروں کی توجہ زیادہ تر لذت کام و دہان پر مبذول ہو کر رہ گئی تھی۔ اور ان کے اسی شوق کی تسکین کے لیے بڑے بڑے باورچی پیدا ہوگئے تھے۔ جو ہزاروں روپے تنخواہ پاتے تھے۔ اور امرا کو ان کی ناز برداریاں کرنی پڑتی تھیں۔

فنِ رکاب داری کے کمالات

مختلف قسم کے پلاؤ، کباب، سالن، میٹھے، مربے، اچار اور روٹیاں تیار کرنے کا کام تو باورچی کرتے تھے لیکن بعض حیرت انگیز کھانوں کو تیار کر کے اور انھیں دستر خوان پر سجا کر دیکھنے والوں کو ششدر کر دینا رکاب داروں کا کام تھا۔ رکاب داری کے کمال کا ایک قصہ شرر نے لکھا ہے۔ کہ دہلی کے شہزادگان مغل میں سے مرزا خرم بخت کے فرزند مرزا آسمان قدر لکھنؤ آئے۔ واجد علی شاہ نے ان کی دعوت کی۔ دستر خوان پر ایک مربہ لا کر رکھا گیا جو صورت میں نہایت لطیف ونفیس و مرغوب تھا۔ مرزا آسمان قدر نے اس کا لقمہ اٹھایا تو چکرائے کہ وہ مربا نہ تھا بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا جس کی صورت رکاب دار نے بعینہٖ مربے کی طرح بنا دی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر انھیں ندامت ہوئی اور واجد علی شاہ خوش ہوئے کہ دہلی کے ایک معزز شہزادے کو دھوکا دیا۔

دو چار روز بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی اور واجد علی شاہ یہ خیال کر کے آئے تھے کہ مجھے ضرور دھوکا دیا جائے گا۔ مگر اس ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے۔ اس لیے کہ آسمان قدر کے باورچی شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا کہ گو دستر خوان پر صدہا الوانِ نعمت اور قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ پلاؤ تھا، زردہ تھا، بریانی تھی، قورما تھا، کباب تھے، ترکاریاں تھیں، چٹنیاں تھیں، اچار تھے، روٹیاں تھیں، پراٹھے تھے، شیرمالیں تھیں، غرض ہمہ نعمت موجود تھی۔ مگر جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھا تو شکر کا، چاول تھے تو شکر کے، اچار تھا تو شکر کا، اور روٹیاں تھیں تو شکر کی۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں، تمام برتن، دستر خوان اور سلفچی آفتابہ تک شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کر ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکے پر دھوکا کھاتے رہے۔

غالباً یہ خفت اٹھانے کے بعد واجد علی شاہ نے شہزادہ آسمان قدر سے معذرت کی ہوگی کہ میں تو اسی دودمان عالی کا فیض یافتہ ہوں۔ مجھ سے یہ سلوک کیوں؟ اور اس کے بعد شہزادے نے یہ مصنوعی دستر خوان اٹھوا کر اصلی کھانے چنوائے ہوں گے۔

مٹھائیاں

باورچیوں اور رکاب داروں کے کمالات کا تذکرہ طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان بادشاہ ہزاروں روپے روزانہ اپنے دسترخوان پر صَرف کرتے تھے۔ اور دونوں وقت ہزاروں انسان اس وسیع خوانِ نعمت سے اعلیٰ درجے کے کھانے کھاتے تھے۔ ان کے کھانے، ان کے دسترخوان اور ان کے رکاب داروں کی نفاست پسندی کا یہ عالم تھا کہ آج کل یورپ کے بڑے بڑے محلوں، شاہی تناول خانوں اور گراں قیمت ہوٹلوں کے مشہور اور نامور باورچی اور بہرے ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ روپیہ تو اب بھی بے شمار خرچ کیا جاتا ہے لیکن وہ ہنر اور سلیقہ کہاں سے آئے۔

اگرچہ ہندو مٹھائیوں کے بڑے شوقین تھے۔ لیکن صرف چند مٹھائیاں بناتے تھے جن میں کوئی خاص ہنرمندی ضرری نہ ہوتی تھی۔ مثلاً پیڑا، امرتی، رس گلا، موہن بھوگ۔ مسلمانوں نے آ کر حلوے، بالو شاہی، خرمے، نکتیاں، برفی، قلاقند، گلاب جامن، دربہشت وغیرہ رائج کیں۔ جن کے نام شاہد ہیں کہ یہ مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ جلیبی کو عربی میں زلابیہ کہتے ہیں، یہ بھی باہر ہی سے آئی ہے۔ حلوا خود عربی لفظ ہے اور حلوا ساری دنیائے اسلام میں صدیوں سے بنایا اور کھایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی بیسیوں قسمیں عام ہوئیں۔ حلوا سوہن کی قسمیں جوزی، حبشی، دودھیا اور پپڑی ہیں۔ جنوبی ہند میں متعدد قسم کے حلوے اسی زمانے سے رائج ہیں۔ جب پہلی صدی ہجری میں عرب وہاں آئے تھے۔ سندھی حلوہ بھی جسے آج کل کراچی کا حلوہ کہتے ہیں، عربوں کی یادگار ہے۔ خود لفظ حلوائی پکار پکار کر اعلان کر رہا ہے کہ مجھے یہ عزت مسلمانوں نے بخشی ہے۔ ورنہ ہندو تو کسی دوسرے کے ہاتھ کی بنی ہوئی مٹھائی کھا نہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں اس پیشے کا نام کیونکر ہوسکتا تھا۔

آب دار خانہ

باورچی خانے کے ساتھ آب دار خانہ بھی سلاطین و امرا کے گھروں اور کمپوں کا جزو لاینفک تھا۔ جس میں ان کے پینے کے لیے پاکیزہ اور مقطر اور ٹھنڈا پانی ہر وقت مہیا رہتا تھا۔ پانی کی تقطیر کا اہتمام ریت اور کوئلے سے کیا جاتا۔ یعنی اوپر تلے کورے گھڑے رکھے جاتے۔ پانی پہلے اس گھڑے سے گزرتا جو آدھا ریت سے بھرا ہوتا۔ یہاں سے گزر کر کوئلے والے گھڑے

میں گرتا۔ اور اس کے بعد نیچے خالی گھڑے میں قطرہ قطرہ ہو کر صاف ستھری صافی میں سے چھن کر جمع ہو جاتا۔ نازک اور نفیس آبخورے دھرے رہتے۔ گھڑوں اور آبخوروں پر سرخ کپڑا چڑھایا جاتا اور تر رکھا جاتا۔ گرم ہوا لگنے سے گھڑوں کا پانی خنک ہو جاتا۔

پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خاص اہتمام کیے جاتے۔ ناندوں میں قلمی شورہ اور نمک اور پانی ڈال کر جست کی نازک نازک صراحیاں اس میں پھرائی جاتیں۔ اس ترکیب سے پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہو جاتا۔ اس کے علاوہ برف پہاڑوں سے بھی منگائی جاتی۔ اور زمین کے نیچے کھتوں میں محفوظ رکھی جاتی۔ اس میں بھی صراحیاں جھلی جاتیں۔ برف غریبوں کو بہت کم مل سکتی تھی۔ اس لیے کہ پہاڑوں سے آنے کی وجہ سے گراں ہو جاتی تھی۔ لیکن قلمی شورے والا نسخہ ہر غریب امیر استعمال کر لیتا تھا۔ صراحی اور آبخورہ کے لفظ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ تکلّفات بھی مسلمانوں ہی کے لائے ہوئے تھے۔

بیسیوں قسم کے شربت و سکنجبین بھی عام تھے اور اہل ہند اس سے قبل ان مشروبات سے بے خبر تھے۔ طبابت وعطاری نے فن شربت سازی کو فروغ دیا تھا۔ اور بہت سے شربت علاج امراض کے علاوہ مفرحات کا کام بھی دیتے تھے۔ کیوڑے، گلاب اور بیدمشک کے عرق اس پر مستزاد تھے۔

پان اور حقہ

ہندو ہزارہا سال سے پان کھاتے تھے۔ لیکن ان میں کوئی نفاست پیدا نہ کر سکے تھے۔ ہندوستان کے جن حصوں میں مسلم ثقافت و شائستگی کا اثر کم پہنچا ہے۔ ان میں آج کل بھی دیکھیے تو پان بنانے کا طریقہ بالکل ابتدائی ہے۔ بڑا سا پتا لیا، اس پر کتھا چونا تھوپا، چھالیا کے چند ٹکڑے ڈالے اور اسے کھا کر جگہ جگہ پیک تھوکتے پھرے۔ مسلمانوں نے اس شغل میں بھی نفاستیں پیدا کیں۔ چھوٹی چھوٹی گلوریاں ہیں۔ ان میں معطّر، مصفّی اور پاکیزہ کتھا چونا لگا ہوا ہے۔ الائچی کے چند دانے بھی شامل ہیں۔ گلوری چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ہے اس کے علاوہ پاندان، خاصدان، مقابہ، اگالدان بھی مسلمانوں ہی کی اختراعیں ہیں۔ پھر زردہ، قوام، مشکبو گولیاں بھی۔

تمباکو مغلوں کے عہد میں آیا۔ اس کے بعد ہندوؤں نے چلم اور ناریل میں پینا شروع کر دیا۔ لیکن مسلمانوں نے حقہ نیچواں، سٹک، فتح پیچ، مدریہ، ہردم تازہ، فرشی وغیرہ بنائے۔ چلم پر چنبر کی ٹوپی

رکھی۔ مُہنال اور زنجیروں کا اضافہ کیا۔ گرمیوں میں ان کو خس سے ٹھنڈا کیا۔ عطریات سے بسایا۔ خوشبودار خمیرے تیار کیے۔ غرض ایک ایسی چیز کو جو آغاز کار میں بادشاہوں اور امیروں کے نزدیک نامقبول تھی نہایت لطیف دلآویز بنا دیا۔ ملک میں تنبولیوں کی ہزاروں دکانیں کھل گئیں۔ جن میں سے بعض نے نفاست کے ساتھ پان بنانے میں بہت ناموری حاصل کی۔

حواشی

[۱] اس فصل میں، مَیں نے بعض اقتباسات محمد حسین آزاد کی ''دربارِ اکبری'' سے نقل کیے ہیں۔ اس لیے کہ اس ادیب بے ہمتا نے ترجمے کے علاوہ حسنِ بیان کا حق ادا کر دیا ہے۔

[۲] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ۱۹۳۵ء، جلد اوّل، ۱۶۵۔

[۳] آئینِ اکبری۔

[۴] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ۱۶۵۔

[۵] توزکِ جہانگیری، ۳۰۱۔ آئینِ اکبری، ۹۴۔

[۶] توزکِ جہانگیری۔

[۷] توزکِ جہانگیری، ۱۳۳۔

[۸] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر۔

[۹] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر۔

[۱۰] توزکِ جہانگیری۔

[۱۱] آئینِ اکبری۔

[۱۲] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر۔

[۱۳] آئینِ اکبری۔

[۱۴] خافی خاں، ۲۶۹۔

[۱۵] ماخوذ از آئینِ اکبری، جلد ۳۔

[۱۶] سفرنامہ ابن بطوطہ۔

[۱۷] باربوسہ، جلد اوّل، ۱۴۱-۱۴۲ و ۱۵۴-۱۵۵۔

[۱۸] آئینِ اکبری، ابوالفضل۔

[۱۹] مآثر الامرا۔

[۲۰] توزکِ جہانگیری، جلد اوّل، ۱۳۔

[۲۱] دیوانِ زیب النساء، ۱۴۔

ساتواں باب

مذاہب ہنود اور مسلمان

پہلی فصل: رواداری

حقائق کے اعتبار سے یہ مسئلہ بالکل خارج از بحث ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے مسلم فاتحین، سلاطین، امرا اور حکام روادار تھے یا نہ تھے۔ کیوں کہ کالے کوسوں سے چل کر آئے ہوئے جن مٹھی بھر مسلمانوں نے اس ملک پر اپنی حکومتیں قائم کیں اور ہزار سال تک ان کو کامیابی سے چلاتے رہے ان کے لیے رواداری کے سوا اور کوئی طریق کار ہی نہ تھا۔ اور ناروا داری ان کے لیے ممکن ہی نہ تھی۔ بلاشبہ مسلمان متحد اور قوی تھے اور ان کے مقابلے میں ہندو بے شمار حصوں، طبقوں اور شاخوں میں بٹ کر اپنی قوت کھو چکے تھے لیکن اس کے باوجود مقابلہ ہزاروں اور کروڑوں کا تھا۔ اگر چند ہزار غیر ملکی کروڑوں ملکی باشندوں کے مذہب کی رعایت نہ کرتے۔ انہیں عام انسانی حقوق سے محروم کر دیتے اور ان کو ملک کے نظم ونسق میں غالب حصہ نہ دیتے تو ان کی حکومت چند سال بھی قائم نہ رہتی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا طویل استحکام ہی اس امر کا روشن ثبوت ہے۔ کہ مسلمان ارباب حکومت اپنی رعایا کی نظروں میں قدر وعزت رکھتے تھے۔ اور وہی قدر و عزت تھی جس کی وجہ سے ہندو ہمیشہ اپنے مسلمان حکمرانوں کے پسینے کی جگہ خون بہانے کو موجود رہتے تھے۔

پوجا کی آزادی

مسلمان حکمرانوں کی حکومت غیر مسلموں کے لیے قطعی طور پر سیکولر (غیر مذہبی) حکومت تھی۔ جب تک فرامین شاہی کے آگے ان کا سرِ تسلیم خم رہتا اور وہ سلطنت کے قوانین وضوابط کی وفادارانہ تعمیل کرتے رہے۔ وہ ہر قسم کے خطرے سے محفوظ اور ہر اعتبار سے مسرور و مطمئن رہتے۔

یہی کیفیت مسلم رعایا کی تھی۔اور بے فکری اور اطمینان کی یہی شرط ان پر بھی عائد ہوتی تھی۔ بادشاہ اور اس کے حکام ہندوؤں کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت کے روادار نہ تھے۔ اسلام شرک اور بت پرستی اور اوہام کا شدید مخالف تھا۔لیکن پایۂ تخت میں بھی اور صوبائی مرکزوں میں بھی بتوں کی پوجا کھلم کھلا کی جاتی تھی۔ ہندو دھرم کی رسوم پر پوری طرح عمل کیا جاتا۔ ہندو اپنے مندروں اور مورتیوں کی آراستگی اور پوجا پاٹ میں اپنے دھرم کے سب تقاضوں کو پورا کرتے۔ اور تیوہاروں کے موقع پر ناچتے، گاتے اور باجے بجاتے ہوئے جلوس بھی نکالتے تھے۔ بت خانوں کے ناقوسوں اور گھنٹوں کی آوازیں سلاطین کے عظیم الشان محلوں کے اندر تک سنائی دیتی تھی۔[۱] جب ہندوؤں میں بھگتی تحریک شروع ہوئی تو خود مسلمان بادشاہوں نے اس کی سرپرستی اور امداد کی۔ اور ہندو دھرم کے پرچارکوں اور اپدیشکوں کو تبلیغ مذہب کے پورے پورے حقوق عطا کیے۔[۲]

ذرا یہ تماشا ملاحظہ ہو کہ ہندو دھرم اور ہندو معاشرت کی حیثیت و بدستور علیحدہ اور مستقل اور منقطع رہی۔ لیکن مسلمان ملیچھ قرار دیئے گئے۔ یعنی اگر کسی برہمن یا اونچی ذات کے کسی اور ہندو سے مسلمان کا دامن بھی چھو جائے تو وہ ہندو بھرشٹ ہو جائے گا۔ مسلمانوں نے اپنی صدیوں کی حکومت کے دوران میں یہ صورت حال صبر اور رواداری سے برداشت کی۔ اس کی مثال دنیا بھر کی تاریخ میں نایاب ہے۔

مسلمان فاتحوں اور بادشاہوں پر مندروں کے ڈھانے اور جزیہ لگانے کے الزامات مخالفین کی طرف سے عام طور پر عائد کیے جاتے ہیں۔ ہم مندروں کے متعلق قطعی طور پر ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کو کسی مسلمان فاتح نے کبھی نہیں چھیڑا۔ بلاشبہ بعض جوشیلوں سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام عبادت گاہوں کو ڈھانے کا نہ حکم دیتا ہے۔ نہ اس کا روا رکھتا ہے۔ بلکہ واضح طور پر مسلمانوں کو اس سے منع کرتا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے سیاسی وجوہ سے یا بت پرستی کے خلاف شدید جذبۂ نفرت کے ماتحت کسی مندر کو نقصان پہنچایا تو اسلام اس کا ذمہ دار نہیں ہے اور پھر اس قسم کے واقعات ہزار سال کی مدت میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ جنگ کی حالت میں اس قسم کے تجاوزات تو آج کل کی مہذب اور ترقی یافتہ قوموں سے بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔ اگر آج سے ہزار سال قبل جنگ کے جوش و خروش میں کسی سے ایسی حرکت ہوگئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس ملک میں مسلمان کے داخلہ اور اقتدار کو مورتیوں اور مندروں

کی تباہی اور بزور شمشیر اسلام پھیلانے کا ایک مسلسل ''جہاد'' قرار دے دیا جائے۔

سر وولزلی ہیگ لکھتے ہیں کہ: ''مسلم مؤرخین کی بلند بانگ انشا پردازی سے یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کا ابتدائی نفوذ و تسلط بت پرستی کے استیصال اور اسلام کی اشاعت کا ایک طویل جہاد تھا۔ ہمارے پاس اس قسم کے ثبوت موجود ہیں کہ ایسا ہرگز نہ تھا۔[۳]

مندر اور فاتحین

مندروں کے متعلق ہم اس سے پیشتر بھی کہیں لکھ چکے ہیں کہ بعض مسلمان حملہ آوروں نے بعض مندروں پر اس لیے حملے کیے کہ ہندوؤں نے اپنی ان عبادت گاہوں کو محفوظ مقامات سمجھ کر ان میں بے اندازہ دولت جمع کر رکھی تھی جس کو وہ مسلمانوں کے خلاف صرف کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ ان حملہ آوروں کے متعلق یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے دولت کی حرص سے مندروں کو توڑا۔ لیکن یہ کہنا بالکل زیادتی ہے کہ کوئی مذہبی جذبہ ان کا محرک تھا۔ کیوں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں مندر اور بت خانے اس وقت بھی محفوظ رہے۔ اور مسلمانوں کی پوری حکومت کے دوران میں بھی ان کو کسی نے ہاتھ نہ لگایا۔ حالانکہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے شریعت پرور بادشاہ کی حکومت کابل سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔

مندروں کا ملبہ

اگر بعض قدیم مسجدوں کی تعمیر میں مندروں کے ملبے کے استعمال کا سراغ ملتا ہے تو اس کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں۔ بعض مندر جنگ و پیکار کے ہنگامے میں برباد و منہدم ہو گئے مسلمانوں کو مسجدوں کی ضرورت تھی۔ انھوں نے انہی مندروں کا ملبہ استعمال کر لیا۔ بعض مندروں کو ہندو خود چھوڑ گئے۔ یا آس پاس کی آبادی مسلمان ہو گئی۔ اور اس نے اپنے پرانے معبد ہی میں کسی قدر ترمیم کر کے اس کو مسجد بنا لیا۔ اگر بعض قدیم مسجدوں کا اسلوب مندروں سے ملتا جلتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نومسلموں نے اپنی پسند کے مطابق مسجد تعمیر کر لی۔ جس میں ان کا اپنا ذوق تعمیر جھلک رہا ہے۔

جزیہ

جزیہ کے متعلق گزشتہ پچاس برس کے دوران میں بے شمار مسلمان مصنفین و مؤرخین

توضیحات کر چکے ہیں۔ اور مستند ذرائع سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ ٹیکس نہ ہندوؤں پر حتی کی نیت سے عائد کیا گیا تھا۔ نہ انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا مقصود تھا۔ بلکہ تندرست اور کمانے والے غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے ان سے ایک چھوٹا سا محصول لیا جاتا تھا جس کی مقدار آٹھ آنے ماہانہ فی کس سے زیادہ نہ تھی اور اس کے بدلے میں ان کو فوجی خدمت معاف تھی۔ عورتیں، بچے، مجنون، اپاہج، بیمار، غلام، فوجی ملازم اور نادار سب اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ اس کا مذہبی تعصب سے کوئی دور کا واسطہ نہ تھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ہندوؤں کے پرچارک، مندروں کے پجاری اور ان کے تمام دھارمک پیشوا اور سادھو بھی جزیہ سے آزاد تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس کے مقابلے میں مسلمانوں پر زکوٰۃ عائد تھی۔ یعنی اگر لاکھ روپیہ رکھنے والا ہندو سال بھر کے بعد چھ روپے بطور جزیہ ادا کرتا تھا تو اسی پونجی کے مالک مسلمان کو ڈھائی ہزار روپے بیت المال اسلامی میں داخل کرنے پڑتے تھے۔

خواہ مخواہ عیب چینی

بعض عیب چین لوگ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی تاریخ سے بعض ایسے واقعات ڈھونڈ نکالیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمان اپنی ہندو رعایا پر تشدد روا رکھتے تھے لیکن اس کوشش اور تلاش میں انھیں کامیابی نہیں ہوتی اور وہ بعض مؤرخوں کی تحریروں کو توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا بنا لیتے ہیں۔ مثلاً برنی کی تاریخ فیروز شاہی کے بعض فقروں سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ علاء الدین خلجی نے ہندوؤں کو ان کے بعض حقوق سے محروم کر دیا اور ان پر مالیہ کی شرح بڑھا دی۔ حالانکہ اصل حالات یہ تھے کہ علاء الدین خلجی نہایت بلند حوصلہ، ذی اقتدار اور زور دار بادشاہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ منگولوں کے حملوں سے ملک بھر کا کچومر نکل چکا ہے اور اقتصادی حالت خطرناک حد تک خراب ہو چکی ہے تو اس نے وہ تمام جاگیریں، اوقاف اور انعام واپس لے لیے جو شاہان ماسبق نے مسلمانوں کو دے رکھے تھے کیونکہ یہ لوگ خزانہ عامرہ کے لیے مسلسل نقصان کا باعث ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے بعد اس نے ہندوؤں کی طرف توجہ مبذول کی۔ دیہاتی زندگی میں اقتدار تین قسم کے زمینداروں اور اہلکاروں کو حاصل تھا۔ جن کو مقدم، خوت اور بلاہر کہتے تھے۔ انھوں نے سلطنت سے قطعات اراضی حاصل کر رکھے تھے۔ ایک مقررہ لگان خزانے میں داخل کر دیا کرتے تھے۔ اور کھیتوں اور

چراگاہوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس کے علاوہ آج کل کے نمبرداروں کی طرح سرکاری مالیہ کی تحصیل کرتے تھے اور اس میں سے ایک مقررہ ''پنچوترا'' وضع کرلیا کرتے تھے چوں کہ یہ لوگ مقامی حالات سے خوب واقف اور دیہاتی معاشرے پر بہت حاوی تھے۔ اس لیے ایک طرف سلطنت کے واجبات کا خاصہ حصہ خورد برد کر جاتے تھے اور دوسری طرف کسانوں کو تنگ کر کے خود مزے اڑاتے تھے۔ یہاں تک کہ سلطان علاء الدین خلجی کو یہ شکایت کرنی پڑی کہ ''خوت اور مقدم اعلیٰ درجے کے گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ لباس فاخرہ پہنتے ہیں۔ ایرانی کمانیں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے دو ہی شغل ہیں، شکار اور باہم پیکار، نہ وہ خراج ادا کرتے ہیں، نہ جزیہ، نہ سکونت کا ٹیکس دیتے ہیں، نہ چرائی کا محصول اور فراہمی مالیہ پر اپنے حبوب ضرور وصول کر لیتے ہیں۔ مے نوشی اور عیش و عشرت میں مصروف رہتے ہیں۔ دیوان میں طلب کرنے سے بھی حاضر نہیں ہوتے اور حکام مالگزاری کی قطعاً پروانہیں کرتے۔[۴] اس کے بعد سلطان نے خوتوں اور مقدموں کو اس بلند مقام سے گرا کر ان کے ''حقوقِ خوتی'' منسوخ کر دیئے۔ آئندہ مالیہ کی فراہمی کے لیے دیوان مالگزاری کے نائب مقرر کر دیئے۔ اس کے علاوہ فرمان نافذ کیا کہ اراضی پر اس کی وسعت کے تناسب سے مالیہ عائد کیا جائے اور طاقتوروں کا بار کمزوروں پر نہ ڈالا جائے۔ ان انقلابی احکام سے دیہاتی معاشرے میں ہل چل مچ گئی۔ اور خوت اور مقدم اپنے تمام ناجائز مفادات سے محروم ہو کر سیدھے ہوئے اور چونکہ یہ قریب قریب سبھی ہندو تھے۔ اس لیے بعض ہندو مؤرخین کو علاء الدین خلجی پر تشدد کا الزام عائد کرنے کا موقع مل گیا۔ حالاں کہ سلطان اس سے قبل ہزاروں مسلمان جاگیرداروں اور انعام داروں کو ان کے مقبوضات سے محروم کر چکا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ جو ہندو براہِ راست سلطان کے محکوم تھے۔ ان سے جزیہ بھی وصول نہ کیا جاتا تھا۔ یہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ علاء الدین خلجی کی اصلاحات ملک کے سود و بہبود کے لیے تھیں۔ ان میں مذہبی تعصب کا شائبہ تک نہ تھا۔

علاء الدین خلجی کی یہ سختی ملکی خزانے کی معموری اور رعایا کی خوشحالی کی غرض سے تھی۔ پھر یہ بھی دنیا جانتی ہے کہ اس نے منڈیوں کے نرخ باندھ کر اور کاروبار تجارت کو منظم کر کے عوام کو اس قدر مطمئن اور خوشحال بنا دیا تھا کہ وہ رات دن اس کو دعائیں دیتے تھے اور یہ عوام پچانوے فی صدی سے بھی زیادہ ہندو تھے۔

محمد تغلق اور ہندو

بعد کے زمانے میں حالات بہتر ہو گئے۔ اور سلطان علاء الدین خلجی کی حکمت عملی بدل دی گئی۔ چنانچہ محمد بن تغلق کے وقت جو کیفیت تھی وہ اس کے مخالف ضیاء الدین برنی کی زبان سے سنیے:

''کفار و مشرکین خارجی اور ذمی سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا انھیں مراتب جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ اور انھیں طبل وعلم مکلّل بہ جواہر عطا کیے جاتے ہیں۔ خلعت ہائے کمخواب اور اسپ ہائے مزین بخشے جاتے ہیں اور ان کو والی اور حاکم مقرر کیا جاتا ہے۔''

پایہ تخت کے ہندو باشندوں کے متعلق لکھتا ہے:

یہ لوگ قصر فلک نما تعمیر کرتے ہیں۔ زربفت و کمخواب کا لباس پہنتے ہیں۔ طلائی و نقرئی سازو یراق کے عرب گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو لاکھوں نشان ہائے عظمت سے مزیّن کرتے ہیں۔ عیش و آسائش سے بسر کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو نوکر رکھتے ہیں جو ان کی سواری کے آگے آگے دوڑتے ہیں۔ غریب مسلمان ان سے بھیک مانگتے ہیں اور ان کے محلوں کے دروازوں پر خیرات لینے کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ سلطنت کے دارالخلافہ میں جس کی بلندی پر اسلام کے قصر رفیع کی عظمت کا مدار ہے۔ یہ لوگ رائے، رانا، ٹھاکر، ساہ، مہتہ اور پنڈت جیسے القاب سے پکارے جاتے ہیں۔[۵]

سکندر لودھی

اگر کسی بادشاہ یا امیر سے کسی وقت کسی غلط میلان کا اظہار ہوتا تو علماء اسلام اس کو اسلامی رواداری کا سبق سکھانے میں تامل نہ کرتے۔ مثلاً سکندر لودھی نے شہزادگی کے ایام میں سنا تھا کہ تھانیسر میں ایک تالاب ہے جس کو ہندو متبرک سمجھتے ہیں۔ اور اس میں غسل کرنا باعث نجاتِ ابدی تصور کرتے ہیں۔ وہاں ایک مندر بھی ہے جس میں بتوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ سکندر نے علماء سے پوچھا کہ آیا میں اس شرک و کفر کے مرکز کو برباد کر دوں؟ علماء نے کہا:

بت خانہ ہائے قدیم کو ویران کرنا جائز نہیں ہے۔ اور ہندوؤں کو تالاب میں نہانے سے بھی کوئی منع نہیں کر سکتا۔

سکندر لودھی نے طیش میں آ کر قبضۂ خنجر پر ہاتھ رکھا اور کہا تم کفار کی جانب داری

کرتے ہو؟

ایک عالم دین نے آگے بڑھ کر کہا:

ہم کفار کی نہیں بلکہ حق کی جانب داری کرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہی ہے اور تعلیمِ اسلام کی اشاعت میں اظہارِ حق سے ہمیں کوئی طاقت روک نہیں رکھتی۔

شہزادہ لاجواب ہوکر خاموش ہوگیا۔[۶]

شیر شاہ سوری

شیر شاہ سوری کی رواداری تمام سلاطین سے بڑھ کر تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''بادشاہ کو رعایا کی جان و مال کی حفاظت کا فرض ہر وقت ادا کرنا چاہیے۔ عوام کے تمام طبقات کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرنا چاہیے اور تمام حکام سلطنت کو حکم دینا چاہیے کہ وہ اپنے دائرہ اقتدار میں ظلم و تشدد سے قطعی طور پر اجتناب کریں۔[۷] شیر شاہ نے ہندوؤں کو کاروبار حکومت میں بھی فیاضانہ حصہ عطا کیا۔ اور سرکاری سراؤں اور شفا خانوں میں ان کے قیام، طعام اور علاج کے لیے مخصوص انتظامات کیے۔ ایشوری پرشاد نے لکھا ہے کہ

''جزیہ تو معاف نہیں کیا گیا لیکن ہندوؤں کے ساتھ انصاف اور رواداری کا سلوک کیا جاتا تھا۔ ہندو رعایا میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے سلطان نے ان کو اوقاف عطا کیے اور ان کے انتظام کا بھی پورا اختیار عطا کیا۔ یہی وہ فیاضانہ اور مفید رویّہ تھا جس کی وجہ سے سلطان کی پوری رعایا بلالحاظ مذہب و ملت اس پر فریفتہ تھی۔[۸]

وصیت نامہ بابر

تاجدارانِ مغل کی رواداری کسی ثبوت کی محتاج نہیں کیونکہ اکثر ہندو مؤرخین ان کے عدل و انصاف اور بے تعصّبی کے ثنا خواں ہیں۔ بابر نے ہمایوں کے نام جو وصیت نامہ لکھا۔ وہ ریاست بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں بجنسہٖ موجود ہے۔ اور سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے ۱۹۲۲ء میں یہ دستاویز پرنس آف ویلز کو دکھائی تھی۔ وصیّت نامہ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''وصیت نامِ مخفی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی بنام شاہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں، اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ یہ وصیّت نامہ سلطنت کی بنیاد کو پختہ کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔

اے فرزند! ہندوستان کی مملکت میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس ملک کی بادشاہت میرے حوالے کی۔ پس مناسب ہے کہ مذہبی تعصب سے دل کو صاف رکھو۔ ہر فرقے کے مذہبی خیالات کے مطابق عدل و انصاف کرو، خاص کر گائے کی قربانی سے پرہیز کرو۔ کیوں کہ اہلِ ہند کے دلوں کو قابو میں لانے کا یہی نسخہ ہے۔ اور اس ملک کے لوگ شاہی مہربانی کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ علاوہ بریں مختلف مذاہب کے جو معبد اور مندر تمھاری سلطنت میں ہیں ان سے کسی کو برباد نہ کرو۔ بلکہ پورے عدل وانصاف سے حکومت کرو۔ کیوں کہ بادشاہ کا استحکام رعیت پر اور رعایا کا امن و اطمینان سلطنت کی مضبوطی پر منحصر ہے۔ اسلام کی ترقی ظلم کی تلوار سے نہیں بلکہ احسان سے کرنی چاہیے۔ سنیوں اور شیعوں کے جھگڑوں سے بھی چشم پوشی کرو۔ مختلف مذاہب کے افراد رعایا کو سلطنت کے عناصر اربعہ سمجھ کر ان کی حفاظت کرتے رہو۔ تاکہ سلطنت کا جسم امراض سے محفوظ رہے۔ بہر حال تم حضرت امیر تیمور صاحبِ قرآن کے کارناموں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بادشاہت کے فرائض انجام دیتے رہو۔

گائے کا گوشت

شہنشاہ ہمایوں جب کابل سے مراجعت پر پھر صف آرا ہوا۔ تو اس کا بھائی شہزادہ کامران اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر پنجاب سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد سراج خان والی نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ قلعہ میں تشریف لے چلیے۔ ہمایوں قلعہ میں آکر دیوان خانے میں بیٹھا۔ رات کا وقت تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ رقیہ بیگم کو پیغام بھجوایا کہ کچھ کھانے کا انتظام کیا جائے۔ بیگم نے گائے کے گوشت کی یخنی اور گائے کے کباب خاصہ بردار کے ہاتھ دیوان خانے میں بھجوا دیئے۔ جونہی بادشاہ نے لقمہ اٹھایا۔ اسے معلوم ہوا کہ یخنی اور کباب گائے کے ہیں فوراً لقمہ ہاتھ سے گرا دیا۔ اور کہا:

"بدنصیب کامران۔ تیری تباہی کا یہی باعث ہے کہ تو لذت طعام کے لیے گائیوں کو ہلاک کرتا رہا ہے۔ فرزندانِ بابر کے لیے گائے کے گوشت سے پرہیز لازم ہے۔ ہم چاروں بھائیوں کو وہی کرنا چاہیے جو ہمارے والد بزرگوار کرتے رہے ہیں۔ جب بھیڑیں اور بکریاں مل سکتی ہیں تو اس جانور کو کیوں ضائع کرتے ہو۔" [۹]

اس سے معلوم ہوا کہ شاہانِ مغل صرف حکمت عملی کے طور پر لحم بقر سے پرہیز نہ کرتے

تھے بلکہ انھوں نے اپنی رعایا سے ہم رنگ ہونے کے لیے اس پرہیز کو اپنے معمولات زندگی میں شامل کرلیا تھا اور یہ رواداری کی انتہا ہے۔

سلطان زین العابدین

کشمیر کا سلطان زین العابدین جس کو کشمیری بڈ شاہ کہتے ہیں۔ جلال الدین اکبر سے کوئی پچاسی سال پہلے گزرا ہے۔ اس بادشاہ کی رعایا پروری، بے تعصبی اور مذہبی رواداری اکبر سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے زمانے میں ہندوؤں کو اپنی رسوم مذہبی کی بجا آوری کے لیے جو سہولتیں حاصل تھیں ان کا تذکرہ ہندو تاریخوں میں بھی تفصیل سے موجود ہے۔ ہندوؤں کے میلوں، تیوہاروں اور تیرتھوں پر سلطان خود حاضر ہوتا۔ تاکہ کسی حاکم یا اہلکار کو ہندوؤں کے مذہبی امور میں مداخلت کی جرأت نہ ہو۔ اس نے برہمنوں کے بیٹوں کو عربی فارسی کی تعلیم دلا کر بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز کیا۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں جو معدوم ہوگئی تھیں۔ ہندوستان سے منگوا کر کشمیر میں تقسیم کیں۔ ویدوں، شاستروں، پرانوں کے ترجمے کرائے۔ ایک ہندو برہمن کو وزیر تعلیم مقرر کیا۔ مندروں کے مصارف کے لیے جاگیریں عطا کیں جن مندروں کو جنگ میں نقصان پہنچا تھا انھیں از سر نو تعمیر کرایا۔ مندر زشتی شور (کوہ سلیمان) کی مرمت کرائی۔ اس میں چار نئے حجری ستون نصب کیے اور سقف اور گنبد کو بھی استوار کرادیا۔ ذبح گاؤ کی عام ممانعت کردی۔ غرض اس بادشاہ نے ہندوؤں کی پرورش اور تالیف قلوب پر اس قدر گہری توجہ مبذول کی کہ بعض اوقات مسلمانوں کو بے توجہی کی شکایت ہونے لگی۔ پھر لطف یہ ہے کہ سلطان زین العابدین خود نہایت راسخ الاعتقاد مسلمان تھا۔ اکبر کی طرح اس کو مذہبی رواداری نے ملحد نہیں بنا دیا تھا۔ تاریخ کشمیر کی جتنی کتابیں ہندوؤں کے قلم سے نکلی ہیں سب کی سب بڈ شاہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔[۱۰]

جہانگیر اور جدروپ

مسلمان بادشاہ اگر کسی ہندو جوگی یا نیک و پارسا آدمی کا سراغ پاتے تو اس کی خدمت میں بھی عقیدت مندانہ حاضر ہوتے۔ تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں سے صرف ایک ملاحظہ ہو۔ شہنشاہ جہانگیر نے اجین کے مشہور جوگی گسائیں جدروپ کا یوں ذکر کیا ہے:

''میں گسائیں جدروپ کے نام سے کئی سال سے واقف تھا۔ وہ آبادی سے دور ایک گوشۂ صحرا میں رہتا تھا۔ مجھے اس سے ملاقات کرنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میں کشتی سے اتر کر اور شاہانہ تخیل کو خیر باد کہہ کر پون کوس تک پاپیادہ اس کی ملاقات کو گیا۔ وہ ایک غار میں رہتا تھا۔ جس کا طول ساڑھے پانچ گز اور عرض ساڑھے تین گز تھا۔ اس کے بدن پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ اس کے سوا اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ غار کے پاس ہی ایک تالاب تھا جس میں وہ دن میں دو مرتبہ نہاتا تھا۔ اس کی خوراک پانچ لقموں سے زیادہ نہ تھی۔ وہ نہ شہرت کا خواہاں تھا اور نہ اس کو کسی سے ملاقات کی خواہش تھی۔ لیکن لوگ جوق در جوق اس کے درشنوں کو آتے تھے۔ میں چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا۔ وہ دانش سے معمور تھا۔ اور علم بیدانت سے جو تصوف ہے۔ خوب ماہر تھا۔ اس کی باتوں سے میرے قلب پر بڑا اثر ہوا۔

شہنشاہ جہانگیر ایک دفعہ پھر گسائیں جدروپ سے ملا۔ چنانچہ لکھتا ہے: میں سیر کشمیر کے لیے آگرہ سے روانہ ہوا جب متھرا پہنچا تو گسائیں جدروپ کے وہاں موجود ہونے کی خبر مجھے ملی۔ میں بے تکلف اس کے پاس گیا۔ حق جل و علا نے اس کو عجیب توفیق عنایت کی ہے فہم عالی اور فطرت بلند کے ساتھ عقل خداداد کا خزانہ اس کے پاس ہے۔ مال و طمع دنیا سے بے پروا اور اپنے حال میں مستغنی اور بے نیاز ہے۔ میں نے دیکھا کہ اسباب دنیا سے آدھ گز لنگوٹی اور ایک مٹی کے برتن کے سوا جس سے وہ پانی پیتا تھا۔ اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ جب میں اس سے رخصت ہوا تو فی الحقیقت اس کی جدائی میرے دل کو نہایت ناگوار گزری۔[۱۱]

عالمگیر

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر چونکہ پابند مذہب اور متشرع مسلمان تھا۔ اس لیے مخالفین نے اس کو تعصب کے الزامات سے داغ دار بنانے کی بے حد کوشش کی ہے۔ حالاں کہ اس کی حکمت عملی بھی دوسرے شاہانِ مغل کی طرح روادارنہ و مصنفانہ تھی۔ بلکہ دین اسلام کے اصول اساسی پر مبنی ہونے کی وجہ سے زیادہ استوار اور قابل اعتماد تھی۔ اس پر مندروں کو گرانے کا الزام قطعی طور پر غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے متعدد فرامین اس کی اسلامی رواداری کے شاہد عادل ہیں۔ مثلاً ۱۹۱۱ء میں مشہور مستشرق لیفٹیننٹ کرنل فلٹ کو بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں علمی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں انھیں عالمگیر کے ایک فرمان کی عکسی نقل ہاتھ لگی۔ یہ فرمان ابوالحسن حاکم

بنارس کے نام تھا۔ کرنل فلٹ نے تلاش جاری رکھی۔ بالآخر انھیں خان بہادر شیخ محمد طیب کوتوال شہر کی امداد سے اصل فرمان دیکھنے کا موقع بھی مل گیا۔ جس کی پشت پر شہزادہ محمد سلطان کی مہر بھی ثبت تھی۔ فلٹ نے یہ فرمان انگلستان کے اخباروں میں چھپوا دیا۔ اس فرمان عالمگیری کا خلاصہ ترجمہ درج ذیل ہے:

"شرع شریف ملت حنیف کی رو سے نئے مندر نہیں بنائے جاسکتے لیکن پرانے مندروں کو توڑنا بھی جائز نہیں ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ بعض عمال سرکاری از راہ جبر و تعدی قصبہ بنارس اور نواحی مقامات کے ہندوؤں اور برہمنوں پر جو قدیم بت خانوں کے پروہت ہیں۔ تشدد کرتے ہیں اور انھیں پروہتائی سے علیحدہ کر دینا چاہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ بے چارے پریشان ہوکر مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لیے تم (ابوالحسن حاکم بنارس) کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس فرمان کے پہنچتے ہی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص تمہارے علاقے کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں پر جبر و تشدد نہ کر سکے۔ اور ان کی تشویش کا باعث نہ ہو۔ تاکہ یہ گروہ بدستور سابق اپنے اپنے مقامات و مناصب پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولت خداداد کے حق میں مصروفِ دعا رہے۔ اس باب میں مزید تاکید جانو (۱۵۔ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۹ھ)[۱۲]

۱۰؍رجب ۱۰۷۰ھ کے عالمگیری فرمان میں پالیتانہ (جس کو شطرنجے بھی کہتے ہیں) کے مندر، گاؤں اور پہاڑی پر احمد آباد کے شانتی داس جوہری کے قبضے کی تصدیق کی گئی ہے اور جوناگڑھ کے مندر گرنار اس کی پہاڑیوں اور سروہی کے آبو جی بھی اسی پروہت کو عطا کر دیے گئے ہیں۔ گوہاٹی (آسام) میں اوماننند کے مقام پر شیو جی کا مندر ہے جس کے دلائی (یعنی گدی نشین) کے نام عطائے اراضی کی ایک سند بھی اورنگ زیب ہی کی عطا کی ہوئی ہے۔ ۱۰۹۰ھ اور ۱۰۹۸ھ میں بھگونت اور رام جیون گسائیں کی مقبوضات وقف کی تصدیق کی گئی اور انھیں ہر قسم کی مداخلت سے محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ یہ فرمان بھی عالمگیر ہی کے ہیں۔[۱۳]

غیر مسلم مؤرخین کی شہادت

اس قسم کے اور بھی متعدد فرامین و اسناد محفوظ ہیں۔ جن سے حضرت عالمگیر کی مذہبی رواداری کے نہایت روشن ثبوت مہیا ہوتے ہیں۔ متعدد غیر مسلم مؤرخین اور سیاح مثلاً لین پول، کپتان ہملٹن، ڈاکٹر برنیر، لفنسٹن، پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر جدوناتھ سرکار اس امر پر متفق ہیں کہ

عالمگیر پر مذہبی تعصب اور عدم رواداری کا الزام قطعاً غلط ہے۔ مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں:

لین پول: ''سیاحوں کی مخالفانہ نکتہ چینیاں اورنگ زیب کے خلاف صرف زمانۂ شہزادگی تک محدود ہیں۔ وہی سیاح جب اس کے زمانۂ شہنشاہی کا حال لکھتے ہیں تو سوائے کلمات تحسین کے اور کچھ نہیں لکھتے۔ اس کے پچاس برس کے طویل عہد حکومت میں ایک بھی ظالمانہ فعل ثابت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کے ستانے میں بھی جو اس کی دین داری کا ایک جزو تھا (مراد صرف یہ جزیہ ہے) سب کو تسلیم ہے۔ کہ کوئی قتل یا جسمانی ایذا رسانی ظہور میں نہیں آئی۔'' (کتاب سوانح عالمگیر)

کپتان ہملٹن (سیاح) حکومت کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں دس ہندوؤں کے پیچھے ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طرح سے برتی جاتی ہے وہ برت رکھتے ہیں۔ اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں۔ جس طرح ہندوؤں کی بادشاہی کے زمانے میں مناتے تھے۔ وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں۔ لیکن ان کی بیویوں کو یہ اجازت نہیں کہ اپنے مردہ شوہروں کے ساتھ ستی ہوں۔'' (سفرنامہ ہملٹن جلد اول ۱۲۷۔۱۲۸)

شہر سورت میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان اعتقادات و عبادات کے متعلق کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان (مسلمانوں) میں بالکل مفقود ہے۔'' (سفرنامہ جلد اول ۱۶۲)

ڈاکٹر برنیئر (فرانسیسی سیاح جو اورنگ زیب کے زمانے میں یہاں موجود تھا) ''سلاطین مغلیہ اگرچہ مسلمان ہیں لیکن ان پرانی رسوم کی آزادانہ بجا آوری کو یا تو اس خیال سے منع نہیں کرتے کہ ہندوؤں کی مذہبی معاملات میں دست اندازی کرنا ہی نہیں چاہتی یا دست اندازی کی جرأت نہیں رکھتے۔'' (سفرنامہ جلد دوم ۵۶)

الفنسٹن: ''یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی ہندو کو اس کے مذہب کی بنا پر قتل، قید یا جرمانہ کی سزا دی گئی ہو۔ یا کسی شخص پر علانیہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہو۔'' (تاریخ ہند)

ٹی ڈبلیو آرنلڈ: ''جہاں تک مجھے پتا چلا ہے اورنگ زیب کے عہد کی تاریخوں میں کسی کو بہ جبر مسلمان کرنے کا کہیں ذکر نہیں ...... عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو

جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے۔ آتش پرستی کی پاداش میں موقوف کر دیا جائے۔ عالمگیر نے عرضی پر لکھا ''مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں۔ نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اگر عرضی دہندہ کی دلیل کو درست مانا جائے تو ہم کو چاہیے تھا کہ اس ملک کے تمام راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے۔ مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت کے موافق ملیں گی۔ کسی اور لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔'' (ترجمہ پریچنگ آف اسلام ۲۸۰)

نظم حکومت میں ہندو

یہ تو مذہبی رواداری کی داستان تھی۔ باقی رہا ہندوؤں کو نظم و نسق حکومت میں شامل رکھنا۔ تو اس اعتبار سے پوری تاریخ شاہد ہے کہ محمد بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کوئی مسلمان سلطان، کوئی مسلمان تاجدار، کوئی مسلمان امیر ایسا نہیں گزرا جس کی سرکار میں ہندو ملازم اور اہل کار زیادہ سے زیادہ دخیل نہ تھے محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد نظم امور کے اہم ترین شعبے برہمنوں کے سپرد کیے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے ہی میں ہندو افواج اسلام میں بھرتی کیے جاتے تھے۔ سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں سُندر (سپہ سالار کی وفات پر تلک کو ہندو فوجوں کا افسر بنا کر اسے نیالتگین والی ہند کی سرکوبی پر مامور کیا جاتا ہے۔ خاندان غلاماں کے زمانے میں بھی اسلامی فوجوں کے ساتھ ساتھ ہندو فوجیں موجود تھیں۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے خلاف ملک چھجو والی اودھ نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ تو اس کی فوج بھی زیادہ تر ہندوؤں ہی سے بھرتی کی گئی تھی۔

سرکاری کارندوں اور ملازموں میں خوتوں اور مقدموں اور پٹواریوں سے لے کر اوپر تک منشی، متصدی اور اہل کار زیادہ تر ہندو ہوتے تھے۔ اور دفاتر کی ترتیب و تنظیم کا اکثر کام انہی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں ہندو وزارت، نیابت اور سپہ سالاری تک کے عہدوں پر فائز رہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں سب کے معتمد علیہ کار پردازوں میں خاصی تعداد ہندوؤں کی تھی۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر نے بھی جے سنگھ اور جسونت سنگھ کو بڑے بڑے مناصب دے کر فوجوں کی جرنیلی تفویض کر رکھی تھی۔ اور ہندو منصب داروں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔

...ے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انفرادی تعلقات ... مصنف

کے روشن ترین واقعات کی تفاصیل سے کتب تاریخ بھری پڑی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ مسلمان سلاطین و امرا اس ملک کو اپنا وطن اور اس کے تمام باشندوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت اپنے برادران وطن سمجھتے تھے اور ان کا سلوک ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ قطعاً مساوی تھا۔ آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں ہزاروں ہندو خاندان ایسے ہیں جو اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کو ہندوستان کے تاجداران اسلام نے مورد لطف و عنایات بنا کر انھیں خاک سے لاکھ بنا دیا۔

دوسری فصل: ہندو دھرم اور اسلام

اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دین کے معاملے میں کسی قسم کے جبر واکراہ کو روا نہیں رکھا۔ اور مسلمان خلفاء و سلاطین نے ابتدائی خلافت راشدہ سے لے کر آخر تک غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا۔ ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کو اقتدارِ شاہانہ حاصل رہا۔ لیکن انھوں نے ہر دور میں ہندوؤں کی مذہبی آزادی کو تسلیم کیا۔ ان کو پوجا پاٹ اور دوسری دھارمک رسوم کی بجا آوری سے کبھی نہ روکا۔ ان کے مندروں کی حفاظت کی۔ بلکہ ان کے قیام و انصرام کے لیے جاگیریں تک عطا کیں۔ بعض غیر مسلم مؤرخین کا یہ دعویٰ کہ مسلمان فاتحین و سلاطین ہندوؤں کو بنوک شمشیر مسلمان بناتے رہے۔ اب کسی تردید کا محتاج نہیں۔ اس لیے کہ خود اکثر غیر مسلم مؤرخین ہی شدومد سے اس کی تردید کر چکے ہیں۔

مسلمان فاتحین و سلاطین ایک تو کشور کشائی اور ملک داری میں اس قدر مصروف تھے کہ انھیں جبراً کسی کو مسلمان بنانے کی فرصت ہی نہ تھی۔ علاوہ بریں وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے بھی باخبر تھے۔ جنھوں نے مذہب کے معاملے میں جبر کو گناہ قرار دیا ہے۔ پھر مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ جن کروڑوں انسانوں پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے مذہبی جذبات کا احترام کریں۔ اور انھیں اطمینان سے پوجا پاٹ کرنے کی آزادی دیں۔ بلاشبہ تبلیغ اسلام کا مقصد ہر مسلمان کو عزیز ہے۔ اور یہ سلاطین اس مقصد سے غافل نہ تھے۔ لیکن جہاں تک جبر واکراہ کا تعلق ہے انھوں نے کبھی اس امر کا تصور بھی نہیں کیا کہ اپنی رعایا کو زبردستی اسلام کا حلقہ بگوش بنائیں۔ ہندوستان میں ہزارہا قدیم مندروں کا وجود آج بھی مسلمانوں اور مسلمان سلاطین کی رواداری کا شاہد عادل ہے۔

ملیبار میں مسلمان

جب پہلی صدی ہجری میں عرب تاجر جنوبی ہند میں وارد ہوئے تو ان کا ورود قطعی طور پر پرامن تھا۔ اس لیے کہ وہ تجارت کی غرض سے آتے تھے اور اسلام سے پہلے بھی صدیوں سے عربوں کی تجارت ان ممالک کے ساتھ جاری چلی آرہی تھی۔ لیکن چونکہ وہ تازہ مسلمان تھے اس لیے تبلیغ دین ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ ان کا ہر فرد مبلغ تھا اور اپنے اعمال و اخلاق سے بھی اس دین مقدس کی برتری اور پاکیزگی کا ثبوت پیش کرتا تھا۔ جب کالی کٹ (ملیبار) کے مشہور راجا زیمورن نے مسلمان تاجروں سے اسلام کے محاسن معلوم کیے تو ان مبلغین کی بے حد خاطر مدارات کی۔ انھیں تجارت میں ہر قسم کی سہولتیں عطا کیں اور اس کی رعایا کے جو لوگ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوئے۔ ان کو تبدیل مذہب سے منع کرنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

ملیبار کے راجا چیرامن پیرومل کہلاتے تھے۔ ان میں سے آخری راجا نویں صدی عیسوی کے اوائل میں کوڈنگلور میں راج کرتا تھا۔ اس نے کسی بزرگ مبلغ کی تلقین سے اسلام قبول کرلیا۔ اور حج کرنے کے لیے عازم مکہ معظمہ ہوا۔ وہ بندرگاہ شہر پر اترا۔ اور چار سال بعد وہیں فوت ہوگیا۔ اس نے مالک بن دینار، شرف الدین مالک اور مالک بن حبیب کو جو مقامی فضلا میں سے تھے۔ مع اہل و عیال کے ملیبار روانہ کیا۔ اور ایک مراسلہ اپنے جانشینوں کو بھیجا۔ جس میں ملک کے نظم و نسق کے متعلق کچھ ہدایات درج تھیں۔ اور اس کے ساتھ ان مسلمان مبلغین کی پذیرائی کی بھی تلقین کی گئی تھی۔ جب یہ بزرگ راجا کی چٹھی لے کر ملیبار پہنچے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اور انھیں مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس ملک میں راجا کے قبول اسلام کی یاد کو اب تک تازہ رکھا گیا ہے۔ اور اس کے جانشین راجاؤں کی تاج پوشی میں بعض مسلمانی رسوم بھی شامل کرلی گئی ہیں۔ ہندی ثقافت پر اسلام کا اثر۔ ڈاکٹر تاراچند ۳۴)

بلکہ ڈاکٹر تارا چند یہ بھی لکھتے ہیں کہ زیمورن محض چیرامن پیرومل کے نمائندے کی حیثیت سے تخت پر بیٹھتا ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا قدیم راجا مکہ سے واپس آئے گا۔ آج تک یہ کیفیت ہے کہ جب مہاراجا ٹراونکور کو تاج پوشی کے موقع پر نشان سلطنت کے طور پر [illegible]یش کی جاتی ہے تو وہ یہ فقرا دہراتے ہیں کہ میں اس تلوار کو اس وقت تک اپنے پاس رکھوں [illegible] چچا جو مکے گئے ہوئے ہیں، واپس آ جائیں۔ [۱۴]

ایک اور راجا گن پانڈیا نے مسجدوں کی تعمیر کے لیے مسلمانوں کو قطعات اراضی بالکل مفت عطا کیے۔ جب راجاؤں کی اسلام پسندی کا یہ حال عوام نے دیکھا، اور انھیں خود بھی اسلام اور مسلمانوں میں بے نظیر خوبیاں نظر آئیں تو وہ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے اور مسلمان علماء و فقرا نے ان کی دینی تربیت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

جنوبی ہند کے دونوں ساحلوں پر اسلام کو جو کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ اسلام کی اشاعت کسی جبر و ظلم سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی خوبیوں نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اور وہ مسلمان ہو گئے۔

سندھ میں اگرچہ محمد بن قاسم نے فوج کشی کی اور فتح پا کر سلطنت اسلامی قائم کی۔ لیکن ہندوؤں کے متعلق اس کی رواداری کے واقعات سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہی رواداری شفقت اور اخلاق اسلامی کی قوت تھی جس نے سندھ کے لاکھوں انسانوں کو اسلام کا شیفتہ و فریفتہ بنا دیا۔

مبلغین اسلام

سلطان محمود غزنوی اور اس کے بعد کے فاتحین، سلاطین اور شاہانِ مغل نے تبلیغ و اشاعتِ دین کا کام بزرگان دین اور صوفیہ کرام کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ مقدس لوگ برابر ہندوستان آتے رہے اور اپنے انفاس قدسیہ اور مرحمت و شفقت سے یہاں کے لوگوں کے قلوب میں اسلام کے اثرات کو راسخ کرتے رہے۔ ابوحفص ربیع بن صاحب الاسدی بصری، منصور حلاج، علی یار شاہ، شیخ اسماعیل بخاری، فرید الدین عطار، بابا ریحان، نورالدین (نور ستگر، گجرات)، سید علی ہجویری (داتا گنج بخش)، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ جلال الدین تبریزی، سید جلال الدین بخاری، بابا فرید شکر گنج، نظام الدین اولیاء، عبدالکریم جیلی، سید محمد گیسو دراز، پیر صدر الدین اور صدہا دیگر اولیاء و اصفیا رحمہم اللہ ملک کے ہر گوشے میں خدمت اسلام کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

ہندوستان میں مذہب کے پیچیدہ قوانین

اسلام کو ہندوستان میں اس قدر جلد کامیابی کیوں حاصل ہوئی۔ اس سوال کا جواب کچھ بھی مشکل نہیں۔ جس وقت مسلمان ہندوستان آئے ہیں۔ ہندو مذہبی اعتبار سے سخت مصیبت میں تھے۔ سیکڑوں نہیں۔ ہزاروں دیوی دیوتا تھے اور ان کی مورتیوں سے ملک بھر کے مندر آباد تھے۔

سناتن دھرم اور بدھ مت کا کوئی فرقہ بت پرستی سے آزاد نہ تھا۔ مذہبی رسوم و عوائد کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اوہام نے ہندوؤں کی زندگی کے ہر شعبے پر احاطہ کر رکھا تھا۔ اور منوجی کے وحشیانہ قوانین نے برہمنوں کے سوا باقی تمام ذاتوں کو ذلیل کر رکھا تھا۔ خصوصاً ویش اور شودر اور چنڈال تو حیوانات سے بھی پست تر سطح پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور انسانیت ہزار ہا سال سے چلا رہی تھی کہ کوئی آئے اور اسے اس ظلمِ مسلسل سے نجات دے۔ ذات پات اور چھوت چھات کے عجیب و غریب قواعد و ضوابط سے انسانوں کے درمیان مواکلت، مجالست اور مناکحت کے مسئلے سخت پیچیدہ ہو رہے تھے۔

اسلام کی سادگی

اسلام ایک نہایت سیدھا سادا مذہب تھا۔ اس نے انسان کی غلامی کی تمام زنجیریں کاٹ کر پھینک دی تھیں۔ تمام دیوی دیوتا باطل ہیں۔ صرف خدائے واحد عبادت کے لائق ہے۔ بُت پرستی قطعی ناجائز ہے۔ اسلام میں کوئی ایسی ریتیں رسمیں نہیں۔ جن کی تکمیل کے لیے کسی پروہت یا پجاری کی ضرورت ہو۔ خدا اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ و وسیلہ نہیں۔ ذات پات کے امتیازات باطل ہیں۔ اللہ کے نزدیک سب بندے برابر ہیں۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک گدائے بے نوا نماز میں شہنشاہ کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس کے دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتا ہے۔ ایک غلام ترقی کر کے بادشاہ بن سکتا ہے اور کوئی اس کی حقیر ابتدا پر طعنہ زن نہیں ہو سکتا۔ کسی انسان کے بڑے یا چھوٹے۔ اچھے یا برے ہونے کا معیار صرف ذاتی تقویٰ ہے۔ اللہ کے نزدیک انسانوں میں سب سے زیادہ قابل احترام وہ ہے جو ان سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ پنج ارکان اسلام مسلمانوں کی عالمگیر برادری کے ظاہری نشان ہیں۔ اسلام کی یہی سادگی، یہی اخوت، یہی مساوات اور اوہام سے آزادی تھی۔ جس نے ایک وسیع آبادی کو جو عجیب و غریب قیود کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اسلام کا شیفتہ بنا دیا۔ اور جن بزرگوں کی زندگیاں احکام الٰہی کی پابندی کا پیکر تھیں۔ ان کے عدل و احسان، حلم و حیا، زہد و تقویٰ، شفقت و محبت، تحمل اور رواداری، اور روحانیت کے نمونے ہندوؤں کو کشاں کشاں اس مذہب کے دائرے میں لے آئے۔

ہندوؤں کی مذہب پرستی

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بعض ہندوؤں کے مسلمان ہونے کے اسباب سیاسی و اقتصادی بھی ہوں گے۔ "الناس علی دین ملوکھم" میں بڑی صداقت ہے۔ اور پھر شخصی حکومت میں حصول دولت و جاہ کے لیے بعض ابن الوقت ہر قسم کے پاپڑ بیلتے ہیں۔ لیکن ایسے افراد بہت ہی کم ہوں گے۔ لاکھوں کروڑوں انسان مذہب تبدیل کر کے کسی منصب و جاہ کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شہنشاہ بھی کروڑوں کے پیٹ اپنے عطایا سے نہیں بھر سکتا۔ پھر ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جن ہندوؤں نے مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں بڑے بڑے رتبے حاصل کیے۔ وہ آخر دم تک اپنے مذہب پر پختگی سے قائم رہے اور انھیں کبھی اس امر کا خیال نہ آیا کہ اپنے آقائے ولی نعمت کی خوشنودی کے لیے مسلمان ہو جائیں۔ اکبر کا دینِ الٰہی اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ رکھتا تھا۔ لیکن جب اکبر نے بھگوان داس اور مان سنگھ جیسے راجپوتوں سے جو اس کے عزیز اور خویش تھے۔ دین الٰہی میں شامل ہونے کے لیے کہا تو انھوں نے نہایت سختی سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اسلام کو ستیاناس کرنے والے ایک نئے مذہب سے تعلق پیدا کر کے اکبر کی آنکھوں میں وقارِ مزید حاصل کرنے کا یہ بہت زرّیں موقع تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سیاسی و اقتصادی وجوہ علی العموم تبدیل مذہب کے مؤثر عوامل نہیں سمجھے جا سکتے۔ عوام تو ایک طرف رہے حبِّ جاہ کے دیوانے خواص میں بھی ایسی مثالیں بہت کم یاب ہیں۔

غرض جب اسلام کی خوبی اور پاکیزگی نے ہندو عوام کو نہایت شدت سے متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے حقائق کے سامنے ویدک دھرم، بودھ دھرم، جین مت کے دلائل بالکل تارِ عنکبوت ثابت ہوئے تو ہندو رشیوں اور سادھوؤں نے ہندوؤں کے مذہبی تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ نہایت قدیم زمانے میں جب وید نازل ہوئے ہیں، ویدک دھرم توحید کا مبلغ تھا اور اس میں ذات پات کے امتیازات بھی نہ تھے۔ ہمیں اس دعوے کی تردید کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے اس زمانے میں ملہم من اللہ انبیاء ہندوستان میں آئے ہوں اور انھوں نے توحید الٰہی کی تبلیغ کی ہو۔ لیکن اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہندو دھرم ہزارہا سال سے سُرتیوں اور سمرتیوں کا ایک ملغوبہ اور مقامی اور قومی دیویوں اور دیوتاؤں کی بازی گاہ بنا ہوا تھا۔ اور برہمنوں نے راجاؤں سے ساز باز کر کے عملاً پوری ہندوستانی قوم کو پامال

کر رکھا تھا۔ بدھ مت نمودار ہوا۔ اس نے اخوت و مساوات کی تعلیم دی۔ لیکن خدا کے وجود سے انکار کیا۔ اور مہاتما بدھ ہی کو مقصد المقاصد قرار دیا۔ پھر ہندوؤں کے ربط کی وجہ سے یہ مذہب بھی اصنام پرستی کی نذر ہوگیا۔ اور تمام ہندوستان بدھ کی مورتیوں سے بھر گیا۔ ہندوؤں نے اس کی ابتدائی صورت بگاڑ دینے ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ بالآخر اس کو ایسا نابود کیا کہ اس کو ہندوستان سے باہر برما، چین اور جاپان میں پناہ لینی پڑی۔ اور جو لوگ بدھ ہوگئے تھے وہ پھر سے ہندو معاشرے میں جذب ہوگئے۔ یونانی آئے، وہ بھی ہندو معاشرے میں جذب ہو گئے۔ ہُن، ستھین، ساکا، غرض جو قوم باہر سے آئی وہ تھوڑی مدت کے بعد ہندوؤں کا جزو لاینفک ہو کر رہ گئی۔ اور ہندوؤں کی برتری کا جھنڈا بدستور اڑتا رہا۔

ہندوؤں نے مسلمانوں کو بھی جذب کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور سندھ میں ایک مقام پر کسی مندر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسلمان سلاطین و حکام نے ایک لمحے میں اس بدعت کو ختم کر دیا ورنہ کچھ عجب نہ تھا کہ بھارت میں جابجا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مورتی کے مندر بن جاتے۔ اور ہندوؤں میں ایک فرقہ ''محمدی سماج'' کے نام سے معرض وجود میں آ جاتا۔

اختلاط باہمی کا اثر

مسلمانوں کو اپنے مذہب کی بلندی اور پاکیزگی کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ ہندو دھرم اور ہندو معاشرے کے نقائص و عیوب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور اسلام پر ان کا ایمان روز بروز زیادہ پختہ اور راسخ ہوتا جاتا تھا۔ لیکن اس انقطاع کے باوجود ہندو اور مسلمان کچھ مدت کے بعد جب جنگ و پیکار کی تلخ یادیں فراموش ہوئیں۔ آپس میں دوستانہ ملنے لگے۔ مسلمانوں نے نو مسلم عورتوں سے شادیاں کیں۔ ہندوؤں نے مسلم سلاطین و امرا کی سرکاروں میں نوکریاں کیں۔ ہندو اور مسلمان بچے مکاتب اور مدارس میں اکٹھے تعلیم پانے لگے۔ ہندوؤں نے عربی و فارسی اور مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت سیکھی۔ بعض مسلمانوں نے ہندوؤں کی رسوم اختیار کیں۔ بعض ہندوؤں نے مسلمانوں کے طور طریقے سیکھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں مسلمان صوفیہ و اولیا کی درگاہوں پر یکساں عقیدت سے حاضر ہونے لگے۔ بلکہ بعض صوفیہ نے ہندوؤں کو (بلا تبدیل مذہب) مرید بھی کرنا شروع کر دیا۔

ہم نے اس سے پیشتر لکھا ہے کہ اسلام کے نفوذ کو دیکھ کر ہندو سادھوؤں، عالموں اور رشیوں نے ہندوؤں کے مذہبی تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ انھوں نے سوچا کہ جس حالت میں اسلام روز بروز ہندو آبادی کے بڑے حصے میں مقبول ہوتا جاتا ہے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا اثر بھی یہی ہو رہا ہے کہ ہندو اپنے مذہب سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دن تمام ہندو مسلمان ہو جائیں گے۔ وہ روشن خیال لوگ تھے۔ انھیں اپنے مذہب کی حالیہ صورت اور اپنے معاشرے کی موجودہ تنظیم سے بھی بے حد بیزاری ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ اصلاح مذہب کے لیے اٹھے اور اسلام کو سامنے رکھ کر ہندو دھرم میں ترمیمات و اصلاحات کرنے لگے۔ آئندہ فصل میں انھی کوششوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔

تیسری فصل: بھگتی کی تحریک اور ہندو مصلحین

عرب جنوبی ہند میں

رولینڈسن نے "تحفۃ المجاہدین" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ عرب کے مسلمان سب سے پہلے ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملیبار کے ساحل پر آباد ہونا شروع ہوئے۔ بعض دوسرے مؤرخین مثلاً فرانسس ڈے اور سٹراک نے بھی اپنی کتابوں میں یہی لکھا ہے۔ ملیبار کے راجاؤں، تاجروں اور عام لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ ملحوظ رکھا۔ اس لیے کہ ان سے ملک کو بے اندازہ تجارتی منافع حاصل ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر جابجا مسجدیں بنائیں۔ قطعات اراضی حاصل کیے اور اپنے دین کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ہر مسلمان اپنے آپ کو مبلغ سمجھتا تھا۔ نہایت سادگی سے ہندوؤں کے آگے اسلام کے سیدھے سادھے عقائد پیش کرتا تھا۔ اور اپنے اعمال و اخلاق کے نمونے سے عوام کو متاثر کرتا تھا۔ تقریباً ایک سو سال تک تجارت اور تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ملیبار میں اسلام پھیل گیا۔ بلکہ وہاں کا راجا بھی مسلمان ہو گیا۔ اور حج کی نیت سے مکہ معظمہ کا عازم ہوا۔

اس زمانے میں جنوبی ہند مذہبی کشمکش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہندو دھرم والے بدھ مت اور جین مت کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ اتنے میں اسلام نمودار ہوا اور اس کے مبلغین نے توحید الٰہی کا عقیدہ پیش کیا۔ ذات پات اور چھوت چھات کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ عوام جو ہزارہا سال سے ان امتیازات کے شکار ہو رہے تھے۔ بے اختیار اس نئے مذہب کی طرف کھنچنے لگے۔

حکومت اور معاشرے کی طرف سے تبدیلی مذہب پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس لیے ہزاروں مسلمان ہوگئے۔ اور ہندو دھرم کے محافظوں کی تشویش روز افزوں ہوگئی۔

شنکر اچاریا

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملیبار کے ساحل پر دریائے الور کے کنارے ایک گاؤں کلڑی میں ایک نمبودری برہمن شیوگرو رہتا تھا۔ اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام شنکر رکھا گیا۔ یہی وہ شنکر ہے جو ہندو دھرم کی تاریخ میں شنکر اچاریا کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے لڑکپن ہی میں تمام علوم مروّجہ میں مہارت پیدا کرلی۔ اور کچھ مدت سنیاس میں بسر کرنے کے بعد ملک کا دورہ شروع کردیا۔ اس نے بدھ مت کی شدید مخالفت کی۔ اور ہندوؤں کو دعوت دی کہ وہ اپنے تمام فرقوں کو ختم کرکے ایک ویدک دھرم میں آجائیں۔ اس نے کہا۔ خدا ایک ہے۔ وہی حقیقت ہے۔ باقی سب دھوکا ہے۔ دنیا مایا ہے۔ اس کی حقیقت برہما ہے اور افراد سب اسی حقیقت کے اجزا ہیں۔ شنکر نے اپنا فلسفہ اس قدر عالمانہ اور دل کش طریقے سے پیش کیا اور شمالی ہند کے تیرتھوں پر جاکر برہمنوں سے اس قدر فیصلہ کن بحثیں کیں کہ ہندو علی العموم اس کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوگئے۔

بارتھ اپنی کتاب ''ریلجنز آف انڈیا'' میں لکھا ہے: ''خلافتِ اسلامیہ کے عرب ان سواحل پر سیاحوں کی حیثیت سے آئے تھے اور اپنے ہم مذہب افغانوں، ترکوں اور منگولوں سے (جو فاتحین کی حیثیت سے آئے) بہت پہلے ان علاقوں سے تجارت اور میل ملاپ کے تعلقات قائم کرچکے تھے۔ اور یہی وہ علاقے ہیں جن میں نویں صدی سے بارھویں صدی عیسوی تک وہ عظیم مذہبی تحریکیں نمودار ہوئیں جو شنکر اچاریا، رامانج، انندتیرتھ اور بساوَ کے ناموں سے منسوب ہیں۔''

اس کے علاوہ ڈاکٹر تارا چند اپنی مشہور کتاب ''اسلام کا اثر ہندی ثقافت پر'' میں بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ان تحریکوں کے عناصر واضح طور پر دین اسلام کے اثرات کا پتا دیتے ہیں۔ اسلام نے توحید کے عقیدے کو اس قدر وضاحت اور قوت کے ساتھ پیش کیا کہ ہندو رشیوں اور فلسفیوں کے لیے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ انھوں نے کروڑوں دیوتاؤں کے مذہب میں ترمیم ضروری سمجھی۔ اور پھر ہندوؤں سے کہا کہ توحید کوئی مسلمانوں ہی کا اجارہ نہیں

ہے۔ ہندوؤں کے قدیم دھرم میں بھی یہ عقیدہ موجود ہے اور ہندوؤں ہی نے اس کو بھلا رکھا ہے۔

رامانج

شنکر اچاریا کے شاگرد اور جانشین اپنے گرو کی تعلیمات کو آگے بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۰۱۶ء میں مدراس کے پاس ایک گاؤں میں رامانج پیدا ہوا۔ یہ بھی شنکر اچاریا کی طرح برہمن تھا۔ پہلے وہ شنکر کے ایک شاگرد یادوپرکاش کا شاگرد بنا۔ لیکن بعض مسائل پر اس کا استاد سے اختلاف ہوگیا۔ لہٰذا وہ وہاں سے رخصت ہوکر سری رنگم کے جمنامُنی کا چیلا بن گیا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا جانشین نامزد کیا گیا۔ اس کی بعد اس نے کچھ کتابیں لکھیں اور اپنے چند چیلوں کو ساتھ لے کر شمالی ہند میں کشمیر تک نکل گیا۔

رامانج حقیقت میں ''بھگتی'' کی تحریک کا بانی ہے۔ اس نے شنکر اچاریا کے ''مایا'' کے نظریے کی مخالفت کی۔ اور اس کی نامکمل توحید کو مکمل کیا۔ شنکر اچاریا صفات الٰہی کا قائل نہ تھا۔ رامانج نے اعلان کیا کہ برہما اور ایشور ایک ہی ہیں۔ وہی روح اعظم ہے۔ اس کی ذات و صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ فعال لما یرید ہے۔ قادر مطلق ہے اسی میں سے روح اور مادہ نکلے ہیں اور اپنی ہستی کے لیے اسی کے محتاج ہیں۔ روح خدا کو صرف بھگتی سے حاصل کرسکتی ہے پہلی منزل ادائے فرائض ہے۔ دوسری منزل ریاضت ہے اور تیسری بھگتی۔ یعنی اس نے شریعت و طریقت دونوں کی پابندی کو اصل عبادت اور باعث نجات قرار دیا۔ اگرچہ رامانج ذاتوں کی پرانی تقسیم کا قائل تھا لیکن اس نے شودروں اور چنڈالوں کے حق عبادت کو تسلیم کیا اور بعض مندر ان کے لیے کھول دیے۔[۱۵]

رامانج کے بعد دوسرے اشخاص نے اپنے نظریات پیش کیے۔ لیکن بھگتی کے دائرے سے کوئی باہر نہ جاسکا۔ اب گویا بھگتی کے مذہب نے یہ شکل اختیار کی کہ شوا (یعنی خدا) اور اس کے فضل پر ایمان۔ اپنے گرو اور معلم سے قطعی عقیدت والہانہ عبادت و ریاضت۔ یوگ کے اعمال اور سماع و رقص اور وجد۔ تمام مذاہب سے رواداری۔ بت پرستی اور دوسری ریتوں رسموں کی مخالفت۔ تمام انسانوں کے درمیان مذہبی مساوات بلا امتیاز ذات و فرقہ۔

یعنی شنکر سے یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہندو دھرم کے ''بھگتی مسلک'' کی شکل وصورت

واضح طور پر اسلام سے مشابہ ہوگئی۔ بلکہ اس میں تصوف کا عنصر بھی صاف نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ وشنو سوامی، نمبارک اور مادھو (رامانج کے شاگردان) نے خدا اور انسان کی نوعیت کے متعلق جو مابعد الطبیعی بحثیں کی ہیں ان کو پڑھ کر نظام، اشعری اور غزالی کے مذاکرات و مباحثات یاد آجاتے ہیں۔

لنگایت

لنگایت اور بعض دوسرے فرقوں میں بھی اسلام کے نقوش و اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ ان کا گرو غالباً بساوٗ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے اور وہ تمام صفات عالیہ کا جامع ہے۔ وہی تمام مادے اور تمام ارواح کا خالق و مالک ہے وہ اپنے آپ کو معلّمِ عالم کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ لنگایتوں میں پیری مریدی اور بیعت کے طور طریقے مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس فرقے میں رسمیں ریتیں نہیں ہیں۔ ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں۔ ایک چنڈال بھی اس میں شامل ہوجائے۔ تو برہمن کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بچپن کی شادی ممنوع ہے۔ طلاق کی اجازت ہے۔ بیواؤں کا احترام کیا جاتا ہے اور انھیں نکاح ثانی کا حق حاصل ہے۔ لنگایت اپنے مُردوں کو جلاتے نہیں بلکہ دفن کرتے ہیں۔ شرادھ اور دوسری موت کی رسمیں مفقود ہیں۔ تناسخ کا عقیدہ ان کے نزدیک غلط ہے۔ یہ لوگ پرہیز گار اور مجاہد مزاج ہیں۔ کنٹری اور تلنگی علاقے میں خصوصاً بلگام، بیجاپور اور دھاوار کے اضلاع میں آبادی کا پینتیس فیصدی ہیں۔ میسور اور کولہاپور میں بھی آباد ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ''ویرشیوا (یعنی شیوا کے بہادر) کہتے ہیں۔[۱۶]

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ لنگایتوں میں یہ تمام شعار کیونکر رائج ہوگئے جن سے ہندو قوم قطعی طور پر بیگانہ تھی۔ سب مؤرخین متفق الرائے ہیں کہ سب مسلمان عربوں کی تلقین اور صحبت کا اثر ہے۔

بساوٗ کے اقوال میں سے بعض ڈاکٹر تارا چند نے نقل کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ وہ ساری کائنات پر حاوی ہے۔ توبہ اور پشیمانی کے سوا اور کوئی نذر نیاز یا قربانی گناہوں کا کفارہ نہیں ہوسکتی۔ گھوڑے وغیرہ کی قربانی کا کچھ فائدہ نہیں۔ ذات پات کے امتیازات بالکل بے معنی ہیں۔ عمل کرو اور جزا کی توقع نہ رکھو۔ سب روحیں خدا کی ذات میں جذب ہونے والی ہیں۔

جنوب میں تو اسلام پُرامن عرب تاجروں اور مبلغوں کی وساطت سے پہنچا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ہندو دھرم کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور سو دو سو سال کے اندر نہایت ذی اثر ہندو فرقے انہی عقائد کا اظہار کرنے لگے جو اسلام کے عقائد تھے۔ لیکن شمال میں محمود غزنوی کے ورود سے اسلام ملک گیری اور کشور کشائی کے جھنڈے لہراتا ہوا داخل ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان فاتحین، مسلمان بادشاہ، مسلمان امرا، شعرا، اولیا، علما سارے شمالی ہند میں پھیل گئے۔ خدائے واحد کی عبادت ہونے لگی۔ ہندوؤں کی معاشرتی بنیادیں کھوکھلی ہونے لگیں۔ مذہبی اعتبار سے ذات پات، چھوت چھات اور رسوم و عوائد کے بندھن کمزور ہو گئے۔ جنوب کے مذہبی معلمین کی تعلیمات ہندوؤں کے نزدیک روز بروز مقبول ہونے لگیں۔ اور بھگتی مارگ پر لاکھوں ہندو گامزن ہو گئے۔ یہاں تک کہ رامانج کے جانشینوں میں سے پانچویں نمبر پر رامانند کا ظہور ہوا یہ شخص ۱۲۹۹ء میں پریاگ الٰہ آباد کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا۔ اور پریاگ و بنارس میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ خدا کی شان دیکھو ہندوستان میں برہمیت کے اقتدار اور برہمنوں کی فوقیت کو ختم کرنے والے شنکر اچاریا، رامانج، بساؤ اور رامانند بھی خود برہمن خاندانوں ہی کے چشم و چراغ تھے۔

رامانند

رامانند کے متعلق میکالف نے اپنی کتاب میں جو اس نے سکھوں کے متعلق لکھی ہے، یہ بتایا ہے کہ رامانند نے بنارس میں بعض مسلمان علماء سے بھی رابطہ پیدا کیا اور ان سے دینی مسائل پر گفتگو کی رامانند رامانج کا پانچواں جانشین تھا۔ لیکن اس نے اپنے پیر و مرشد کے بعض عقائد سے انحراف بھی کیا۔ مثلاً اس نے ذات پات کے تمام امتیازات موقوف کر دیئے تمام تیرتھوں کا سفر کیا۔ اور رام اور سیتا کی پوجا کو رواج دیا (بھگتی مارگ کے معلّمین کے ذکر میں ہر جگہ برہما، ویشنو، کرشن، شیو، رام وغیرہ کی پوجا کا ذکر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ان ناموں سے ان کی مراد ذات باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں ہوتی) رامانند نے تمام ذاتوں کے افراد کو اپنے فرقے میں شامل کیا۔ بلکہ مرد عورت اور ہندو مسلمان کا امتیاز بھی اٹھا دیا۔ اس کے بارہ بڑے چیلے مشہور ہیں جن کے نام یہ ہیں:

اننتانند، کبیر، پیپا، بھاوانند، شوکھا، سرسرا، پدماوتی، نرہاری، دھنا رائے داس، سین اور

سرسرا کی بیوی، ان بارہ میں ایک نائی، ایک چمار اور ایک جولاہا بھی شامل تھے۔ رامانند پہلا مصلح ہے جس نے اپنے عقائد و اصول کی تبلیغ کے لیے ہندی زبان اختیار کی اور سنسکرت کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ اس کے مواعظ کو عوام میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔[۱۷]

رامانند کے چیلوں میں کبیر سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ اس کے سن ولادت کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ جن کی چھان بین کے بعد ڈاکٹر تارا چند نے رائے دی ہے کہ کبیر غالباً ۱۴۲۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کبیر ایک برہمن بیوہ کے بطن سے تھا۔ جو اس کو بنارس کے ایک تالاب کے کنارے چھوڑ گئی تھی۔ ایک جولاہا نیرو اس کو اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اور نیرو اور اس کی بیوی نیما نے اسے متبنیٰ بنالیا۔ جب کبیر سیانا ہوا تو اس نے اپنے باپ کا پیشہ بافندگی سیکھ لیا اور اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ کبیر کی طبیعت میں آغاز ہی سے تحقیق و استفسار کا رجحان تھا۔ اور بنارس کی فضا بالکل ہندوانہ تھی۔ اس لیے کبیر بہت جلد ہندو دھرم اور اسلام کے مبادی سے واقف ہوگیا اور جس زمانے میں اس نے روحانی استفاضہ کے لیے کسی پیر یا گرو کی تلاش شروع کی وہ بہت سے مسلمان مشائخ اور ہندو سادھوؤں سے ملا۔ لیکن کسی جگہ اس کی تسلی نہ ہوئی۔ آخر کسی نے اس کو رامانند برہمن کا پتا دیا جو نہایت روشن دماغ پیرِ کہن سال تھا۔ چنانچہ کبیر رامانند کا چیلا بن گیا۔[۱۸]

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ مدت تک رامانند کے پاس نہیں رہا۔ بلکہ سیر و سفر میں مصروف ہوگیا۔ جس کے دوران میں اس کے اوقات اکثر مسلمان صوفیہ کی صحبت میں صرف ہوئے۔ کبیر پڑھا لکھا نہ تھا۔ اس کا تمام تر علم صوفی بزرگوں کے ملفوظات پر مبنی تھا۔ جب وہ مختلف مقامات پر گھومنے پھرنے کے بعد بنارس میں مقیم ہوگیا اور اپنے خیالات و عقائد کا پرچار کرنے لگا تو پنڈتوں اور مولویوں نے ان کو ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے خلاف قرار دے کر کبیر کو ہدف ملامت بنایا۔ لیکن سکندر لودھی نے کبیر کے خلوص کو دیکھ کر اس کی امداد اور حفاظت کی۔ جس کے بعد علما و براہمہ نے اس کو دق نہیں کیا۔ کبیر کو روز بروز ہندوؤں اور مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ اور وہ شمالی ہند کا بڑا معلم اور مصلح تسلیم کرلیا گیا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو صرف معرفت الٰہی کا سبق دیتا تھا۔ ہندو دھرم کے ورن آشرم اور چھ درشن (شاستر) اور دوسرے مسلمات کا منکر تھا۔ اور بلند آہنگی سے اعلان کرتا تھا کہ مذہب بھگتی کے سوا کچھ نہیں (بھگتی اس عبادت کو کہتے ہیں جو عاشقانہ و والہانہ کی جائے۔ ہمارے تصوف کی اصطلاح میں اسے عشق کہا

جاسکتا ہے) یعنی کبیر کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ خدا ایک ہے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔ بت پرستی گمراہی ہے۔ ذات پات اور چھوت چھات اور فلسفے کی پیچیدگیاں سب خرافات ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو عرفان الٰہی کے حصول میں مصروف رہنا چاہیے۔ اور آپس میں بھائی بھائی کی سی محبت رکھنی چاہیے۔ ہندو دھرم اور اسلام میں جو باتیں اس نصب العین کے خلاف نظر آئیں۔ وہ قابل ترک ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کبیر اپنے نصب العین کی تکمیل کے جوش میں بعض اوقات اسلام کے اصول و عقائد پر بھی حملہ کر دیتا ہے۔ لیکن چونکہ تصوف و طریقت کے مسلک کا پرجوش حامی ہے اس لیے اس کو زیادہ سے زیادہ صوفی کہا جاسکتا ہے۔ اور صوفیہ کے بعض فرقوں کی آزاد خیالی ظاہر ہی ہے۔ بہرکیف اس نے اپنی تعلیمات میں ہندو مذہب کے تمام بنیادی عقائد و اعمال کی شدید مخالفت کی ہے اور اس اعتبار سے وہ بھگتی مارگ معلّمین میں سب سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ کبیر عمر بھر مختلف اوزان و بحور میں شعر کہتا رہا۔ اور بڑے بڑے مجمعوں میں زبانی سناتا رہا۔ اس کا کلام اس کے زمانے میں معرض تحریر میں نہیں آیا۔ لیکن اس کے چیلوں نے جب اپنے گرو کے اشعار جمع کیے تو بہت بڑا مجموعہ مرتب ہو گیا۔ بنارس کے کبیر چوراہے میں کبیر پنتھیوں کا مرکز ہے۔ اس میں اکیس کتابوں کا مجموعہ موجود ہے جس کو ''خاص گرنتھ'' کہتے ہیں۔ کبیر کا سارا کلام ہندی اور اردو میں ہے۔ بلکہ اس کی ایک کتاب کا تو نام ہی ''ریختہ'' ہے اس کے دوہے شمالی ہند میں اکثر لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔

کبیر کا جذبۂ خدا پرستی نہایت عمیق ہے اور چونکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں مخاطب کرتا ہے اس لیے خدا کے لیے رام، ہری، گوبند، برہما، سمرتھ، سائیں، ست پرش، اللہ، خدا، صاحب بیچوں، رحیم، رحمان کے الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اور یوگ اور تصوف کی اصطلاحات سے بھی کام لیتا ہے۔ اس کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کے مذاہب مروّجہ سے برگشتہ کر کے ایک نئے مذہب یعنی بھگتی کا پیروکار بنا دے اور اس طرح ان کے تمام رگڑے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

چے تنیہ

۱۴۸۵ء میں بنگال کے مقام ''نودیپ'' میں چے تنیہ پیدا ہوا۔ پچیس برس کی عمر

میں سنیاسی بن گیا اور ملک بھر میں دورہ کر کے پریم اور شانتی کا پرچار کرنے لگا۔ اس کی شخصیت میں بے حد کشش تھی۔ جب وہ کرشن بھگتی کے نشے میں سرشار ہوکر ''محبت اور صلح'' کا پیغام دیتا۔ تو ہزاروں ہندو اس کے آگے سربسجود ہو جاتے۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ کرشن (یعنی خدا) ہر آتما میں موجود ہے۔ اس لیے ہر فرد کی عزت کرو۔ اور عجز و انکسار کو اپنا شعار بناؤ چےتنیہ ذات پات کے امتیاز کا مخالف، غریبوں اور مصیبت زدوں سے پریم و محبت کرنے والا۔ اور کبر و غرور سے سخت متنفر تھا۔ وہ اچھوتوں اور چنڈالوں کو گلے لگاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ کرشن کے نزدیک برہمن اور شودر بالکل ایک ہیں۔ تمام انسان بھائی بھائی ہیں اور صرف خدا کی عبادت اور پریم اور شانتی ہی سے سرور جاوداں کی نعمت حاصل کی جاسکتی ہے۔ بنگال میں اب تک لاکھوں ہندو چےتنیہ کو سری کرشن کا اوتار مانتے ہیں اور اس کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

اسی طرح مہاراشٹر میں بھی ایک مرہٹہ سادھو نام دیو پیدا ہوا۔ جو کسی نیچ ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بھی خدا کی وحدانیت کا پرچار کیا۔ بت پرستی کو ناپاک حرکت بتایا۔ اور ذات پات اور ریت رسم کی مخالفت کی۔

نانک

لاہور کے پاس تحصیل شرق پور میں ایک گاؤں تلونڈی کے نام سے موجود ہے۔ یہاں ۱۴۶۹ء میں مہتہ کالوچند کھتری کے گھر نانک پیدا ہوا۔ نانک کو اس کے والدین نے پہلے ایک پنڈت سے ہندی پڑھوائی۔ پھر ایک معلّم ملا قطب الدین کے پاس فارسی پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ لیکن نانک نے ابتدائی اسباق کے سوا کچھ نہ پڑھا۔ یہ بچہ ہر وقت سوچ میں مستغرق رہتا۔ اور جو کام بھی اس کے سپرد کیا جاتا اس کو خوبی سے انجام نہ دیتا۔ کھیتی باڑی اس سے نہ ہوسکی۔ مویشیوں کو وہ نہ چرا سکا۔ دکانداری وہ نہ کرسکا۔ آخر ماں باپ اس کو فاتر العقل سمجھ کر مایوس ہوگئے لیکن جب نانک کی بہن نواب دولت خاں لودھی کے دیوان جے رام سے بیاہی گئی تو اس نے کوشش کرکے نانک کو نواب کے خیرات خانے میں نوکر کروا دیا۔ یہاں نانک ۱۴۹۹ء تک رہا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں نانک کی شادی ہوگئی۔ سری چند اور لکھمیداس دو بیٹے ہوئے۔ لیکن جب نانک کی عمر تیس سال کی ہوئی تو اس نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اور تلونڈی کے ایک مسلمان میراثی مردانہ اور بھائی بالا کو ساتھ لے کر فقیر ہوگیا۔ ان تینوں نے دور دور کے ملکوں

کی سیاحت کی..... تیرتھوں اور خانقاہوں اور دوسرے مقدس مقامات پر جا کر سادھو سنتوں اور صوفیوں کی صحبت سے استفادہ کیا اور پھر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی۔

پنجاب صدہا سال سے اسلامی حکومت کے ماتحت چلا آتا تھا۔ لاہور، سرہند، پاک پٹن، ملتان، اوچ، پانی پت اور دیگر مقامات بڑے بڑے صوفیہ و اولیا کے مرکز رہ چکے تھے۔ اور شیخ اسمٰعیل بخاری، سید علی ہجویری، بابا فرید، علاء الحق، جلال الدین بخاری، مخدوم جہانیاں اور دوسرے بزرگوں کے نام انتہائی احترام سے لیے جاتے تھے۔ اور ان کی پارسائی، پرہیز گاری اور شفقت کی وجہ سے ہندو مسلمان یکساں ان کے معتقد تھے۔ یہ زمانہ تھا جس میں نانک نے ان چشمہ ہائے معرفت سے اپنی پیاس بجھائی۔ نانک بھی کبیر کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملانا چاہتا تھا۔ جس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ان دونوں کو خدا کی توحید اور معرفت پر جمع کیا جائے اور ان مذہبی تفصیلات سے اجتناب کیا جائے جن سے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔

نانک نے ذاتِ باری تعالیٰ کی عظمت اور اس کے تمام صفات کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ کوئی مسلمان اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ وہ ذات پات کا سخت دشمن ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کے تمام بندے یکساں ہیں۔ اوہام پسندی، ضعیف الاعتقادی اور رسوم پرستی اس کے نزدیک بالکل لایعنی چیزیں ہیں۔ وہ واضح طور پر ''خدا'' کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس کو ویشنو، شیو، کرشن، رام وغیرہ کے پردے میں ملفوف نہیں کرتا۔ وہ ''اوتار'' اور ''حلول'' کے عقیدے کا منکر ہے۔ وہ ہندو سے کہتا ہے کہ تیرتھوں پر جا کر بے معنی رسوم ادا کرنا اور گنگا کے پانی کو پوتر جاننا اور چار وید اور اٹھارہ پران اٹھائے پھرنا بالکل بیکار ہے۔ جب تک معرفت الٰہی حاصل نہ ہو جائے۔ اور مسلمان سے کہتا ہے کہ شفقت کو اپنی مسجد، خلوص کو اپنا مصلیٰ اور عدل و انصاف کو اپنا قرآن بنا۔ حیا کو اپنا ختنہ، تہذیب کو اپنا روزہ، تقویٰ کو اپنا کعبہ، راستی کو اپنا مرشد اور عملِ نیک کو اپنی نماز بنا۔ جب جا کر تو مسلمان بنے گا اور اللہ تجھے آبرومند بنائے گا۔

نانک عمر بھر نیکی کی دعوت دیتا رہا۔ بدی سے احتراز کا وعظ کہتا رہا۔ ریاکاری، خود غرضی، دنیاداری اور جھوٹ کے خلاف آواز بلند کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تمام انسانوں کو اللہ کے دربار میں حساب دینا ہوگا۔ اور عمل نیک کے سوا کسی کی نجات نہ ہوگی۔ یعنی نانک کے نزدیک جزا و سزا کی شکل بھی وہی ہے جو اسلام نے تعلیم کی ہے۔ نانک نے اپنے کلام میں اکثر مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا کی ہے۔ اور قرآن کو چشمۂ ہدایت بتایا ہے۔ اس کو اسلام

کے کسی عقیدے سے بھی اختلاف نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے شمار مسلمان نہایت تیقن کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ گرونانک دراصل مسلمان تھے۔ صوفیہ و اولیا کی صحبت نے ان کو تصوف کا پیکر بنا دیا تھا اور اسی تصوف کے سایہ شفقت میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی بن کر رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

نانک کے بعد سکھ گروؤں کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔ یہاں تک کہ آخر میں مسلم حکومت سے سکھوں کا تصادم بھی ہوا۔ لیکن نانک کا بویا ہوا بیج ضائع نہیں ہوا۔ سکھ آج تک توحید کے قائل ہیں۔ ذات پات کو نہیں مانتے، بت پرستی کے دشمن ہیں۔ اور ان کی عبادت و ریاضت اور اوراد و وظائف کے طریقے بڑی حد تک مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں۔

بعد کے سادھو سنت

نانک کے بعد سولھویں اور سترھویں صدی میں بھی بے شمار ہندو سادھو سنت گزرے ہیں جنھوں نے اپنی تعلیمات میں اسلام کے بنیادی اصول و عقائد کی تائید کی ہے۔ اور تصوف سے ملتے جلتے عقائد پیش کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے میں کوشاں رہے ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند کی کتاب ''اسلام کا اثر ہندو ثقافت پر'' اس اعتبار سے معلومات ضروریہ کا خزانہ ہے اور راقم الحروف بھی اس فصل کے مندرجات کے لیے زیادہ تر اسی بیش بہا کتاب کا شرمندۂ احسان ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سولھویں اور سترھویں صدی کے سادھوؤں اور معلموں کے متعلق پوری معلومات جمع کر دی ہیں۔ اہلِ ذوق ان سے ہر وقت استفادہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں برہموں سماج اور آریہ سماج کی تحریکیں بھی اسلام کے اثرات کی صدائے بازگشت ہیں۔ کیشپ چندرسین، راجہ رام موہن رائے اور سوامی دیانند سرسوتی بھی وحدانیت کے قائل۔ بت پرستی کے مخالف، ذات پات کے امتیازات کو مٹانے والے اور ہندوؤں کو ہزارہا سال کی تاریک خیالی سے نجات دلانے والے لوگ ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ شنکر اچاریا سے لے کر سوامی دیانند تک تمام اکابر ہنود کی جدید تحریکات اسلام سے متاثر ہوئیں۔ جدوناتھ سرکار، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور بعض دوسرے حقیقت نگر ہندو مورخین نے نہایت صفائی سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ہندو دھرم

کی تجدید اسلام ہی کے اثرات کی ممنونِ احسان ہے۔

چوتھی فصل: تصوف ہندوستان میں

اس فصل میں فلسفۂ تصوف کے نظریات اور مختلف مسالک طریقت کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں۔ صرف ہلکا سا خاکہ پیش کرنا منظور ہے جس سے ہندوستان پر اسلامی تصوف کے اثرات کا اندازہ ہو جائے۔

اسلام نہایت سیدھا سادہ دین تھا۔ ترک دنیا اور رہبانیت اور فلسفیانہ موشگافیاں اس کے دائرے سے بالکل باہر تھیں۔ اس دین کا مقصد محض یہ تھا کہ بندگان خدا صرف خدائے واحد کی عبادت کریں۔ اخلاق کے فضائل اختیار کریں۔ رذائل سے مجتنب رہیں۔ غیر اللہ کے خوف سے آزار رہیں۔ اوہام پرستی، ضعیف الاعتقادی اور مادر پدر آزادی سے پرہیز کر کے دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کریں۔ اور تمام انسانوں کو مساوی سمجھیں۔

اوائلِ اسلام میں جہاد مسلمانوں کے تمام اعمال کا مرکز تھا۔ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے اور اس راہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کا جذبہ ہر مسلمان کے قلب میں جاگزیں تھا۔ وہ محض اللہ کے راستے میں سربکف ہو کر تلواریں مارتے تھے۔ مر گئے تو شہید، زندہ رہ گئے تو غازی۔ انسان ادراک اور جذبے کا مرکب ہے۔ مسلمانوں کے ادراک کی رہنمائی کلام الٰہی اور ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی تھی۔ اور وہ اس کو کافی و وافی سمجھتے تھے۔ باقی رہا جذبہ، تو اس کی تسکین نماز کے خشوع و خضوع اور جہاد کے جوش و خروش سے ہو جاتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ادراک اور جذبہ دونوں بے راہ روی سے محفوظ رہ کر اس راستے پر گامزن تھے جو خدا اور بندگان خدا کے نزدیک صراط مستقیم تھا۔

جب ابتدائی ملک گیری اور کشور کشائی کا دور ختم ہوا۔ مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ خوشحالی عام ہوئی۔ اور دنیوی آسائشیں میسر ہو گئیں تو ایک طرف عجمی افکار و خیالات نے دماغوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اور دوسری طرف جذبات بے راہ رو ہونے لگے۔ بعض نیک نیت بزرگوں نے اسلام کے اوامر و نواہی کو مسلمانوں کے سامنے تسلسل و تواتر سے پیش کیا۔ اور اپنی زندگیوں کو کتاب و سنت کے احکام کی تعمیل کا نمونہ بنایا۔ تاکہ مسلمان اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قائم رہیں اور گمراہ نہ ہونے پائیں۔ جہاد کی جگہ ''مجاہدہ'' نے لے لی۔ یعنی خارجی جہاد کے بجائے اب

داخلی جہاد کا رواج ہوا۔ زہاد و عباد کی کثرت ہوگئی۔ کوفہ اور بصرہ ان لوگوں کے مرکز تھے۔ ''صوفی'' کی اصطلاح سب سے پہلے ابو ہاشم کوفی کے لیے استعمال کی گئی۔ جن حضرات نے زہد و تقویٰ کی اس تحریک کو اپنے خیالات و تلقینات سے تقویت دی ان میں امام جعفر صادق، حسن بصری، اویس قرنی، داؤد طائی، شقیق بلخی، ابراہیم بن ادھم، رابعہ عدویہ، حبیب عجمی، ابوحنیفہ نعمان، الخراز اور فضیل بن عیاض کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات ''طریقت و معرفت'' کی پیچیدگیوں میں نہ پڑتے تھے۔ بلکہ زہد و تقویٰ اور حسن عاقبت کی فکر میں رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جذباتی اور وجدانی رجحانات کی تربیت بھی کر رہے تھے۔

تیسری صدی ہجری کے بعد تصوف نے جو صورت اختیار کی۔ اس کو اصل اسلام سے بہت کم تعلق تھا۔ شیعہ اور معتزلہ نے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے عقائد سے انحراف کر کے اپنے بعض نظریات قائم کر رکھے تھے جن میں تصوف کے جراثیم موجود تھے۔ چنانچہ جب تصوف نے فلسفے کا جامہ پہنا تو وہ نظریات پوری قوت سے سامنے آ گئے نوافلاطونی فلسفہ وحدت الوجود کو ساتھ لایا۔ اور جب یونانی علوم کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوکر عام ہوگئیں تو عمل صالح کی جگہ فکر نے لے لی۔ اور دین کے حقائق فلسفے کی کسوٹی پر کسے جانے لگے۔ صوفیہ کے متعدد گروہ ہوگئے جو اپنے اپنے شیوخ کی قیادت میں گوناگوں عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔ کہیں قساری تھے، کہیں ملامتی، کہیں سہلی، ترکِ دنیا، نفس کشی اور رہبانیت کا مذاق عام ہوگیا۔ بعض حلول اور تناسخ تک کے قائل تھے۔ مسلمان فلسفی مثلاً الکندی، فارابی، اخوان الصفا، ابن مسکویہ، بوعلی سینا، ابن ماجہ، ابن طفیل، ابن رشد تمامتر یونانی فلسفہ سے متاثر تھے۔ انہی کی وجہ سے اسلام میں ذہنی انارکی پھیلی۔ اور طرح طرح کے مسلک پیدا ہوگئے۔ حسین بن منصور حلاّج، محی الدین ابن عربی، عبدالکریم جیلی نے وحدت الوجود کو خوب پھیلایا۔ اور اس قدر پیچیدہ بحثیں کیں کہ زمانے کے علماء و فضلا ان سے مرعوب ہوگئے۔ اور منصور تو بالکل ہی حد سے متجاوز ہوجانے کی وجہ سے سزائے موت کا مستوجب قرار پایا۔ عربی اور فارسی کے اکثر شعرا مثلاً ابوسعید ابوالخیر، ابوالعلا معری، عمر خیام وغیرہم بھی تصوف ہی کے پردے میں ملحدانہ خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ جن کا اسلام کے حقیقی عقائد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ وہ خیالات اکثر اسلام کے خلاف تھے۔ ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ، شہاب الدین سہروردی کی حکمۃ الاشراق کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیالات پر فلوطینیس، مانی، زروشت اور بدھ کے افکار و عقائد کا نہایت گہرا اثر ہے۔

امام غزالی عالم اسلام کے فلسفیوں وصوفیوں میں بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے تحصیل علوم کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد تشکک میں مبتلا ہوگئے۔ آخر ان پر انکشاف ہوا کہ فلسفہ و کلام سے حصول علم ناممکن ہے۔ علم حقیقت عقل اور منطق سے نہیں بلکہ محض وجدان سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس انکشاف سے ان کے قلب کو اطمینان حاصل ہوا۔ اور انھوں نے اپنے وطن طوس میں ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ بنائی اور اپنی مشہور کتاب ''تہافت الفلاسفہ'' لکھی۔ جس میں فلسفیوں کے افکار کا بڑی شدت سے ردّ کیا۔

دنیائے اسلام میں عقیدۂ وحدت الوجود اور اس کے متعلقات کی ترویج کا اثر نہایت خطرناک ثابت ہوا۔ اس سے عمل کی روح بے حد کمزور ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں خدا ہے۔ لہٰذا خدا کی عبادت ہر طریقے سے کی جاسکتی ہے۔ پتھر، جانور، آگ، پانی، ہوا، انسان، غرض کسی کی بھی پرستش کی جائے وہ خدا ہی کی پرستش سمجھی جائے گی۔ کیوں کہ سب اشیاء مخلوقات میں خدا موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفیانہ عقیدے اور اسلام کے عقیدۂ توحید میں بُعد المشرقین اور شدید تضاد ہے۔ لیکن تاویل پیشہ علماء و مصنّفین نے ان دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ مُلّا جامی نے 'لوائح'' لکھی، حکیم سنائی، شبستری، فریدالدین عطار، جلال الدین رومی، غرض بڑے بڑے عالی قدر مصنّفین وشعرا نے نظریاتی اعتبار سے تصوف کو انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اور وحدت الوجود کو زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول بنانے میں مصروف رہے۔

تصوف اور وحدت الوجود کے علم برداروں میں شطحیات وخرافات اور الحاد و زندقہ کے مرتکبین بھی کثرت سے موجود تھے۔ لیکن اکابر علماء و مشائخ نے تصوف کو شریعت حقہ اسلامیہ سے قریب تر رکھنے کے لیے اپنی زندگیوں میں بڑا اہتمام کیا۔ اورانھی کی پارسائی اور پرہیز گاری کا یہ اثر ہے کہ معتبر ترین سلاسل تصوف اب تک شریعت مصطفویہ کے حلقے سے باہر نہیں جاسکے۔ صوفیہ کا عام نصب العین یہ ہے کہ روح انسانی ذات واجب الوجود میں جذب ہوجائے۔ پابندِ شریعت صوفیوں کے نزدیک اس نصب العین کے حصول کے تین مدارج ہیں۔ اوّل شریعت کی اطاعت۔ سب سے پہلے سالک گناہوں سے توبہ کرے۔ پھر ایمان، طہارت، صوم، صلوٰۃ، حج کی بجا آوری اختیار کرے۔ دوم طریقت، خلوت، روزہ داری اور سکوت سے نفس امارہ کے تقاضوں مثلاً جہل، کبر، حسد، ظلم، غیظ اور خواہشات نفسانی کو زیر کرے۔

تیسری منزل ''معرفت'' کہلاتی ہے۔ اس منزل پر عقل و استدلال کو ترک کردینا پڑتا ہے اور روح محض اللہ تعالیٰ کے فیضان وعنایت سے واجب الوجود کا عرفان حاصل کرسکتی ہے۔ یہاں پہنچ کر سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ خالق ومخلوق کی دوئی محض دھوکا ہے۔ اور اعمال صالح اور ان کی جزا بیکار ہے۔ یہاں سالک کو مخلوقات سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

پھر صرف معرفت ہی کافی نہیں۔ بلکہ اس کے بعد فنا کا درجہ ہے۔ جو بالآخر بقا کی طرف لے جاتا ہے۔ ''فنافی اللہ'' اور ''بقا باللہ'' یعنی سالک کی ذات بالکل فنا ہوکر ذات واجب الوجود میں جذب ہوجاتی ہے جس کو بقائے جاودانی حاصل ہے۔

سالک کے بعض مقامات و احوال بھی ہیں۔ مثلاً مقامات سات ہیں:

توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، توکل، رضا۔

احوال دس ہیں:

مراقبہ، قرب، محبت، خوف، رجا، شوق، انس، اطمینان، مشاہدہ، یقین۔

مقامات سالک کو خود طے کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن احوال ذات واجب الوجود کے فیض وعنایت پر موقوف ہیں۔

ہر سالک وصوفی کے لیے مرشد اور شیخ ضروری ہے۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ جس شخص کا کوئی مرشد نہیں اس کا امام شیطان ہے۔ اطاعت شیخ پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ وہ ذوالنون مصری کے اس قول سے ظاہر ہے کہ سچا مرید شیخ کی اطاعت کو اطاعت الٰہی سے بھی ضروری سمجھتا ہے۔ دین اسلام نے تو اطاعت صرف احکام خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود کردی تھی۔ لیکن تصوف نے اس کو شیخ کی طرف منتقل کردیا۔ یہاں تک کہ تصور شیخ کو بھی جزو عبادت و ریاضت قرار دے دیا۔

اسلام میں تو صوفیہ کے اذکار و اشغال کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن تصوف نے ذکر خفی اور ذکر جلی اور خدا جانے کس قدر اور اذکار و اشغال واجب قرار دے دیئے ہیں۔ یہ اذکار جوگیوں کے ''پرانایام'' سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جس کو تصوف میں ''پاس انفاس'' کہا جاتا ہے۔ ہندو جوگی سانس روک کر ''اوم'' کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نقشبندیوں کے ہاں مرید اپنی آنکھیں اور منہ بند کرلیتا ہے اور اپنی زبان تالو سے چپکا لیتا ہے۔ سانس کو روک کر دل میں ذکر کرتا ہے۔ ''لا'' کو [illegible] طرف لے جاتا ہے ''الٰہ'' کو [illegible] طرف اور پھر ''الا اللہ'' [illegible] ب

قلب پر لگاتا ہے۔

عشقِ الٰہی کے جذبے کو تیز کرنے کے لیے صوفیہ نے رقص و سماع کو بے حد مفید بتایا ہے۔ اور سماع کے تو قریب قریب تمام صوفیہ قائل ہیں۔ مختلف مسالک میں تھوڑا بہت تفاوت ضرور ہے۔ مثلاً نقشبندی سماع کو جائز سمجھتے ہیں لیکن مزامیر کے روادار نہیں۔ چشتیوں اور سہروردیوں کے نزدیک سماع و مزامیر ذکر الٰہی کا ضروری جزو ہیں۔ ہجویری سماع کے قائل ہیں البتہ ''پائے بازی'' کو درست نہیں سمجھتے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو یعنی فرقہ مولویہ کے درویش باقاعدہ رقص کرتے ہیں۔ دوسرے سلسلوں میں رقص کی اجازت تو نہیں لیکن وجد و حال کی صورت میں رقص پر کوئی معترض نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایک اضطراری کیفیت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں اسلام کے ورود کے بعد ہندو دھرم میں جو نئی تحریکات پیدا ہوئیں ان کا ذکر گزشتہ فصل میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا تصوف بے حد پسند آیا۔ چونکہ تصوف کے اکثر اجزا مثلاً وحدت الوجود، متصوفانہ الحاد، ترک دنیا، نفس کشی، ریاضت، اطاعت شیخ، پاس انفاس، رقص، سماع، ہندوؤں میں ویدانت، یوگ اور بھگتی کی وجہ سے پہلے ہی موجود تھے۔ اور نروان، آٹھ درجے، یوگ، ابھیاس اور چمتکار یعنی فنا و بقا، طریقہ و سلوک، مراقبہ اور کرامت کی اصطلاحات سے بھی ہندو بیگانہ نہ تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے تصوف نے اپنے بعض اجزا آریائی مآخذ مثلاً یونان، ایران اور ہندوستان سے حاصل کیے تھے۔ اس لیے تصوف کو ہندوستان میں بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ بھگتی مارگ کے بڑے بڑے ہندو معلمین کی تعلیمات تصوف کے اثر سے شرابور تھیں۔ علاوہ بریں کبیر، نانک، رائے داس، دادو، ملوک داس، سندر داس اور دوسرے ہندو درویش عربی و فارسی میں جاہل ہونے کے باوجود اپنے کلام میں تصوف کی اصطلاحات مثلاً ناوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، ہاہوت، معرفت، شریعت، طریقت، عرش، مرشد، مرید، آیات، فرقان، نور، جمال، حیرت، حضور، عاشق، حبیب، مقام، حال بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور عامہ ہنود انھیں بلا دقت سمجھتے ہیں۔

جب قوموں کے قوائے عمل میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ جنگ و جہاد ملک گیری اور کشور کشائی کا ولولہ باقی نہیں رہتا۔ تو تصوف خوب پھولتا پھلتا ہے اور مسجدوں کے بجائے خانقاہیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ہندو قوم کی کیفیت بھی یہی ہوئی۔ جب راجپوت حکومتیں مسلمانوں کے حملوں کے سامنے ریت کی دیواروں کی طرح بیٹھتی چلی گئیں۔ اور قوت کی بحالی کا بظاہر کوئی امکان باقی

نہ رہا تو بھگتی اور تصوف کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ اور سادھو سنتوں کی تعلیم کے خواب آور اثرات جنوب سے شروع ہو کر شمال تک پھیل گئے۔ مندر ویران اور مٹھ آباد نظر آنے لگے۔ آج ہندو ان تحریکات اور ان اثرات کو اپنی ثقافت کا قابل فخر جزو قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کا وجود بھی مسلمانوں ہی کے تصوف کا ممنون احسان ہے۔

حواشی

[۱] برنی، تاریخِ فیروز شاہی، ۱۰۶، ۲۱۶، ۶۸۷، ۵۸۸۔

[۲] علی گڑھ منتھلی، اکتوبر-دسمبر، ۱۹۳۱ء، ص ۸۔

[۳] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد دوم، ۸۸-۸۹۔

[۴] تاریخِ فیروز شاہی، ۲۹۱۔ فرشتہ، جلد اوّل، ۱۰۹۔

[۵] اشتیاق قریشی، بحوالہ ''فتاوئے جہانداری''، ۲۲۶-۲۲۷۔

[۶] طبقاتِ اکبری، ص ۱۷۰۔

[۷] عباس سروانی، تاریخ شیر شاہی۔

[۸] ہسٹری آف مسلم رول، ۳۴۱۔

[۹] تذکرۃ الواقعات، جوہر، ترجمہ انگریزی، ۱۲۰-۱۲۱۔

[۱۰] ماخوذ از شباب کشمیر، منشی محمد دین فوق۔

[۱۱] توزکِ جہانگیری (واقعات ۱۰۲۸ھ)۔

[۱۲] مغل ایمپائر بابر سے اورنگ زیب تک (۲۸۶ سے ۲۹۸ تک)۔

[۱۳] آرکائیوز آف دی مغل ایمپائر، باب چہارم۔

[۱۴] ہندی ثقافت پر اسلام کا اثر، ڈاکٹر تارا چند، ۳۴-۳۶۔

[۱۵] ہندو ثقافت پر اسلام کا اثر، ڈاکٹر تارا چند۔

[۱۶] ہندو ثقافت پر اسلام کا اثر، ڈاکٹر تارا چند، ص ۱۱۹۔

[۱۷] ہندو ثقافت پر اسلام کا اثر، ڈاکٹر تارا چند، ص ۱۴۵۔

[۱۸] دبستانِ مذاہب، محسن فانی (ترجمہ)، ۱۸۶۔

آٹھواں باب

اَلسنۂ فارسی و اُردو

پہلی فصل: مقامی زبانوں پر فارسی کے اثرات

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں کوئی ایک ہزار سال تک فارسی سرکاری و درباری زبان رہی۔ اور تصنیف و تالیف اور تخلیقی ادب پر بھی اسی زبان کا قبضہ رہا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کی ثقافت اہلِ ہند کے تمام شعبہ ہائے حیات پر اثر انداز ہورہی تھی۔ اور زبان ثقافت کا اہم ترین جزو ہے اس لیے ہندوستان کی صوبائی اور علاقائی زبانوں میں بھی فارسی کے اثرات نفوذ کر گئے۔ کشمیری، پشتو اور بلوچی زبانیں تو اس ملک میں مسلمانوں کے ورود سے پیشتر بھی فارسی سے رابطہ رکھتی تھیں اور سندھ کے تعلقات بھی ایران کے ساتھ قدیمانہ تھے۔ اس لیے ان زبانوں میں فارسی الفاظ کے شمول اور عجمی اسالیب بیان کے رواج پر چنداں تعجب نہیں ہوتا۔ لیکن ملتانی، پنجابی، برج بھاشا، بنگالی، مرہٹی، گجراتی اور بعض دوسری زبانوں کے ادبیات کا فارسی سے متاثر ہونا حقیقتاً حیر انگیز ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اس ملک کے باشندوں سے مسلمانوں کے میل جول اور ربط و ضبط کی وجہ سے ان کی زبانوں میں بھی اختلاط شروع ہوگیا۔ اور چونکہ فارسی حکمران طبقے کی زبان تھی اس لیے صوبائی زبانوں نے اس کے الفاظ کو اخذ کرنا موجب فخر خیال کیا۔ کیوں کہ زمانے کی اقدار ثقافت کا تقاضا یہی تھا۔

اب ہم مختصراً بعض مقامی زبانوں میں فارسی کے نفوذ کا ذکر کریں گے۔

کشمیری

کشمیر کی ایران سے مشابہت مسلّم ہے۔ بلکہ کشمیر کو ''ایرانِ صغیر'' کہا گیا ہے۔ اس ملک کا قدرتی ماحول۔ اس کے موسموں کے تغیرات اس کے درختوں اور پھولوں کی یکسانی اس کو بڑی

حد تک ایران کا نمونہ ظاہر کرتی ہیں۔ پھر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ایسے مقام پر واقع تھا جہاں ایرانی ثقافت کے اثرات ہمیشہ سے موجود تھے۔ چوں کہ کشمیر میں اسلام ان حضرات کی وساطت سے داخل ہوا جو فارسی بولتے تھے اور اس وقت اسلام کی پشت پر کوئی سیاسی دباؤ نہ تھا کہ فارسی کشمیر میں صرف سرکاری زبان بن کر رہ جاتی۔ بلکہ متصوفین نے اپنا اثر براہ راست عوام تک پہنچایا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کشمیری زبان نے فارسی کی تشبیہیں، فارسی کے استعارے، اور فارسی کی ترکیبیں بے تکلف اختیار کرلیں۔ بلکہ کشمیر کے اوزان و بحور، اس کے اصنافِ سخن، اس کے قافیہ و ردیف سب کے سب فارسی سے مستعار ہیں۔ اور فارسی کے الفاظ تو صرف شاعری ہی میں نہیں عوام کی زبان پر بھی بے شمار ہیں۔

شیخ نورالدین کی ایک رباعی بہ زبان کشمیری ملاحظہ ہو۔

تیرن تھندن دار نہ‌نہٖ سپر
کرتل چھوکن پھر زِنہ روئی
بلایہ تھزہ وند زہ شکر
اَدہ چھوئی یتہٖ کیوءِ تتہ آبروئی

ترجمہ:

اس کے تیروں کے آگے سپر نہ ڈالو۔ اور نہ اس کی تلوار کی ضرب سے منہ موڑنا ٹھیک ہے۔ اس کی بھیجی ہوئی بلاؤں کو شکر سمجھو۔ جبھی اس زندگی میں اور اس کے بعد آبرو پاؤ گے۔

ان اشعار کا اسلوب بیان قطعاً فارسی ہے۔ اور پھر اس میں تیر، سپر، روئی، بلا، شکر، آبرو فارسی کے الفاظ ہیں۔

پھر یہی نہیں کہ فارسی کا یہ اسلوب بیان صرف اس وقت کشمیری میں رائج ہوا جب مسلمانوں کو اپنے مسائل کے بیان کی ضرورت داعی ہوئی۔ بلکہ کشمیری پنڈتوں کی نہایت ہر دل عزیز شاعرہ شریمتی ارنہ مل لکھتی ہیں:

ربہ تلہ کاوتل ہا سُنبلو
ینبرزل پیالہ ھیتھ پراران چھئی
ھی تھرچس نہ بیہ نو پھلیو
کنہ رن پھللہٗ ملہ یُو بُو

ترجمہ:

اے میرے سنبل۔ تم مٹی سے سر اٹھاؤ۔ میں نرگس ہوں اور اپنا پیالہ لے کے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ میں چمیلی کا پودا ہوں۔ اور پھر میرے شگوفے نہیں پھوٹیں گے۔ اے میرے محبوب آؤ میں تمھیں عطر میں بسا دوں۔

یعنی وہی سنبل و نرگس، وہی پیالہ اور شگوفہ اور وہی اظہارِ عشق جو فارسی شاعری کی جان ہے، یہاں بھی موجود ہے۔

کشمیری زبان کے ادب میں جو قصوں کی کتابیں ہیں وہ بھی زیادہ تر انہی موضوعات سے متعلق ہیں جو فارسی میں عام ہیں۔ مثلاً محمود گامی کے قصے، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، شیریں خسرو، ہارون رشید، وامق و عذرا (سیف الدین)، گلریز (مقبول شاہ کرالہ داری)، ہارون رشید، محمود غزنوی (عزیز اللہ حقانی)، رستم سہراب (وہاب پرے)۔

محمود گامی اور خواجہ حبیب اللہ نوشہروی کی غزلیں اور نظمیں عشق و تصوف میں بے نظیر ہیں۔ اور از سر تا پا فارسی کے استعارات اور فارسی کی تشبیہوں، اور فارسی کے انداز فکر سے معمور ہیں۔ ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری زبان فارسی انداز بیان کے سوا اور کوئی اسلوب تسلیم ہی نہیں کرتی۔

پشتو

پشتو پر فارسی کا اثر بیان کرنا بالکل تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تاریخ لسانیات کے ماہرین پشتو اور قدیم فارسی کو بالکل ایک دوسری کی بہنیں قرار دیتے ہیں۔ اور بعض کا تو خیال یہ ہے کہ ژندواوستا اور پشتو آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ فارسی کا قدیم ماخذ ژندواوستا ہی ہیں جو ارتقا پذیر ہوتے ہوتے ایران کی موجودہ زبان بن گئیں۔ اب ایک تو پشتو پر فارسی کا اثر ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود سے بہت پہلے موجود تھا۔ پھر اکثر مسلمان فاتح انہی علاقوں میں سے گزر کر ہندوستان میں داخل ہوئے جن کی زبان پشتو تھی۔ اور پشتونوں نے سب سے پہلے ان فاتحین سے ربط ضبط پیدا کیا۔ لہٰذا پشتو اور فارسی کا تعلق روز افزوں ہوتا گیا۔ اور پشتو نے فارسی کے اثرات کو سب زبانوں سے زیادہ قبول کیا۔ پشتو کے مصادر ان کے مشتقات اور گردانیں ملاحظہ ہوں تو ان اثرات کا نہایت روشن ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً فارسی میں دیدن، پشتو میں

لیدل، فارسی میں خوردن۔ پشتو میں خوڑل۔ فارسی میں کنم پشتو میں کوم۔ فارسی میں بینم۔ پشتو میں وینم۔ فارسی میں خورم۔ پشتو میں خورم۔

فارسی کے ثقافتی اثرات سے پیشتر پشتو میں صرف صنف شعر کا سراغ ملتا ہے۔ اور وہ ہے ٹپہ (یعنی صرف ایک مصرع کی نظم) لیکن فارسی سے رابطہ ہونے کے بعد اس زبان میں فارسی کے تمام اسالیب سخن راہ پا گئے اور قصیدہ، مرثیہ، غزل، رباعی، مثنوی سب کی سب اصناف رائج ہوگئیں۔ اور پھر انداز تخیل بھی کاملاً فارسی رنگ اختیار کر گیا۔ آج کل آپ پشتو نظم و نثر کا کوئی ٹکڑا بھی اٹھا کر دیکھیے۔ اس میں فارسی کے الفاظ بے شمار نظر آئیں گے۔

بلوچی

بلوچستان چونکہ ایران کے ساتھ ملا ہوا واقع ہے۔ اس لیے فارسی اور بلوچی میں بہت کم فرق ہے۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچی ایران ہی کی مختلف بولیوں میں سے ایک بولی ہے۔ بعض اوقات کوئی شستہ ذوق بلوچی اپنی زبان میں بات کر رہا ہو۔ تو فارسی جاننے والے اس کے اکثر الفاظ کو سمجھ لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بلوچ ایک شامی قوم ہے جو بنو امیہ کے خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں حلب سے ہجرت کر کے ایران و مکران میں آباد ہوگئی۔ پھر ان کے چوبیس قبیلوں نے ایک حاکم مکران سے ناراض ہوکر میر جلال خاں کی قیادت میں سندھ، ڈیرہ غازی خاں، پنجاب اور بلوچستان کے علاقوں میں سکونت اختیار کر لی۔ چونکہ یہ قوم مدتوں ایران میں رہ چکی ہے اس لیے اس کی زبان میں فارسی کے بے شمار الفاظ موجود ہیں۔ اور پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے باعث اس کو اور بھی تقویت پہنچی۔ اور بلوچوں میں عشقیہ اور رزمیہ نظمیں لکھنے والے متعدد شعرا پیدا ہوگئے۔ جن کا اسلوب خالص ایرانی تھا۔

لیکن یہ امر بالکل واضح ہے کہ بلوچی بڑی حد تک فارسی ہے۔ اس میں بیا، برو، کجا، چہ، کے، چوں، نان، آب، خوراک، پوشاک، گوشت، پوست، کار، کردار جیسے الفاظ بالکل فارسی کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "اگر ایک فارسی دان شخص کے سامنے جو بلوچی زبان سے ناآشنا ہے۔ یہ بلوچی مصرع پڑھا جائے۔

اے کبوتر کاغذے تو خدمت دوستا ببر

تو وہ فارسی دان فوراً یہی کہے گا کہ بھائی! یہ تو صاف بلوچی ہے۔"[1]

پنجابی

پنجابی سب سے پہلی زبان ہے جس سے فارسی بولنے والوں کا رابطہ استوار ہوا۔ کیوں کہ شمال مغرب سے آنے والا ہر فاتح پہلے پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھتا تھا۔ فارسی کی زبان عربی الفاظ کے شمول سے نہایت وسیع و مؤثر زبان بن گئی تھی۔ پنجابیوں نے بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ خلا ملا میں فارسی اور عربی کے بے شمار الفاظ سیکھے۔ جو صرف ان کے ادب و شعر ہی میں نہیں بلکہ عوام کی زبانوں پر بھی بے تکلف، رواں ہو گئے۔ آج بھی جب ایک ان پڑھ بھکاری پنجابیوں کے سامنے یہ صدا لگاتا ہے کہ

"بابا! گریب متھاج نوں نذر اللہ نیاز حسین ایک پیسہ دے جا"

تو وہ ایک فقرے میں سات آٹھ عربی کے الفاظ کہہ جاتا ہے۔ عام پنجابیوں کی زبان پر زمین، آسمان، صبح، شام، زندگی، موت، رنج، خوشی اور اسی قسم کے بے شمار الفاظ رواں ہیں۔ جو فارسی کے ورود سے قبل بالکل معدوم تھے۔ اور ان کی جگہ جو الفاظ زمانہ قدیم میں بولے جاتے تھے، وہ قطعاً متروک بلکہ فراموش ہو چکے ہیں۔

مقبول عام شعرا ہمیشہ وہی زبان اختیار کرتے ہیں جس کو عوام سمجھ سکیں۔ پنجاب کا مقبول ترین شاعر وارث شاہ ہے۔ ذرا اس کی ہیر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہیر آکھیا عشق دے راہ پوناں نہیں کم ملوانیاں قاضیاں دا
ایس عشق میدان دے کٹھیاں نوں درجہ ملے شہیداں تے غازیاں دا
تُرت وچ درگاہ قبول ہووے سجدہ عاشقاں پاک نمازیاں دا
راہ حق دے جان قربان کرنی ایہہ کم نہیں جھوٹھیاں پازیاں دا
کرکے قول زبان تھیں ہار جانا کم بے ایماناں دھوکے بازیاں دا
عشق سر ہے ذات خدائی دا وے عاشق شان ویکھن کارسازیاں دا
رانجھا نال ایمان قبولیا میں قصہ ختم کر دور درازیاں دا
رانجھا چھڈ کے انگ نہ لاں کھیڑا ہوندا گدھے نوں حق نہ تازیاں دا
رانجھا چھڈ کے انگ نہ لاں کھیڑا ہوند گدھے نوں حق نہ تازیاں دا

یعنی ان آٹھ مصرعوں میں عربی فارسی کے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

عشق، راہ، قاضی، درجہ، شہید، درگاہ، غازی، درگاہ، قبول، سجدہ، عاشق، پاک، نمازی، حق جان، قربان، زبان، بے ایمان، سر، ذات، خدا، شان، کارسازی، دور دراز، قصہ، تازی۔

بلھے شاہ پنجابی کا صوفی شاعر ہے۔ وہ بھی اپنی سادہ سی بات مستی کے ساتھ کہتا ہے تو اس پر بھی فارسی زبان اور ایرانی تصوف چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جے ظاہر کراں اسرار تائیں
سب بھل جاون تکرار تائیں
پھر مارن بلھے یار تائیں
ایتھے مخفی گل سوہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی ای
اک لازم بات ادب دی اے
سانوں بات معلومی سب دی اے
ہر ہر وچ صورت رب دی اے
کہوں ظاہر کہوں چھپیندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے
جدوں ظاہر ہوئے نور ہوریں
جل گئے پہاڑ کوہ طور ہوریں
تدوں دار چڑھے منصور ہوریں
اوتھے شیخی نہ میںڈی تینڈی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

بلھے شاہ اپنے مذکورہ شعروں میں عربی فارسی کے الفاظِ ذیل بے تکلف استعمال کر گئے ہیں: ظاہر، اسرار، تکرار، یار، مخفی، لازم، ادب، معلوم، صورت، رب، نور، کوہ طور، دار، منصور۔

ملتانی

ملتانی بولی ایک نہایت فصیح زبان ہے۔ محققین کے نزدیک اسی کی آمیزش سے اردو زبان وجود میں آئی ہے۔ اس کو ''لہندا'' بھی کہتے ہیں۔ اس زبان کے جلیل القدر شاعر خواجہ غلام

فرید چاچڑاں والے اپنے کلام میں بے شمار فارسی کے الفاظ اس قدر حسن و خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ کہ ''لہندا'' میں بالکل اجنبی معلوم نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک کافی ملاحظہ ہو۔

نازک ناز نگاہ سجن دے
عشوے غمزے من موہن دے
لگڑے کاری تیر دو
سے سینے چُھدے پل پل پھل
سسّی شوہدی پَیر پیادی
ناں تیر تاڑے جھوک آبادی
مٹھڑی بے تقصیر دو
ناں خرچ پلے نہ گنڈھ سمل

لہذا دیس کے عام لوگوں کا ذخیرۂ الفاظ فارسی ملاحظہ ہو۔ یہ لوگ نازک، ناز، نگاہ، عشوہ، غمزہ، تیر، سینہ، پیادہ، آبادی، تقصیر، خرچ جیسے الفاظ کو خوب سمجھتے ہیں۔ جبھی ان کے مقبول ترین شاعر نے ان الفاظ کو بے تکلف اپنی کافی میں باندھ دیا ہے۔

پنجابی میں فارسی کے بے شمار الفاظ تو اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جو ماحول اور طبعی حالات کے ماتحت ذرا شکل بدل کر رائج ہوگئے ہیں۔ مثلاً ''شاہلا جیویں'' کی دعا دراصل ''انشاء اللہ جیویں'' ہے۔ اور ''شاہلا'' اس قدر عام ہوگیا ہے کہ خود بولنے والوں کو بھی معلوم نہیں۔ کہ یہ اصل میں کیا تھا۔ طرح کی جگہ طراں سادہ کی جگہ سادی وغیرہ کئی ایسے الفاظ ہیں۔ صوفی تبسم لکھتے ہیں:

''تریجہ پنجابی میں اس پھل کو کہتے ہیں جو پک کر خود بخود شاخ سے گر جاتا ہے۔ اور بچے اٹھا کر کھا جاتے ہیں۔ یہ تریجہ فارسی کے لفظ ''تہ ریزہ'' سے بگڑا ہے۔''

''اَلفتا'' پنجابی میں شریر آدمی کو کہتے ہیں۔ حالانکہ ''اَلفتیٰ'' عربی میں جوانمرد تھا۔ اور جہاں کسی بلند پایہ آدمی کا ذکر آتا تھا اس کو الفتی کہتے تھے۔ پنجابی میں لفظ کی شکل صورت قریب قریب سلامت رہی۔ لیکن معنی بدل گئے۔ جیسے اردو میں ''بڑے حضرت ہیں'' اور ''صلواتیں سنانا'' کے محاورات میں ''حضرت اور صلوات'' جیسے پاکیزہ لفظوں کی مٹی پلید کی گئی ہے۔

پنجابی ادب و شعر میں زیادہ تر تشبیہات، استعارات اور اشارات فارسی سے آئے ہیں۔

اور اس کا ظاہر و باطن واضح طور پر فارسی سے ملتا ہے۔

سندھی

ایران سے سندھ کے تعلقات بہت قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ کیانی، ہخامنشی اور ساسانی بادشاہوں کے زمانے میں سندھ ایران کی ایک باجگزار ریاست تھی۔ سندھ میں مسلمانوں نے برہمن آباد کی جگہ ایک شہر منصورہ آباد کیا تھا۔ یہ برہمن آباد حقیقت ''بہمن آباد'' تھا جس کو زمانۂ قدیم میں ایران کے شہنشاہ بہمن دراز دست نے آباد کیا تھا۔ ظہور اسلام کے بعد جب عرب فوجیں ایران پر حملہ آور ہوئیں تو مؤرخین نے لکھا ہے کہ سندھ کے راجا نے شاہ ایران کی امداد کے لیے اپنی فوج بھیجی تھی۔ بلکہ وہ راجا سندھ ہی کا فیل سفید تھا جو عربوں کے خلاف ایران کے ہاتھیوں کے دستے کی قیادت کر رہا تھا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کی فوج میں ایرانی سپاہی بھی شامل تھے۔ جو شیراز سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ غرض ایران و سندھ کے تعلقات مدت دراز سے چلے آتے تھے اور سندھی زبان بھی ایرانی اثرات اخذ کر رہی تھی۔

عباسیہ خاندان کے خلیفہ المعتمد نے سندھ اور مکران کو ایران کے صفاریوں کے سپرد کر دیا۔ اور پہلے حاکم سندھ یعقوب بن لیث صفاری نے فارسی کو سندھ کی سرکاری زبان قرار دیا۔ پانچویں صدی ہجری میں سندھ دولت غزنویہ کا باجگزار تھا۔ اور سندھ اور غزنی کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس زمانے میں بھی سندھ میں فارسی رائج تھی۔ اور ملتان کی مسجدوں میں خطبات جمعہ فارسی زبان میں پڑھے جاتے تھے۔

اس کے بعد ساتویں یا آٹھویں صدی ہجری میں سندھی زبان کے ادب کا آغاز ہوا۔ لیکن سومروں، سموں، ارغونوں، ترخانوں کے عہد میں سرکاری اور علمی زبان صرف فارسی رہی۔ اور سندھی ادب بالکل ابتدائی حالت میں رہا۔ البتہ کلہوڑوں کے دور میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسا صوفی اور جلیل القدر شاعر پیدا ہوا جس کا سارا سندھی کلام فارسی کے اثرات کا آئینہ دار ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی صوفی تھے۔ قرآن حکیم اور مثنوی مولانا روم کا باالتزام مطالعہ فرماتے تھے۔ مثنوی کے بعض اشعار کا ترجمہ انھوں نے سندھی میں کیا۔ بلکہ چینیوں اور رومیوں کا قصہ بھی مثنوی ہی سے اخذ کر کے اپنے مشہور رسالے میں شامل کیا۔ جس کو ''شاہ جو رسالہ'' کہتے ہیں۔

چوں کہ سندھ میں ایران کے اکثر علماء شعرا اور ادبا بھی آتے رہے۔ سرکاری درباری زبان بھی فارسی رہی۔ سندھیوں کے ذوق تصوف نے ان کو ہمیشہ رومی، جامی، عطار کا شیفتہ بنائے رکھا۔ اور عام سندھیوں کی تعلیم فارسی ہی کی کتابوں سے ہوتی تھی۔ اس لیے سندھی زبان کی شاعری فارسی اصطلاحات اور محاورات سے بھرپور رہی۔ اور فارسی و عربی کے صدہا الفاظ سندھی میں شامل ہوگئے۔ سندھی نثر میں زیادہ تر قصے وہی ہیں جو فارسی سے آئے تھے۔ مثلاً حاتم طائی، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، امیر حمزہ، چہار درویش، گل بکاؤلی وغیرہ۔

سندھی میں کم از کم پچیس فی صدی الفاظ فارسی کے ہیں۔ چند عام الفاظ ملاحظہ ہوں جو سندھ کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ آب، آبادی، آتش بازی، بادشاہ، بازی گر، پیالہ، دامن، دیگ، پروانہ، برباد، آباد، بیزار، بیدار، بیباک، پاک، تازہ، خوش، چست، چالاک، روشن، تاریک، ہوشیار، بے خبر، دو آتشہ، سہ آتشہ۔

عربی الفاظ بھی بے شمار ہیں۔ غرض سندھی بھی پنجابی کی طرح فارسی سے بے انتہا متاثر ہوئی ہے۔ اور اس کے اسالیب بیان، اس کے استعارے، اس کی تشبیہیں، اس کی ترکیبیں زیادہ تر فارسی سے ماخوذ ہیں۔

ہندی بھاشا

اُردو زبان کی تاریخ کا بیان تو اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں ہمیں یہ بیان کرنا ہے کہ برج بھاشا اور دوسری بھاشائیں جو زمانۂ قدیم میں شمالی ہند کے بعض علاقوں میں بول جاتی تھیں۔ بہت جلد فارسی سے متاثر ہوئیں۔ پرتھی راج راسا جو ہندی کے مشہور شاعر چندر بروائی کی تصنیف ہے زیادہ تر شہاب الدین غوری اور پرتھی راج کی لڑائیوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہ مفروضہ اب مؤرخین نے باطل قرار دے دیا ہے کہ چندر بروائی نے پرتھی راج کے زمانے میں یہ نظم لکھی۔ کیوں کہ اس کے بعض مندرجات بعد کے واقعات پر بھی حاوی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن خیال یہ ہے کہ یہ کتاب مغلوں کی آمد کے وقت مرتب ہوئی ہے۔ بہرحال یہاں اس تحقیق سے بحث نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ بتانا ہے کہ اس کتاب میں جو مسلمانوں کے دور میں اولیں قابل ذکر ہندی تصنیف ہے حسب ذیل الفاظ فارسی کے اثرات کا پتا دیتے ہیں۔ اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اس وقت عوام کی زبانوں پر بے تکلف رواں تھے۔ اعلام کا فارسی عربی میں ہونا تو

ناگزیر ہے۔ ''ساہاب دین سرتان'' یعنی شہاب الدین سلطان کا نام تو بہر حال لکھنا ہی تھا۔ لیکن ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

کھبر (خبر)، بکسی (بخشی)، ارداس (عرضداشت)، کمان، تبیب (طبیب)، نکیب (نقیب)، حکم، تسلیم، سلام، گاجی (غازی) کھلک (خلق)، راجی (راضی)، کھیر (خیر)، دواہ (دعا)، تکھت (تخت)، الائچی، سکر (شکر)، آچار (فارسی لفظ ہے)، باگ (باغ)، گل، سیب، عبیر، عنبر، آسمان، گلاب، انار، شہتوت، زنگین (نارنگی)، نناس (اناس)، جلیبی (جلیبی) (جو عربی کے زلابیہ سے بگڑی ہے)، سکر پارے، کھرما (خرما)، بہی، ناشپاتی، مصری، میدہ، بندوک (بندوق)، تپک (توپک)، جنبور (زنبور)، گولنداج (گولنداز)، حجرت (حضرت)، پھرمان (فرمان)۔

پھر امیر خسرو نے جو ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے ہندی میں بہت سی پہیلیاں کہ مکرنیاں، دو سخنے، انمل اور دوہے لکھے جن میں فارسی کا اثر واضح ہے۔

سکندر لودھی کے زمانے میں بنارس کے بھگت کبیر پیدا ہوئے جن کے کلام میں عربی فارسی کے الفاظ کی بھرمار ہے۔ مثلاً ان کے دو دوہے ملاحظہ ہوں:

دین گوایا دُنی سے دُنی نہ آیو ہاتھ
پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ

کبیر سرِیر سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

چار مصرعوں میں دین، دنیا، غافل، سرائے، کوچ، نقارہ چھ فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں۔ یہی حالت گورونانک کی ہے۔ جن کا ایک دوہا یہ ہے:

ساس ماس سب جیو تمھارا
تُو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایو کہت ہے
سچے پروردگارا

یعنی شاعر اور پروردگار یہاں بھی موجود ہیں۔

بڑے بڑے ہندو مذہبی پیشوا مجبور تھے کہ اپنے کلام میں فارسی کے الفاظ سے کام لیں۔

مثلاً سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن نے رامائن کو بھاشا میں ترجمہ کیا۔ ان کے دوہوں میں تو فارسی کے الفاظ بے شمار ہیں۔ لیکن رامائن بھی ان سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً:

گھربسواس بچن ہٹ بولے
کتنی بھنگ گلہ بھی کھولے

رام اینک گریب نواجے
لوک بید بربر و براجے

گنی گریب گرام نرناگر
پنڈت موٹے ملیں اجاگر

اور وہ مصرع تو زبان زد عام ہے کہ "تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات"

سورداس جی نے اسی زمانے میں کرشن جی کا قصہ نظم کیا۔ اس نظم میں شاید ہی کوئی شعر ہو جو فارسی الفاظ سے خالی ہو:

مایا دھام دھن ونتا
باندھیوں ہوں اس ساج
سنت سبھی جانت ہوں
تو نہ آئیو باج
کھیت بہت کاہے تم تانے
سبن سنی اداج
دیو نہ جات پار اتر آئے
چاہت چڑھیں جہاج
لیجے پار اتار سور کوں
مہاراج برج راج
نئیں کرت کہت پربھو تم سوں
سدا گریب نواج

یہ ان لوگوں کی تصانیف کا حال ہے جو آج سے صدہا سال پہلے ہوئے ہیں۔ اور اب تو ہندی بھاشا فارسی کے الفاظ سے مالا مال ہے۔ اور متعصب لوگوں کی انتہائی کوششوں کے باوجود

ہندی ادب و شعر میں ہزاروں فارسی اور عربی کے الفاظ شامل ہو چکے ہیں۔ جن کے بغیر گزارا ہی نہیں۔

یہی بھاشا تھی جو زبانِ اردو کی بنیاد بنی۔ جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں کو ایک عجیب کیمیا گرانہ آمیزش سے اظہار خیالات کا ایک قوی اور جاندار آلہ بنا دیا۔ اور پھر ان دونوں قوموں نے مل کر اس کو جو رونق بخشی وہ لسانیات کی تاریخ میں ایک معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ ہر شخص کو ماننا پڑے گا۔ کہ اس آمیزش کی ساری دلفریبی اور صلاحیت فارسی زبان کے الفاظ اور اسالیب بیان کی ممنون ہے۔ اردو سے فارسی نکال لیجیے۔ اس کی قوت اور آرائش صفر کے برابر رہ جائے گی۔

بنگالی

بنگال کو تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں محمد بختیار خلجی نے فتح کیا۔ اور اس علاقے پر پٹھانوں کی حکومت شروع ہوئی۔ پٹھان سلاطین نے فارسی اور بنگالی دونوں کی یکساں خدمت کی۔ ان کی سرپرستی میں بہت سی بنگلہ کی کتابیں فارسی میں اور بہت سی فارسی کی کتابیں بنگلہ میں ترجمہ ہوئیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بنگلہ زبان اور ادب کا قابل ذکر آغاز ہی پٹھانوں کے عہد میں ہوا۔ چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں حضرت شاہ جلال الدین تبریزی نے بنگالہ میں تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔ خصوصاً مشرقی بنگال کے دیہات میں اسلام کی تعلیمات پھیلائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سے متعلق بے شمار فارسی اور عربی الفاظ زبان زد عام ہو گئے۔ تو مسلموں کو اسلام اور اس کی ثقافت سے آشنا کرنے کے لیے بہت سی کتابیں بنگلہ میں لکھی گئیں۔ مثلاً جنگ نامہ، قیامت نامہ، محمد حنفیہ، شاہ والہ پیر، مقتول حسین، قاسم لڑائی، سکینار بیلاپ، امیر حمزہ، انبیانی موسار سوال، راحت القلوب، کفایت المسلمین، امیر جنگ، نور قندیل، نشاط نامہ، فکر نامہ، نبی نامہ، ابلیس نامہ، گیان ساگر، دھیان مالا، سراج القلوب، سات چکر بھید، تالنا تلاوت جن کے ناموں ہی سے ظاہر ہے کہ فارسی اور عربی کس حد تک بنگلہ زبان کو متاثر کر چکی تھیں۔

جس طرح دوسری زبانوں میں ایران و عرب کے بعض رومانی قصے لکھے گئے اسی طرح بنگلہ میں بھی لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا، سیف الملوک، الماتی سیف الملوک، لال متی، ہفت پیکر، سکندر نامہ، زیب الملوک، شمیم گلاں، مصری جمال، سورج جمال، بانو حسن، بہرام گور، حاتم طائی

اور بے شمار دوسری کتابیں نظم ونثر میں تصنیف کی گئیں۔

اس زمانے سے قبل بھی بنگلہ میں بعض فارسی اور عربی الفاظ دخیل ہو چکے تھے۔ بلکہ بعض ہندو شعرا نے بھی ان کو اختیار کرنے میں تامل نہ کیا تھا۔ مثلاً رامانی پنڈت نے گیارھویں صدی عیسوی میں ''سنتا پوران'' لکھی جس کے چند بند دیکھیے:

دھرمو ہوئیلا جبن روپی

ماتھا اے تے کالو ٹوپی

چاپیا اتم ہوئے

تری بھوبنے لاگے بھوئے

خدائے بولیا ایک نام

برہما ہوئیلا محمد

بشنو ہوئیلا پیغمبر

آدم ہوئیلا شول پانی

گنیش ہوئیلا غازی

کارتک ہوئیلا قاضی

فقیر ہوئیلا جوتو مونی

اس کے بعد سولھویں اور سترھویں صدی میں کوی کنکن مکند رام کی کتاب ''چنڈی منگل'' قاضی دولت کی کتابیں اور بھارت چندروان کی آنند منگل فارسی کے الفاظ سے معمور نظر آتی ہیں۔ آخری کتاب کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

بادشاہ کوہن سنومان سنگھ رائے

غضب کوریلا تہی عجب کوتھائے

لشکرے دو تین لاکھ آدمی تو مار

ہاتھی گھوڑا اونٹ گادھا خچر جے آر

دیکھو پاٹھا پاٹھی ناکورے ذباح

[illegible]

حلال ناکری کرے، ناحق ہلاک
جو تو کام کرے ہندو شکلی ناپاک
بھارت ایرکی کو بوپان پانیر عیب
قاضی ناہیں مانے پیغمبر ایر نائب

اسی قسم کی اور بے شمار مثالیں بنگلہ نظم و نثر میں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں فارسی عربی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی بنگال کے مسلمانوں کے لیے نہایت مصیبت ناک تھیں۔ وہابی تحریک، سید احمد بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے جہاد اور بندوبست دوامی کے اثرات و نتائج اور برطانوی حکومت اور ہندوؤں کے تشدد کی وجہ سے مسلمان سخت پریشان اور بدحال ہوگئے۔ اور بنگلہ ادب پر ہندوؤں کے غلبے نے بنگلہ کی شکل کو بالکل مسخ کرکے اس کو سنسکرت کی بہن بنا دیا۔ آخر بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان پھر بیدار ہوئے۔ اور ۱۹۱۱ء میں ''بنگلہ مسلم ساہتیہ سمیتی'' قائم کی گئی۔ جس نے بنگلہ میں دوبارہ عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ رائج کیے۔ مشرف حسین کیقباد اور نذر الاسلام نے اپنی بے نظیر شاعرانہ استعداد سے اس تحریک کو تقویت دی۔ نذر الاسلام کے کلام میں ہزاروں فارسی الفاظ بے تکلف نظم ہوئے ہیں۔ انھوں نے قومی نظمیں، نعتیں، غزلیں اور قوالی کے گیت خوب لکھے۔ اور بنگلہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ مثلاً نذر الاسلام ایک قومی نظم میں لکھتے ہیں:

باجی سے دمامہ، بادھور سے عمامہ، شرے اونچا کورے مسلمان دعوت ایشے تچھے،
نیاز مانہ، بھنگہ قلعہ اڑے نشان

یعنی صرف عربی و فارسی الفاظ نہیں بلکہ طرز تخیل میں بھی اسلامی زبانوں کی جان داری اور ولولہ انگیزی داخل کردی گئی ہے۔ نذر الاسلام کی مثال نے بے شمار بنگالی مسلمان شعرا پیدا کردیئے جن کا کلام فارسی اور عربی کے الفاظ سے مالا مال ہے۔[۲]

مرہٹی

مہاراشٹر میں مسلمان سب سے پہلے تیرھویں صدی کے اواخر میں داخل ہوئے جب علاء الدین خلجی نے دفعتۂ دولت آباد پہنچ کر راجا رام دیو راؤ کو جالیا۔ پھر محمد تغلق نے دولت آباد کو

پورے ہندوستان کا دارالخلافہ بنانے کے جنون میں تمام شاہی دفاتر و کارخانہ جات بلکہ پوری دہلی کو دولت آباد میں منتقل کردیا۔ اس کا یہ منصوبہ بری طرح ناکام ہوا۔ اور دکن میں بہمنیوں کی حکومت شروع ہوئی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ جب اس سلطنت میں انتشار پیدا ہوا تو بیجاپور، احمد نگر، برار، بیدر اور گولکنڈہ میں الگ الگ سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ ان تمام حکومتوں میں مرہٹے مؤثر طور پر دخیل تھے۔ اور مالی اور فوجی صیغوں میں انھیں نہایت مقتدرانہ حیثیت حاصل تھی۔ دفتروں میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ مسلمان صوفی اور درویش اسلام کی تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے اور معاشرت کے مختلف شعبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جول بڑھ رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار فارسی، عربی کے الفاظ مرہٹی زبان میں داخل ہوگئے۔

سیواجی نے ایک دفعہ کوشش بھی کی کہ سرکاری و درباری کاروبار سے فارسی کو خارج کرکے مرہٹی اور سنسکرت کے الفاظ داخل کیے جائیں۔ لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ بلکہ خود سیواجی اور اس کے جانشینوں نے اپنی تحریروں اور اپنے فرمانوں میں فارسی الفاظ استعمال کیے۔ کیوں کہ وہ مجبور تھے۔ مرہٹی زبان میں ایسا تغیر رونما ہوچکا تھا کہ فارسی عربی الفاظ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ فارسی اور مرہٹی ساڑھے تین سو سال تک یکجا رہیں۔ اور اس یکجائی اور اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف فارسی کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کی تراکیب، اس کے اسلوب اظہار اور اس کے محاورات تک مرہٹی میں عام ہوگئے۔

پٹن ضلع اورنگ آباد کا ایک مشہور شاعر اور سادھو ایکناتھ تھا جو سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں فوت ہوا۔ اس نے اپنی ایک تصنیف میں ایک فرضی عرضداشت تحریر کی ہے جو روح نے خدا کے نام لکھی ہے۔ اس عرضداشت کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

عرضداشت عرض وار بندگی نواز۔ علیکم سلام۔ صاحبانچے سیوے سی بندے شریا کار۔ جیوا جی شیکھدار۔ بدھا جی کارکن پرگنہ شریر آباد۔ قلعہ کایا پوری سرکار صاحبانچی۔

اونیا گھے اون سوار جالوں تو پرگنہ مذکور این اے اون سرکار کام کردیاس لاگتو۔ تو پرگنہ مجھ کورچے۔ جمعدار داماجی شیٹے و کاماجی مہاجن و منی رام ویشکھ و ممتاجی۔ دیش پانڈین کرودھاجی۔

نائک واڑی ایئے سے حرام زادے پھارایت نے سرکار کا ماچا کیاس چالو دیت ناہیت داماجی شے شیٹے کچیر لیس اے اون جوم دھرون بس تو منی رام دیشکھ آپلیں۔

کام [illegible] حاری کروں گھے تو ممتاجی دیش پانڈین اپنے تمام تفرقت [illegible]

سندھ چوبدار آلاتیا نے خبر کیلی کیں ماگوں یماجی پنتاجی طلب۔

صرف ان چند سطروں میں عرضداشت، عرض دار، بندہ نواز، علیکم سلام صاحب، بندہ ٹیکھدار (ٹھیکدار)، کارکن، شریہ آباد، قلعہ کایاپوری، سرکار، سوار، مذکور، زمیندار، حرام زادہ، قیاس، تمام، تفرقہ، چوبدار، خیر، طلب۔ یعنی کوئی اکیس بائیس فارسی کے الفاظ موجود ہیں۔

سترہویں صدی میں ملک عنبر نے ساہ جی (والد سیواجی) کے پروہت دامودر بھٹ اور اس کے بھائی کو عطائے جاگیر کے متعلق ایک خط لکھا ہے جس میں اعلام سے قطع نظر فارسی الفاظ ۱۲۷ ہیں۔ اور مرہٹی صرف ۳۸

مولوی عبدالحق صاحب (بابائے اردو) نے مرہٹی پر فارسی کے اثر کے متعلق ایک عالمانہ مقالہ لکھا ہے جس سے میں استفادہ کررہا ہوں۔ اس میں بیسیوں اس قسم کی تحریروں کے اقتباسات دیئے ہیں۔ پھر بتایا ہے کہ مرہٹی نے فارسی کے بہت سے لاحقے اور سابقے تک اختیار کرلیے ہیں اور الفاظ و محاورات کا تو کچھ شمار نہیں۔ مثلاً قبول، جواب، قاعدہ، عمل، انعام، فیصلہ، قید، فریاد، دعویٰ، مدعا، ظلمی، ناحق، گمان، کارخانہ، سرکار، اشارات، حق، فائدہ، متصدی، خوشامدی، فوجداری، دیوانی، زمیندار، عمل دار، بے شمار ایسے الفاظ ہیں جن کی شکل مرہٹی میں بدل گئی ہے۔ لیکن اصلاً وہ فارسی کے ہیں۔ مثلاً سمی (شمع)، سار (شمار)، مکادم (مقدم)، یندہ (آئندہ)، وستاد (استاد)۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو فارسی کے ہیں لیکن مرہٹی میں ان کے معنی بدل گئے ہیں۔ مسکین (بدمعاشی)، واصلات (آخری تصفیہ)، شکست (انتہائی کوشش)، حال (جسمانی یا روحانی تکالیف)، حیوان (کمزور) وغیرہ۔

مرہٹی میں بعض ایسے الفاظ و محاورات ہیں جو فارسی محاورات یا مرکب مصادر سے ترجمہ کرلیے گئے ہیں۔ اور اکثر اوقات لفظ بدستور رہا۔ اور صرف مصدر کا ترجمہ کرلیا گیا۔ مثلاً خالی کردن (کھالی کرنے)، معاف کردن (مابھ کرنے)، ہلہ کردن (ہلہ کرنے)، جمع شدن (جما ہونے)، دوستی داشتن (دوستی ٹھیونے)، زیر کردن (جیر کرنے)، کمربستن (کمرباندھنے)، ظاہر ساختن (جاہر کرنے)، تعلیم دادن (تالیم دینے)، دہشت خوردن (دہشت کھانے)، درخواست کردن (درکھاس کرنے)، اور اسی قسم کے بے شمار مصادر فارسی اور مرہٹی میں مشترک ہیں۔

فارسی میں مرہٹی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، مصادر، لاحقوں، سابقوں وغیرہ میں اس قدر گھر کرلیا ہے کہ اب ان کے بغیر مرہٹی زبان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس صدی کے

آغاز میں ایک تحریک پیدا ہوئی تھی۔ (سیوا جی کی تقلید میں) کہ مرہٹی سے عربی فارسی الفاظ خارج کر دیے جائیں...... لیکن بعض فہیم اور دور اندیش لوگوں نے اس تحریک کی مخالفت کی۔ مثلاً مسٹر بال گنگا دھر تلک کے مشہور اخبار ''کیسری'' نے اس کارروائی کے خلاف آواز بلند کی۔ اور لکھا:

''اگر فارسی عربی الفاظ خارج کر دیے گئے تو مرہٹی زبان کی قوت میں ضعف پیدا ہو جائے گا۔ اور زبان بے مزہ ہو جائے گی۔ مثلاً ''فوج''۔ ''قلعہ'' اور اس قسم کے سیکڑوں الفاظ نکال دیے جائیں اور ان کی جگہ دوسرے ہم معنی الفاظ داخل کر لیے جائیں تو ان سے کبھی وہ مفہوم اور تصور پیدا نہ ہوگا جو پرانے فارسی الفاظ سے اس وقت ہو سکتا ہے۔'' (مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر'' مقالہ مولوی عبدالحق سے)

گجراتی

گجراتی زبان شورسینی اپ بھرنش کی ایک شاخ گوجر اپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہے جو چودھویں صدی عیسوی تک گجرات میں ادبی زبان کی حیثیت سے زندہ رہی۔ اس کے بعد اس میں گجراتی زبان کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور وہ ادبی زبان بن گئی۔ چوں کہ مدت دراز سے عرب اور ایرانی تاجر گجرات میں آتے جاتے تھے۔ بلکہ بعض حصوں میں آباد بھی ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ تیرھویں صدی کے اواخر میں علاء الدین نے گجرات کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ اور کوئی ایک سو سال تک دہلی سے گورنر آتے رہے۔ اس لیے ۱۳۵۸ء میں گجراتی زبان کی جو رزمیہ مثنوی ''رنمل چھند'' لکھی گئی۔ اور ۱۴۵۶ء میں ''کانتھ دے پر بندھ'' کے نام سے جو ادبی کارنامہ ظہور میں آیا ان میں فارسی کے الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ ۱۴۰۰ء سے گجرات میں خود مختار حکومت وجود میں آ گئی اور سلاطین کی رواداری اور ہندوؤں مسلمانوں کے میل ملاپ سے موجودہ گجراتی زبان کو بڑا فروغ ہوا۔ کایستھوں اور کشمیری پنڈتوں کی طرح گجرات میں ناگروں نے فارسی سیکھنے پر زیادہ توجہ دی۔ اور دفتروں اور محکموں پر چھا گئے۔ صوفیہ کرام تیرھویں چودھویں صدی عیسوی سے گجرات میں پیغام حق کی تبلیغ کرنے لگے جس سے فارسی الفاظ کثرت سے پھیلے۔ سولھویں صدی عیسوی میں جلال الدین اکبر نے گجرات کی خود مختار حکومت کا خاتمہ کر کے اسے مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد ناگروں کے علاوہ دوسری قوموں نے بھی فارسی سیکھنی شروع کر دی۔ اور فارسی کا ذوق یہاں تک پھیلا کہ بعض ہندو خواتین تک نے فارسی ادبیات میں

مہارت حاصل کرلی۔ مغلوں کے ارتباط کی وجہ سے گجراتیوں کے ناموں پر بھی اثر پڑا۔ چنانچہ آج بھی گجرات میں فقیر چند دولت رائے، گلاب رائے، حکیم چند وغیرہ جیسے نام پائے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی گجراتی زبان میں فارسی اور اردو کے الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اور پچیس تیس سال سے تو گجراتی میں غزل کا رواج ہو رہا ہے۔ جس کی تکنیک بالکل فارسی اور اردو غزل کی ہے۔ یہاں تک کہ اگر بعض گجراتی غزلوں میں اگر افعال اور حروف جو بدل دیئے جائیں تو وہ اردو کی غزلیں ہو جاتی ہیں۔

گجراتی زبان میں سیاست، معاشرت، تعلیم، جہاز رانی، کھیل تماشے غرض زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق فارسی، عربی کے ہزاروں الفاظ شامل ہو چکے ہیں۔ اور خیال یہ ہے کہ اس زبان میں کم وبیش تیس فی صدی الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں۔ مثلاً چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

شوکھ (شوق)، کھمیس (قمیص)، نگارا (نقارہ)، تگادو (تقاضا)، آمدانی (آمدنی)، تپسیل (تفصیل)، سفیل (فصیل)، مندیل۔ ماتبر (معتبر)، اِکھترا (اختراع)، جڈبے سلاک (ضرب شلاق)، کبول (قبول)، سوگات (سوغات)، مہربان، محنت، دائرہ دہشت، انامت (امانت)، دے دار (دیدار)، کندیل (قندیل)، لیاکت (لیاقت)، مگرور (مغرور)، ان کے علاوہ بے اور غیر کے سابقے عام ہیں۔ بے سواد، بے جان، گیر ساودھ (چوکنے نہ رہنا)، گیرا پیوگی (جو ضرورت میں کام نہ آئے)۔

پھر مرکبات بھی ہیں۔ مان مرتبہ (اعزاز)، وگ وسیلہ (وسیلہ)، کاوا داوا (دعویٰ)۔

اب مختلف ادوار کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔ مثلاً ۱۴۵۶ء کی گجراتی شاعری میں دھری بھیٹی گھوڈانی میرا د میرے کری ارداس (امیر۔ اُمرا۔ عرضداشت) وڈو مکرم مادھو نام پاتی شہنئی کری سلام (مقدم۔ شاہ۔ سلام)

۱۷۰۰ء کا ایک مصرع بطور نمونہ حاضر ہے:

واپانی سکھر وسنسار تینوں شو اِتبار (اعتبار)

۱۸۶۰ء کی غزل کا مطلع

اتار ناکئیں پیار اے دلدار صبر لے
غم خوار جگر خوارنی کتیں خبر لے

گلستان ماں حیران چھے مستان آبلبل
بھر پیار نتھی یار وفادار خبر لے

۱۹۰۰ء کی ایک گجراتی غزل کا شعر ملاحظہ ہو:

صنم ناپیرنی لابی جگرنوں خون ماروں چھے
ارے اے رنگ مہارو تو ہجو فریاد شانی چھے

۱۹۵۳ء کا ایک گجراتی شعر

دنیا! ہوئے تاری کرامت چھیتری شکشے نہیں
پہلاں ہوں غافل ہتوپن آج تو غافل نتھی

دوسری فصل: مسلمانوں کا بہترین ثقافتی تحفہ

اردو

پنجاب، سندھ، سرحد اور دکن کے باشندے سب کے سب اس امر کے مدعی ہیں کہ زبان اردو کا آغاز ان کے علاقوں سے ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اس وقت پڑی جب مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط نے انہیں ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ کا استعمال سکھایا۔ تاکہ باہم مبادلۂ خیالات میں آسانی ہو۔ دہلی میں جب قطب الدین ایبک نے سلطنت اسلام کی بنیاد رکھی تو اس سے کم وبیش دو سو سال پیشتر فارسی بولنے والے سپاہی اور دوسرے لوگ پنجاب میں داخل ہو چکے تھے۔ کیوں کہ محمود غزنوی کا پہلا حملہ ۱۰۲۷ء میں ہوا تھا۔ اور خاندان غلاماں کا پہلا سلطان ایبک ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اردو اپنی قواعد، نحوی ترکیب، اور صوتیات کے اعتبار سے پنجابی اور ملتانی سے بہت کچھ مشابہ ہے اور ہونی چاہیے تھی۔ کیوں کہ یہی وہ زبانیں ہیں جن کی بنیاد پر اردو کا قصر تعمیر ہوا۔ ملتانی بولی کو پنجابی اور سندھی کے درمیان ایک کڑی سمجھیے۔ اور سرحد کے شہروں میں جو بولی ''ہندکو'' کے نام سے موسوم کی جاتی ہے وہ اصلاً پنجابی ہی ہے۔ اور پشاور اور لاہور کے لوگ ایک دوسرے کی بولی کو نہایت آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو ہندوستان کی انہی شمال مغربی زبانوں پر مبنی ہے۔

باقی رہا دکن کا دعویٰ۔ تو اس میں شک نہیں کہ دکن میں سب سے پہلے اردو نظم و نثر کا آغاز ہوا۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہوئی کہ علاء الدین خلجی کے فوجیوں نے فارسی آمیز بھاشا کو تیرھویں صدی کے اواخر میں وہاں رائج کیا۔ اور پھر ۱۳۲۶ء میں جب محمد تغلق نے پایہ تخت کو دہلی سے دولت آباد میں منتقل کیا تو یہ زبان دکن میں عام ہوگئی۔ گجراتی اور مرہٹی کے کچھ اثرات بھی شامل ہوئے اور ''دکنی'' زبان پیدا ہوگئی۔ اور پھر اس کو ریختہ کہا گیا۔ اور میر کے معاصر قائم نے بر سبیل تعلّی اس ریختے پر چوٹ بھی کی ہے۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اور خود میر تقی نے تسلیم کیا ہے کہ ریختہ کا آغاز دکن ہی سے ہوا تھا

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

یہ زبان جو ''ہندکو'' پنجابی اور ریختہ کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ آخر مغلوں کے دور میں اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ بابر نے اپنی توزک میں سب سے پہلے اس زبان کو اردو کے نام سے یاد کیا ہے۔[۳]

اردو کے ابتدائی نظم و نثر کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ چودھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ امیر خسرو کا انتقال ۱۳۲۵ء میں ہوا۔ شاعری ہو یا موسیقی۔ زبان ہو یا ادب۔ اس کی طبع وقاد نے ہر چیز میں صنعت و اختراع کے بہترین کمالات کا اظہار کیا۔ اس کے بیسیوں گیت، دوسخنے، مکرنیاں، پہیلیاں اس زبان میں موجود ہیں۔ جو اس زمانے میں عوام کی زبان بن چکی تھی۔ اور انصاف یہ ہے کہ وہ زبان اردو کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً ایک پہیلی ملاحظہ ہو۔

ترور سے اک تریا اتری اس نے بہت رجھایا
باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری!
امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام بنولی (بنولی)

ساون کا گیت زبان زد عام ہے۔

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا

ایک دو مکرنیاں ملاحظہ ہوں

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی دیا

وہ آوے تب شادی ہووے
اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے وا کے بول
اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

دو سخنے بھی عام لوگوں کی زبان پر ہیں۔ ذرا غور کیجیے۔ کہ یہ آج سے سات سو سال پہلے کی اردو ہے۔ اور آج کل کی اردو سے کسی طرح بھی مختلف نہیں۔

گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا — گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا — تلا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا۔ وزیر کیوں نہ رکھا — دانا نہ تھا

امیر خسرو نے صرف یہی عوامی لطائف اردو میں مرتب نہیں کیے بلکہ فارسی اور بھاشا کی مخلوط شاعری کا بھی تجربہ کیا۔ مثلاً

زِحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز و صلت چو عمر کو تہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیران زمہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں۔ نہ انگ چیناں۔ نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

یہ تو شمال کی کیفیت تھی۔ اب ذرا جنوب کی طرف آیئے۔ اسی چودھویں صدی عیسوی میں دکن نے اس زبان کی نظم و نثر میں طبع آزمائی شروع کی۔ جو زیادہ تر مذہبی مضامین پر مشتمل تھی۔ مثلاً حضرت محمد سید گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ نے ۱۳۹۸ء میں معراج العاشقین کے نام سے تصوف پر ایک رسالہ لکھا جس سے قدیم اردو نثر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:[۴]

نبی علیہ السلام کہے۔ انسان کے بوجنے کو پانچ تن۔ ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پیلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی۔ نفس اس کا امارہ یعنی واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو حرص کے کان سوں غیر نہ سننا۔ سو حسد نک سوں بدبوئی نہ کینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ لینا سو کینہ کی شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کر دوا دینا۔ پیر منع کیے سو پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی مشاہدے کے کانے میں میکائیل کی مدد کے پانی سو جلی کا کاڑ کر کو پیلا، شگن (تشبیہ) کا کاڑا (گھولواں) دینا۔ نرگن (پاک) ہوا تو تو شفا پاوے گا۔ طبیب فرمائے تیوں (تو) پرہیز کرے تو اُنے (وہ) بھی طبیب ہووے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی۔ ماٹی میں پانی۔ ماٹی میں ہوا۔ ماٹی میں خالی۔ ان پانچ عناصر ان کا واجب الوجود بُو جا تو معریفت تمام ہوا۔

یہ زبان کی قدیم ترین نثر کا نمونہ ہے۔ مذہبی شاعری کے دو مرکز قطب شاہی اور عادل شاہی خاندانوں کے عہد میں قائم ہوئے۔ یعنی بیجاپور اور گولکنڈہ۔ شاہ بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان، شاہ علی جیو[۵] نے عارفانہ نظمیں اور مرثیے لکھے۔ دربار بیجاپور کے ایک شاعر نصرتی نے رزمیہ اور بیانیہ شاعری کے لیے مثنوی کو استعمال کیا۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں دکن کی اردو شاعری نے بہت ترقی کی۔ گولکنڈہ کا سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ جس نے ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک حکومت کی۔ شہر حیدرآباد کی بنیاد بھی اسی نے رکھی تھی۔ اس نے غزل کے علاوہ مثنویاں بھی لکھیں۔ ہندو مسلم تہواروں، سالگرہوں، پھولوں، بیاہ شادیوں پر خالص ہندوستانی اسلوب میں اشعار کہے۔ نعت اور

منقبت بھی لکھی۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

مومناں خوشیاں کرو ہے آج دن مولود کا
مرتضیٰ بارہ اماماں عید ہے معبود کا

مصطفیٰ ہور مرتضیٰ اس دن میں کیتے ہیں ظہور
جن کرے یہ عید ہر دو طالع مسعود کا

جب وہ ابر رحمت اس جگ پر ہوا ہے فیض بار
شیعیاں کی تیئں اتھاوہ دن مگر بہبود کا

فارس کا اگن بجھا جب میگھ رحمت برسیا
سرک تن کیتا جگت میں اگن نمرود کا[٦]

وجہی اور غواصی نے بالکل اسی رنگ میں مثنویاں لکھیں۔ جس میں فارسی کی مثنویاں لکھی جاتی تھیں۔ وجہی کی ''سب رس'' ایک داستان عشقیہ ہے جو بیانیہ نثر کا اولیں کارنامہ ہے۔

دکنی اردو کا سب سے مشہور شاعر ولی ہے (۱٦٦٨ء تا ۱۷۴۴ء) جب عالمگیر نے دکن کو فتح کرلیا تو مغلوں کے لشکر کی زبان جو شمالی اردو تھی۔ دکن میں پہنچی۔ ولی نے دو دفعہ دکن سے دہلی کا سفر کیا۔ پہلی دفعہ ۱۷۰۰ء میں اور دوسری بار ۱۷۲۲ء میں۔ اس نے دہلی کی فارسی آمیز اور شائستہ زبان کو دکنی محاورات سے آمیختہ کرکے اردو شاعری میں ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی۔ اور اساتذہ دہلی نے ولی کی مثال سے مستفیض ہوکر اس شاعری کا آغاز کیا جس نے میر تقی اور رفیع السودا جیسے عدیم المثال شاعر پیدا کردیئے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اس شاعری کے چار دور تجویز کرتے ہیں:

اول: محمد شاہی دور ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک جس میں ولی، حاتم، ناجی، آبرو اور بعض دوسرے شعرا شامل ہیں:

دوم: شاہ عالمی دور ۱۷۵۰ء سے ۱۸۰۰ء تک۔ یعنی میر، سودا، درد، انشا، سوز، جرأت، مصحفی، میر حسن کا زمانہ۔

سوم: بہادر شاہی دور ۱۸۰۱ء سے ۱۸۵۸ء تک۔ شاہ نصیر ذوق، غالب، مومن، امیر، مجروح کا دور۔

چہارم: وکٹورین دور ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۵ء تک۔ جس میں حالی و آزاد اور ان سے ہ[illegible]

شمار کیے جائیں گے۔

اس کے بعد اقبال، اکبر، حسرت موہانی، چکبست اور دوسرے بے شمار شاعر پیدا ہوئے۔

ولی کے آنے کے بعد دہلی میں اردوئے معلّٰی کا دور دورہ ہوگیا۔ محمد شاہی دور کے شعرا کا کلام ولی کے محاورات اور طرز فکر سے متاثر معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو، قزلباش خاں امید، شیخ سعد اللہ گلشن، میر شمس الدین فقیر جیسے فاضل بزرگوں نے زبان کے قواعد منظم و منضبط کیے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر فارسی کے شاعر تھے۔ اور اردو شعر میں کسی خاص کمال کا ثبوت نہیں دے سکے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میر و سودا جیسے خدایان سخن نے انہی کے زیر سایہ تربیت پائی۔ مرزا مظہر جان جاناں، میر عبدالحی تاباں، میر سوز، میر ضاحک، خواجہ میر درد نے بھی انہی کی برکت سے نام پیدا کیا۔

اب اردو میں فارسی کے الفاظ کثرت سے راہ پا چکے تھے۔ اور فارسی ہی کے اسالیب و استعارات کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اس لیے اردو کی شاعری اپنے بانکپن میں فارسی سے لگا کھانے لگی۔ اس میں شیرینی، گھلاوٹ اور نرمی پیدا ہوگئی۔ اور جذبات و محسوسات کی آئینہ داری کا مذاق عام ہوگیا تھا۔ مثلاً میر تقی کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو جس کا آج تک جواب نہیں۔

دلِ پرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج
رات گزرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

اور وہ مشہور غزل

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، اور دن کو جوں توں شام کیا
میؔر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو تم، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

سودا کا رنگ میر سے مختلف ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ اپنا زور فکر مدحیہ و ہجویہ قصائد پر صرف کیا۔ ہجو وطنز میں ابتذال سے بچنا یوں بھی مشکل ہوتا ہے۔ پھر اس زمانے کے معاشرے کا حال بھی معلوم ہے۔ جس کی وجہ سے سودا کی ہجو اکثر مبتذل ہو جاتی ہے۔ ان کے ہم عصر خواجہ میر دردؔ تھے۔ جنھوں نے اردو کو عرفان و تصوف کے خیالات سے مالا مال کیا۔ ان کی غزل عشق مجازی اور عشق حقیقی کے پاکیزہ واردات کا آئینہ تھی۔ جب اس زمانے میں دہلی کا سیاسی و معاشرتی ماحول سخت ناگوار ہوگیا۔ اور میر، سودا، مصحفی، انشا اور دوسرے بے شمار شعرا نے کشمکش روزگار سے تنگ آ کر لکھنؤ کا رخ کر لیا جہاں اودھ کے نواب انحطاط و تنزل کے تمام آثار کے باوجود شعر و سخن کی سرپرستی نہایت فیاضانہ کر رہے تھے۔ تو خواجہ میر دردؔ نے اس حالت میں بھی اپنے گوشۂ عزلت کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اور دہلی میں مقیم رہ کر زبان کی خدمت میں مصروف رہے۔

یہاں نظیر اکبر آبادی کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے ۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔ یہ اردو شاعری میں فطرت نگاری یا ''نیچرل شاعری'' کے بانی ہیں۔ عوام کی زبان میں عوامی سرگرمیوں، تہواروں اور مشغلوں پر نظمیں لکھتے تھے۔ لیکن چونکہ اردو شاعری پر ''درباریت'' کا اثر بے حد مسلط تھا۔ اس لیے وہ اس صنف شاعری میں تنہا ہی رہے۔ اور ان کی تحریک ان کی ساتھ ہی دفن ہوگئی۔

دہلی کی مجلس اجڑ کر لکھنؤ کے دربار کی زینت بن گئی۔ ان دونوں شہروں کے دبستان ہائے شاعری کے اختلاط نے اردو زبان کی صلاحیت اظہار کو بڑی تقویت پہنچائی۔ مصحفی اور انشا نے ایک دوسرے کے خلاف کیچڑ اچھالنے میں کمال کر دیا۔ اور اس امر کا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہجو و طنز سودا پر ختم نہیں ہوا بلکہ ابھی ان سے بڑھ کر پھکڑ لکھنے والے موجود ہیں۔

میر حسن کا اصلی وطن دہلی تھا۔ لیکن وہ کچھ مدت فیض آباد میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں مقیم ہوگئے۔ بڑے باکمال زبان دان اور شیوا بیان شاعر تھے۔ ان کی مثنوی سحر البیان اردو کی مایہ ناز بیانیہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔

دبستان لکھنؤ نے جو ممتاز شعرا پیدا کیے ان میں آتش، ناسخ، دبیر اور انیس بہت نمایاں ہیں۔ ان لوگو نے دبستان دہلی کے شعرا کے تعاون سے زبان کو مانجھنے اور اسالیب سخن کو پاکیزہ بنانے میں اشد محنت کی۔ خصوصاً ناسخ نے اردو کو فارسی اور بعض علاقائی زبانوں کے اثرات سے پاک کر کے معیاری زبان بنا دیا۔ شعرائے لکھنؤ میں اکثر ایسے تھے جو لفظی رعایات و مناسبات کو مضحکہ خیز حد تک مدنظر رکھتے تھے۔ لیکن بڑے اساتذہ حدود معینہ سے تجاوز نہ کرتے تھے۔ آتش نے بعض اوقات پاکیزہ جذبات کو پاکیزہ زبان میں ادا کیا ہے اور یہ امر ان کی استادی اور عظمت کی دلیل ہے۔ انیس و دبیر نے منقبت اہل بیتِ اطہار اور مرثیہ سید الشہداء امام حسینؑ کو مدۃ العمر کے لیے اپنا موضوعِ سخن قرار دیا۔ اور زبانِ اردو کو رزمیہ اور بیانیہ شاعری کے کمالات کے اعتبار سے فارسی کا ہم پلّہ بنا دیا۔ خصوصاً انیس نے جذبات کی صحیح مصوری، مناظر کی عکاسی اور حسنِ بیان میں وہ مرتبہ حاصل کیا جو اردو شاعری میں کسی کو نصیب نہ ہوا تھا۔

دہلی میں مغل بادشاہوں کی حکومت لال قلعے کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو اقتدار کامل حاصل ہوگیا تھا۔ دبستان لکھنؤ کے اساتذہ کے معاصرین دہلی میں شاہ نصیر، مومن، ذوق اور غالب تھے۔ شاہ نصیر اتنے بڑے شاعر نہ تھے جتنے بڑے استاد تھے۔ چنانچہ صدہا ہندو، مسلمان بلکہ بعض انگریز تک اردو غزل میں ان سے اصلاح لیتے تھے اور ذوق نے بھی اپنا ابتدائی کلام انہی کو دکھایا تھا۔ ذوق نے زبان کی صفائی پر زیادہ توجہ صَرف کی۔ اور غزل کے علاوہ قصائد مدحیہ میں زورِ قلم دکھایا۔ لیکن ان کے تخیل میں وہی قدما کا رنگ تھا۔ کسی قسم کی جدّت یا گہرائی نہ تھی۔ مومن خاں ان سے بہت بہتر شاعر تھے۔ ان کی غزلیں اور ان کی مثنویاں خلوص اور حسن تخیل کی سرمایہ دار ہیں۔

اس دَور کا عظیم ترین شاعر غالب ہے۔ (ولادت ۱۷۹۶ء وفات ۱۸۶۹ء) غالباً فطرت کو یہ ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ زبان اردو کی شاعری کی رگوں میں فارسی کا تازہ خون دوڑایا جائے تاکہ اس کا جمود رفع ہو۔ اور اس کو نئی زندگی مل جائے۔ مرزا غالب حقیقت میں فارسی کے ایک عالی پایہ اور شیوا بیان شاعر تھے۔ اور ابتدا میں عبدالقادر بیدل اور مولانا ظہوری سے متاثر

ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ فلسفی نہ تھے۔ لیکن چونکہ ان کا اسلوب فکر رسمی اردو شاعری کی سطح سے بہت بلند واقع ہوا تھا۔ اس لیے ان کے تخیلات عمیق، ان کا زاویہ نظر وسیع اور ان کا طریق اظہار عامیانہ انداز سے بالکل جداگانہ تھا۔ ان کے ہاں جذبہ اور تخیل دونوں ہم عناں چلتے ہیں۔ اور ان کی ہم آہنگی اہل فکر کے نزدیک بے حد لذت آفریں ہوتی ہے۔

مزا غالب نے درحقیقت اپنے معاصرین کی ڈگر سے الگ راستہ نکال کر اردو شاعری کا مزاج اور موضوع بدل دیا۔ اور ایک نئی طرز کی بنیاد رکھ دی۔ جس سے ان کے بعد کے تمام شعرا متاثر ہوئے۔ اردو شاعری کی اقلیم میں اب تک مرزا غالب ہی کی خسروی و سلطانی کا سکّہ چل رہا ہے۔

شاعری کے تذکرے میں اردو کی نثر کا بیان رہا جاتا ہے۔ چوں کہ شعرا کی پیہم کوششوں کی وجہ سے اب اردو ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت پیدا کر چکی تھی۔ دربارِ مغلیہ کے انتزاع کے بعد فارسی میں تصنیف و تالیف کے سلسلے کمزور پڑ چکے تھے اور ملک کے نئے حکمران بھی فارسی کی بقا کے روادار نہ تھے۔ اس لیے انیسویں صدی کے آغاز میں کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے جو خود بھی اردو گرائمر اور لسانیات کے ماہر اور اس موضوع پر چند کتابوں کے مصنف تھے۔ ملک بھر کا دورہ کر کے چند اردو نثر لکھنے والوں کو جمع کیا۔ اور ان سے اردو میں قصے کہانیوں کی کتابیں لکھوائیں۔ میر امن دہلوی نے ''باغ و بہار''۔ سید حیدر بخش حیدری نے ''طوطا کہانی'' اور ''آرائش محفل''۔ شیر علی افسوس نے ''ترجمہ گلستان سعدی'' بہادر علی حسینی نے ''نثر بے نظیر'' اور ''اخلاق ہندی'' (ترجمہ ہتوپدیش) مظہر علی ولا نے ''مادھونل'' ''کام کندلا'' اور ''بیتال پچیسی'' نہال چند لاہوری نے قصہ ''گل بکاؤلی'' منشی بنی نرائن جہان نے ''چار گلشن'' للو لال کوی نے ''لطافتِ ہندی''۔ ''سنگھاسن بتیسی'' اور ''پریم ساگر'' (ترجمہ گیتا) لکھیں اور اردو میں نثر کا خاصا ذخیرہ فراہم کردیا۔ مرزا علی لطف نے ''تذکرہ گلشن ہند'' مرتب کیا۔

اس کے بعد مرزا غالب نے اپنے رقعات کے ذریعے سے زبان اردو کی نثر کو چار چاند لگا دیئے۔ اور ایسی سادہ، سلیس اور دلآویز نثر لکھی جس کی آج تک مثال نہیں۔ نثر فارسی کے وہ تمام تکلفات جو اب تک بعض اردو نثر نگاروں کی تحریرات میں بھی جھلک رہے تھے۔ مرا غالب نے قطعی طور پر ترک کر دیے یعنی اردو نثر میں انھیں دخیل نہ ہونے دیا۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مرزا غالب نے اردو نظم اور نثر دونوں کو ایک نیا سانچا عطا کیا۔ جس میں ہماری زبان ہمیشہ

کے لیے ڈھل گئی۔ اور کسی اور سانچے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا رہا سہا رسوخ و اقتدار بھی ختم ہوگیا۔ مغلوں کا آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر جو محض برائے نام بادشاہ تھا۔ خود زبان اردو کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اور اس کے دم سے دہلی کی بزمِ سخن میں تھوڑی بہت جان باقی تھی۔ جب وہ گرفتار ہوکر برما میں جلاوطن کردیا گیا تو زبان اردو کا ایک بالکل نیا دور شروع ہوا۔ معاشرے کو انگریزی راج میں تبدیل شدہ حالات سے ہم آہنگی اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مشرق و مغرب کی ثقافتیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں۔ اور ان میں امتزاج کے طریقے سوچے جانے لگے۔ کشمکش اور نکتہ چینی اور جرح قدح کے دور کا آغاز ہوا۔ جس سے اردو نثر و نظم کی ہیئت میں عجیب و غریب تغیرات پیدا ہوئے جو اس سے قبل کسی کے تصور میں بھی نہ آسکتے تھے۔

لطف یہ ہے کہ اس ہنگامہ پرور دور میں بھی اردو کی روایتی شاعری کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کہیں کہیں بدستور نظر آتے رہے۔ مثلاً فصیح الملک داغ، منشی امیر مینائی، جلال، تسلیم اولاً دربار رام پور کے شاعر تھے۔ ان لوگوں کے کمال میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ان کا اسلوب وہی قدیمانہ تھا۔ جس میں حقیقت طرازی اور خلوص کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کے تغزل نے فکر و خیال کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ لیکن بہرحال زبان میں صفائی اور سلاست پیدا کرنے کی خدمت ضرور انجام دی۔ اور اس اعتبار سے وہ اساتذۂ زبان کی صفت میں شامل ہیں۔

دہلی کالج میں تراجم اور تالیفات کا کام جاری ہوا۔ اور اس درس گاہ کے فیض یافتہ حضرات نے نہایت محنت اور انہماک سے اپنا کام شروع کردیا۔ مثلاً ماسٹر رام چندر اردو میں سائنس اور ریاضیات پڑھاتے تھے۔ رائے بہادر پیارے لال نے مدارس پنجاب کے لیے کہانیوں کی کتابیں لکھیں۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ، ریاضیات اور دوسرے علوم میں بے شمار کتابیں تالیف کر ڈالیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مجموعہ تعزیرات ہند کا ترجمہ اردو میں کردیا۔ اور مولوی محمد حسین آزاد نے اپنا ادبی و تعلیمی کام شروع کیا۔ یہ سب حضرات دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ پنجاب میں کرنل ہالرائڈ کی حوصلہ افزائی سے اردو نثر و نظم کو بڑی تقویت پہنچی۔ چوں کہ خواجہ حالی اور مولانا آزاد پنجاب میں مقیم تھے اور دونوں نثر و نظم اردو میں باکمال ہونے کے علاوہ نئے خیالات و افکار کے قبول کی صلاحیت بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ اس لیے مولانا آزاد نے ۱۸۶۷ء میں اردو شاعری پر اپنے خطبات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ۱۸۷۲ء میں ایک انجمن مشاعرہ قائم کی۔ جس

یں مصرع طرح کے بجائے نظم کا موضوع تجویز کیا جاتا تھا۔ اس مشاعرے نے اردو شاعری کا رجحان غزل سے نظم کی طرف کردیا۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد نے ''بڑے چلو''۔ ''آمدِ شب'' ور بعض دوسری نظمیں لکھیں۔ اور مولانا حالی نے مناظرۂ رحم و انصاف، برکھا رُت، نشاطِ اُمید، شکوۂ ہند، چپ کی داد اور مناجات بیوہ جیسی مشہور نظمیں اردو کو عطا فرمائیں۔

اب ایک طرف دہلی کالج، دبستان لاہور، فورٹ ولیم کالج وغیرہ میں اردو کتابوں کے ترجمہ و تالیف کا کام جاری تھا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں میں اصلاح معاشرت، تنویرِ افکار اور اشاعت تعلیم کی ایک تحریک سرسید احمد خاں کے زیر قیادت شروع ہوئی۔ سرسید نے نثر اردو کو تکلف و تصنع عبارت آرائی، قافیہ پیائی وغیرہ سے نجات دلا کر ایک سیدھا سادہ کاروباری اندازِ تحریر اختیار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ علوم مغربی کی ترویج، اردو صحافت کے قیام، اور اصلاحی و تعلیمی نشر و اشاعت کا کام صرف اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے۔ کہ زبان کو تمام تکلفات سے آزاد کردیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فن تعمیر، آثار قدیمہ، مذہب، علم کلام، فلسفہ، تعلیمی و سیاسی مسائل اور اصلاح معاشرت پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ بے شمار مضامین لکھے اور لکھوائے۔ اور اپنے احباب مثلاً محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی اور دوسرے بزرگوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ مولانا نذیر احمد، مولانا ذکاء اللہ، مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد۔ اگرچہ علی گڑھ کی تحریک سے متعلق نہ تھے۔ لیکن سرسید کے دوست، مداح اور قدر دان تھے۔ اس لیے انھوں نے سرسید کی ادبی تحریک میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ مولانا نذیر احمد نے متعدد اصلاحی ناول لکھے۔ اور مذہبی کتابیں تصنیف کیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے بیسیوں موضوعات پر علمی کتابیں لکھیں مولانا حالی نے مسدس لکھی۔ غالب کے سوانح حیات مرتب کیے۔ سرسید کے بعد ان کی سوانح عمری حیات جاوید کے نام سے لکھی۔ اور ثابت کردیا کہ وہ نثر نگاری میں شاعری سے زیادہ کمال رکھتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جو نہایت بلند پایہ انشا پرداز اور صاحب طرز ادیب تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن کو آج تک قبول عام کی نعمت حاصل ہے۔

اس دوران میں نظم کا بہترین نمونہ مولانا حالی کی مسدس ہے۔ اس میں شاعر کی معجز نگاری درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ یعنی وہ شعر فارسی اور شعر اردو کی قدیم روایات، ان کی تشبیہوں اور استعاروں اور دیگر تکلفات سے قطعاً خالی ہونے کے باوجود بے انتہا مؤثر، زوردار اور پرشکوہ نظم ہے۔ اردو شاعری میں یہ اپنی قسم کی واحد تصنیف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے جمود کو توڑنے میں اس نظم نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

مولانا شبلی کچھ مدت تک سرسید کے ساتھ رہے۔ اور علی گڑھ کالج میں خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ نابغۂ عظیم علم و فضل اور شعر و ادب کا جامع تھا۔ اس نے اسلامی تاریخ کے وہ گوشے اجاگر کیے جن کی معلومات آج کل کے مسلمانوں کے لیے دلیل راہ بن سکتی تھیں۔ ایران کی شاعری پر مجتہدانہ تبصرہ کیا۔ ادبی تنقید پر کتابیں لکھیں۔ فارسی اور اردو کی شاعری میں اپنے کمال کا ثبوت دیا۔ اور علم کلام پر عالمانہ کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا شبلی نصف صدی تک ہمارے علمی افق پر اپنی تجلیاں بکھیرتے رہے۔ اور ان کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے جلیل القدر رفقا نے اپنے استاذ محترم کے کام کو بوجہ احسن جاری رکھا۔

اردو شاعری میں سب سے بڑا انقلاب علامہ اقبال کے ظہور سے ہوا۔ جنھوں نے اردو غزل کو مع اس کی روایات کہنہ کے کاملاً ترک کر دیا۔ اور ابتدا میں جو قدیمانہ غزلیں بھی کہیں۔ ان میں بھی رسمی اور عامیانہ انداز کی پیروی نہ کی بلکہ حتی الوسع جدت تخیل سے کام لیا۔ انھوں نے نظم کی صنف کو اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کے لیے مستقل طور پر اختیار کر لیا۔ ''بانگ درا'' زیادہ تر ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ غزلیں صرف چند ہیں۔ اہل ملک کو نظم کی قوت کا احساس تو مسدس حالی ہی سے ہو چکا تھا۔ لیکن اقبال کی منظومات نے تو تعلیم یافتہ طبقوں کو پرانی غزل سے قطعی طور پر متنفر کر کے نظم کا والہ و شیدا بنا دیا۔ چوں کہ علامہ اقبال غزل کے صرف پرانے انداز ہی کو ناپسند کرتے تھے، نفس غزل کے مخالف نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اردو غزل کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ اور ''بال جبریل'' میں اس اسلوب کو کمال تک پہنچا کر ثابت کر دیا کہ اگر زندگی کے حقائق سے انقطاع اختیار نہ کر لیا جائے۔ اور اظہار خیال میں افادے اور خلوص کو مد نظر رکھا جائے۔ تو اردو کی غزل آج بھی بلند ترین خیالات اور عمیق ترین جذبات کے اظہار کا آلہ بن سکتی ہے۔ یہاں علامہ اقبال کی صرف اردو شاعری کا تذکرہ مقصود ہے۔ انھوں نے ذہن انسانی اور فکر اسلامی کی رہنمائی کا جو فرض ادا کیا ہے اس کا ذکر کسی آئندہ فصل میں کیا جائے گا۔

فلسفہ و شعر کو یکجا کرنے اور عمر بھر واحد نصب العین کے ساتھ شاعری کو اپنے خیالات کا آلۂ اظہار بنانے میں اقبال بالکل منفرد ہے۔ اور اردو زبان فخر و ناز سے یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس نے اقبال کو پیدا کر کے دنیا کی عظیم الشان زبانوں کی صف میں اپنے لیے ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو یورپ کے علمی و ادبی حلقے تسلیم کر چکے ہیں۔ اور نقادوں کے

نزدیک اقبال کا مرتبہ اٹلی کے دانتے اور جرمنی کے گوئٹے سے کسی طرح کم نہیں۔

کہانی چونکہ مقبول عام چیز ہے اس لیے فورٹ ولیم کی داستانوں کے بعد لکھنؤ میں طلسم ہوشربا، بوستان خیال اور ترجمہ الف لیلیٰ جیسی عظیم کتابیں مرتب کی گئیں جنھوں نے عوام کو اردو نثر کا والہ وشیدا بنا دیا۔ پھر سرشار نے ''فسانہ آزاد'' لکھ کر اردو داستان کو مافوق الفطرت عناصر اور عجائبات سے پاک کیا۔ اور آج کل کے ناول کی بنیاد رکھ دی۔ سرشار نے فسانہ آزاد کے علاوہ بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اور اپنی زود نویسی، زیادہ نویسی اور دلکش نویسی سے اردو کو ایک خاص اور بھرپور اسلوب عطا کیا۔ عبدالحلیم شرر نے تاریخی واقعات کو رومانی افسانے سے مخلوط کر کے بہت سے ناول لکھے جو ملک بھر میں مقبول ہوئے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اہل ملک میں تاریخ کی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے والوں میں شرر کے ناولوں نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ شرر نے ان ناولوں کے علاوہ صدہا علمی و تاریخی مضامین بھی لکھے۔ سالہا سال تک رسالہ ''دلگداز'' نکالتے رہے۔ اور اس میں صرف خود ہی لکھتے رہے۔ متعدد تاریخی کتابیں تالیف کیں۔ شرر کا انداز تحریر نہایت رواں اور دل نشیں تھا۔ وہ ہر قسم کے تصنع و تکلف سے پاک زبان لکھتے تھے۔ مرزا ہادی رسوا اور سید سجاد حسین مدیر ''اودھ پنچ'' نے بھی چند ناول لکھے۔ اور ناول کو بلند مرتبے پر پہنچا دیا۔ اس لیے کہ ان کے بعض ناول مغربی اصول تنقید پر بھی پورے اترتے ہیں اور اب تک نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

دہلی میں ڈپٹی نذیر احمد کے معاشرتی ناولوں کے بعد راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی نے فسانوں اور داستانوں اور ہلکے پھلکے مضمونوں سے اردو کے ادب لطیف میں گرانقدر اضافہ کر دیا۔ منشی پریم چند وہ عالی پایہ فسانہ نگار ہیں جنھوں نے اردو کے افسانے اور ناول کو خلوص اور حقیقت سے مالا مال کر دیا۔ ان کے افسانے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے فسانوں کے مقابلے میں پیش کیے گئے۔ اور ارباب ذوقِ سلیم اور نقادانِ فن نے ان کو آنکھوں پر رکھا۔

سرسید اور ان کے رفقا نے اردو زبان کو علم و تحقیق کے راستے پر لگا ہی دیا تھا۔ چنانچہ ان حضرات کے بعد تحقیقی سرگرمیوں اور تنقید ادب کے مشغلوں کو مولانا سید سلیمان ندوی اور رفقائے دار المصنفین نے جاری رکھا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی پوری زندگی زبان اردو کی خدمت و حمایت میں صرف کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ متعدد کتابیں خود لکھیں۔ اور بہت سی ایڈٹ کر کے شائع کیں۔ یہ مولوی عبدالحق ہی کا کارنامہ تھا کہ ان کی سعی و جہد سے حیدر آباد دکن میں عثمانیہ

یونیورسٹی قائم ہوئی۔ جس نے اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا۔ اور دارالترجمہ کے قیام سے تمام علوم وفنونِ حاضرہ کی کتابیں اردو میں مہیا کردیں۔ اس یونیورسٹی کے طلباء نے اردو میں بی اے، ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر کے اکثر دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا پر اپنی فوقیت و برتری کا ثبوت دیا۔ مولوی عبدالحق کی انجمن ترقی اردو نے اردو کی ترویج میں بڑا کام کیا۔ بے شمار اعلیٰ درجے کی علمی کتابیں شائع کیں۔ اور بہت سے حضرات میں اردو زبان و ادب کی تحقیق اور تاریخی ریسرچ کا ذوق پیدا کردیا۔

ادب کی ایک اہم شاخ ڈراما بھی ہے۔ اردو زبان اس شعبے میں بھی پیچھے نہیں رہی۔ امانت کی اندرسبھا سے لے کر امتیاز علی تاج کی انارکلی تک اردو ڈراما کی ترقی کی داستان بے حد دلچسپ ہے۔ مہدی حسن احسن، طالب بنارسی، بیتاب اور پھر آغا حشر کاشمیری نے ڈراما کو چار چاند لگا دیئے۔ شیکسپیئر کے تقریباً تمام ڈرامے بھی حسب ضرورت ترمیم کے ساتھ اردو میں منتقل کرلیے گئے۔ اور آغا حشر کی مہارت فن اور انشا پردازی نے اس صنف ادب کو وہ رونق دی کہ ادبی حلقے جو اس سے پہلے ڈراما کو مبتذل سمجھ کر متوجہ نہ ہوتے تھے۔ حشر کے ڈراموں پر فریفتہ ہوگئے۔ محمد عمر نورالٰہی نے ''ناٹک ساگر'' لکھ کر ہمیں اردو ڈراما کی تاریخ سے روشناس کرایا۔ حکیم احمد شجاع، پنڈت کیفی دہلوی، اشتیاق حسین قریشی جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے بھی متعدد بلند پایہ ڈرامے لکھے۔ سید امتیاز علی تاج نے ''انارکلی'' لکھ کر لازوال شہرت حاصل کی۔

بیسویں صدی انگلستان میں ڈرامے اور اخبار نویسی کے اوج کمال پر پہنچنے کی صدی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو پر بھی انگلستان کی اس رجحان کا اثر پڑا۔ اور ہمارے ہاں بھی ڈراموں، رسالوں، اخباروں کی بھرمار ہوگئی۔ شیخ عبدالقادر نے ''مخزن''، منشی دیانرائن نگم نے ''زمانہ'' جاری کیا۔ منشی نوبت رائے نظر کا ''ادیب''۔ پیارے لال شاکر کا ''العصر''، مولوی ظفر علی خاں کا ''دکن ریویو''، نیاز فتحپوری کا ''نگار''، مولانا تاجور کا ''ادبی دنیا''، میاں بشیر احمد کا ''ہمایوں''، حکیم یوسف حسن کا ''نیرنگ خیال''، سید سلیمان ندوی کا ''معارف''، مولوی عبدالحق کا ''اردو'' ادبی رسائل میں نہایت ممتاز رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے ہفتہ وار صحافت کے معیار کو بلندیوں پر پہنچا دیا۔ سید ممتاز علی نے ''تہذیب نسواں'' اور مولانا راشد الخیری نے ''عصمت'' جاری کر کے طبقۂ نسواں کی بے نظیر تعلیمی و معاشرتی خدمت انجام دی۔ پھر روزانہ اخباروں کا دور شروع ہوا۔ مولوی محبوب عالم کا ''پیسہ'' ...

مولوی انشاء اللہ کا ''وطن'' مولوی ظفر علی خاں کا ''زمیندار'' سالک اور مہر کا ''انقلاب'' سید جالب کا ''ہمدم'' ہندوؤں کے بڑے بڑے اخبارات ''ملاپ''، ''پرتاپ''، ''بندے ماترم'' جاری ہوئے۔

یہ زبان اردو کے ادبیات یعنی نظم، نثر، ڈراما، صحافت کا نہایت مختصر تذکرہ ہے۔ ان شعبوں کی مفصل تاریخ لکھنا اس کتاب کے دائرۂ موضوع سے خارج ہے۔ ورنہ ہم یہ بھی بتاتے کہ اردو نظم و نثر کا کام صرف دہلی، لکھنؤ، لاہور اور حیدرآباد ہی میں نہیں ہوا بلکہ صوبہ سرحد، سندھ، دکن، بنگال، یوپی، پنجاب کے دور دست علاقوں میں بھی اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے اور یہ زبان پورے ہندوستان میں مقبول عام ہوگئی۔ آج سیاسی لوگ کچھ بھی کہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی ایک زبان پاکستان و ہندوستان کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے اور جس کا جاننے والا اس برصغیر کے کسی گاؤں تک میں بھی زباں فہمی کی دشواری کو محسوس نہیں کرسکتا تو وہ صرف اردو ہے۔ راس کماری سے لے کر پشاور تک لوگ جس بولی کو سمجھتے ہیں اس کو ہندوستانی کہیے، ہندی کہیے، اردو کہیے، بہرحال یہی وہ زبان ہے جس کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے روز اول ہی سے مل کر تیار کیا۔ افعال و حروف زیادہ تر ہندی بھاشا سے لیے۔ الفاظ زیادہ تر فارسی، عربی اور دوسری زبانوں سے اخذ کیے۔ اور ایک ایسی بولی پیدا کرلی جس سے باہم اظہار خیالات آسان ہوگیا۔ اور یہ بولی اہل ہند کو اس قدر محبوب ہوئی کہ انھوں نے اس میں شعر کہنا شروع کردیا۔ اور اس بولی میں بڑے بڑے جلیل القدر شعرا پیدا ہوئے۔ مسلمان سلاطین و امرا کی سرپرستی میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے اس کی تحسین و تہذیب میں برابر کا حصہ لیا۔ اور آج وہی بولی دنیا کی معزز ترین زبانوں سے حریفانہ آنکھیں ملا رہی ہے۔

بلا مبالغہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی تمام زبانوں میں صرف اردو ہی ہے جس میں آج بھی بے شمار بڑے بڑے شعرا، بڑے بڑے نثر نگار اور اخبار نویس اپنی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ بلا شبہ دوسری زبانوں میں بھی ادبی کام ہو رہا ہے لیکن وہ کام کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اردو کے ادبی کارناموں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

تیسری فصل: فارسی کے ہندو شعرا و مصنفین

یہ عجیب بات ہے کہ محمود غزنوی کی آمد سے لے کر اکبر کے زمانے تک یعنی تقریباً چھ سو

سال کی مدت میں ہندوؤں نے فارسی شعر و ادب کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ محمود اور ان کے جانشینوں کے درباروں میں ہندوؤں کا خاصہ عمل دخل رہا۔ تاریخ شاہد ہے کہ غزنویوں کی ایک ہندو فوج بھی تھی۔ جس کے افسر بھی ہندو تھے۔ اور غزنی کے ایک وزیر نے ہندوؤں کے ساتھ رابطہ سہل کرنے کے لیے ایک ترجمان بھی مقرر کیا۔[۷] غزنوی عہد کے ایک قابل و نامور افسر تلک کا ذکر ہر کتاب میں موجود ہے۔ جو خواجہ احمد حسن میمندی کا دبیر اور امیر مسعود کے عہد میں ہندی افواج کا سپہ سالار بھی ہوگیا تھا۔ یہ بے حد ذکی اور ہوشیار آدمی تھا۔ اور دبیری و ترجمانی کی فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا تھا۔[۸] ظاہر ہے کہ دبیری و ترجمانی اعلیٰ درجے کی فارسی دانی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اس کے علاوہ غزنویوں کے بعض دوسرے ہندو معتمدین کا ذکر بھی تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ جو یقیناً فارسی داں ہوں گے۔

سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی کی طرف بطور خاص اس پیمانے پر توجہ مبذول کی۔ کہ اس سے قبل اس کی مثال موجود نہ تھی۔[۹] معلوم ہوتا ہے کہ سکندر لودھی نے جب دفاتر اور مناصب پر ہندوؤں کو مقرر کرنا چاہا۔ اور ان کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی تو برہمن اور کھشتری تو متوجہ نہ ہوئے۔ لیکن کائستھوں نے سلطان کے حکم کی تعمیل میں فارسی سیکھنی شروع کردی۔ اور بہت سے سرکاری عہدوں پر فائز ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں کے زمانے میں بھی ہمیں دفاترِ سرکاری پر کائستھوں کا غلبہ نظر آتا ہے۔

کشمیر کے سلطان زین العابدین شاہ نے تالیف قلوب اور رواداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ اور کشمیری پنڈتوں نے فارسی علوم کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ بہت تھوڑی مدت میں وہ فارسی دانی کے لحاظ سے کائستھوں کے ہم پلہ بن گئے فارسی کے ہندو شعرا و مؤرخین میں بلاشبہ زیادہ تعداد کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں کی ہے۔ جنھوں نے ہندوؤں کے دوسرے طبقات سے بہت پہلے تحصیلِ فارسی کی طرف توجہ مبذول کر کے امتیاز حاصل کرلیا تھا۔

اکبر کے عہد میں جہاں ہندوؤں کے علوم و فنون کی قدر افزائی بدرجۂ اتم ہوئی۔ وہاں ہندوؤں نے بھی فارسی کی تحصیل میں بہت سرگرمی کا اظہار کیا۔ اکبر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مدارس کا انتظام کیا۔ اور ہندوؤں کے لیے خاص نصاب بھی مقرر کیا۔ چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے:

''اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست

مدن، طب، منطق، طبیعی، الٰہی، ریاضی، تاریخ مرتبہ مرتبہ اندوزد و از ہندی علوم بیاکرن، نیائے، بیدانت پاتنجل برخواند و ہرکس را از بائیست وقت درنگزارند۔'' [۱۰]

جب راجا ٹوڈرمل نے اپنی اصلاحات نافذ کی اور تمام دفاتر سرکاری میں فارسی کو رواج دیا تو ہندوؤں نے جوق در جوق فارسی پڑھنی شروع کی اور دفاتر و مناصب پر بے شمار ہندو فائز ہوگئے۔ خود راجا ٹوڈرمل فارسی میں بہت ماہر تھا۔ اور فارسی کی بعض کتابیں بھی اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں فارسی کا پہلا قابل ذکر ہندو شاعر مرزا منوہر توسنی ہے۔ جو رائے محمد منوہر توسنی کہلاتا تھا۔ اسلام اور فارسی زبان سے بے حد شغف رکھتا تھا اور صرف یہی نہیں کہ فارسی میں پاکیزہ شعر کہتا تھا۔ بلکہ محمد منوہر کہلانے پر فخر کرتا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے:

منوہر نام دارد، ولد لون کرن راجہ سانبراست کہ درنمک زار مشہور است و ایں ہمہ نمک درسخنِ او تاثیر ایں سرزمین استِ صاحبِ حسن غریب و ذہن عجیب است۔ اول اور امحمد منوہر مے خوانند۔ بعد ازاں مرزا منوہر خطاب یافت۔ و پدرش باوجود کفر بشرف و افتخار و مباہات ہمیں محمد منوہر می گفت ہرچند مرضی طبع بادشاہی نبود۔ [۱۱]

طبقات اکبری، تزک جہانگیری اور بعض دوسری کتابوں میں بھی منوہر کا ذکر موجود ہے۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

شیخ مستغنی بہ دین و برہمن مغرورِ کفر
مستِ حسن دوست را باکفر و ایماں کارنیست

یگانہ بودن و یکتا شدن زِ چشم آموز
کہ ہر دو چشم جدا و جدا نمی نگرند

عہد شاہ جہانی میں منشی چندربھان برہمن ایک نامور ہندو شاعر، مورخ، منشی، اور مصنف گزرا ہے جس کا دیوان موجود ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہرکہ دارد ہوسِ عشق نشانے با اوست
چوں گل لالہ بہ دل داغ نہانے با اوست

در جہاں باش و لیکن زجہاں فارغ باش
ہر کہ فارغ زجہان است جہانے با اوست

بانی خانہ و بت خانہ (میخانہ) یکیست
خانہ بسیار ولے صاحب ہر خانہ یکیست
ماحالِ دلِ خویش نہفتیم و نگفتیم
شب تا سحر از درد نہ خفتیم و نگفتیم

بارشتۂ مژگاں ہمہ شب دانۂ اشکے
از غیر نہاں داشتہ سفتیم و نگفتیم
درسینۂ خود رازِ غمِ عشق برہمن
چوں غنچہ بصد پردہ نہفتیم و نگفتیم

برہمن کے کلام کی سادگی و سلاست اچھے اچھے ایرانی شعرا سے لگا کھاتی ہے۔ اس کے علاوہ متھرا داس ہندو، بنوالی داس بنوالی، وامق کھتری بھی اسی عہد کے شعرا ہیں۔ داراشکوہ کے جلیسوں میں ایک ہندو شاعر بیغم بیراگی بھی تھا۔ جس کی مثنوی تصوف میں مشہور ہے اور اس کے بعض اشعار پر مثنوی رومی کا دھوکا ہوتا ہے۔

شعرا کے علاوہ عہدِ مغلیہ کے بعض مؤرخین بھی ہندو تھے۔ مثلاً چندر بھان برہمن مصنف چہار چمن، بھگونت داس مصنف شاہ جہاں نامہ، منشی ہیرامن مصنف گوالیار نامہ، بندرابن داس بہادر شاہی مصنف لب التواریخ، منشی سجان رائے بٹالوی مصنف خلاصۃ التواریخ، نرائن کول عاجز مصنف تاریخ کشمیر، بھیم سین ولد رگھو نندن داس مصنف تاریخ دلکشا اور متعدد دوسرے مؤرخین مشہور ہیں۔ خصوصاً منشی سجان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ تو تاریخ ہند کے معتبر مآخذ میں شمار کی جاتی ہے۔

فنِ انشا میں بھی ہندوؤں نے بڑے بڑے باکمال پیدا کیے۔ مثلاً ہرکرن، برہمن مادھو رام، ملک زادہ منشی اور منشی اودھے راج۔ ان میں چندر بھان، برہمن انشا پردازی کے اعتبار سے مثال نہ رکھتا تھا۔ اور انشائے مادھو رام تو گزشتہ صدی تک ہمارے فارسی نصاب میں شامل رہی

ہے۔ ملک زادہ منشی کی نگار نامہ اور اودھے راج کی ہفت انجمن بھی انشا کی قابل قدر کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ ہندو مترجمین اور قصہ نویس بھی موجود تھے جن کی کتابوں کے نسخے ہمارے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

جب مغلوں پر زوال و انحطاط کا دور شروع ہوا تو ہندوؤں کی فارسی نویسی شباب پر آئی۔ مرکزی دربار میں تعلیم یافتہ ہندو ملازموں اور افسروں کا شمار نہ تھا۔ شاہان اودھ کے دربار میں معمولی منشی متصدی سے لے کر دیوان اعلیٰ کے مناصب تک پر ہندو فائز تھے۔ بیت الانشاء اور دارالانشاء پر تو ہندوؤں کا اجارہ قائم تھا۔ اور یہ تمام تعلیم یافتہ ہندو نہایت نکتہ پرور، نکتہ سنج اور اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ حیدر آباد دکن کی کیفیت بھی یہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر و مناصب پر بھی فارسی دان ہندوؤں کا تسلط تھا۔

اس عہد میں بڑے بڑے لغت نویس پیدا ہوئے۔ مثلاً خان آرزو، محمد افضل ثابت، رائے انند رام مخلص، سیالکوٹی مل وارستہ، ٹیک چند بہار۔ آخری دو یعنی وارستہ اور بہار کی دو کتابیں ''مصطلحات وارستہ'' اور ''بہار عجم'' ہندوستان کے تمامتر فارسی لٹریچر میں اہم ترین ہیں۔ وسعت معلومات ژرف نگاہی، تحقیق و تنقید کے اعتبار سے ان کتابوں کا جواب نہیں۔ اس دور کا بہت بڑا ہندو مؤرخ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ہے۔

ہندو مؤرخین نے اس زمانے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف سلطنتوں کی جو تاریخیں لکھیں ان کا مختصر تذکرہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے کیا ہے۔ اور ان کی تعداد ۳۷ ہے۔ خوشحال چند کائستھ (تاریخ محمد شاہی)، رائے چتر من کائستھ (چہار گلشن)، لچھمی نرائن شفیق (مآثر حیدری اور کتب متعددہ)، ان میں بے حد ممتاز ہیں۔ تذکروں کی تعداد سولہ ہے جو سب کے سب ہندو انشا پردازوں کی تالیف ہیں۔ ان میں لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا پایہ سب سے اونچا ہے۔ جس نے تذکرۂ گلِ رعنا، تذکرۂ شامِ غریباں، تذکرۂ چمنستان شعرا جیسی مشہور کتابیں چھوڑی ہیں۔ اس عہد میں فن انشا پر بیس سے زیادہ قابل ذکر کتابیں لکھی گئیں۔ جن کی فہرست ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ قصص و حکایات میں نو، مترجمات میں گیارہ، اور علم الحساب، ہیئت و نجوم اور دیگر فنون میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔[۱۲]

انند رام مخلص نے اپنی مشہور لغت مراۃ الاصطلاح کے علاوہ بھی متعدد کتابیں لکھیں جن سے نثرِ فارسی میں ان کے کمال کا پتا چلتا ہے۔ ''نشترِ عشق'' میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ ''در فارسی

روش مخصوص بدست آوردہ''۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی مقبول عام تھا۔ چنانچہ غلام علی آزاد نے ''خزانۂ عامرہ'' میں لکھا ہے کہ ''سخن انند رام قشقۂ قبول برجبیں دارد'' اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔[۱۳]

بُرد سودائے سرِ زلفِ تو از خویش مرا
سفر دور و دراز آمدہ در پیش مرا
گزشتی از نظر و بے تو زندہ ایم ہنوز
زشرم آب نگشیتم خاک برسر ما

میازار اے محبت بارچوں من ناتوانے را
غریبے دردمندے بیکسے آرزدہ جانے را
زحال بلبل مسکیں نداریم اطلاع اما
بپائے گلبنے دیدیم مشت استخوانے را

''مصطلحات وارستہ'' کے مصنف سیالکوٹی نے فارسی لغت اور محاورہ میں ایسا کمال پیدا کیا کہ بعض امور میں وہ سراج الدین علی خاں آرزو کے بیانات پر بھی دلیری سے جرح کرتا ہے اور زبان کے معاملے میں اساتذہ ایران کے سوا کسی کی سند کو معتبر نہیں مانتا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ اس نے مدۃ العمر پنجاب ہی میں زندگی بسر کی۔ اور دہلی و لکھنؤ کے مرکزوں میں بہت کم جا سکا۔ لیکن ''مصطلحات'' نے اس محقق زبان دان اور انشا پرداز کا لوہا بڑے بڑوں سے منوالیا۔ وارستہ شاعر بھی تھا۔ لیکن مصطلحات میں صرف چند اشعار کے سوا اس کا کلام نایاب ہے۔ غالباً صاحب دیوان نہ تھا۔

منشی ٹیک چند بہار کی ''بہار عجم'' بیس برس کی محنت سے مرتب ہوئی۔ اور ہندوستان کی فارسی کتب لغات میں پایۂ بلند رکھتی ہے۔ یہ سراج الدین علی خان آرزو کا شاگرد تھا۔ لیکن خود خان آرزو نے اس کے متعلق لکھا ہے:

بہار عجم وغیرہ از یاران فقیر آرزو است۔ ومثل او دریں عصر بہم نرسیدہ و دریں کاتب گاہے با او صلح است وگاہے جنگ است[۱۴]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس دور کے جن ہندو شعرائے فارسی کا تزکرہ کیا ہے ان کی تعداد

چھپن تک پہنچتی ہے۔ ان میں سوامی بھوپت رائے بیغم بیراگی، لالہ امانت رائے امانت، منشی بساون لال بیدار، انند رام مخلص بندرابن داس خوشگو، سرب سکھ دیوانہ اور بچھمی نرائن شفیق کے نام ممتاز ہیں۔ بیغم بیراگی تو اپنی مثنوی کے لیے جو تصوف و معرفت میں ہے کافی مشہور ہے لیکن مثنوی کے علاوہ اس نے غزلیات و رباعیات بھی کہی ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

در فضائے عشق جاناں بوالہوس را کار نیست
ہر سرے شائستہ سنگ و سزائے دار نیست

مرا ابرو کمانے می کشد در بر۔ ولے ترسم
کہ ایں در برکشیدن ہا چو ناوک دورم اندازد

ہر گاہ کہ ساز عیش بنیاد کنید
باید کہ دل غمزدہ شاد کنید
یاراں چو ولے بیک دگر بنشینید
باللہ کہ از فقیر خود یاد کنید

امانت رائے کے دو شعر درج ذیل ہیں:

بسکہ خوں درجگر از دست نگارے دارم
در دل خود چو حنا جوشِ بہارے دارم
در تمنائے تو اے سرو رواں برلبِ جُو
ہمچو ساحل تہی از خویش کنارے دارم

بساون لال بیدار کے کلام کا نمونہ یہ ہے
بہ فرزندان مردم دل غلط بستم ندانستم
کہ ہرگز دیگرے مالک نگردد شعرِ تضمیں را
بندرابن داس خوشگو

آواز تیشہ امشب در بے ستوں نیامد
شاید بخوابِ شیریں فرہاد رفتہ باشد

موجود گر نبودیم معدوم ہم نبودیم
امروز از کجائیم گر در عدم نبودیم

سرب سنگھ دیوانہ

گفتند از زبان تو بامن پیام وصل
باور نیایدم کہ پیام از زبانِ تست

من و دل ہر دو در راہے زضعف افتادہ در ساعت
گہے من دستِ دل گیرم گہے دل و دست من گیرد

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے دوسرے کمالات کا ذکر آچکا ہے۔ یہ شاعر بھی خوب تھا۔ لکھتا ہے:

زخارہائے مغیلاں پُر است وادیٔ عشق
شفیق آبلہ پا می رود خدا حافظ

برلبِ نازک او بوسہ تواں داد شفیق
کہ مرا یاد کند باز بہ دُشنامے چند

اگرچہ اس دور کے بعد مسلمانوں کی حکومت زوال و انحطاط کا شکار ہوگئی اودھ کی سلطنت میں انگریز دخیل ہونے لگے۔ اور ۱۸۵۷ء میں دودمانِ تیموری کی مسند ویران ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود ملک میں ہزارہا ہندو فارسی دان مختلف درباروں میں منشی متصدی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کے سرکاری دفاتر کی زبان بھی فارسی تھی۔ اور دربار میں فقیر عزیز الدین اور حکیم نورالدین انصاری کے ساتھ ہی ساتھ مصر بیلی رام، دیوان امرناتھ، دیوان دینا ناتھ، دیوان گنگا رام بھی فارسی انشاء کے ماہر موجود تھے۔ اور اس زمانے میں منشی سوہن لال (عمدۃ التواریخ)، پنڈت کاچر (مجمع التواریخ)، منشی دیا رام دُر، کرنل مہاں سنگ، دیوان کرپا رام، دیوان

انت رام اور دیوان بخت مل زبان فارسی میں تاریخ کی بلند پایہ کتابیں تصنیف کر رہے تھے۔ انگریزی عہد میں بھی مدت دراز تک فارسی کا دور دورہ رہا۔ یہاں تک ۱۸۴۴ء میں فارسی سرکاری دفاتر سے خارج کردی گئی۔

اس دور میں تاریخ، سوانح، قصص، علوم طبعیہ، طب، موسیقی، انشا، لغت کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً تاریخ کی پینتیس چالیس کتابوں میں کلیان سنگھ کی خلاصۃ التواریخ، سدا سکھ نیاز کی منتخب التواریخ، بساون لال شاداں کا امیر نامہ، منشی سوہن لال کی عمدۃ التواریخ اور رائے کرپا رام کی گلزارِ کشمیر خاصی مشہور و ممتاز تالیفات ہیں۔ سوانح میں وقائع معین الدین چشتیؒ بابو لال نے لکھی۔ رتن سنگھ زخمی نے انیس العاشقین کے نام سے شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ مرتب کیا۔ رام سیتا سنگھ فکرت نے حقیقتہائے بیخود کے نام سے اپنے صوفی گرو کی سوانح عمری لکھی۔ بہت سی متصوفانہ اور مذہبی کتب کے ترجمے کیے گئے۔ فن انشاء پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں نوندہ رام کی دستور الصبیان تو مدتِ دراز تک مدارس میں پڑھائی جاتی رہی۔

اس زمانے میں فارسی کے ہندو شعرا کی وہ بھرمار ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ چند نمایاں شاعروں کا حال سنیئے۔

ذوقی رام حسرت شاہ جہاں آبادی نے فارسی میں دو دیوان چھوڑے ہیں۔ انیس العاشقین میں بیان کیا گیا ہے کہ شعر فارسی میں اپنا ایک خاص اسلوب رکھتا تھا۔ اور محاورات ایرانی میں شاذ و نادر ہی غلطی کرتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

حسرت آں عاشق و دیوانۂ مادر زادیم
کہ زما دست بہ طفلی پدر ما برداشت

چہ کنم ترک غم عشق بتاں کارم نیست
ورنہ آں نیست کہ از خواری خود عارم نیست

تابعد مرگ ہم نہ گزارد مرا بہ خویش
برخاکِ من گزشت و عزارا بہانہ ساخت

منشی ہرگوپال تفتہ کائستھ سکندر آبادی مرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھا۔ پہلے

رامی تخلص تھا۔ پھر تفتہ اختیار کیا۔ مرزا غالب سے بے حد مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ رقعات غالب میں اس کا اکثر ذکر آتا ہے۔ تفتہ کے چار ضخیم دیوان فارسی میں ہیں جو اہل ذوق سے مخفی نہیں ہیں۔ اس لیے نمونۂ کلام دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

راجا رتن سنگھ زخمی کائستھ۔ شاہانِ اودھ کی ملازمت ان کی پشتوں میں چلی آتی تھی۔ فخر الدولہ منشی الممالک خطاب تھا۔ شاہانِ اودھ کے حالات میں ایک کتاب "سلطان التواریخ" لکھی۔ ایک دیوان اشعار فارسی کا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ماندہ باقی زمن و دل نفسے یا قسمت
نیست از حال من آگاہ کسے یا قسمت

ہم صفیراں بشما باد مبارک گلزار
یاد تنہائی و کنجِ قفسے یا قسمت

بامن نشیں کہ خوفِ خدا خود بہانہ ایست
مے دہِ کہ بیم روز جزا خود بہانہ ایست

خون من است ایں کہ نہاں می کنند خلق
ہر لحظہ وصف رنگ حنا خود بہانہ ایست

اِندرمن کائستھ آنکھوں سے معذور تھا۔ حسین قلی خاں عشق کا ذاتی دوست تھا جس نے اپنے تذکرہ "نشترِ عشق" میں اس کے حالات لکھے ہیں۔ نمونۂ کلام

تو بہرجا کہ نہی آں کفِ پا گل خیزد
برزمینے کہ فتد زلفِ تو سنبل خیزد

گردر آئی بچمن باقدِ بالا گل رو
سرو از پافتدو نالہ ز بلبل خیزد

ذکر رو دگراز بلا زلف کشا کہ ہم چنیں
فتنہ بجویدار کسے چشم نما کہ ہم چنیں

ہر کہ طلب کند نشاں چوں بشود قیامتے؟
ناز کناں زخانۂ خویش بر آ کہ ہم چنیں

صاحب رام خاموش کھتری بنارس۔ پہلے تخلص مجزوں تھا۔ پھر خاموش اختیار کیا۔ یہ شیخ علی حزیں کا شاگرد تھا۔ ایک ضخیم دیوان غزلیات، قطعات، رباعیات و قصائد پر مشتمل ہے۔ ایک شعر سنیے:

فرض کردم ہمہ تقصیر من است
بعد ازیں گو کہ چہ تدبیر من است

ان کے علاوہ بے شمار دوسرے شعرا بھی تھے۔ سیّد محمد عبداللہ نے تذکرہ کریم الدین، انیس العاشقین، عیار الشعرا، قاموس المشاہیر، آثار الصنادید، خمخانۂ جاوید اور دوسرے مآخذ سے کوئی ڈیڑھ دوسو ہندو شعرائے فارسی کے نام جمع کر کے اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔

انگریزی دور میں فارسی و عربی کے علوم و فنون کی اشاعت و حفاظت کا جو کام منشی نول کشور نے اپنے مشہورِ عالم مطبع میں انجام دیا، اس کی مثال نہیں۔ انہوں نے قرآن مجید، تفسیر، حدیث، فقہ، طب، علومِ طبیعیہ، شعر، ادب، قصص، غرض تمام شعبوں کی ہزارہا کتابیں انتہائی کاروباری ہمت کے ساتھ چھاپ کر ملک بھر میں پھیلا دیں۔ اور علم و ثقافت کے اس ذخیرے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ ورنہ صدہا کتابیں تلف ہو جاتیں۔

چوتھی فصل: اردو کے ہندو شعرا

گزشتہ فصل کے مندرجات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں تو ہندوؤں نے فارسی میں تصنیف و تالیف اور ادب و شعر کے مشاغل اختیار کیے ہی تھے۔ لیکن سلطنت کے روبہ زوال ہونے کی حالت میں یہ مشاغل کم ہونے کے بجائے زیادہ وسیع ہو گئے اور اواخر عہد مغلیہ میں ہندو مصنفین و مورخین و شعرا کی تعداد زمانۂ ماضی کی نسبت بہت بڑھ گئی۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہندوؤں نے تہذیب فارسی کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنالیا تھا۔ اور اس کو چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہ تھے۔ پھر جب اپنی ابتدائی شکل میں ادبی حلقوں سے روشناس ہوئی تو ہندوؤں نے اس زبان میں شعر کہنا شروع کر دیا۔

سترھویں صدی

اگرچہ امیر خسرو نے تیرھویں صدی عیسوی میں مکرنیاں، پہیلیاں، دو سخنے اور اردو فارسی کی مخلوط نظمیں لکھ کر گویا اردو شاعری کی بنیاد رکھ دی تھی۔ لیکن اردو کی شاعری باقاعدہ سترھویں

صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ اور محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی اور پھر نصرتی اور ولی اورنگ آبادی نے اردو غزل اور مثنوی میں طبع آزمائی کی۔ اس صدی میں ہندوؤں نے اردو شاعری کی طرف توجہ نہیں کی۔ البتہ دو نام نظر آتے ہیں۔ ایک ولی رام ولی، دوسرے چندر بھان برہمن۔

ولی رام ولی

شاہ جہاں آباد کا ایک کائستھ تھا۔ شہزادہ داراشکوہ کا مشیر خاص اور عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کا ماہر تھا۔ بعض اوقات اس نے ایسے اشعار بھی لکھے جن کا ایک مصرع فارسی میں اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا۔ مثلاً

تو مہماں آمدی اینجا شدی خود خانہ خاوند
تو اپنے آپ کو بھولا کسی کو نہ پچھانا ہے
قبا و چیرۂ رنگیں ہمہ ارتن تو بکشایند
دہیں گے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے
(دیں گے)

چندر بھان برہمن

ہندوستان کے ممتاز ترین فارسی شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا ذکر فصل گزشتہ میں آچکا ہے۔ یہ شہزادہ داراشکوہ کا منشی تھا۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں، کروں کیسے
نہ تسبی ہے، نہ سمرن ہے، نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے، نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

اٹھارہویں صدی

اس کے بعد اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں تو اردو کے فارسی شعرا جابجا پیدا ہوگئے۔ تذکروں میں کم و بیش ڈھائی تین سو ایسے شاعروں کا ذکر موجود ہے۔ ان سب کے حالات کا

احاطہ تو دشوار ہے صرف بعض نمایاں اور ممتاز شعرا کا تعارف کرایا جائے گا۔

مہاراجا بینی بہادر بہادرؔ

لکھنؤ کے کائستھ اور نواب شجاع الدولہ کے مصاحب تھے۔ اور خوش فکر شاعر تھے۔ ایک مطلع ملاحظہ ہو۔

سیاہی مُو کی گئی دل کی آرزو نہ گئی
ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

مہاراجا کا صاحبزادہ راجا جسونت سنگھ پروانہ ایک خوبصورت اور خوش مزاج نوجوان تھا۔ بعض تذکرہ نگار اس کو مصحفی اور میر حسن کا شاگرد بتاتے ہیں۔ فارسی میں بھی شعر کہتا تھا۔ اردو میں نمونۂ کلام یہ ہے

نسیم آہ نے شاید کسی کے کی تاثیر
شگفتگی سی ترے غنچۂ دہاں پر ہے

بحرِ ہستی میں ترا جسم ہے مانند حباب
تِس پہ اک دن کی ہوا کھانے پہ مسرور ہے تُو
آئینہ سال ہے صاحب جوہر کو زنگِ غم
اس دور میں کہ عیب و ہنر دونوں ایک ہیں

رائے سرب سنگھ دیوانہ

اردو اور فارسی کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ دہلی کا رہنے والا تھا۔ ہندوستان کے مشرقی حصے کے بہت سے ممتاز شعرا اس کے شاگرد تھے۔ مثلاً جعفر علی حسرت (استاد جرأت) اور میر حیدر علی حیران۔ نمونۂ کلام

وے یار کہاں کہ یارا باشی کیجے
وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشے میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا
اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

جب نہ تب سنیئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے ولے
گرمیِ بزم کہاں اس بُتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ جلیسوں نے کہا
ہوچکی اس کو شفا شربت دیدار بغیر

جس کی خاطر کے لیے یار سب اغیار ہوئے
کیونکر دیوانہ بھلا رہیئے اب اس یار بغیر

مرزا راجا رام ناتھ بہادر ذرّہ شاہ عالم کے دربار میں عہدۂ نظارت پر مامور تھا۔ چونکہ شاہ عالم کا تخلص آفتاب تھا۔ اس لیے اس نے اپنا تخلص ذرّہ رکھا۔ اس کی دو شعروں سے لطف اٹھائیے۔

غضب ہے آکے عاشق کو لٹا دیتی ہیں لال آنکھیں
چھنا لیتی ہیں میری جان وہ کافر چھنال آنکھیں

ترے کوچے میں روز و شب پڑا پھرتا ہے یہ ذرّہ
بجا ہے ایسے دیوانے کے مطلب کو روا رکھنا

ذرّہ کا بیٹا راجا شنکرناتھ صبا سعادت یار رنگین کا شاگرد تھا۔ اکثر اپنے اہتمام میں مشاعرے کراتا تھا۔ دو شعر درج ذیل ہیں

کیا پوچھتے ہو جور و ستم مجھ سے یار کا
دیکھو نہ حال میرے دلِ بے قرار کا

دل جب اس کی نگہِ مست کا مخمور ہوا
سرخوش کیفیتِ بادۂ انگور ہوا

صبا کا بھائی مرزا راجا گوپال ناتھ غلام اِنشاء کا دوست اور شاگرد تھا۔ ان کے دو شعر بھی

سن لیجیے۔

جو ہم بستر کبھی ہم ہوں غلامؔ اس خوبصورت سے
نہ لیں واللہ تا روزِ قیامت دوسری کروٹ

خط دے یا نہ دے گوش برآواز ہیں قاصد
مژدہ تو ہمیں یار کے آنے کا سنا دے

راجا نول رائے وفا صفدر جنگ والی اودھ کے بڑے معتبر امیر تھے بڑے مرد میدان اور جنگ آور۔ لیکن فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کے دیوان موجود ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بکھرائے کوئی زلف کو اپنی جو اے وفاؔ
پھر آہ کس طرح ملے میرا سراغِ دل

کہنے لگا وہ سن کے میرا نالہ و فغاں
یارب جیا رہے گا یہ بیچارہ کب تلک

شیو سنگھ ظہورؔ دہلوی اپنے زمانے کے اچھے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ آگرہ میں قیام تھا۔ انعام اللہ خاں یقین کے ہمعصر اور پیرو تھے۔ نمونۂ کلام

ہمیشہ زلفِ خوباں کو کرے ہے درہم و برہم
مرے دل کے ستانے کو کبھی شانہ نہ باز آیا
بیاباں میں مرے مرنے سے اب تک خاک اڑتی ہے
میرے ماتم کے کرنے سے تو ویرانہ نہ باز آیا

سیتا رام عمدہ انعام اللہ خاں یقیںؔ کے شاگردوں اور خان آرزو کے شناساؤں میں تھے۔ کشمیری تھے، لیکن دہلی میں رہتے تھے۔ اردو میں شگفتہ اور رواں شعر کہتے تھے۔ مثلاً

حکم کیا ہے اسے راتوں کو ترے کوچے میں
دل مرا نالہ و فریاد کرے یا نہ کرے
عمدہ اب ہم تو اسے یاد بہت کرتے ہیں
یاد ہم کو وہ پریزاد کرے یا نہ کرے

کسی کے سینے میں ہرگز مرا سا داغ نہ تھا
مرے چراغ سا روشن کوئی چراغ نہ تھا
چمن میں کھینچ کے لائے ہیں گلرخاں مجھ کو
وگرنہ سیر چمن کا مجھے دماغ نہ تھا

خان آرزو کے شاگردوں میں دو ہندو اپنے کمالات کے اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ ٹیک چند بہار اور انند رام مخلص۔ ان کی لغت دانی اور مہارت فارسی کا ذکر فصل گزشتہ میں آچکا ہے۔ یہ دونوں اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔

ٹیک چند بہار (صاحب بہار عجم) کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

کوئی کس ساتھ ایسی فصل گل میں دل کو پرچاوے
نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ مطرب ہے نہ ہمدم ہے
ہمیں واعظ ڈراتا کیوں ہے دوزخ کے عذابوں سے
معاصی گو ہمارے بیش ہوں کچھ مغفرت کم ہے

وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں
اگر جلوہ نہیں ہے کفر کا اسلام میں ظاہر
سلیمانی کے خط کو دیکھ کیوں زنّار کہتے ہیں؟

رائے انند رام مخلص محمد شاہ کے زمانے میں نواب عماد الدولہ کے وکیل تھے۔ خان آرزو کے علاوہ مرزا بیدل سے اصلاح لیتے تھے۔ اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

یوں پکارے ہے کھڑا گلشن میں سرو از بیکسی
پہنچیو قمری کہ کیا آزاد جاتی ہے بہار

آتا ہے ہر سحر اٹھ تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

بندرابن راقم متھرا کے رہنے والے تھے۔ سودا کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی میر سے

اصلاح لیا کرتے تھے۔ بعض تذکرہ نگار انھیں مرزا مظہر جان جاناں کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اردو کلام کا نمونہ۔

مری بدشرابیوں سے کریں میکسار توبہ
رہے وہ عمل کہ ہووے سبب نجات یاراں
یاں تک قبول خاطر کیجیے تری جفا کو
تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

بچھی رام فدا بھی سوداؔ کے شاگرد تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ اردو میں شعر بہت صاف ستھرا کہتے تھے۔ مثلاً

گزشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے
نہ ہوں فریفتہ کیوں کر کہ آن باقی ہے
کہا جو ان سے کہ میں دل تو کر چکا ہوں فدا
تو ہنس کے بولے ابھی تجھ میں جان باقی ہے

سدا سکھ نثار دہلوی صاحبِ دیوان تھے۔ سوداؔ سے تلمذ تھا۔ ان کے دو شعر سنیے:

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے
تو شکوہ ہمیں کچھ تمہارا نہیں ہے

کیا سنگھار رجھانے کو کس کے تم نے چشم
کہ بال بال دُرِ اشک جو پروئے ہیں

جھمن ناتھ جھمنؔ دہلوی کے بزرگ امیر الامرا نواب ضابطہ خان بہادر کی سرکار میں معزز رہے۔ یہ عربی اور فارسی میں مہارت دانی رکھتے تھے۔ "بہارِ دانش" کو منظوم کیا۔ خواجہ میر درد کے شاگرد ہی نہیں مرید بھی تھے۔ اور فقر و فاقہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں

دل جوں سپند عشق کی آتش سے جل گیا
اک آہ کھینچتے ہی مرا دم نکل گیا

اشک ہوتے ہی تولد اس قدر رسوا ہوا
یہ تو لڑکا حضرتِ مجنوں کا بھی باوا ہوا

بھکاری لال عزیزؔ دہلوی میر دردؔ کے شاگرد تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

بات اب امتحان پر آئی
قصہ کوتاہ جان پہ آئی

آرام وصل و ہجر میں ممکن نہیں ہمیں
یوں ہی ہمیشہ مضطرب اے رشکِ ماہ تھے

اب ہجر ہے تو حسرتِ دیدار لے ہے جی
جب وصل تھا تو کشتۂ تیغ نگاہ تھے

صاحب رائے فریادؔ لکھنوی کائستھ میر سوزؔ کے شاگرد تھے شعر ملاحظہ ہو۔

غم جب سے ہوا ہے یار دل کا
کوئی نہیں غمگسار دل کا

چین پایا وہ پسِ مُردن دلِ بیتاب سے
گوشۂ مرقد ہمیں آغوشِ مادر ہوگیا

قیام الدین قائمؔ، بیانؔ، قدرتؔ، بقاؔ، میر حسنؔ، اور قلندر بخش جرأتؔ کے بھی بہت سے ہندو شاگرد تھے۔

گنگا پرشاد رندؔ لکھنوی ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جرأتؔ کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی نظیر حسین شائقؔ بھی اصلاح لیتے تھے۔ نمونۂ کلام

روتا ہوں چپکے چپکے آتا ہے یاد جس دم
وہ دیکھنا کسی کا نظریں چُرا چُرا کر

مانتے ہو گر بُرا معشوق کہنے سے تو جان
ہم تمھیں مشہور اپنا چاہنے والا کریں

وہی فغاں ہے وہی آہ ہے وہی نالہ
خدا کے فضل سے اپنا جو حال ہے سو ہے

ٹیکا رام تسلیؔ وزیر الممالک گوپال رائے بخشی کے صاحبزادے تھے۔ وطن اٹاوہ تھا۔ لیکن پیدا لکھنؤ میں ہوئے۔ اردو میں مصحفی کے شاگرد تھے۔ نمونۂ اشعار

آنکھیں سحر تلک مری در سے لگی رہیں
کیا پوچھتے ہو حال شب انتظار کا

گو دل میں خفا ہے تو، پر اس بات کو ناداں
کہ بیٹھیو مت عاشقِ دلگیر کے منہ پر

منوہر لال صبا لکھنؤ کے کائستھ تھے۔ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ یہ مشہور شعرانہی کا ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

آفتاب رائے رسواؔ محمد شاہ کے عہد میں شاہ جہاں آباد میں رہتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

کہتے ہیں شیخ یوں کہ تو اسلام کر قبول
اور برہمن ہیں کہتے بتوں کے تئیں نہ بھول
رہتا ہوں شب و روز میں اسی فکر میں ملول
کس کا کہا میں مانوں اور کس کا کروں عدول

"از کوئے توبہ کعبہ روم یا بہ بتکدہ
اے پیرِ رہ بگو کہ طریق صواب چیست؟"

ہر گلی گر گر پڑے ہیں مست ہو دیوار و در
ابر رحمت ہے برستا یا برستی ہے شراب

وصل میں بے خود رہے اور ہجر میں بے تاب ہو
اس دوانے دل کو رسوا کس طرح سمجھائیے

ایک مہتاب رائے تاب کشمیری تھے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

خو ہوتی ہمیشہ سے تمھاری اگر ایسی
تو کاہے کو نبھتی مری اے فتنہ گر ایسی

یہ مشہور شعر بھی انہی کا ہے۔ اور اسی غزل میں ہے

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

مینڈو لال زارؔ اپنے عہد کے اچھے شعرا میں سے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کی کتاب "گلزارِ فصاحت" مشہور ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

آنکھ اپنی بت حور شمائل سے لگی ہے
بُت بن گئے جنت کی ہوا دل سے لگی ہے

جس دم دھواں اٹھا دل پُر اضطراب کا
گل ہو گیا فلک پہ چراغ آفتاب کا

اس دور میں لالہ نہال کرن داغؔ، موہن لال بیتابؔ، لال چند رنگیںؔ، شیو سنگھ بیجانؔ، کنور سین جامؔ، ذوقی رام حسرتؔ، مکند لال فدویؔ، راجس مغمومؔ، جھنو لال طربؔ، ہری رام جودتؔ، طوطا رام عاصیؔ، بکھاری لال دہلویؔ اور بہت سے اور ہندو شعرا ہوئے۔ جن کا تذکرہ کتابوں میں موجود ہے۔

انیسویں صدی

انیسویں صدی کے ہندو شعرائے اردو کے تذکرہ میں پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دکن، کلکتہ اور دوسرے مقامات کے ان رؤسا کا ذکر کیا جائے جنھوں نے اردو میں اشعار کہے۔

راجا مکھن لال (دکن) نے رباعیات عمر خیام کو اردو کا جامہ پہنایا۔ مثلاً دو تین رباعیوں کا ترجمہ سنیے:

جب عشق ہو پستی و بلندی پھر کیا
ہے بے خردی تو ہوشمندی پھر کیا

رکھ طاق میں یار تو مریدی پیری
رندی میں خیالِ ارجمندی پھر کیا

پہلے غمِ ہجر گرمیِ محفل تھا
چندے برات شوق ہم منزل تھا
اے یار اب آکے دیکھ تُربت کو مری
یہ مُشتِ غبار کچھ دنوں تک دل تھا

کعبے میں جو ہم مطیعِ اسلام ہوئے
یا دیر میں ہم حریفِ اصنام ہوئے
ہے ہے ہمیں کچھ اس کا نتیجہ نہ ملا
بس دیر و حرم میں مفت بدنام ہوئے

مہاراجا چندو لال شاداں (۱۷۶۶ء۔ ۱۸۴۵ء) دکن کے وزیراعظم ہوئے۔ شعر و سخن سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اہل کمال کے قدر دان تھے۔ چنانچہ ان کے عہد میں شاہ نصیر دہلوی اور شیخ حفیظ دکن آئے۔ اور مہاراجا کی قدر دانی سے مالا مال ہوئے۔ مہاراجا خود بھی شعر کہتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق تھا یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا
شاداں وہاں بھی کیا ہے حسینوں کی انجمن
جاتے ہیں لوگ کیوں عدم آباد کی طرف

راجا گردہاری پرشاد باقی کا انتقال ۱۹۰۰ء میں ہوا۔ حیدرآباد دکن میں رہتے تھے۔ شعر و سُخن کا خوب ذوق رکھتے تھے۔ بہت سے شعرا کی سرپرستی کرتے تھے۔ داغ بھی جب حیدرآباد آئے تو باقی نے ان کی امداد کی۔ ان کی بہت سی تصنیفات طبع ہو چکی ہیں۔ کلیات باقی، قصائد باقی، بھگوت گیتا کا منظوم فارسی ترجمہ کنز التاریخ، بقائے باقی، پیرایۂ عروض، آئینۂ سخن وغیرہ۔ دو تین اشعار بطور نمونۂ کلام ملاحظہ ہوں۔

پتلیاں بھرتی رہتی ہیں آنسو
میری آنکھیں ہیں یا کہ پنگھٹ ہیں

مست و مجذوب میں نہیں کچھ فرق
مے پرستی خدا پرستی ہے

مبارک شیخ صاحب کو عمامہ
اٹھائیں گے نہ یہ بارِ گراں ہم

پازیب کی آواز سنانا نہیں اچھا
سوتے ہوئے فتنوں کو جگانا نہیں اچھا

راجا سری پرشاد احقر راجا باقی کے برادر زادے تھے۔ سرکار نظام میں سررشتہ دار افواج کے عہدے پر مامور تھے۔ نمونہ کلام:

انھی نے لوٹ لیا دل مراد کھا کے جھلک
ادھر سے روز جو آنکھیں چرائے جاتے ہیں

ہم تو تم پر جان دیں اور تم کرو غیروں سے پیار
بندہ پرور! یہ ہماری خوبی تقدیر ہے

کلکتہ کے رؤسا میں راجا راج کشن راجا مرزا جان طپش کے شاگرد تھے۔ انھوں نے معظم شاہ کا حال اردو نظم میں لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب
تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

راجا کے دو لڑکے تھے۔ روپ کشن اور کالی کشن۔ راجا روپ کشن بہادر نے اپنے کلام کا مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔ دو شعر درج ذیل ہیں۔

شیدا ہے عشق میں ترے دل شیخ و شاب کا
قالب تہی ہے یاد میں تیری حباب کا

نہ پوچھو گزری ہے جو مجھ پہ بیقراری رات
مثالِ شمع کٹی روتے روتے ساری رات

راجا جادو کشن بہادر مشفق کلکتہ کے مشہور رئیس تھے۔ مولوی ظہور النبی محزوں کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام

خفتگان خاک ہیں قربان اس رفتار پر
ہے قیامت کا گ[illegible] ہے کہ قد دلدار پر

راجا جنم جی متر ارمان اور کشن چندر گھوش [illegible]ن بھی روسا میں اچھے شاعر تھے۔

راجا جگل کشور ظہور راجا جیا لال کے داماد۔ دہلی کے رہنے والے اور آتش کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام

کالے کوسوں ہمیں آتی ہے نظر منزلِ عشق
راستا مانگ کا نکلا ہے سرِ گیسو پر
آہوئے دشتِ ختن مست ہیں اس کی بو پر
وجد کرتے ہیں جو بھونرے تو اسی گیسو پر

ہرچند کشور ہرچند دہلی کے عمائد میں سے تھے۔ دیوان بھی چھپا ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ ہے۔

پردۂ ظلمات دل پر سے وہیں سب اٹھ گئے
شمع رونے جب چراغِ بزم او مں کردیا
رُخِ پُرنور رشک ماہ کا گر عکس پڑ جائے
برنگ مہر ہو روشن ہر اک ذرہ بیاباں کا

مرزا راجا کدار ناتھ نسیم مرزا راجا ذرہ کے پوتے اور سعادت یار خاں رنگین کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام

قتل ہاتھوں سے ترے عاشق رنجور ہوا
درد سر روز کا تھا خوب ہوا دُور ہوا

ہے جب سے چھپا ہم سے دل آرام ہمارا
پایا تاہی نہیں تب سے دل آرام ہمارا

راجا پیارے لال الفتی (عظیم آباد)، بہادر سنگھ دلخوش، راجا بلاس رائے (نواب رحمت خاں کے دیوان)، راجا کشن کمار وقار مراد آبادی بشن پرشاد فرحت کائستھ دہلوی۔ کنور شنکر دت دوبے تجلی (برادر راجا جونپور) وغیرہم متعدد روٴسائے ہنود کا ذکر کتابوں میں آیا ہے۔ جو اردو میں شعر کہتے تھے۔

مہاراجا سر دگ بجے سنگھ بہادر کے سی ایس آئی ریاست بلرام پور دتلسی پور کے والی اور انجمن تعلق داران اودھ کے صدر تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

گئے وہ دن کہ حسینوں کو پیار کرتے تھے
نہ ولولے رہے اپنے نہ وہ شباب رہا

خم کھلے شیشے کھلے اور میکدے کا در کھلا
مغبچو، ہم پر نہ مضمون خطِ ساغر کھلا

راجا بلوان سنگھ راجا مہاراجا چیت سنگھ والی بنارس کے فرزند تھے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر سے تلمذ تھا۔ اپنا دیوان بھی مرتب کیا۔ ایک مثنوی بھی لکھی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

دوستو رشک کے ہم خوب معانی سمجھے
سایۂ یار کو بھی دشمنِ جانی سمجھے

مٹ گئی شکل نقشِ پا کیسی
پس گئی چال پر حنا کیسی

کنور چکرورتی سنگھ کنور راجا بلوان سنگھ کے صاحبزادے اور حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔ جوانی میں انتقال کیا۔ ان کی بیوہ نے "گلِ رعنا" کے نام سے ان کا دیوان شائع کیا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

نہ کیوں کونین میں حل ہوں ہمارے عقدۂ مشکل
علی بازوئے پیغمبر علی دستِ خدا ٹھیرے
ہماری مشکلیں کیونکر نہ سب آسان ہو جائیں
کنورا! جب ہم غلام حضرتِ مشکل کشا ٹھیرے

گلِ زخمِ جگر اب دیکھیے کیا رنگ لاتے ہیں
سنا ہے آج وہ پوشاک پھولوں میں بساتے ہیں
جو کہتا ہوں دُکھانا دِل کا کچھ اچھا نہیں صاحب
تو کہتے ہیں کہ ہم تیری محبت آزماتے ہیں

ایسر سنگھ نشاط کائستھ تھے۔ انشا اور رنگین دونوں سے تلمذ رکھتے تھے۔ ان کو بعض تذکرہ نویسوں نے بسنت سنگھ نشاط بھی لکھا ہے۔ نمونۂ کلام

کوئی تڑپے ہے مارا چشم کا اور کوئی قامت کا
ترے کوچے میں ہے گرم آج ہنگامہ قیامت کا

ہو اجازت تو ذرا لیجیے دم سائے میں
تیری دیوار کے آپہنچے ہیں ہم سائے میں

اجودھیا پرشاد صبر شاہجہاں آباد میں رہتے تھے۔ قوم کے کائستھ تھے۔ شاہ نصیر اور مومن دونوں کے شاگرد تھے۔ دو شعر سنیے:

دل لگانے کو بتاتا ہے تو مشکل ناصح
تیرے نزدیک چھڑانا مگر آساں ہوگا
ہمیں گماں کہ وہ آئے ہمارے قابو میں
انھیں یقیں کہ مرے ہاتھ اک شکار آیا

سندر لال بسمل کشمیر کے باشندے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اپنا ایک دیوان بھی شائع کیا۔ نمونۂ کلام

یہ نہیں ناقوس اے طفلِ برہمن ہاتھ میں
کر رہا ہے مرغِ دل اپنا یہ شیون ہاتھ میں
گوری گوری انگلیاں یوں شب کو آتی ہیں نظر
شمعیں ہیں کافور کی گویا کہ روشن ہاتھ میں

رام دیال سخن لکھنوی فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ خصوصاً فارسی قصیدہ خوب لکھتے تھے۔ خاقانی وانوری کے جواب میں متعدد قصائد لکھے۔ جوانی میں فوت ہو گئے۔ اردو کلام کا

نمونہ ملاحظہ ہو۔

خدا کے واسطے سن اے صنم گلہ دل کا
کہ تیری آنکھوں نے لوٹا ہے قافلہ دل کا
نگاہ یار سے بچنا ہے اے سخنؔ دشوار
پڑا ہے دشمن جاں سے مقابلہ دل کا

مُول چند مُنشی دہلی کے باشندے اور قوم کے کائستھ تھے۔ نو ہزار بیت کی ایک مثنوی ''شاہ نامہ'' کے نام سے لکھی جس میں قدیم ایرانی بادشاہوں کی داستانیں بیان کیں۔ غزل بھی کہتے تھے۔ شاہ نصیر سے تلمذ تھا۔ دو شعر درج ہیں

چشم ہے قہر، بلا زلف، قیامت قامت
اس لیے لوگ تمھیں آفت جاں کہتے ہیں

خواہش نہیں کہ ہاتھ مرے سیم و زر لگے
یہ آرزو ہے سینے سے وہ سیم بر لگے

خوب چند ذکاؔ کائستھ قوم کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ چار پانچ ہزار شعرا کا ایک تزکرہ ''عیار الشعرا'' کے نام سے لکھا۔ نمونۂ کلام

آسیا جب کہ چلے سر پر ذکاؔ نیند کہاں
ہاتھ سے چرخ کے ڈھونڈے ہے تو آرام کہاں

نقشِ پا خالقِ گیتی نے بنایا ہم کو
جس کے قدموں سے لگے اس نے مٹایا ہم کو

گنگا داس ضمیرؔ، رام سکھ عاشقؔ، مہاراج سنگھ عزیزؔ، موہن لال صنمؔ، گھپت رائے نظیرؔ، منو لال پریشاںؔ، دھومی لال طربؔ، موتی لال طربؔ، گھنشام داس عاصیؔ، خیالی رام عیاشؔ، رائے عزت سنگھ عیشؔ، مہتاب سنگھ غمؔ، دولت سنگھ لطیفؔ اور متعدد دیگر ہندو شعرا شاہ نصیر سے تلمذ رکھتے تھے۔ خوش وقت رائے خوشوقتؔ، دولت رام عبرتؔ، دینا ناتھ جوہرؔ، گنگا پرشاد رحمتؔ، کدار ناتھ فرحتؔ، دیبی پرشاد فرحتؔ، ناتھو جی مروّتؔ، شنکر لال ذرّہؔ، رتن ناتھ دریاؔ مختلف اساتذہ کے شاگرد

تھے۔ اور اردو میں اچھی غزلیں لکھتے تھے۔

مرزا غالب کے کوئی نو ہندو شاگردوں کا حال تذکروں میں درج ہے۔

رائے بہادر منشی شیونرائن آرام اکبر آبادی۔ مالک مطبع ''مفیدِ خلائق'' جس میں غالب کی اکثر کتابیں طبع ہوئیں۔ اردوئے معلّٰی کے بعض خطوط میں ان کا ذکر ہے۔ غالب کے فیضِ صحبت سے اردو شاعری سے شغف پیدا ہوا۔ نمونے کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ چاہیں جس قدر جور و جفا ہم پر کریں لیکن
ہمیں تسلیم لازم ہے کہ پابند رضا ٹھیرے

ادھر آنے کو وہ ہیں اور ادھر وقت سفر آیا
عجب مشکل نہ وہ آئیں نہ دم بھر کو قضا ٹھیرے

قیام اپنا ہو اس محنت سرائے دہر میں کیونکر
جہاں آفت ہی آفت ہو وہاں آرام کیا ٹھیرے

ہرگوپال تفتہؔ۔ مرزا غالب کے مشہور شاگرد اور نیاز مند۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر۔ اردو میں بہت کم کہتے تھے۔ لیکن غالب کی وفات پر دو شعر ملاحظہ ہوں۔

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے

فیض و کمال۔ صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

رائے بہادر پیارے لال آشوبؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ بریلی گوڑگانوہ، لاہور اور جالندھر میں کافی عرصہ رہے۔ دہلی کی اردو لٹریری سوسائٹی کے بانی اور سیکرٹری تھے۔ جس کے اجلاسوں میں ہمیشہ علمی اور ادبی مقالات پڑھتے رہے۔ غالب ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

نمونۂ کلام۔

گر شیخ پاک دامن طالب نہ ہو ریا کا
رندوں کی محفلوں میں اس کا اڑے نہ خاکا

پتھر پہ شکلِ شیریں فرہاد نے بنائی
اور ہم نے اپنے دل پر کھینچا ہے تیرا خاکا

زاہد چھوئے جو دامن رندان بادہ کش

تو چاہیے کہ مے سے اسے شست وشو کریں

بھاری لال مشتاؔق۔ اکمل الاخبار دہلی کے مدیر۔ غالبؔ کے عقیدت مند شاگرد تھے۔ غالب کے انتقال کے بعد خواجہ حالی کو کلام دکھاتے رہے۔ نمونۂ کلام

آئینہ بنا لو دلِ ارباب صفا کا

پھر اور ہی عالم نظر آئے گا ادا کا

غیروں نے بیٹھنے نہ دیا جب کہیں مجھے

میں انجمن میں منتظمِ انجمن ہوا

یہ کہنا اور یہ کہنا یہ کہتے ہوئے ہم آپ

قاصد کے ساتھ ساتھ گئے تا بہ کوئے دوست

امراؤ سنگھ حبابؔ۔ انھوں نے دہلی میں ایک اخبار نکالا جو بہت جلد حوادث کا شکار ہوگیا۔ رنگِ کلام سنجیدہ و متصوفانہ تھا۔ نمونۂ کلام۔

غل کرتا ہوا مژدہ آزادی کا

زنداں سے رہا ہو کے اسیر آتا ہے

بیتابی و اضطراب کا نقش مٹا

اے موجِ حبابؔ دستگیر آتا ہے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو

نگاہِ دیدۂ بے ہوش ہیں ہم

صدائے نالۂ خاموش ہیں ہم

بشیشر ناتھ بصیرؔ کشمیری تھے اور دہلی میں رہتے تھے۔ غالب کے شاگرد و مرزا یوسف علی خاں عزیز سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ دو شعر سنیے

کیونکر وہاں تلک ہو رسائی نگاہ کی

کچھ دن سے مُلکِ رخ پہ ہوا انتظامِ زلف

قیامت کیا کرے برپا خدا جانے جوانی میں
ابھی سے ڈھنگ اس بت کے زمانے سے نرالے ہیں

منشی بالمکند بےؔ صبر۔ بھٹناگر کائستھ تھے۔ ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ اردو اور فارسی میں غالب کے شاگرد تھے۔ آپ کا دیوان اور دوسری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نمونۂ کلام

اتنا ذلت سے ہوں بار خاطر
سبکی سے ہے گرانی میری
بھیجے غالبؔ کو وہ بےؔ صبر پیام
اور پھر وہ بھی زبانی میری

زمیں سے آسماں اور آسماں سے لامکاں پہنچے
تلاشِ یار میں دیکھو کہاں سے ہم کہاں پہنچے

پیارے لال ظہیؔر دہلی کے کائستھ تھے۔ غالب سے تلمذ تھا۔ مجذوب سے آدمی تھے۔ غریب و نامانوس زمینوں میں کہنے کا خاص شوق تھا۔ مثلاً

رات گھر اس کے دیئے میں کہیں جلتی تھی ضرور
تار ہائے نگۂ اہلِ نظر کی بتّی
شمع کی مجھ کو ضرورت نہیں واللہ ظہیؔر
میری روشن ہے ہر اک مصرع تر کی بتی

اسمٰعیل حسین منیؔر کے بھی کئی ہندو شاگرد تھے۔ مثلاً دیبی پرشاد تسلیم، کنھیا لال تاثیؔر، ہر نرائن داس توقیؔر، سندر لال فہم، ایک مادھو رام جوہر بھی تھے۔ فرخ آباد کے ساہوکار تھے۔ خوب شعر کہتے تھے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

اس شان سے ہے وصل کی خواہش
ایسا موقع بھی اے خدا ہو
دو دو ساغر ہوں دو دو شیشے
دوہرا دوہرا ہر اک مزا ہو
بہکی بہکی ہوں اس کی باتیں
ساقی ساقی پکارتا ہو

نکھری نکھری ہو ساری محفل
ٹھنڈی ٹھنڈی وہاں ہوا ہو

کیا یاد کرکے روؤں کہ کیسا شباب تھا
کچھ بھی نہ تھا ہوا تھی، کہانی تھی، خواب تھا
اب عطر بھی ملو تو تکلّف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا۔

مقصود عالم مقصوؔد کے ہندو شاگرد پانچ تھے۔ رگھناتھ پرشاد بسنتؔ، اندرمن ہمتؔ، کاشی رام یاد، تن سکھ رائے یاسؔ، بہاری لال چمن۔

مرزا داغ کے متعدد ہندو شاگرد تھے۔ مثلاً چند کا حال ملاحظہ ہو۔

تربھون ناتھ زاد۔ ایک معزز کشمیری خاندان کے چشم و چراغ اور دہلی کے رہنے والے ہیں۔ نمونۂ کلام۔

ایک بوسے کے طلبگار ہیں ہم
اور مانگیں تو گنہگار ہیں ہم
بادۂ عشق سے سرشار ہیں ہم
دامِ گیسو کے گرفتار ہیں ہم

پنڈت راج نرائن ارمانؔ۔ مشہور شاعر تھے۔ متعدد اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

خود ہی پہنچ گیا ہوں وہاں بہر التجا
طرز بیاں بتاتا ہوا نامہ بر کو میں

ہری شنکر سہائے برقؔ۔ دہلی کے کاستھ تھے۔ اپنے کلام میں داغ کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نمونہ

اللہ رے بیخودی کہ تصور میں یار کے
تصویرِ یار ہی سے ہم آغوش ہوگئے

آئینہ تمھارے روبرو ہے
سچ سچ کہو کہ کون خوبرو ہے

ہرکشن سنگھ بیدآر۔ موضع کشن کوٹ ضلع گورداسپور کے رئیس تھے۔ امرت سر میں بھی خاصی جائیداد تھی۔ داغ ایک دفعہ ان کے مہمان ہوئے۔ اور کئی ماہ کشن کوٹ اور امرتسر میں مقیم رہے۔ نمونۂ کلام

لو ہوا اور ستم کا یہ طریقہ ایجاد
نام کافر نے تغافل کا حیا رکھا ہے
حسرت و یاس و تمنا کی نہ پوچھو بیدآر
سب نے دل میں میرے کہرام مچا رکھا ہے

ان کے علاوہ بے شمار ہندو شعرا نواب عاشور علی خاں، حافظ اکرام احمد ضیغم، حاتم علی مہر، خواجہ وزیر، قربان علی بیگ سالک اور دوسرے اساتذہ کے شاگرد تھے۔ جن کے ذکر سے تذکرے معمور ہیں۔

انیسویں صدی یں بعض نہایت ممتاز اور نمایاں ہندو شعرا پیدا ہوئے۔ جن کا پایہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے۔ مثلاً۔ پنڈت دیاشنکر نسیم، رام سہائے تمنا، منشی شنکر دیال فرحت، دوارکا پرشاد افق، امرناتھ شعلہ، رتن ناتھ دریا، جانکی بی بی اہل، نہال چند لاہوری، رتن ناتھ سرشار، گورکھ پرشاد عبرت اور متعدد دوسرے حضرات۔

دیاشنکر نسیم لکھنوی آتش کے شاگرد اور مثنوی "گلزارِ نسیم" کے مشہور مصنف تھے۔ صرف ایک مثنوی لکھ کر انھوں نے اردو شاعری میں بقائے دوام حاصل کرلیا۔ ان کے کلام کا نمونہ پیش کرنا بیکار ہے۔ اس لیے کہ یہ مثنوی ہر صاحب ذوق کے مطالعہ میں آچکی ہے۔

رام سہائے تمنا، منشی دوارکا پرشاد افق کے بھائی اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ چند عاشقانہ مثنویاں بھی لکھیں۔ نمونہ کلام۔

بتوں سے ہم دل لگا چکے ہیں، سب ان کی سختی اٹھا چکے ہیں
ہم آپ خود کو مٹا چکے ہیں، کہ سل پہ شیشہ گرا چکے ہیں
خمار دیرینہ جوش پر ہے پلادے مے ساقیا کدھر ہے
بھلا بھی کچھ خبر ہے تجھ کو کہ ہم بھی محفل میں آچکے ہیں

عجیب دنیا کا حال دیکھا کمال ہی کو زوال دیکھا
انہی کو اب پُر ملال دیکھا جو لُطفِ راحت اٹھا چکے ہیں

منشی شنکر دیال فرحت لکھنؤ کے کائستھ سکسینہ تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور اردو میں شعر خوب کہتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

سنا ہے آپ ذکرِ عاشقِ ناشاد کرتے ہیں
جزاک اللہ، مجھ بھولے ہوئے کو یاد کرتے ہیں

اتر آتی ہیں پریاں صاف ان کے شیشۂ دل میں
نہیں معلوم کیا جادو یہ آدم زاد کرتے ہیں

حل کسی سے نہ ہوا عقدۂ پیچیدۂ زلف
اس معمّے کو جو سمجھے تو فقط ہم سمجھے

ہوگی اک دانۂ گندم سے خرابی کیا کیا
ہائے پہلے سے نہ یہ حضرتِ آدم سمجھے

قصۂ ہجر بتاں ہوش میں آلوں تو کہوں
تھام لوں، ضبط کروں، دل کو سنبھالوں تو کہوں

سلسبیل دہنِ پاک کی پوچھو نہ خبر
ہاتھ منہ دھو لوں، وضو کر لوں، نہا لوں تو کہوں

امرناتھ شعلؔہ۔ کشمیری برہمن تھے۔ لیکن لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ طبع موزوں اور ذہن رسا تھے۔ نمونہ کلام۔

تھے نہ سیماب مہوس، نے طلا زرگر کے ہم
کیا سمجھ کر چرخ نے ہم کو ملایا خاک میں

جلوۂ گلزار ابراہیم آتا ہے نظر
اے بہار حسن تیرے روئے آتشناک میں

رتن ناتھ دریا شعلہ کے فرزند تھے۔ اور میر اوسط علی اشک اور ناطق بلگرامی سے اصلاح لیتے تھے۔ نمونہ

آرزو دل میں بھری رہتی ہے پیمانوں کی
میری مٹی میں مگر خاک ہے میخانوں کی
اے میرے عقدہ کشا عقدہ کشائی کیجیے
تار جاں میں گرہیں پڑ گئیں ارمانوں کی

جانکی بی بی اہل۔ الہ آباد کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اردو شعر سے بے حد شغف رکھتی تھیں۔ نمونہ کلام:

ملتا ہے وہ مضمون ہمیں ذہنِ رسا سے
رہ جاتا ہے جو بندشِ فکر شعرا سے
سچ پوچھیے تو خاک دریا پہ ہم کو
آرام ہے بڑھ کر کہیں نقشِ کفِ پا سے

نہال چند لاہوری۔ انھوں نے جان گلکراسٹ کی فرمائش سے گل بکاؤلی کے قصے کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے میں کہیں کہیں مثنوی کی بحر میں اردو شعر لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار سنیے

قمر اس کی جبیں سے داغ کھائے
مہ نو پیشِ ابرو سر جھکائے
اگر چینِ جبیں اس کی بنائے
مصور چین کا چیں بول جائے
بلا انگیز آنکھیں جادو آمیز
مے گلرنگ سے دو جام لبریز
کبھی دیکھی تھی اس گلرو کی کاکل
پریشاں آج تک ہے حالِ سنبل

رتن ناتھ سرشار فسانۂ آزاد کے نامور مصنف، اردو زبان کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نویس، لکھنؤ کے ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے۔ آپ نے متعدد ناول لکھے۔ اور زبان اردو کی

تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوا لیا۔ شعر میں مظفر علی اسیرؔ کے شاگرد تھے۔ شعر بھی کم کہتے تھے۔ لیکن نمونہ ملاحظہ ہو۔

لندن کی پلادو آتشہ مے
اے پیرِ مُغاں کدھر چُھپا ہے
داتا پلوا شراب اچھوتی
خوشبو خوش رنگ تیز چوکھی
کوثر کی کھچی ہوئی ہے منظور
لیڈی وائن جسے پئے حور
بدمست ہوں پی کے ایک چلو
زاہد کو بنائیں خوب اُلو
اے شیخ تجھے خدا کی سوگند
رندوں کی گرہ میں باندھ لے پند
لے منہ سے لگا لے جام بادہ
اک بوند ہی پی نہ پی زیادہ
کیوں شیخ کو اجتناب ہے یہ
کچھ زہر نہیں شراب ہے یہ

گورکھ پرشاد عبرتؔ گورکھپوری۔ آپ کے صاحبزادے رگھوپتی سہائے فراقؔ آج ہندوستان کے نامور شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ عبرتؔ کی غزل نہایت سنجیدہ مطالب پر مشتمل ہوتی تھی۔ عاشقانہ اندازِ فکر پسند نہ تھا۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زمانے کی گردش سے چارا نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے
گئے جان سے بھی تو جیتے رہے ہم
محبت میں تیری خسارا نہیں ہے
تری آشنائی کا اے بحرِ خوبی
کہیں ہم کو ملتا کنارا نہیں ہے

وہ ہے آدمیت سے خارج کہ جس میں
محبت، مُروّت، مدارا نہیں ہے

بیسویں صدی

بیسویں صدی میں ہندوؤں نے اردو کے وہ نامور شعرا پیدا کیے جن کا نقش تاریخ ادبیات اردو میں بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔ ان تمام بزرگوں نے فارسی تہذیب اور فارسی ادب سے اپنے کمال کی شمعیں روشن کیں۔ اور ان شمعوں کی روشنی میں اردو شعر کو فارسی کی سی آب و تاب بخشی۔ ذیل میں ان چند ہندو شعرا کا تذکرہ کیا جائے گا جو فوت ہو چکے ہیں۔ آج کل کی دنیائے ادب میں جناب فراقؔ گورکھپوری، پنڈت انند نرائن ملا، جوش ملسیانی، (تلمیذ داغ) عرش ملسیانی، پنڈت ہری چند اخترؔ، منشی تلوک چند محرومؔ، جگن ناتھ آزاد اور متعدد دوسرے ہندو شعرا بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے اہل ذوق سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ اور نوجوان ہندو شعرا کی ایک طویل قطار آئندہ کے لیے اردو شاعری کی خدمت پر کمربستہ ہے۔ خدا انھیں بیش از پیش توفیق دے۔ وہ برصغیر میں اس ثقافتِ ادبی کے علم بردار ہیں جو ہزار سال کے عمل ارتقا سے موجودہ بلندیوں پر پہنچی ہے۔ اب ذرا ان لوگوں کا تذکرہ سنیے جو ابھی چند سال پیشتر ہمارے درمیان زندہ سلامت موجود تھے۔ اور آج ان کا نام اور کلام زندہ ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست۔ لکھنؤ کے کشمیری پنڈت، ۱۹۲۶ء میں انتقال ہوا۔ زبان نہایت شستہ و رفتہ، خیالات بلند، قدیم و جدید طرز کے جامع، نیچرل، قومی و سیاسی، مذہبی و معاشرتی موضوعات پر اعلیٰ درجے کی نظمیں لکھ کر شعرائے اردو کو زمانے کی رفتار جدید کی طرف متوجہ کرنے والے۔ فرماتے ہیں۔

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

ان کا کلام ہر جگہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ نمونے کے اشعار درج کرنا بے حد دشوار ہے۔ اس لیے کہ ان کی شاعری ہزار پہلو ہے۔ اور قوتِ انتخاب مجروح ہے۔ غزل کم کہتے تھے، مسدس زیادہ تر لکھے ہیں۔ اور جو کچھ بھی لکھا ہے، ان میں لطافت و پاکیزگی اور درد و اثر نمایاں ہے۔

سرور جہان آبادی۔ منشی درگاہ سہائے سرور جہاں آبادی ضلع پیلی بھیت کے رہنے

والے تے۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ غزل کم اور نظمیں اکثر لکھتے تھے۔ سب سے پہلے اہل ذوق کو ان کے کمال سے ''مخزن'' نے متعارف کیا۔ تاریخی و مذہبی نظموں میں چکبست کا رنگ ہے۔ پدمنی کی شان میں لکھتے ہیں۔

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو
تو وہ لیلیٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
ناز آیا ترے حصے میں ادا بھی آئی
جانفروشی بھی محبت بھی وفا بھی آئی
آہ اے پرتوِ انوارِ صفا کی دیوی
اے زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی
تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ اب تک
تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ اب تک

مناظر قدرت کے بیان میں لطافت کلام ملاحظہ ہو

اٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابر بہار
چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار
سہی قدوں کا ہے جھمگھٹ کنارِ آبِ رواں
کہ برج میں لبِ جمنا ہے گوپیوں کی قطار
ترانہ ریز ہے یوں شاخِ سرو پر قمری
کہ جیسے گاتی ہو مدھ بن میں کوئی سندر نار
عجب نشاط ہے بادہ کشو چلو تو سہی
پیامِ عیش ہے لایا چمن میں ابرِ بہار

غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو، ایک زمانے میں یہ غزل ملک بھر میں زبان زد عام تھی۔

کسی مستِ ناز کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھالوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سو جا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا میرے راز دار سو جا

مہاراجا سرکشن پرشاد۔ آپ مہاراجا چندو لال شاداںؔ کے نواسے اور ریاست حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم تھے۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی، مرہٹی، تلنگی غرض متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ کوئی تیس چالیس کتابوں کے مصنف تھے۔ کلام میں تصوف کی چاشنی غالب تھی۔ آپ نے ادبِ اردو کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اور بہت سے باکمالوں کو اپنی جود و سخا سے بے فکری اور اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

احمد کے در پہ اس لیے میں جبہ سا رہا
سجدے کے لائق اور کوئی آستاں نہ تھا
معراج میں حضور جو مدعو خدا کے تھے
خلوت تھی اور کوئی وہاں مہماں نہ تھا

بندے کو ہو دعوائے خدائی واللہ
کیا بات ہے کیا بات ہے سبحان اللہ
ہو مورِ ضعیف کو سلیمان سے کد
پر لگ گئے چیونٹی کو ماشاء اللہ

گھر سے جو چلے جا کے لحد میں پہنچے
ہم ہو کے فنا دارِ ابد میں پہنچے
دریا سے نہیں شادؔ جدا کچھ یہ حباب
چلتے چلتے سب اپنی حد میں پہنچے

نوبت رائے نظرؔ لکھنوی۔ ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔ بلند پایہ شاعر، مشہور صحافی اور ادیب۔ "خدنگِ نظر" لکھنؤ، زمانہ کانپور، ادیب الہ آباد، آزاد کانپور اور اودھ اخبار میں کام کرتے رہے۔ رنگِ قدیم میں شعر کہتے تھے۔ لیکن زبان سلیس اور تخیل بلند تھا۔ نمونے کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

طولِ غم سے مختصر غم کی کہانی ہوگئی
جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہوگئی

ہر قدم پر ایک نالہ ہر قدم پر ایک آہ
زندگی کیا ایک شرحِ سخت جانی ہوگئی

ہجر میں آنکھوں سے جاری ہے برابر سیلِ اشک
بند دو کوزوں میں دریا کی روانی ہوگئی

مے کو دنیا آتشِ سیّال کہتی ہے نظرؔ
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہوگئی

پیارے لال رونق دہلوی۔ آپ دہلی کے باشندے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن راسخ سے تلمذ تھا۔ رسالہ ''کمال دہلی'' مدت تک نکالتے رہے جس نے اردو ادب و شعر کی بے حد خدمت کی۔ آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''رونقِ سخن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دہلی کی کائستھ سبھا نے ''کلامِ رونق'' کے نام سے ایک اور مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔ مذہبی رواداری اور وسیع المشربی کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں محترم تھے۔ لکھتے ہیں۔

نظر آئے نہ جلوہ ہر گھڑی کیونکر محمد کا
ازل سے دیدہ و دل میں ہے اپنے گھر محمد کا

مجھے بھی کیا کوئی وہ فتنۂ خوابیدہ سمجھے ہیں
لگا جاتے ہیں ٹھوکر چلتے چلتے مرے مدفن کو

ایک ہے سب کے لیے پست و فرازِ زندگی
ہو نہیں سکتا جہاں میں امتیازِ زندگی

نرائن پرشاد بیتابؔ۔ آپ دہلی کے رہنے والے تھے۔ مشہور ڈراما نگار، صحافی اور شاعر تھے۔ بمبئی سے ''شیکسپیئر'' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے۔ ان کے ڈراموں میں قتلِ نظیر، دو رنگی دنیا، زہری سانپ، کرشن سداما، فریب محبت بہت مقبول ہوئے۔ سردار محمد طالب اور نظیر حسن سخا سے اصلاح لیتے رہے۔ نمونہ کلام:

فرق کچھ اپنے پرائے میں نہیں آتا نظر
امتیازِ آشنا ناآشنا کچھ بھی نہیں
رہ گئی ہے اب زمانے میں محبت نام کی
دل ٹٹولیں تو بجز مکر و دغا کچھ بھی نہیں

جوالا پرشاد برقؔ۔ ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ پیشہ وکالت تھا۔ ۱۹۱۱ء میں انتقال ہوا۔ منشی سجاد حسین مدیر ''اودھ پنچ'' اور منشی احمد علی شوقؔ کی صحبت میں لکھنؤ کی زبان پر حاوی ہوگئے۔ بنکم چندر چیٹر جی کے چار ناولوں کا ترجمہ آپ نے کیا۔ یہ ترجمے مارِ آستین، مارنالنی، روہنی اور پرتاپ کے ناموں سے چھپے اور بہت مقبول ہوئے۔ اس زمانے میں ''اودھ پنچ'' نے سرسید احمد خاں کے خلاف طنز و استہزا کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ اور اس کے مقالہ نگار سب اسی کے رنگ میں رنگے گئے تھے۔ برقؔ نے بھی چند اشعار لکھے۔ ملاحظہ ہوں۔

نظر پڑا ایک پیرِ نیچر نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو سو برس کی یہ قہر آفت غضب خدا کا
سفید داڑھی پہ کالا جوتا اور اس پہ طرّہ وہ سرخ ٹوپی
بدن پہ جاکٹ گلے میں پٹی سی عالم اس پر ہے اک بلا کا
ہیں اس کی باتیں وہ سحر و افسوں کہ سن لیں جس نے ہوا وہ مفتوں
غضب کے فقرے ستم کے جملے اور اس پہ طرزِ بیاں بلا کا
بہت دنوں تک کیے کرشمے طرح طرح کے دکھا کے نخرے
خدا کے بندوں کو دین و دنیا میں خوب لوٹا غضب خدا کا

وناٹک پرشاد طالبؔ بنارسی۔ ''مخزن'' میں آپ کے متعدد مضامین اور چند نظمیں شائع ہوئیں۔ آپ ڈراما نگار بھی تھے۔ ''لیل و نہار'' اور ''گوپی چند'' آپ کے مشہور ڈرامے ہیں۔ شعر و سخن میں مولانا راسخ سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک مسدس کا بند ملاحظہ ہو۔

کیا جانے گھڑی کونسی منحوس تھی ناکام
جس وقت ملا جان کو یہ جسم بد انجام
جب تک رہے دنیا میں رہا غم سے سدا کام
کچھ بھی نہیں آرام

واں حشر کی دہشت سے فراغت نہیں ملتی
تن چھوڑ کے بھی روح کو راحت نہیں ملتی

بشن نرائن در آبر کاشمیری۔ آپ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کے مشاہیر میں آپ کا شمار تھا۔ نہایت قابل بیرسٹر اور نہایت اچھے انگریزی دان تھے۔ آپ کے بہت سے مضامین انگریزی کے اخباروں میں شائع ہوئے۔ کبھی کبھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام

غنچوں کو گو زباں بھی ملی اور گل کو گوش
رازِ ریاض دہر گر کچھ کھلا نہیں
زیب بدن ہو اتنی ہی جتنی ہو چاک چاک
کچھ کم قبائے گل سے ہماری قبا نہیں

جگت موہن لال رواں۔ اناؤ کے رہنے والے تھے اور شیوا بیان شاعر تھے۔ ان کے کلام میں تاریخی اور نیچرل نظمیں بھی موجود ہیں۔ نمونہ کلام:

ہونے والا ہے کسی بے کس کا ان ہاتھوں سے خون
یہ بتاتا ہے برہمن دستِ جاناں دیکھ کر
ہوگیا ان پر اثر انداز میرا ضبطِ عشق
آپ حیراں ہوگئے وہ مجھ کو حیراں دیکھ کر

مہاراج بہادر برق دہلوی۔ آغا شاعر قزلباش کے شاگرد تھے غزلوں کے علاوہ مناظر قدرت پر بھی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اور شیوا بیان اور خوشگو شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی ایک نظم ''ماہِ تاباں'' کے دو شعر درج ذیل ہیں۔

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے وادئ گل پوش میں
کاروانِ نور اترا منظرِ خاموش میں
درس آموزِ حقیقت ہے ترا اوج و زوال
تیری طلعت سے ہے روشن میری دنیائے خیال

اس فصل کی ترتیب میں جابجا حوالے دینے سے احتراز کیا گیا ہے آخر میں یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ زیادہ تر بعض مشہور تذکرے مثلاً تذکرۂ ریختہ گویاں (فتح علی حسینی گردیزی)، گلشن ہند (مرزا آصف علی لطف)، چمنستان شعرا (لچھمی نرائن شفیق)، گلشن بے خار (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ)، شعرائے ہنود (دیبی پرشاد بشاش، حصہ دوم، جس میں اردو شعرا کا تذکرہ ہے)، خمخانۂ جاوید (سری رام) اور بعض دوسری کتابیں پیشِ نظر رہی ہیں۔ علاوہ بریں میں عزیزی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی اس امداد کا شکر گزار ہوں جو میں نے ان کی محنت کے نتائج سے حاصل کی۔

حواشی

[۱] قاضی عبدالرحیم صابر بلوچ (مقالہ)۔

[۲] ادارہ مطبوعاتِ پاکستان نے ''پاکستان کی علاقائی زبانوں پر فارسی کا اثر'' کے نام سے جو پمفلٹ (چند نشری تقاریر پر مشتمل) شائع کیا ہے، اس سے میں نے اس فصل میں کافی استفادہ کیا ہے۔ (مؤلف)

[۳] ''پنجاب میں اُردو''، شیرانی فصل اوّل۔

[۴] تاریخِ نثر اُردو، احسن مارہروی، ۳۹۔

[۵] اُردو لٹریچر، گراہم بیلی، باب دوم، ص ۱۶-۱۸۔

[۶] شعر الہند، عبدالسلام ندوی، ۱۸۔

[۷] بیہقی، ۵۰۳-۵۰۴۔

[۸] بیہقی، ۵۰۳۔

[۹] فرشتہ، جلد اوّل، ۱۸۷۔

[۱۰] آئینِ اکبری، جلد اوّل، ۲۰۲۔

[۱۱] منتخب التواریخ، بدایونی، جلد سوم، ۲۰۱۔

[۱۲ و ۱۳] ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ڈاکٹر سیّد عبداللہ۔

[۱۴] ڈاکٹر سیّد عبداللہ، بحوالہ مثمر خان آرزو (قلمی)، ۱۳۴۔

نواں باب

تجدید و اصلاح کا دور

پہلی فصل: حضرت شاہ ولی اللہ

حضرت اورنگ زیب عالمگیر اس ملک میں سرمایۂ ملّت کے نگہبان اور دینِ مقدس کے غیور خادم تھے۔ اگرچہ ان کا زیادہ وقت جنوب کی چپقلشوں میں بسر ہوا لیکن انھوں نے برصغیر کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لیے امکان بھر کوشش کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین نہایت کمزور اور بے غیرت ثابت ہوئے۔ اس لیے عہد عالمگیری کی دینی روک ٹوک کا شدید ردِ عمل ہوا۔ اور مملکت اور معاشرہ دونوں انتہائی خلفشار میں مبتلا ہوگئے۔ عالمگیر کے بعد بہادر شاہ اول، معز الدین جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی اور سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے۔ اور بہادر شاہ پر ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس دور میں سادات بارہہ کا تسلط، فرخ سیر کی دردناک موت، تورانی امیروں کے ہاتھوں ساداتِ بارہہ کا خاتمہ، مرہٹوں کی بغاوت، سکھوں کی سرکشی، نادر شاہ کا حملہ، دہلی کا قتل عام، احمد شاہ ابدالی کا معرکۂ پانی پت، روہیلوں کا دور، ایرانی و تورانی امرا کی کشمکش، بنگال و بہار میں انگریزوں کا تسلط اور پھر سارے ہندوستان پر چھا جانا تاریخ ہند کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ سلاطین و امرا کی نالائقی، علما کی غفلت و مداہنت، عمال حکومت کی نمک حرامی اور اخلاق باختگی نے پورے معاشرے کو عقائد فاسدہ اور اعمالِ شنیعہ کے گرداب میں غرق کردیا۔

اس وقت ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ کوئی جلیل القدر شخصیت پیدا ہو۔ جو اسلام کے نظام عقائد کے احیا اور مسلم معاشرے کی تربیت و اصلاح کے لیے انقلابی روح لے کر اٹھے۔ اور صدیوں کے فرسودہ نظام کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نئی زندگی بخشے۔ اگر دیمک خوردہ مملکت

کا احیا بعض حالات و کوائف کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو کم از کم مسلمانوں کو مسلمان بنانے اور فرقہ پرستی اور اوہام نوازی سے نجات دلانے کی صورت تو پیدا ہو جائے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے اسّی سال بعد اور عالمگیر اعظم کی وفات سے چار سال پہلے فروری ۱۷۰۳ء میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ جو اس برصغیر میں محی السنۃ، وارثِ کمالاتِ نبوت اور حجۃ الاسلام ثابت ہوئے اور جن کے فیوض و کمالات سے اسلام کو حیات تازہ حاصل ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔ آپ کے دادا شیخ وجیہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر میں ایک ممتاز سردار تھے۔ والد ماجد شیخ عبدالرحیم دہلی کے نہایت نامور عالم دین اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔ جنھوں نے پرانی دہلی میں ایک دینی درسگاہ ''مدرسۂ رحیمیہ'' کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ آپ دربار شاہی سے الگ تھلگ رہ کر درس و ارشاد میں مصروف رہتے تھے۔ البتہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کی جلالت علمی کے باعث آپ کو ''فتاویٰ عالمگیری'' کی ترتیب و تدوین میں شامل کرلیا تھا۔ آپ نہایت جامع حیثیات بزرگ تھے۔ ظاہری و باطنی علوم میں کامل اور دنیاوی عقل و فراست میں فرد تھے۔ ''انفاس العارفین'' میں حضرت شاہ صاحب اپنے والد محترم کے متعلق لکھتے ہیں:

حضرت ایشاں بااخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودند و عقل معاشی مثل عقل معاد کامل وافر داشتند و مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیارے آموختند۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے سوانح حیات کے لیے مختلف کتب کی ورق گردانی سے بہتر ہے کہ خود حضرت کے خودنوشت حالات سے استفادہ کیا جائے۔ آپ نے اپنے حالات میں ایک مختصر رسالہ ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ عبدالضعیف'' کے نام سے لکھا تھا۔ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

یہ فقیر ۱۴۔ شوال ۱۱۱۴ھ کو بدھ کے دن طلوع آفتاب کے وقت تولد ہوا۔ تاریخی نام ''عظیم الدین'' نکلا۔ ولادت سے پہلے والدین اور بعض دوسرے صلحا نے میرے متعلق بعض مبشر خواب دیکھے۔ عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھایا گیا۔ ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرا دیا۔ اسی سال رسم ختنہ ادا ہوئی۔ اور اسی سال قرآن مجید ختم کر کے فارسی تعلیم شروع

کی۔ یہاں تک کہ دسویں سال شرح مُلّا جامی پڑھ لی اور عربی کتب کے مطالعہ کی قابلیت پیدا ہوگئی۔ چودھویں سال شادی ہوگئی۔ پندرہ سال کی عمر میں میں نے حضرت والد ماجد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مشائخ صوفیہ بالخصوص نقشبندیہ کے اشغال میں مصروف ہوگیا۔ اور توجہ و تلقین اور آداب طریقت کی تعلیم اور خرقہ پوشی کی جہت سے میں نے اپنی نسبت کو درست کیا۔ اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا اس ملک کے مروّجہ نصابِ تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ ذیل کی کتابیں میں نے سبقاً سبقاً پڑھیں:

حدیث میں پوری مشکوٰۃ شریف (سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب تک) صحیح بخاری کتاب الطہارت تک، شمائل ترمذی کامل تفسیر بیضاوی، اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ۔ اس کے ساتھ ہی سب سے بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ والد ماجد کے درس قرآن میں باقاعدہ حاضر رہا۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پوری پڑھیں۔ اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کافی حصہ، منطق میں شرح شمسیہ پوری پڑھی، اور شرح مطالعہ کا کچھ حصہ، کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف کا ایک حصہ، سلوک و تصوف میں عوارف، رسائل نقشبندیہ وغیرہ، علم الحقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص، فنِ خواص اسما و آیات میں والد ماجد کا خاص مجموعہ، طب میں موجز، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ، نحو میں کافیہ اور شرح مُلّا جامی، علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی، ہیئت و حساب کے بعض مختصر رسالے، الحمدللہ کہ اس تحصیل کے زمانے میں ہر فن سے خاص مناسبت پیدا ہوگئی۔

میری عمر کے سترھویں سال والد ماجد واصل بحق ہوئے۔ اور مرض الموت میں مجھے بیعت و ارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت عمر بھر مجھ سے راضی رہے۔ آپکی وفات کے بعد بارہ سال تک دینی کتب اور معقولات کے درس میں مشغول رہا۔ مذاہبِ فقہ اور ان کی اصولِ فقہ کی کتابیں بغور پڑھیں۔ ان احادیث کا مطالعہ کیا جن سے فقہائے محدثین اپنے مسائل میں استناد کرتے رہے۔ اس کے بعد زیارتِ حرمین شریفین کا شوق پیدا ہوا۔ اور ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں یہ فقیر حج سے مشرف ہوا۔ ۱۱۴۴ھ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رہا اور شیخ ابوطاہر قدس سرہ اور دیگر مشائخ حرمین سے اخذ روایت حدیث کی سعادت حاصل ہوئی۔ دورانِ قیامِ مدینہ منورہ میں روضۂ مقدسہ میری توجہ کا خاص مرکز رہا۔ اور الحمدللہ کہ اس دربار قدسی سے مجھ پر فیض برکات کی بے پایاں بارش ہوئی۔ حضرت شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے تمام طرق صوفیہ کا جامع

خرقہ عنایت ہوا۔ ۱۱۴۴ھ کے آخر میں دوبارہ حج کیا۔ اور اوائل ۱۱۴۵ھ میں وطن واپس آیا۔

حج سے واپس آکر شاہ صاحب نے بدستور والد ماجد کے مدرسۂ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آخر تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء میں بمقام دہلی رحلت فرمائی۔ تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے:

"او بود امامِ اعظم دیں"

حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری عمر اس کرب انگیز اور دردناک خلفشار کو دیکھتے ہی گزر گئی جس کا ذکر اس فصل کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ آپ نے حکومت کے ضعف، معاشرے کی گمراہی اور علما و مشائخ کی غفلت و غلط کاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور دس بادشاہوں کا عہد آپ کے سامنے گزار۔ آپ نے دیکھا کہ برصغیر کے مروّجہ نصاب دینی یعنی درس نظامی میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ حدیث کے علوم فراموش ہو چکے ہیں۔ فقہ میں مذاہب اربعہ کی کھینچ تان اور تعصبِ باہمی کا دَور دَورہ ہے۔ اجتہاد کا نام و نشان تک نہیں۔ عوام نہایت گمراہی اور اوہام پرستی میں مبتلا ہیں۔ اخلاق کے بندھن میں کمزور پڑ چکے ہیں۔ معاشرے کے تمام طبقات غافل ہیں اور تباہی و بربادی کے راستے پر گامزن ہیں۔ علما و مشائخ نے شریعت و طریقت دونوں کو کھیل بنا رکھا ہے۔ اور اسلام کے روشن چہرے کو اپنے عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ بد سے داغدار کرنے میں مصروف ہیں۔ آپ نے اپنے علم و فضل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت اور اپنی فراست و دردمندی کے طفیل سے تجدید و اصلاح کا عزم کرلیا۔ اور متعدد انقلاب انگیز کتابیں لکھ کر جمود و قدامت کے پردوں کو چاک کر دیا۔

نواب صدیق حسن خان نے بالکل درست فرمایا۔ کہ اگر شاہ صاحب زمانۂ ماضی میں پیدا ہوئے ہوتے تو پورا عالم اسلام ان کو امام تسلیم کر لیتا۔ اگر وجود او در صدر اول و در زمانۂ ماضی می بود۔ امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد۔

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

ابنِ تیمیہ اور ابنِ رُشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا۔ کہ اخیر زمانے میں کہ اسلام کا نفس واپسیں تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند

پڑ گئے۔ (تاریخ علم الکلام) مولانا ابوالکلام آزاد نے ''تذکرہ'' میں لکھا ہے:

پھر بارھویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علوم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چلی تھی۔ پھر بھی کھیتوں کی سبزی، چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام کاروبار علم و طریقت کے اکابر و اساتذہ اسی صدی میں سربر آوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسل درس و تدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دورِ آخر کے فاتح اور سلطان عصر ہونے کا مقام تھا اور قطبیت وقت کا۔ وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رضی اللہ عنہ) ہی کے لیے تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ رہے۔ کام کرتے رہے۔ مگر جو کام یہاں انجام پایا۔ وہ صرف یہیں کے لیے تھا۔

اب ہم مختصراً ان کارناموں کا ذکر کریں گے جو اس جلیل القدر امام نے دین اسلام، معاشرہ اسلامی بلکہ پوری نسلِ اسلامی کی خدمت و ہدایت کے لیے انجام دیئے۔ اور جنھوں نے ان کو دنیا کے عظیم ترین رہنمایانِ فکر کی صف میں ممتاز مقام عطا کر دیا۔

صدیوں سے ہندی مسلمانوں کا یہ شیوہ چلا آتا تھا کہ قرآن مجید کو محض یُمن و برکت کے لیے پڑھتے اور اس کی ہدایت سے براہ راست مستفید ہونے کی کوشش نہ کرتے۔ غیر عرب قوموں کو کلام الٰہی کا منشا سمجھانے کے لیے اس کا ترجمہ ضروری تھا۔ اور اس کی تفسیر کو بھی آسان بنانا لازمی تھا۔ دینی مدارس میں فقہ، فلسفہ، منطق، صرف نحو سبھی کچھ پڑھایا جاتا تھا۔ لیکن کلام الٰہی اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تدریس کو چنداں اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں خاصی جدوجہد کر چکے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ تاکہ کلام الٰہی کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ اس پر علماء اس قدر برافروختہ ہوئے کہ تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ بعض ملاؤں نے ایک دفعہ کوئی سوسوا سو بازاری غنڈوں کو ساتھ لے کر شاہ صاحب کو فتحپوری کی مسجد میں گھیر لیا۔ ان کے ساتھ اس وقت صرف چند رفیق تھے۔ قریب تھا کہ ہنگامہ ہو جائے۔ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''شاہ صاحب کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی لکڑی تھی اسی لکڑی کو لے کر اس خونی مجمع کے سامنے آئے جو باضابطہ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھا۔ غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے۔''

بعض احباب نے شاہ صاحب کو مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے دہلی سے چلے جائیں۔ اور جب فتنہ فرو ہو جائے تو واپس آ جائیں۔ چنانچہ شاہ صاحب باہر چلے گئے۔ اور جب واپس آئے تو لوگوں کو سمجھایا کہ قرآن مجید کوئی منتروں کی کتاب نہیں ہے کہ اس کو پوجا کے وقت جزدان سے نکال کر پڑھ لیا جائے اور بس۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اگر تم اس کو سمجھو گے نہیں تو عمل کیا کرو گے۔

بہر حال شاہ صاحب کے ترجمے سے آئندہ قرآن مجید کے ترجموں کا دروازہ کھل گیا۔ ترجمے کی لفظی و معنوی صحت اور احتیاط کے اعتبار سے شاہ صاحب کا ترجمہ اب تک نظیر نہیں رکھتا۔ ترجمہ کے ساتھ ہی آپ نے ایک مقدمہ بھی لکھا۔ جس میں مترجموں کی رہنمائی کے لیے مفید ہدایات دیں۔ علم تفسیر پر بھی کتابیں لکھیں۔ جن میں ''الفوز الکبیر فی اصول التذکیر'' نہایت کارآمد ہے۔ اور اس کا اردو ترجمہ بھی علی گڑھ سے شائع ہو چکا ہے۔ نسخ آیات، روایاتِ اسرائیلی اور رسوم جاہلیت کے متعلق بھی شاہ صاحب نے صحیح راستہ دکھایا۔ کیوں کہ علما ان امور میں بہت الجھے ہوئے تھے۔ اور ان سے فہمِ قرآن میں رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔

اگرچہ شیخ عبدالحق محدث نے ہندوستان میں حدیث کا ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے علم و فضل کی پوری قوت صَرف کی۔ لیکن چونکہ عالمگیر کے زمانے میں فقہ کا دور دورہ ہو گیا۔ اور علما زیادہ تر قاضی و مفتی بننے لگے۔ اس لیے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پھر کنج کسمپرسی میں چلی گئی۔ آخر شاہ ولی اللہ نے اس کو مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لیے از سرِ نو زندہ کیا۔ آپ نے اپنے سفرِ حجاز میں جہاں بڑے بڑے اربابِ طریقت کی صحبت سے فیض اٹھایا اور اپنے باطن کو جِلا دی، وہاں بہترین اساتذہ حدیث سے علومِ حدیث کی سندِ تکمیل بھی حاصل کی۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل کشی اور دین میں اس کی برتر افادیت نے شاہ صاحب کو اس قدر متاثر کیا کہ آپ مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے استاذ حدیث سے فرمانے لگے:

ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم اِلّا علم دین (یعنی حدیث)

(ملفوظات عزیزیہ صفحہ ۹۳)

شاہ عبدالعزیز نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے:

''میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے۔ آپ نے چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر سند حاصل فرمائی۔''

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

''اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علما اس زمانے میں علم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو اس علم کے زوال و فنا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔'' (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ)

''ہندوستان کے علما'' سے مراد صرف شاہ ولی اللہ، ان کے جانشین اور ان کے تلامذہ ہیں جن کی طفیل سے علم حدیث نے ہندوستان میں وہ فروغ حاصل کیا کہ اسلامی ملکوں میں سے کوئی بھی اس ملک کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

شاہ ولی اللہ اپنے وصیت نامے میں فرماتے ہیں کہ جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو مؤطا امام مالک (بروایت یحییٰ بن مصمودی) ضرور پڑھا دیں۔ کیونکہ یہ کتاب علم حدیث کی اصل ہے۔ اور اس کے پڑھنے سے بہت فیض حاصل ہوتا ہے۔ آپ نے مؤطا کی شرح عربی میں ''المسوّیٰ'' اور فارسی میں ''المصفیٰ'' کے نام سے لکھی۔ عوام کے لیے احادیث کے چھوٹے چھوٹے رسالے مرتب کیے۔ مثلاً چہل حدیث، النوادر من الحدیث، الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم۔ جب شاہ صاحب نے حجاز سے واپس آکر دہلی میں درس حدیث کا آغاز فرمایا تو مدرسہ رحیمیہ کی وسعت تنگ ہوگئی۔ اور ملک بھر کے اطراف و اکناف سے تشنگان حدیث نبوی جوق در جوق رجوع کرنے لگے۔ اس موقع پر محمد شاہ بادشاہ نے مولانا کو بلوا کر اندرون شہر ایک عالی شان مکان دے دیا۔ وہ مکان کیا تھا۔ ایک بہت بڑی امیری حویلی تھی جس میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق درس دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ حویلی بھی لٹ گئی۔ اب اس کی جگہ ''محلہ مدرسہ شاہ عبدالعزیز'' قائم ہے۔ یعنی یہ حویلی ایک پورے محلے کی وسعت رکھتی تھی۔

حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث اور ان کی کتابوں سے ہندوستان میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عام غلغلہ بلند ہوگیا۔ اور یہی شاہ صاحب کے منصب تجدید و احیائے اسلام کا تقاضا تھا۔ کہ مسلمانوں کو زید و عمر کے اقوال سے ہٹا کر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف لایا جائے۔

شاہ ولی اللہ نے مذاہب فقہ اور مسئلہ تقلید و اجتہاد میں ایک معقول اور متوسط طریق اختیار کیا۔ انھوں نے چاروں مذاہب فقہ کے اختلافات کی بنیاد کو واضح کرنے کے لیے ایک کتاب لکھی۔ ''انصاف فی بیان سبب الاختلاف'' اس میں خلافت راشدہ سے لے کر پانچویں

صدی ہجری تک فقہ کی تدوین، جمع حدیث اور مختلف مذاہب فقہی کی ناقدانہ تاریخ لکھی ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مذاہب کیونکر پیدا ہوئے۔ ان کی خصوصیات کیا کیا ہیں۔ ان کی جداگانہ حیثیتیں کیونکر قائم ہوئیں۔ احادیث کیونکر جمع ہوئیں۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداود وغیرہم کے مجموعوں کی خصوصیات کیا ہیں۔ اجتہاد کی اہمیت کیا ہے۔ اور مسلمانوں میں تقلید کا رواج کن وجوہ کی بنا پر ہوگیا۔ ان تمام مطالب کو اس کتاب میں تحقیقی اور دل نشیں طور پر واضح کیا ہے۔

تقلید و عدم تقلید اور استخراج احکام فقہی کے متعلق شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ فقہ کے چاروں امام معتبر ہیں۔ اس لیے اگر علما ان ائمہ میں سے کسی ایک کا قول کسی مصلحت کی وجہ سے اختیار کریں، تو بالکل جائز ہوگا۔ پھر فرمایا:

اگر انسان کسی مجتہد کے (جس کو اجتہاد کا حق ہو) ایسے قول کی جستجو کرے جو اس کے نفس پر سہل تر ہو تو ہم کو معلوم نہیں کہ شرع نے اس عمل پر اس کی برائی کی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوتی تھیں انہی کو پسند فرماتے تھے۔ (عقد الجید صفحہ ۷۲)

شاہ صاحب کا مسلک یہ تھا کہ عامیوں کے لیے تقلید ہی بہتر ہے کیونکہ اگر ان کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو جس ملک میں شریعت اسلامی رائج ہوگی وہاں کا نظام بالکل درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن علما کو اپنی بصیرت سے کام لینا چاہیے ان پر ''لزوم مذہب معیّنہ'' کی پابندی نہیں۔ شاہ صاحب مذاہب اربعہ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ کسی ایک کی جانبداری اور دوسرے مذاہب کی نکتہ چینی انھوں نے نہیں کی بلکہ جو حکم کسی مذہب کا انھیں باعتبار استدلال یا استحسان پسند آیا۔ اس کو بے تکلف اختیار کرلیا۔ اپنی کتاب ''تفہیمات الٰہیہ'' میں لکھتے ہیں:

ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب زیادہ مشہور ہیں اور مسلمانوں میں زیادہ پیرو بھی انہی کے پائے جاتے ہیں۔ کتابیں بھی انہی کی زیادہ ہیں۔ فقہاء، محدثین، مفسرین، متکلمین، صوفیہ زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں اور حکومتیں اور عام لوگ زیادہ تر مذہب حنفی پر قائم ہیں۔ اس وقت جو امر حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کو ایک جا کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو دواوین حدیث سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے جو ان کے موافق ہوں ان کو باقی رکھا جائے اور جس کی کوئی اصل نہ ملے اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اگر دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور اگر

دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کر لیے جائیں اور دونوں پر عمل کرنا صحیح قرار دیا جائے۔

شاہ صاحب نے ''انصاف'' میں بھی یہی فرمایا ہے کہ اہل الحدیث اور اہل التخریج دونوں کے طریقوں کو جمع کیا جائے۔ اس مسلک اعتدال کے اختیار کرنے کے حق میں شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں اَدلّہ و براہین کا انبار لگا دیا ہے۔ اور صرف اسی مسلک ہی کے اعلان سے اہل سنت سے تمام اختلافات اور مذاہب اربعہ کے پیروؤں کی بے معنی لڑائیوں کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس سے تعصب، تقلیدِ جامد، کوتاہ نظری اور کج بحثی ختم ہو کر ایک طرف عوام الناس کے لیے سہولت پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف علما پر تحقیق و اجتہاد کا باب کھل جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی متعدد کتابوں میں بار بار ظاہر کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ ہرگز بند نہیں ہوا۔ بلکہ ہر زمانے میں کھلا رہا ہے اور آئندہ بھی کھلا رہے گا۔ فرماتے ہیں اجتہاد ہر زمانے میں فرض کفایہ ہے۔ اس لیے کہ مسائل کی کثرت پر کوئی حصر و احاطہ نہیں کر سکتا اور اس میں احکام الٰہی کی معرفت ہر حال میں واجب ہے۔ شاہ صاحب نے اجتہاد کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں دیا۔ بلکہ نہایت تفصیل سے اس کے اصول و قواعد اور حدود و شروط معیّن کیے ہیں۔ ازالۃ الخفا، عقد الجید فی احکام الاجتہاد و تقلید، انصاف، بدورِ بازغہ، مصفیٰ وغیرہ ہر کتاب میں اس کے متعلق کہیں اشارات کیے ہیں۔ اور کہیں مفصل بحث کی ہے اور مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔

بعض علما اس بحث میں پڑ جاتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ حنفی تھے، یا غیر مقلد۔ ہمارے نزدیک آپ اپنی عظمت علمی اور جلالت قدر کی وجہ سے ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اس قسم کی نسبتیں آپ کے لیے بے معنی ہو گئی تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا مسلک آپ کی کتابوں سے واضح ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے تاریخ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی نسبتیں سلطنت اموی کے خاتمہ تک بالکل معدوم تھیں۔ کوئی اپنے آپ کو حنفی شافعی وغیرہ نہ کہتا تھا بلکہ سب اپنے اپنے اماموں اور استادوں کے طریقے پر دلائلِ شرعی سے استنباط کرتے تھے۔ لیکن سلطنت عباسی کے زمانے میں یہ حال ہو گیا کہ ان فرقوں کے نام معیّن ہو گئے۔ اور جب تک لوگ اپنے بڑوں کی نص نہ پاتے۔ کتاب و سنت کی دلیل بھی تسلیم نہ کرتی۔ پھر جب عربوں کی حکومت ختم ہو گئی اور ترکی تسلط کا زمانہ آیا اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے۔ تو ہر ایک نے اپنے مذہب فقہی کو

اصل بنالیا۔ پہلے جو چیز مذہب مستنبطہ تھی۔ اب وہ سنت مستقرہ بن گئی۔ اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں اور تفریع پر تفریع۔ (ازالۃ الخفا)

مختصر یہ کہ حضرت شاہ ولی اللہ فقہ کے ائمہ اربعہ کی عظمت علمی اور ان کی نیک نیتی اور تقویٰ کے قائل ہیں۔ ان کے مذاہب کو بھی حق سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک تو اس کے روادار نہیں کہ کسی ایک امام اور اس کے مذہب سے ایسی وابستگی پیدا کی جائے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مستقل فرقے بن جائیں۔ دوسرے کسی ایک امام کے مسلے یا حکم پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بلکہ دوسرے ائمہ کے احکام بھی دیکھ لیے جائیں۔ اور جس حکم میں حسنِ استدلال اور حسنِ استحسان پایا جائے۔ یعنی جو قرآن و حدیث کے منشا سے زیادہ قریب ہو۔ اور ملت کے لیے زیادہ سہل ہو۔ وہ اختیار کرلیا جائے۔ خواہ وہ کسی امام کا ہو۔ گویا شاہ صاحب نے اس فقہی فرقہ بندی کی جڑ کاٹ دی اور اجتہاد کا دروازہ کھول دیا تا کہ خدا کا دین قیامت تک آفتاب ہدایت بنا رہے۔

واضح رہے کہ ایک خاص تقلید شاہ صاحب کے نزدیک حرام ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اور تقلیدِ حرام کی صورت یہ ہے کہ کسی فقیہ کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ وہ علم کی انتہا تک پہنچ گیا ہے اور اس سے خطا سرزد ہی نہیں ہوسکتی (یہ تقلید حرام اس لیے ہے کہ) ایسے مقلد کو جب کوئی صحیح و صریح حدیث بھی پہنچ جاتی ہے جس سے فقیہ کے قول کی تردید ہوتی ہو تو مقلد پھر بھی اس کو نہیں چھوڑتا۔

شاہ ولی اللہ نے علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ اور اپنے قول کے مطابق اذکار و اشغال میں بھی مصروف رہے تھے۔ ان کی اکثر تصانیف سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ رموز و اسرار ان کے سینۂ صافی پر القا ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور روح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے فکر و اجتہاد کی رہنمائی ہوتی تھی۔ ''فیوض الحرمین'' ان کے مکاشفات کا نہایت قیمتی مجموعہ ہے۔ بعض رویائے صادقہ بھی ان کی کتابوں میں درج ہیں۔ جن کے بعض حصے حیرت انگیز طور پر پورے بھی ہوئے۔ لیکن یاد رہے کہ وہ مروّجہ تصوّف کے سخت مخالف اور آج کل کے صوفیہ و مشائخ کے حرکات و افعال سے بے حد بیزار تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے اس امر کی توضیح بھی کی ہے کہ تصوف کا کتنا حصہ اسلام ہے۔ اور کون کون سے اجنبی عناصر اس میں شامل ہوگئے ہیں۔ آپ نے وحدت الوجود اور حضرت مجدد صاحب کی وحدت الشہود کو تاویل و تعبیر سے باہم مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی متعدد کتابیں تصوف میں ہیں۔ مثلاً الطاف

القدس، لمعات، انفاس العارفین، خیر کثیر، وحدت الوجود و الشہود۔ آپ کی مشہور کتاب تفہیمات الٰہیہ بھی زیادہ تر تصوف ہی کے مطالب پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ جھاڑ پھونک تعویذ، شعبدات و نیرنجات سے تصوف کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہمارے عوام اور ہمارے صوفیہ انہی کو کرامات قرار دے کر ان پر تصوف اور ولایت کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ان چیزوں کو باطل قرار دیا ہے اور ان کے متعلق ''القول الجمیل'' اور ''شرح حزب البحر'' جیسی کتابیں لکھ دیں۔ بلاشبہ شاہ صاحب بیعت کے قائل ہیں۔ ''القول الجمیل'' میں آپ نے بیعت کے فوائد۔ اس کے طریقوں اور صاحب بیعت کے خصائص بیان کیے ہیں۔ لیکن ان کی تلقین یہی ہے کہ آج کل کے بدعتی پیروں کی بیعت ہرگز نہ کرو۔ اگر ان سے کوئی کرامات بھی دیکھو تو اس کو طلسمات سحر سمجھو۔ جس کو قربِ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً وصیت نامے کی وصیت سوم ملاحظہ ہو۔

وصیت دیگر آنست کہ دست در دست مشائخ ایں زماں کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند، ہرگز نباید داد، و بیعت ایشاں نباید کرد، و بغلو عام مغرور نباید بود و نہ بہ کرامات، زیرا کہ اکثر غلوِ عام بسبب رسم است و امور رسمیہ را حقیقت اعتبارے نیست و کرامات فروشان ایں زمانہ ہمہ الاّ ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند۔

شاہ ولی اللہ کی دو کتابوں نے تاریخی معاشرتی اور سیاسی دوائر میں جو انقلاب فکر پیدا کیا ہے ہندوستان بھر کے علما اور ان کی جلیل القدر تصانیف کے اثرات اس انقلاب سے لگا نہیں کھا سکتے۔ ''ازالتہ الخفا'' اور ''حجتہ البالغہ'' یہ دو کتابیں ہر پڑھے لکھے مسلمان کو مستقل طور پر اپنے مطالعہ میں رکھنی چاہئیں۔ ''ازالتہ الخفا'' میں شاہ صاحب نے فلسفۂ تاریخ اور منشائے اسلام کو پیش نظر رکھ کر خلفا کی تاریخ پر سیر حاصل تنقید کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا۔ اس کے بعد کے حضرات کے متعلق شاہ صاحب خاموش ہیں۔ اور آپ کا ارشاد یہ ہے کہ خاندان، نسب، ذاتی قوتِ جسمانی یا بہادری فضیلت کے لیے اتنی اہم نہیں ہیں جس قدر اسلام کی عملی خدمت اہم ہے۔ یعنی جتنی کسی نے اسلام کی خدمت زیادہ کی ہے۔ اتنی ہی اس کو فضیلت حاصل ہے۔ شاہ صاحب نے خلافت اعلیٰ منہاج النبوۃ صرف خلفائے راشدین تک محدود قرار دی ہے۔ اور امویوں کی سلطنت کو دنیاوی ملوکیت کہا ہے۔ خلفا کے منہاج حکومت، ان کے حکام و عمال، ان کے زمانے میں مسلم معاشرہ اور دوسرے متعلقات کو پیش نظر رکھ کر شاہ صاحب نے قرآن و حدیث کے رو سے

ان پر گفتگو کی ہے۔ اور ہر چیز نہایت جرأت کے ساتھ واشگاف طور پر بیان کر دی ہے۔ اس کتاب سے شیعہ و سنی دونوں فرقوں کی بعض غلط فہمیاں اور بے سر و پا فکر آرائیاں بے بنیاد ثابت ہو گئیں اور اسلام کا نظام ریاست و سیاست بالکل واضح ہو کر سامنے آ گیا۔

جس طرح امام غزالی نے ''احیاء علوم الدین'' کے نام سے ایک بے نظیر کتاب لکھ دی تھی اور پوری ملت کو یونان کے ضلالت آموز افکار سے محفوظ کر کے دین قیم کے راستے پر استوار کر دیا تھا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' تصنیف فرما کر اپنے زمانے کے تمام طبقات کی ہدایت و رشد کا سامان مہیا کر دیا۔ (مولوی عبدالرحیم سرحدی نے اس کتاب مستطاب کا ترجمہ سلیس و با محاورہ اُردو میں کیا ہے جو غیر عربی دان لوگوں کے لیے بڑی نعمت ہے) اس کتاب میں پہلے مذاہب و شرائع کی مصلحتوں کا ذکر ہے۔ مذہب کی ضرورت، روح کی حقیقت، جزا سزا، حقیقتِ موت جیسے بنیادی مسائل کی صراحت و وضاحت کی ہے۔ پھر انہی معیاروں پر دین اسلام کے احکام کی مصلحت واضح کی ہے۔ ایمان، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، احسان، معاملات، تدبیر منزل، سیاستِ مدن، معیشت وغیرہ پر حدیث کی رو سے بحث کی ہے۔ شریعت کے ہر حکم کی مصلحتوں کو واضح کیا ہے اور قرآن و حدیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر دینی حکم کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ شاہ صاحب اس خیال کے مخالف ہیں کہ ''شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوتی۔ یا اعمال اور ان کی جزا میں کوئی مناسبت نہیں۔'' شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ احکامِ دین کے مصالح کو سمجھنا اور عقلاً ان کا قائل ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اعمال کا اثر نیتوں اور ان نفسیاتی حالتوں پر موقوف ہے جن سے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ اندھا دھند تعمیل حکم کرنے اور حکم کی مصلحت کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے میں فرق واضح ہے۔

غرض یہ کتاب ''اسرار علوم دین''۔ ''مصالح احکام دین''۔ اصلاح معاشرت تنظیم معیشت و سیاست غرض دین و دنیا کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں رہنمائی کرتی ہے۔ اور پڑھنے والے کے قلب پر اسلام کے منجانب اللہ ہونے کا نقش بٹھا دیتی ہے۔

اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے جس زمانے میں زندگی بسر کی۔ وہ ہندوستان میں سخت ابتری، بدنظمی اور خونریزی کا زمانہ تھا۔ سلطنت دہلی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ فتنوں کی آندھی سے بجھ گیا۔ مرہٹوں اور سکھوں نے جنوب و شمال میں قیامت برپا کر دی۔ دہلی پر نادشاہ کا حملہ ہوا۔ ہزارہا انسانوں اور کروڑوں کی مالیت کے سامان کا نقصان ہوا۔ پانی پت میں مرہٹوں کو

احمد شاہ ابدالی نے شکست دی۔ لیکن مسلمانوں کی سلطنت سنبھل نہ سکی۔ بنگال و بہار میں انگریزوں کا تسلط ہوگیا۔ شاہ ولی اس دورفتن میں چپ چاپ تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت سلطنت مغل کو عسکریت کی مدد سے دوبارہ قائم کرنا محال ہو چکا ہے۔ اس لیے ملت کے فکر و عمل کی اصلاح کرنی چاہیے۔ تاکہ کم ازکم معاشرہ تو اس غار میں گرنے سے محفوظ رہ جائے۔ فتنوں کے دور میں جب ملت کا کوئی سر دھڑ نہ رہا ہو اور روک ٹوک کے تمام عوامل معطل ہو چکے ہوں۔ ملت ہمیشہ گمراہ ہو جایا کرتی ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ اسلام کی تجدید اور اس کے نصب العین کا احیا کیا جائے۔ اس کے روشن چہرے کو داغ دھبوں سے پاک کر کے ایک دفعہ پھر دنیا کے سامنے لایا جائے۔ معاشرت کی اصلاح کی جائے۔ اور ہندوؤں کی ہمسائیگی کی وجہ سے عقیدہ و عمل کی جو گمراہیاں مسلمانوں میں راہ پا گئی ہیں ان کا قلع قمع کیا جائے۔ بادشاہوں، امیروں، افسروں، فوجیوں، مولویوں اور عام لوگوں کو الگ الگ نیکی کی تلقین کی جائے۔ اور ملت کے سیاسی و اقتصادی نظام پر نظر ثانی کی جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے عمر بھر یہی کیا۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب ''تفہیمات الہیہ'' کا وہ حصہ پڑھنا چاہیے جس میں انھوں نے تمام طبقات ملت کو دردمندانہ مخاطب کیا ہے۔ ان کے عیوب و نقائص صاف صاف شمار کرائے ہیں۔ اور انھیں صراط مستقیم کی طرف دعوت دی۔ تفہیمات کا یہ حصہ نہایت موثر ہے جس سے شاہ صاحب کی شدت احساس اور دردمندی واضح ہوتی ہے۔

جب ارباب حکومت عیاشانہ و مسرفانہ زندگی اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی ریس سے خوش حال اور دولت مند طبقہ بھی اسی دلدل میں پھنس جاتا ہے تو اقتصادی توازن تلپٹ ہو جاتا ہے۔ اور اخلاقی و معاشرتی حالات بگڑ جاتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر لکھا ہے:

(ہمارے زمانے میں) شہری زندگی کی بربادی کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ بیت المال (پبلک فنڈ) پر پل پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کا پیشہ ہی یہ ہو جاتا ہے کہ بیت المال سے روپیہ حاصل کریں۔ بعض یہ کہہ کر روپیہ وصول کرتے ہیں کہ ہم غازی ہیں۔ بعض علما کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا بھی بیت المال پر حق ہے۔ بعض زہاد، شعرا اور دوسرے مانگ کھانے والے لوگ بھی بیت المال ہی کو اپنا ذریعہ آمدنی بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ کوئی فرض منصبی بجا نہیں لاتے۔ رفتہ رفتہ ان طفیلیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور

یہ شہر کے لیے، اپنے آپ کے لیے اور ملت کے لیے بارگراں بن جاتے ہیں۔ دوسرا عنصر تمدن کی تباہی کا یہ ہے کہ کاشتکاروں، تاجروں اور اہلِ حرفہ پر ناقابل برداشت ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ اور ان کی وصولی سختی سے کی جاتی ہے۔ جو لوگ اطاعت کے ساتھ ٹیکس ادا کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس کی گرانباری کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں۔ اور جو طاقتور ہوتے ہیں وہ ٹیکس دینے سے انکار کر کے بغاوت اختیار کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں تمدن کی بہتری اسی میں ہے کہ ٹیکس ہلکے ہوں اور ملازم ضرورت سے زیادہ نہ رکھے جائیں۔ (حجۃ اللہ صفحہ ۴۵)

اقتصادیات و معاشیات کے مسائل پر شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور بدور بازغہ میں ''ارتفاقات'' کے عنوان سے جو اصول پیش کیے ہیں ان کو اگر کوئی مسلم حکومت اپنا دستورِ اساسی بنا لے تو اس کی مملکت یقیناً اقتصادی بے چینی اور طبقاتی کشمکش سے بہت بڑی حد تک محفوظ رہے گی۔ انہی ''ابواب ارتفاقات'' میں مالیاتِ حکومت، نظامِ عدل، فوج، پولیس یہاں تک کہ بلدیات وغیرہ کی تنظیم کا نقشہ بھی پیش کر دیا ہے۔

''فیوض الحرمین'' میں شاہ صاحب نے ''تحقیق شریف'' کے عنوان سے ایک نہایت کارآمد بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مسلمان کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ظاہری خلافت والوں اور باطنی خلافت والوں کے لیے حضور کی زندگی میں پوری ہدایت موجود ہے۔ اب ظاہری و باطنی خلافت کی تصریح سنیے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

جو لوگ شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری، سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی اور حفاظت، وفود کو انعام و اکرام دینے کی خدمت، محصول مالگزاری اور صدقات کی وصولی، پھر حقداروں میں ان کی تقسیم، مقدمات کے فیصلے، یتیموں کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام، راستوں، سڑکوں اور مسجدوں وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے دوسرے کاموں پر مامور ہیں۔

میں انھیں ''خلافت ظاہری'' والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ ان لوگوں کے لیے رسول اللہ کی سیرت میں بہترین نمونے ہیں جن کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ پھر جو لوگ:

شرائع و قوانین اسلامی، قرآن، سنن و آثار کی تعلیم دیتے ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے۔ خواہ مناظرہ یا مباحثہ کی راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے۔ یا وعظ و پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام

کے واعظین، خطبا اور مقررین کرتے ہیں۔ پھر جو توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ مثلاً مشائخ وصوفیہ۔ ان کے علاوہ جو نمازیں قائم کراتے ہیں۔ حج کراتے ہیں۔ اور احسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں۔ اور زہد و تقویٰ کی طرف راغب کرتے ہیں۔

ان کو میں ''خلافت باطنی'' والوں کے لقب سے ملقب کرتا ہوں۔ ان لوگوں کے لیے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بہترین نمونے ہیں جن کی تفصیل کتب حدیث میں درج ہے۔

شاہ صاحب کا خیال یہ ہے کہ اگر کسی مسلم مملکت میں دو جماعتیں کام پر آمادہ ہوں۔ ایک جماعت سیاست دانی، دنیاداری اور نظم ونسق میں مہارت رکھتی ہو۔ دوسری ترویج علمِ دین، تزکیۂ باطن اور وعظ وتلقین کی اہل ہو۔ یہ دونوں جماعتیں تقسیم کار کے اصول پر ملت کا کام کریں اور دونوں اپنے اپنے کام کے لیے اسوۂ حسنہ نبوی سے طلب توفیق کریں تو ان کے درمیان ہمیشہ یک آہنگی رہے گی کبھی تصادم وتراحم کی نوبت نہ آئے گی۔ اور ملت دینی و دنیوی، اخلاقی و مادی سب پہلوؤں سے فلاح حاصل کرلے گی۔

اگر پاکستان شاہ صاحب کی اس تجویز کو اختیار کرلے تو قدیم الخیال مولوی اور جدید تعلیم یافتہ کے درمیان کشمکش ختم کی جاسکتی ہے۔ اور ہماری مملکت ایک خوش انتظام اسلامی سلطنت بن سکتی ہے۔

سیاست و معاشیات کے متعلق شاہ صاحب کے نظریات کو تفصیلاً پیش کرنا اس کتاب کے دائرے سے باہر ہے اور بجائے خود ایک کتاب چاہتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شاہ صاحب خیالات وعقائد کی اصلاح ہی کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ مملکت اسلامی کا قیام بھی ان کے پیش نظر تھا۔ خواہ اس کا وجود کسی مستقبل بعید ہی میں ظاہر ہو۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جب مرہٹوں کا فتنہ حد سے بڑھ گیا تو شاہ صاحب ہی نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی۔ اور نواب شجاع الدولہ اور نواب نجیب الدولہ کو ساتھ ملایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پانی پت کے میدان میں تیسری جنگ ہوئی۔ اور مرہٹوں کی قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی گئی کہ وہ دوبارہ پنپ ہی نہ سکے۔ یہ ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے۔ دو سال بعد حضرت شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ زندہ رہتے تو شاید کوئی اور عملی کرشمہ بھی دکھاتے۔

جس ہستی میں خلوص و دردمندی کے جوہر بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ وہ ذوق سخن سے معرا نہیں ہوسکتا۔ شاہ صاحب بھی کبھی کبھی اپنے اندرونی التہاب اور درد دل کے زیر اثر شعر کہتے تھے۔ ان سے آپ کے ذوق سلیم اور طبع بلند کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً ایک غزل کا مطلع ہے۔

ولے دارم زخود خالی حبابش می تواں گفتن
درد کیفیتے جوشِ شرابش می تواں گفتن

ایک اور غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں

تابہ کے محنت و مہجوریٔ دوری بکشم
نازنین و طنم سوئے وطن باز روم
تابہ کے بستۂ زنجیرِ تعلق باشم
آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم

اور ایک غزل کے اشعار

بہ زلفِ پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را
خروشے دردل شبہا نمی کردم چہ میکردم
کسے بائمل ہمی سازو کسے باگل ہمی بازد
اگر من یادِ آں لبہا نمی کردم چہ میکردم

دوسری فصل: خاندان ولی اللّٰہی

شاہ ولی اللہ اس اعتبار سے بھی نہایت خوش قسمت تھے کہ ان کے چاروں صاحبزادے علم دین کے آفتاب بن کر چمکے۔ اور ''الولد سرّ لابیہ'' کو بوجہ احسن ثابت کر گئے۔ مسند علم و فضل اور بارگاہ دعوت و ارشاد ان کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کے وجود سے مزین ہوئی۔ آپ ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں اپنے عدیم المثال باپ کے جانشین ہوگئے۔ اور ساٹھ برس تک درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں مصروف رہ کر ۱۸۲۳ء میں اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں حاضر ہوگئے۔ اردو کے مشہور شاعر حکیم مومن خاں دہلوی کا اصلی نام حبیب اللہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے مومن خاں کہہ کر پکارا جو اصلی نام سے زیادہ مشہور ہوگیا۔ مومن نے آپ کی تاریخ وفات بہت خوبی اور بانکپن سے کہی

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

دوسرے مصرع کے تمام الفاظ کے پہلے اور آخری حروف الگ کردو اور باقی حروف کے اعداد نکالو تو میزان ۱۲۳۹ھ بنتی ہے جو شاہ عبدالعزیز کا ہجری سال وفات ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے زمانے میں ہندوستان کے معزز ترین عالم دین تسلیم کیے جاتے تھے۔ حکومت نے آپ کو علامہ تفضل حسین کی وساطت سے کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کی صدر مدرّسی کے لیے طلب کیا۔ لیکن آپ نے فقر و درویشی اور علومِ اسلامی کی اشاعت کو عز و جاہ پر ترجیح دی۔ حالاں کہ دہلی میں معاش کا کوئی قابل اطمینان سلسلہ موجود نہ تھا۔ آپ نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کے لیے درس و تدریس اور وعظ و خطابت سے کام لیا۔ اور کتابیں بہت کم لکھیں۔ آپ کی تین چار کتابیں شیعیت کے رد میں موجود ہیں۔ مثلاً۔ تحفہ اثنا عشریہ، عزیز الاقتباس، سِرّ الشہادتین۔ ان کے علاوہ حدیث و تفسیر میں دو کتابیں اور بس۔ عربی ادب و شعر میں کمال رکھتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز علما میں اپنی دیانتداری اور روشن خیالی کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ آپ کے زمانے میں انگریزوں کا تسلط دہلی سے کلکتہ تک ہو چکا تھا اور ہر "پبلک" آدمی کو انتہائی احتیاط سے بات کرنی پڑتی تھی۔ شاہ عبدالعزیز کی متانت انگریزوں کے نزدیک بھی مسلّم تھی۔ لیکن اسی زمانے میں آپ نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان کے جتنے حصے غیر مسلم طاقت کے قبضے میں آچکے ہیں وہ سب دارالحرب ہیں۔ یعنی ان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حالت جنگ قائم ہے اور مسلمانوں کو اپنا نظم قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی میں کالج قائم کیا اور مسلمان اس کالج میں تعلیم پانے پر آمادہ نہ ہوئے تو شاہ صاحب نے ان کے شبہات کو رفع کرکے ان سے کہا کہ دہلی کالج سے استفادہ کریں۔ یعنی شاہ صاحب علی گڑھ کالج کے قیام سے پچاس سال پہلے ہی انگریزی سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے چکے تھے۔

شاہ ولی اللہ کے دوسرے اور تیسرے بیٹے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر تھے جو بلاشبہ علم و فضل میں پایہ بلند رکھتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرانِ مجید کا ترجمہ اردو میں کردیا۔ کیوں کہ اب فارسی کی جگہ اردو لے چکی تھی۔ اور شاہ ولی اللہ کا

حکم تھا کہ قرآن مجید کے مطالب کو عوام تک پہنچانا اشد ضروری ہے۔ یہ دونوں ترجمے نہایت خوب ہیں۔ لیکن شاہ عبدالقادر کا موضح القرآن زیادہ مقبول ہے۔ اب تو بے شمار دوسرے حضرات بھی قرآن مجید کے ترجمے شائع کر چکے ہیں۔ لیکن امکانی صحت اور انتہائی احتیاط کے اعتبار سے ان دونوں بزرگوں کے ترجمے اب تک مثال نہیں رکھتے۔

شاہ صاحب کے چوتھے فرزند شاہ عبدالغنی زیادہ تر گوشہ نشین رہ کر درس وتدریس میں مصروف رہے۔ لیکن ان کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شاہ ولی اللہ کے علوم پر حاوی ہوکر جمہور عوام کی ہدایت میں عمر بھر مصروف رہے۔ بلکہ اپنے جوشِ عمل سے ایک ''تحریک جہاد'' کے علم بردار قرار پائے۔

رائے بریلی میں سادات عالی مقام کا ایک خاندان آباد تھا۔ جس کے افراد علم وتقویٰ میں ممتاز تھے۔ اس خاندان میں یکم محرم ۱۲۰۵ھ (۲۴ اکتوبر ۱۷۸۶ء) کو مولانا سید احمد پیدا ہوئے۔ پہلے پہلے آپ علوم سے بے تعلق رہے۔ اور ادھر ادھر تلاشِ روزگار میں پھرتے رہے۔ پھر خود بخود تحصیل علم کا شوق ہوا۔ اور شاہ عبدالعزیز کے پاس دہلی پہنچے۔ شاہ صاحب نے ان کو شاہ عبدالقادر کے سپرد کیا۔ جہاں انھوں نے کچھ صرف ونحو اور کچھ قرآن کا اردو ترجمہ پڑھا۔ شاہ عبدالعزیز سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی۔ اس کے بعد چھ سات سال والیٔ ٹونک نواب امیر خاں کے لشکر میں سوار بھرتی ہوکر فنونِ سپہ گری کی تحصیل کی۔ ۱۸۱۶ء میں دوبارہ دہلی پہنچے۔ اور ہدایت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنے داماد مولانا عبدالحی اور اپنے بھتیجے شاہ اسماعیل کو سید احمد کا رفیق بنایا۔ کیوں کہ شاہ صاحب کی صلاحیت واستعداد پر پورا پورا بھروسا تھا۔ اور وہ صالح ترین حضرات کو ان کا مشیر مقرر کرکے تبلیغ احکام دین کا کام ان کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔

اس کے بعد سید صاحب نے ہندوستان کے اکثر حصوں میں دورہ کرکے اصلاح معاشرت کی کوشش کی۔ جس میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی۔ بے شمار مسلمان رسوم مشرکانہ اور بدعات ومحدثات کو ترک کرکے سیدھے سادے مسلمان بن گئے۔ شادی غمی کے ہندوانہ رسوم ترک ہونے لگے۔ بیواؤں کی شادیاں ہونے لگیں۔ پھر سید صاحب صدہا مسلمانوں کے ساتھ حج کو روانہ ہوگئے اور ۱۸۲۳ء میں واپس آئے۔ اس وقت شاہ عبدالعزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور مسند ارشاد پر شاہ محمد اسحاق متمکن تھے۔ سید صاحب نے ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کے

لیے اور پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کو سکھوں کی وحشیانہ دستبرد سے بچانے کی خاطر جہاد کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے ہزار ہا عقید تمندوں کو ساتھ لے کر رائے بریلی سے کالپی، گوالیار، ٹونک، اجمیر، جودھپور، امروٹ، حیدر آباد، سکھر شکارپور، ڈھاڈر، درۂ بولان، کوئٹہ، پشین، قندھار ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ وہاں سے خیبر کے راستے پشاور اور پھر نوشہرہ گئے۔

جنگ و جہاد کے حالات مولانا مہر کی کتاب ''سید احمد شہید'' میں نہایت شرح و بسط سے بیان ہوئے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل مقصود نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سید صاحب امیر المومنین تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی ان کے وزیر و مشیر تھے۔ آپ نے جہاد کی برکت سے پشاور میں خلافت راشدہ کے مطابق حکومت قائم کی۔ شراب، افیم، بھنگ وغیرہ کی دکانیں بند ہوگئیں۔ فاحشہ عورتیں اپنا پیشہ چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ دختر فروشی کا سدِ باب ہوا۔ اور قرن اولیٰ کا نقشہ نظر آنے لگا کہ یکا یک پشاور کے سردار نے غداری کی۔ سید صاحب کی حکومت کے سردار، اہلکار اور کارکن قتل کردیئے گئے۔ اس پر سید صاحب نے مستقر حکومت کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے بالا کوٹ کی طرف حرکت کی۔ یہاں ان کی فوج سکھ لشکر کے گھیرے میں آ گئی۔ اور ایک لڑائی میں سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل دونوں شہید ہوگئے۔ لیکن اس جہاد کی بلندئ اصول، اس کے رفقا کا عدیم المثال تقویٰ اور خلفائے راشدین کی سی حکومت نے مسلمانانِ ہند کے قلوب پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اور ہزاروں زندگیاں اسی تحریکِ مقدس کے زیر اثر صراطِ مستقیم پر گامزن ہوگئیں۔

اس کے بعد شاہ محمد اسحاق نے حکومت والی اللّٰہی کی ترویج اور اصلاحِ امت کے کام کے لیے مکہ معظمہ کو اپنا مرکز بنایا اور ۱۸۴۳ء میں حجاز چلے گئے۔ مولنا مملوک علی اور حاجی امداد اللہ اور دوسرے حضرات جو شاہ محمد اسحاق کے مدرسے کے پرانے طالب علم تھے۔ ان کے افکار کی اشاعت کے لیے جمع ہوگئے۔ اور ''دہلوی جماعت'' قائم ہوئی جو بعد میں دیوبندی جماعت بن گئی۔ شاہ محمد اسحاق ۱۸۴۵ء میں اور مولانا مملوک علی ۱۸۵۰ء میں فوت ہوگئے۔

حاجی امداد اللہ اور ان کے رفقا نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں کام کیا پھر حرمین تشریف لے گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی ہندوستان میں حضرت حاجی صاحب کے وکیل بنے اور ان کی کوششوں سے ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ سر سید احمد خاں نے اس سے بارہ سال بعد علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ واضح رہے کہ مولانا محمد قاسم اور سر سید احمد خاں دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد ہیں۔

مولانا محمد قاسم کے جانشین شیخ الہند مولانا محمود الحسن قرار پائے۔ جنھوں نے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ مولانا محمد علی مولانا شوکت علی کے ساتھ مل کر خلافت اور ترک موالات کی تحریک میں کام کیا۔ ان تمام اشارات سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانان ہند کی دینی و دنیاوی تعلیم و تنظیم دونوں اب تک حضرت شاہ ولی اللہ کے تصرفات سے متاثر چلی جاتی ہیں۔

تیسری فصل: سرسید احمد خاں

اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہندی مسلمانوں کا جو تنزل شروع ہوا۔ وہ ۱۸۵۷ء میں مکمل ہوگیا۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی نے بنگال میں مسلمانوں کے رہے سہے اقتدار کو ختم کر دیا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں شاہ زمان والی کابل نے رنجیت سنگھ کو لاہور کا صوبیدار مقرر کیا۔ لیکن وہ خود مختار ہوگیا۔ اور پھر ۱۸۱۸ء میں ملتان کو فتح کر کے پورے پنجاب کا حکمران بن گیا۔ انہی دنوں کشمیر بھی مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ اور ۱۸۵۶ء میں اودھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط ہوگیا اور ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے رہے سہے سیاسی آثار بھی نابود ہوگئے۔

مذہبی اعتبار سے مسلم معاشرے کی کیفیت یہ تھی کہ جو حلقے شاہ ولی اللہ کے خاندان کی تلقین سے متاثر ہوئے۔ ان کی وسعت بہت کم تھی۔ عام مسلمان شرک و بدعت اور اوہام پرستی کی دلدل میں غرق تھے۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بڑے بڑے مسلم خاندان تباہ ہوچکے تھے۔ سرکاری ملازمتوں کا دروازہ مسلمانوں پر قریب قریب بند ہوچکا تھا۔ وہ علی العموم افلاس و ناداری کا شکار ہو رہے تھے۔ اور انگریزوں کے آنے کے بعد ذہنی، اقتصادی، تعلیمی ہر اعتبار سے بدحال پس ماندہ اور بیزار سے ہو رہے تھے۔ انگریزی تعلیم کا حصول ہر اعتبار سے اشد ضروری تھا۔ لیکن مسلمان اپنی قدامت پرستی اور جھوٹی عصبیت کی وجہ سے ہر نئے خیال اور ہر نئی تحریک سے بدکتے تھے۔ دردمند مسلمانوں کا ایک طبقہ معاشرے کی اصلاح اور تعلیم جدید کی ترویج پر بے حد مُصر تھا۔ اور اس طبقے کے لیڈر سرسید احمد خاں تھے جو ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا جوادا الدولہ سید ہادی شاہ عالم کے زمانے میں قاضی لشکر اور محتسب کے عہدے پر ممتاز تھے۔ سرسید کے والد میر متقی ایک آزاد طبع انسان تھے۔ لیکن شاہ غلام علی کے مرید تھے۔ سرسید کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد کمپنی کے مدرسہ کلکتہ کے مہتمم تھے۔ اور اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وزیر بھی ہوگئے تھے۔

سید احمد خاں کا خاندان پابند مذہب اور شاہ ولی اللہ کے جانشینوں کا معتقد تھا۔ ان کی بسم اللہ کی رسم شاہ غلام علی نے ادا کی۔ بڑے ہوکر انھوں نے مولانا مملوک علی سے فارسی اور عربی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ دوسرے علوم بعض دوسرے اساتذہ سے حاصل کیے۔ انھوں نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید، اور حضرت سید احمد بریلوی کے حالات نہایت ادب و احترام سے لکھے ہیں۔ سرسید اپنے آپ کو علی الاعلان وہابی کہتے تھے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے ان کے خیالات و عقائد پر بہت گہرا اثر ڈالا اور وہ تقلید سے آزاد ہوگئے۔ بلکہ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تائید میں متعدد کتابیں بھی لکھیں۔ مثلاً ''کلمۃ الحق'' اور ''راہِ سنت و ردِّ بدعت'' ان حقائق کے بیان سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ سرسید احمد خاں بھی (اپنے بعد کے خیالات و عقائد کی آزادی کے باوجود) جس جوش اصلاح سے سرشار تھے، وہ تمامتر خاندان ولی اللّٰہی کا فیض تھا۔

سرسید کے خاندان کی ریاست محض نام کی ریاست تھی۔ شاہی سرپرستی اور امداد کے ختم ہوجانے کے بعد معیشت مضطرب ہوچکی تھی۔ سرسید کو انگریزی ملازمت اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ صدر امین پھر منصف پھر جج ہوئے اور پینتیس سال تک بڑی نیک نامی سے ملازمت کی۔ دوران ملازمت میں بھی تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ اور متعدد کتابیں لکھیں۔ اس دور میں ان کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔ ایک رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' جس میں نہایت واشگاف طور پر ہندوستانیوں کی بے اطمینانی کے وجوہ و اسباب بیان کیے۔ اور اس کی ذمہ داری زیادہ تر حکمرانوں کے رویے پر عائد کی۔ دوسری کتاب ''آثار الصنادید'' ہے۔ جس میں دہلی اور نواح دہلی کے عمارات و آثار کی تاریخ اور اکابر دہلی کے حالات محققانہ طور پر قلمبند کیے۔ اس کتاب کا فرانسیسی ترجمہ گارسان دتاسی نے کیا۔ جس پر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو اپنا آنریری فیلو نامزد کیا۔ آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی (ضیا برنی) کی تصحیح کرکے ان کو شائع کیا۔ ''سرکشی بجنور'' کی تاریخ بھی لکھی۔

اس کے بعد سرسید نے تصیف و تالیف میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ مثلاً خطبات احمدیہ میں سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' کا جواب لکھا۔ تفسیر قرآن سات جلدوں میں لکھی۔ اور متعدد مذہبی رسائل تالیف کیے۔

[illegible] کی ترویج کا شوق سرسید کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا [illegible] وہ اس

سے کسی حال میں غافل نہ رہے۔ دوران ملازمت ہی میں مراد آباد کا فارسی مدرسہ اور پھر غازی پور کا انگریزی سکول قائم کیا۔ غازی پور ہی میں انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ یہ ۱۸۶۳ء کا واقعہ ہے۔ وزیر ہند ڈیوک آف آرگائل اس سوسائٹی کے سرپرست ہوئے۔ صوبوں کے گورنروں نے اس کی امداد کی۔ پھر جب سرسید کا تبادلہ علی گڑھ میں ہوگیا تو یہ سوسائٹی وہاں منتقل ہوگئی۔ اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم ترجمہ و تالیف کے ذریعے سے ہندوستان میں رائج کیے جائیں۔ چنانچہ متعدد کتابوں کے ترجمے شائع کیے گئے۔ بہت سے علمی مقالے پڑھے گئے۔ ایک اخبار بھی جاری کیا گیا۔ جس کا ایک کالم انگریزی میں اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں سرسید صرف مسلمانوں کے لیے کام نہ کرتے تھے۔ بلکہ بلا امتیاز سب ہندوستانیوں کی اصلاح معاشرت اور عمومی ترویج تعلیم میں کوشاں تھے۔ چنانچہ جب وہ علی گڑھ سے بنارس تبدیل ہوئے تو سوسائٹی اور اخبار کا کام راجا جے کشن داس نے اپنے ذمے لے لیا۔ لیکن سرسید بھی اس کی خدمت میں برابر مصروف رہے۔

سرسید کے قیام بنارس کے زمانے کا واقعہ ہے کہ وہاں بعض معزز و ممتاز ہندوؤں نے فارسی اور اردو کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے خارج کرنے اور اس کی جگہ دیوناگری اور بھاشا رائج کرنے کی کوشش کردی۔ اور صوبے کے گورنر انٹونی میکڈانل نے ان کی حمایت کی۔ ان حالات کو دیکھ کر سرسید کو بے حد صدمہ ہوا۔ اور انھوں نے صرف مسلمانوں پر اپنی اصلاحی توجہات مرتکز کردیں۔ اور اپنے ایک انگریز دوست مسٹر شیکسپیئر کمشنر بنارس سے صاف کہہ دیا کہ یہ اختلاف بڑھے گا اور اب ہندو اور مسلمان مل کر کام نہ کرسکیں گے۔ جو زندہ رہے گا وہ اس کا انجام دیکھے گا۔ مسٹر شیکسپیئر نے کہا۔ اگر آپ کی پیش گوئی صحیح نکلی تو بڑے افسوس کی بات ہوگی۔ سرسید نے کہا مجھے بھی بے حد افسوس ہے۔ لیکن مجھے اپنی پیش گوئی کے صحیح ہونے کا پورا یقین ہے۔

انہی دنوں سرسید کے صاحبزادے سید محمود کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک وظیفہ ملا۔ سرسید بھی ان کے ساتھ ہی انگلستان روانہ ہوگئے۔ کیونکہ وہ ترویج تعلیم کی مساعی کو کامیاب بنانے کے لیے انگلستان کے ادارات تعلیمی کا بچشم خود معائنہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی بعض زیر تصنیف کتابوں مثلاً خطبات احمدیہ وغیرہ کے لیے برطانوی کتب خانوں سے مواد بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو روانہ انگلستان ہوکر اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس آئے۔ اور اپنا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ یہ رسالہ اپنی علمی نوعیت کے باعث

بہت کم چھپتا تھا۔عوام اس سے استفادہ نہ کر سکتے تھے۔لیکن جب سرسید نے اس میں مذہبی مسائل پر ایسی آزادی سے اظہار خیال شروع کیا جو مذہبی حلقوں کو سخت ناگوار ہوئی تو چاروں طرف سے ان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اور وہ ملک بھر میں کرستان اور نیچری مشہور ہوگئے۔

انگلستان سے واپس آنے کے بعد سرسید نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کی اور اس کے ذریعے سے ایک اپیل جاری کی کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج علی گڑھ میں کھولا جائے۔ حکام انگریزی اور بعض رؤسا نے ہزارہا روپیہ چندہ دیا۔حکومت نے گرانٹ منظور کی اور جب کافی روپیہ جمع ہوگیا اور سرسید ۱۸۷۶ء میں پنشن پا کر علی گڑھ میں مقیم ہوگئے تو ۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کا افتتاح لارڈ لٹن کے ہاتھوں انجام پایا۔

کالج کھل گیا۔سرسید کی مساعی کے قدر دانوں نے ملک کے ہر حصے سے طلبا کو اس کالج میں بھیجنا شروع کر دیا جو آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں کے انداز پر چلایا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے قابل انگریز اور ہندوستانی پروفیسر مقرر کیے گئے جنھوں نے سرسید کے جوش عمل سے متاثر ہوکر دل و جان سے کالج کی خدمت کی۔لیکن علما کے ایک بڑے طبقے کی طرف سے وسیع پیمانے پر مخالفت شروع ہوئی۔ جس سے سرسید کچھ مدت تک بہت پریشان رہے۔لیکن ایک غلط فہمی کا ازالہ اور سدباب ضروری ہے۔بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علما نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔قرآن و حدیث میں ہر قسم کے علوم کے حصول کی تاکید آئی ہے۔ پھر حضرت شاہ عبدالعزیز بھی فتوے دے چکے تھے کہ جدید تعلیم اور انگریزی زبان کی تحصیل ہرگز ناجائز نہیں۔ اس کے علاوہ کالج میں مذہبی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔ بات اصل یہ تھی کہ سرسید احمد خاں ''تہذیب الاخلاق'' میں مذہب کے بعض مسائل کی تاویلات ایسے انداز سے کر چکے تھے کہ قدیم خیال کے راسخ العقیدہ مسلمان ان سے بدظن ہوگئے تھے۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کا کام ایسے شخص کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جتنے فتوے شائع ہوئے ان میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی مخالفت نہیں کی گئی۔ بلکہ زیادہ تر سرسید کے عقائد کو پیش کر کے انھیں کافر د ملحد قرار دیا گیا ہے۔اور کہا گیا ہے کہ ایسا شخص جو مدرسہ قائم کرے اس کی اعانت شرعاً جائز نہیں۔

لیکن کالج کے کارکنوں نے جن میں مسٹر بیک پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ، والٹر ریلی، سر تھیوڈور ماریسن، مولانا شبلی نعمانی اور دیگر حضرات شامل تھے، بڑی محنت سے کام شروع کیا۔ اور کالج روز بروز ترقی کرنے لگا۔۱۸۸۴ء میں سرسید نے پنجاب کا دورہ کیا تو مخالفت بڑی حد تک

دب چکی تھی۔ اور ہر جگہ سرسید کا شاندار استقبال کیا جارہا تھا۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا سمیع اللہ خاں، خواجہ غلام الثقلین اور دوسرے بزرگ۔ کالج، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور سرسید کے دوسرے کاموں میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ کالج کی مفصل سرگزشت حالی کی ''حیات جاوید'' میں پڑھنی چاہیے۔ بہرکیف سرسید کی عمر کے آخری ایام ضعفِ پیری، ایک ہندو کلرک کے غبن اور سید محمود کی لاعلاج شراب خواری کی وجہ سے بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ اور آخر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو تقریباً اسّی سال کی عمر میں مسلمانانِ ہند کا یہ دردمند رہنما اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملا۔ مرتے وقت قرآن مجید کی آیات مسلسل زبان پر رواں تھیں۔ اللہ عاقبت بخیر کرے۔

سرسید کے انتقال پر نواب محسن الملک کالج کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کالج کے کارپردازوں نے جس خوش اسلوبی سے سرسید کے کام کو جاری رکھا۔ اور اس کو آگے بڑھایا۔ کالج کو یونیورسٹی بنانے میں جس انہماک اور ایثار سے کام لیا اس کی داستان تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ ہمیں ان تمام تفصیلات سے بحث نہیں۔ ہم تو مختصراً اس امر کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ثقافتی اعتبار سے سرسید کا دائرہ عمل کس قدر وسیع تھا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں میں جو علمی و معاشرتی بیداری پیدا ہوئی۔ اور جو سیاسی شعور بروئے کار آیا وہ کس حد تک سرسید کی مساعی کا نتیجہ تھا۔

وہ روزِ اول سے ''سول لائزیشن'' (تہذیب) کے علمبردار تھے۔ چنانچہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں انھوں نے اس تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو رسالے کے مقاصد کی حیثیت سے پیش کیا۔ ملاحظہ ہو:

(۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کے پرچے میں لکھا)

''اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سول لائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو۔ اور وہ بھی دنیا میں مہذب و معزز قوم کہلائیں۔

''سول لائزیشن (انگریزی لفظ ہے) جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعالِ ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت۔ تمدن اور طریقۂ تمدن اور صَرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے علوم و ہنر کو اعلیٰ درجے کی

عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اور تمکن و وقار اور قدر و منزلت حاصل ہوتی ہے۔ اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''

اس کے بعد ایک پرچے میں مقاصد کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے:

''جب ہم کسی کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں تو ہم کو یہ ضرور ہے کہ ہم یہ بھی بتا دیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تمیز کرنی چاہیے ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں۔ جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہیے:

اول۔ آزادی رائے:

مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے ایسی پست و پامال ہو چکے ہیں جس کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی۔ اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

دوم۔ درستی عقائد مذہبی:

ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں۔ اور جو ان کے دلوں میں ہیں۔ اور جن کا یقین ان کو بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقائد کو ہیئت اسلام کے مطابق کرنا، اور اسی پر یقین رکھنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

سوم۔ خیالات و افعالِ مذہبی:

ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہّمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعالِ مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خود بدعت ہیں یا رسومات و خیالاتِ کفر و شرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لیے ان کی تہذیب درکار ہے۔

چہارم۔ تدقیق بعض مسائل مذہبی:

ہمارے مذہب کے بعض صحیح اور اصلی مسائل ایسے ہیں جن کی پوری پوری تحقیق و تدقیق اب تک نہیں ہوئی ہے۔ اور اگرچہ مسائل فی نفسہٖ صحیح اور درست ہیں الّا بیان واضح اور تحقیقِ کامل نہ ہونے کے سبب علومِ عقلیہ کے برخلاف تہذیب و شائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ پس ہم کو ان کی تشریح و تفسیر میں تہذیب کرنی چاہیے۔

پنجم۔ تصحیح بعض مسائل مذہبی:

ہم کچھ شک نہیں کرتے کہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں۔ یا یوں کہو کہ بعض ایسے مسائل کا ہونا ممکن ہے جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو۔ پس ان کو بحث میں لانا اور ایک امر منقح ٹھیرانا ہمارے لیے ضروری ہے۔

ششم۔ تعلیم اطفال:

مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گزشتہ و حال پر نظر کرکے ایک ایسا طریقہ تعلیم معیّن کرنا چاہیے۔ جس سے علوم دینی و دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔

ہفتم۔ سامانِ تعلیم:

ہمارے لیے صرف طریقہ تعلیم کا سبق معیّن کرنا کافی نہ ہوگا۔ بلکہ آپس کی محبت اور مجموعی ہمت، اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کردینا ضروری ہوگا۔

ہشتم۔ عورتوں کی تعلیم:

کچھ شبہ نہیں کہ قومی تہذیب اور شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس ہم کو اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ان کو دستکاری سکھانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

نہم۔ ہنر و فن و حرفہ:

اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت۔ اور فن و حرفہ کو پھیلانا اور ترقی دینا قومی تہذیب

کا ایک بہت بڑا جزو ہے۔"

اس کے بعد اخلاقی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بیس اور شقوں کا ذکر ہے۔ اصلاح و ترقی تہذیب الاخلاق کے مقصد میں داخل ہے۔ ہم طول کے خوف سے صرف ان کے عنوانات درج کیے دیتے ہیں:

خود غرضی، عزت و غیرت، ضبط اوقات، اخلاق صدق مقال، دوستوں سے راہ و رسم، کلام، لہجہ، طریق زندگی، صفائی، طرز لباس، طریق اکل و شرب، تدبیر منزل، رفاہ عورتوں کی حالت میں، کثرتِ ازدواج، غلامی، رسوماتِ شادی، رسوماتِ غمی، ترقی زراعت، ترقی تجارت۔

گویا سرسید کے نزدیک اصلاح و تجدید کا دائرہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ بلاشبہ سرسید علمی اعتبار سے حضرت شاہ ولی اللہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مسائل مذہبی کی تنقیح و تاویل میں انھوں نے جابجا ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن غالباً یہ اسی ولی اللّٰہی تربیت کا اثر ہے جس کو سرسید نے ان کے جانشینوں سے براہ راست حاصل کیا کہ اصلاح و تجدید کا جو پروگرام سید صاحب نے پیش کیا ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے پروگرام سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اگر سرسید علومِ دین میں اسی دِرک و مہارت کے حامل ہوتے جو اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو ودیعت کی تھی تو وہ شاہ صاحب کے بہترین جانشین ثابت ہوتے۔ لیکن ایک علم دین کی کمی۔ دوسرے انگریزی علم و تمدن سے مرعوبیت۔ تیسرے احوال و ظروف کی مجبوری نے ان کو اس بلندی پر پہنچنے سے محروم رکھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے ایک ڈوبتی ہوئی قوم کو سہارا دینے میں بڑا کام کیا۔ اور مسلمانان ہند میں حیاتِ تازہ کی وہ روح پھونک دی جس نے ان کو غیر مسلم اکثریت اور غیر مسلم حکومت دونوں کے مقابلے کے قابل بنا دیا۔

ادبیات میں سرسید احمد خاں کی خدمت بے نظیر ہے۔ انھوں نے اردو کو تکلف و تصنع کی دلدل سے نکال کر عملی زندگی کے مسائل کی بحث کے قابل بنایا۔ اور معجزانہ طور پر ملک بھر کی صحافت و خطابت کو اس سیدھے راستے پر ڈال دیا جس پر چل کر وہ موجودہ پاکیزگی اور نفاست کی سرمایہ دار بن گئی۔ انھوں نے مولانا حالی سے مسدّس لکھوا کر صرف اپنی عاقبت بخیر ہونے کا انتظام ہی نہ کیا۔ بلکہ اردو شاعری کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ انھوں نے تصنیف و تالیف میں ہمیشہ بلند معیاروں کو [illegible] مصنفین [illegible] صحیح [illegible] تک

ہندوستان و پاکستان میں جتنے مؤرخ، مصنف، ادیب، شاعر اور خطیب پیدا ہوئے۔ اور جو آج کل موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ سرسید کی تحریک ادبی سے کاملاً غیر متاثر رہا ہے۔ ہزار ہا انگریزی دان مسلمان جنھوں نے تصنیف و تالیف کی مسندوں اور اعلیٰ درجے کے حکومتی عہدوں کی کرسیوں کو زینت بخشی سب کے سب سرسید احمد خاں کی تحریک کے ممنون احسان ہیں۔ اگر سید صاحب مسلمانوں میں علوم جدیدہ کی تحصیل کا ذوق پیدا نہ کرتے اور اپنی پوری زندگی اس کام میں صرف نہ کرتے تو یہ نتائج ہرگز پیدا نہ ہوئے ہوتے۔ اور وہ سیاسی بیداری بھی رونما نہ ہوئی ہوتی جس نے مسلمانانِ ہند کو پاکستان کے قیام کی توفیق بخش دی۔

سرسید کے رفقا و معاصرین میں بعض تو ایسے تھے جو کالج کے قیام اور تعلیمی تحریک میں آغاز سے ان کے ساتھ رہے۔ بعض بعد میں آکر شامل ہوئے۔ اور بعض اگرچہ کالج سے تعلق نہ رکھتے تھے لیکن اپنے اپنے دائرے میں اپنی صلاحیتوں کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک میں صَرف کر رہے تھے۔ مولوی سمیع اللہ خاں آغاز کار ہی سے سرسید کے ساتھ تھے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کے ساتھ ہی وہ اس کے ممبر ہوگئے۔ اور جب سرسید نے انگلستان سے واپس آکر کالج کے قیام کی تجویز پیش کی تو مولوی سمیع اللہ خاں علی گڑھ میں سب جج تھے۔ سرسید ابھی بنارس ہی میں تھے اور کافی روپیہ جمع ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ لیکن مولوی سمیع اللہ خاں تاخیر کے روادار نہ تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء ہی میں اللہ کا نام لے کر مدرسے کی بنیاد ڈال دی۔ بلند شہر اور علی گڑھ کے رؤسا پر ان کا اثر تھا۔ مولوی صاحب نے ان سے خوب چندہ وصول کیا۔ اور آخر ۱۸۷۷ء میں سرسید نے ان کو مجبور کیا کہ مدرسے کا سنگ بنیاد وہی رکھیں۔ مولوی صاحب بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی مملوک علی اور مولوی سید محمد جیسے مشاہیر زمانہ سے اکتساب علوم کیا تھا۔ آخر مولوی صاحب اور سرسید کے درمیان ٹرسٹی بل کے سلسلے میں شدید اختلاف رونما ہوگیا۔ نواب وقار الملک نے مولوی صاحب کا ساتھ دیا۔ لیکن سرسید کی سختی کے باعث مولوی صاحب کالج کے انتظامی امور سے دستکش ہوگئے۔ تاہم کالج سے ان کی علمی ہمدردی برابر جاری رہی۔ آپ نے الہ آباد میں ایک مسلم ہوسٹل قائم کیا۔ جو مسلمان طلباء کی تربیت میں بعض پہلوؤں کے اعتبار سے بے حد مفید ثابت ہوا۔

سرسید کی وفات کے وقت کالج کی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ ہندو کلرک کے غبن کی خبر نکلنے کے بعد باہر سے چندہ آنا بند ہوگیا تھا۔ بعض طلباء بھی کالج چھوڑ رہے تھے۔ کچھ دنوں

جسٹس محمود کالج کے سیکرٹری رہے۔ لیکن ٹرسٹیوں نے کالج کی بدحالی کو مدنظر رکھ کر بالاتفاق نواب محسن الملک کو سیکرٹری منتخب کیا۔ محسن الملک کا نام سید مہدی علی تھا۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔ دس روپے کی کلرکی سے زندگی کا آغاز کیا۔ اور ترقی کر کے تحصیل دار اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن میں ایک بڑا عہدہ ان کو دیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں حیدرآباد کی ملازمت چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے۔ دورانِ قیام حیدرآباد میں اپنی خدماتِ حسنہ کی وجہ سے منیر نواز جنگ، محسن الدولہ، محسن الملک کے خطابات پا چکے تھے۔ قوم ان کو محسن الملک کی نام سے جانتی ہے۔ انھوں نے سرسید کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ اور ان کے انتقال کے بعد کالج کی خدمت اس شان سے کی کہ طلباء کی تعداد ان کے عہد میں ۳۴۳ سے بڑھ کر آٹھ سو ہوگئی اور کالج کی سالانہ آمدنی جو ۱۸۹۸ء میں چھہتر ہزار تھی۔ نو سال کی مدت میں ڈیڑھ لاکھ ہوگئی اور پانچ چھ سال کے اندر مسلم یونیورسٹی کے سرمائے میں بھی چھ لاکھ روپیہ جمع ہوگیا۔ کالج کے طلباء کی شہرت و ناموری درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔ بے شمار طلباء فارغ التحصیل ہوکر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوگئے۔ اور ہر طرف علی گڑھ کے گریجویٹوں کی مانگ بڑھنے لگی۔

ایم۔اے۔او کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے معتمد و مہتمم ہونے کے ساتھ ہی نواب محسن الملک پوری قوم کے لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں کی سیاسیات سے بھی غافل نہ رہے۔ چنانچہ اکابر مسلمین کا جو وفد جداگانہ انتخاب کا مطالبہ لے کر لارڈ منٹو کے پاس حاضر ہوا۔ اس کی ترتیب بھی نواب محسن الملک ہی نے کی۔ اور ہز ہائی نس سر آغا خاں کی سرکردگی میں یہ وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے سے ملا۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب واپس آیا۔ اس کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکا میں مسلمانوں کا ایک سیاسی جلسہ ہوا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

نواب محسن الملک نہایت ذی علم، صاحب ایثار، متین اور تعمیری ذہن کے رہنما تھے۔ سید محمود اور بعض دوسرے ٹرسٹیوں کی مخالفتوں کے باوجود اپنا کام نہایت سکون سے انجام دیتے رہے۔ ان کے آخری ایام میں بعض شعلہ مزاج طلباء نے کالج میں سٹرائیک کرا دی۔ محسن الملک کو بے حد صدمہ ہوا۔ یہی صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اور آپ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو بمقام شملہ فوت ہوگئے۔ اور علی گڑھ میں دفن کیے گئے۔

تھے لیکن تحقیق کے بعد مسلک اہل سنت اختیار کیا اور ایک

نہایت عمدہ کتاب آیاتِ بیّنات لکھی۔ علم و فضل کی متانت کے ساتھ ہی ساتھ نہایت باغ و بہار طبیعت کے آدمی تھی۔ اور خطبات میں تو ان کی مثال دور دور تک نہ تھی۔

نواب وقار الملک سرسید کے دوسرے جانشین تھے۔ نہایت ضابطہ پسند، مذہبیت اور دیانت کے پیکر، بلند کردار اور سب طبقوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ حیدرآباد دکن میں ملازمت کی۔ سرسید نے سر سالار جنگ سے ان کی سفارش کرتے ہوئے لکھا۔ کہ ''اگر میں کسی کو اپنے سے زیادہ ایماندار سمجھتا ہوں تو وہ مشتاق حسین ہیں'' یہی مشتاق حسین بعد میں اپنی خدمات کی وجہ سے نواب وقار الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ محسن الملک کے بعد وہ کالج کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ وہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی میں انگریزوں کے عمل و دخل کو ہرگز روا نہ رکھتے تھے۔ اور مسلم لیگ کے بانی کی حیثیت سے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے بڑے علم بردار تھے۔ اظہار حق کی جرأت ان میں سرسید اور محسن الملک دونوں سے بڑھی ہوئی تھی۔

مولانا شبلی نعمانی نے اعظم گڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد غازی پور، رام پور، لاہور، سہارنپور میں بعض نامور اساتذہ سے فیوض علمی حاصل کیے۔ چوبیس سال کی عمر تھی جب مولوی سمیع اللہ خاں نے ان کا تعارف سرسید سے کرایا۔ اور وہ کالج میں پروفیسر مقرر کر دیئے گئے۔ ان کے عمیق علمی ذوق کی وجہ سے سرسید نے ان کو اپنے کتب خانہ سے استفادے کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ مولانا کو تاریخ سے وہیں شغف پیدا ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور علمائے مغرب اور مستشرقین کی تصانیف سے واقف ہوئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی شاندار تاریخ سے روشناس کرانے میں مولانا شبلی کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ الفاروق، المامون، الہارون، سیرۃ النعمان اور متعدد دوسرے تاریخی رسائل زبانِ اردو کے ذخیرہ تصانیف میں ہمیشہ گل سرسبد بنے رہیں گے۔ شعر العجم اور موازنہ دبیر و انیس لکھ کر مولانا نے فارسی اور اردو شعر کی تنقید کا بلند معیار قائم کر دیا۔ انھوں نے الندوہ میں بے شمار تحقیقی تاریخی و مذہبی مضامین لکھ کر مسلمانوں کے دماغوں کو روشن کر دیا۔ اس کے علاوہ عربی اور اردو کے نہایت بلند پایہ شاعر بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ علی گڑھ میں رہ کر اور کالج کی ''پیداوار'' کو دیکھ کر مولانا سرسید کی تحریک کے بعض حصوں سے سخت بیزار ہو گئے تھے۔ ان کو جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی پست معیاری کو دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ جدید تعلیم اور تہذیب کے ملک گیر غلغلے کے باوجود علی گڑھ سے ایک بھی ایسا نہ ہوا جو حالی، شبلی یا سرسید کے معیار کو پہنچا ہو۔ اس کے

علاوہ مولانا شبلی کو سرسید اور ان کی تحریک کے متعلق متعدد اعتراضات تھے۔

اب بعض ہوشمند اور اعتدال پسند بزرگوں نے محسوس کیا کہ علی گڑھ کالج سے اسلامی علوم و ثقافت کے تقاضے پورے نہیں ہوئے۔ اور دینی مدارس کا نصاب ضروریات زمانہ کے منافی اور بوسیدہ و فرسودہ ہے۔ اس لیے ایک ایسی درسگاہ قائم کرنی چاہیے۔ جو ان دونوں کے بین بین ہو۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کا قیام لکھنؤ میں ہوا۔ جس کے مقاصد یہ بتائے گئے:

نصابِ تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب اخلاق، شائستگی اطوار علما کے باہمی نزاعات کا ارتفاع۔ مسلمانوں کی فلاح و صلاح کی تدابیر۔ ایک عظیم الشان اسلامی دار العلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع کی تعلیم بھی ہو۔ دینی علوم میں فتوے دینے کے لیے ایک محکمۂ افتا کا قیام۔

مولانا شبلی اور مولانا عبدالحق دہلوی (صاحب تفسیر حقانی) نے ندوہ کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ سرسید، محسن الملک، وقار الملک نے بھی ندوہ کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تقریر و تحریر سے ان کا خیر مقدم کیا۔ لیکن ایک طرف تو سرانیٹنی میکڈانل (گورنر صوبہ جات متحدہ) نے ندوہ کی مخالفت کی۔ اور اس کو سیاسی سازشوں کا مرکز سمجھ کر مشتبہ قرار دیا۔ دوسری طرف مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے ندوہ کی شدید مخالفت شروع کی۔ بلکہ ایک مخالف جماعت جدوہ کے نام سے بھی قائم کردی۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی حیدر آباد دکن کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آئے۔ اپنی شبانہ روز مساعی سے ندوۃ العلما کی مشکلات دور کیں۔ دارالعلوم کے معتمد مقرر ہوئے۔ الندوہ رسالہ جاری کیا۔

بلاشبہ ندوہ کے بعض ارکان اور مولانا شبلی کے درمیان اختلافات بڑھ گئے۔ اور اجرائے کار میں بعض دقتیں بھی رونما ہوتی رہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ندوۃ العلما اور اس کے دارالعلوم نے صحیح نمونے کے بعض علماء و مؤرخین پیدا کیے۔ اور علم و تحقیق کا ذوق اپنے طلبا میں عام کردیا۔ جس دارالعلوم سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا نجیب اشرف اور بیسیوں دیگر روشن دماغ علما پیدا ہوئے ہوں۔ اور جس کے رسالہ کے حلقۂ ادارت میں مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل رہے ہوں۔ اس کے پایۂ علمی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مولانا آزاد مدت تک خود ندوہ میں مقیم رہ کر مستفیض ہوئے۔ اور الہلال کا عملہ

بھی ... مشتمل ...

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی اگرچہ کالج سے متعلق نہ تھے لیکن ان کا شمار سرسید کے حلقۂ رجال میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ حالی نے اپنی پوری زندگی علی گڑھ کی تحریک کی حمایت اور مسلمانوں کے ادبیات کی تجدید میں بسر کردی۔ حالؔی نے اردو میں جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ اور اس کو بے معنی داخلیت سے نجات دلا کر مقصدیت کے لیے وقف کردیا۔ ان کی ''مسدس'' اردو زبان اور ادبیات اسلامی کی ایک لازوال متاع ہے۔ اور اب تک اس کتاب کے کم و بیش ایک کروڑ نسخے ہندوستان کے بے شمار مطابع میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری میں اس نظم نے بلاشبہ بہت بڑا کام کیا ہے۔ مسدس سرسید کے ایما پر لکھا گیا تھا۔ اور وہ اس کی اتنی قدر کرتے تھے کہ فرماتے ہیں:

''جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو دنیا سے کون سے اعمال حسنہ لے کر آیا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔ اس کے سوا میرے دامن میں کچھ نہیں۔''

حالؔی کی بلند کرداری، نیک دلی، انصاف پسندی، میانہ روی اور درویشی مسلم ہے۔ اور خُدّامِ قومی میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔

حالؔی نے شعر و سخن کے علاوہ نثر میں بھی سرسید کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' مرزا غالب کی لائف ''یادگارِ غالبؔ'' اور ''حیات سعدی'' جیسی غیر فانی کتابیں لکھیں اور سوانح نگاری کا ایک نیا اور دلآویز انداز اختیار کیا۔

مولوی چراغ علی یو۔ پی میں ملازم تھے۔ پھر حیدر آباد دکن میں مامور ہوئے۔ حسنِ خدمات کے صلے میں اعظم یار جنگ کا خطاب حاصل کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں بمقام بمبئی فوت ہو گئے۔

مولوی صاحب نہایت بلند پایہ عالم تھے۔ علوم عربی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ فارسی بہت عمدہ لکھتے تھی۔ عبرانی، کالڈی، لاطینی، یونانی بقدر ضرورت جانتے تھے۔ انگریزی زبان میں صاحب تصنیف تھے۔ اور سرسید کی مذہبی بحثوں میں ان کے معاون و مددگار تھے۔ ان کے بعض رسائل و مضامین ''رسائل چراغ علی'' کے نام سے شائع ہوئے۔ دو اہم انگریزی کتابیں لکھیں۔ ایک ''تحقیق جہاد'' اور دوسری ''اعظم الکلام فی ارتقا الاسلام'' کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب ''ریفارمز انڈر دی مسلم رول'' لکھی۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے مولوی چراغ علی کی قابلیت، تنقید اور وسعت مطالعہ کا پتا چلتا ہے۔ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا مسلمانوں

کے دماغوں کو روشن کرنے میں بے حد کام کیا ہے۔

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کے انداز تحریر میں ایک بات اہل علم کو ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ وہ اسلام کے متعلق ہمیشہ معذرت آمیز طرزِ بیان اختیار کرتے تھے اور ہر حالت میں اسلام کو مغربی علوم و خیالات کے مطابق ثابت کرنے کے درپے رہتے تھے۔ بلاشبہ وہ بعض حالات و کیفیات سے بھی مجبور ہوں گے۔ لیکن اصل وجہ وہی تھی کہ دینِ اسلام اور اس کے فلسفے کے متعلق ان حضرات کا علم ناقص تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی ایسا شخص سامنے آئے جو اسلام سے پوری طرح واقف ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے مذاہب اور یورپ کی تاریخ سے بھی باخبر ہو۔ چنانچہ اس زمانے میں سید امیر علی منصۂ شہود پر آئے۔ آپ ۱۸۴۹ء میں بنگال کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے روشن خیال والد سید سعادت علی نے ان کو آغاز کار ہی سے جدید تعلیم دلوائی۔ اور امیر علی علی گڑھ کے قیام سے آٹھ سال پیشتر بی اے پاس کر گئے۔ نواب محمد لطیف نے محسن فنڈ سے جس کے ٹرسٹی مولوی کرامت علی تھے۔ امیر علی کو وظیفہ دلوایا۔ وکالت، بیرسٹری، مجسٹریٹی، ہائی کورٹ کی ججی کے زینے طے کرتے کرتے ۱۹۰۹ء میں پریوی کونسل کے جج مقرر ہوگئے۔ یہ ایسا عہدہ تھا جو اب تک کسی ہندوستانی کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔

سید امیر علی اپنی قابلیت اور دانشمندی کی وجہ سے ہندوستانی اور انگریز دونوں قوموں کے نزدیک واجب الاحترام تھے۔ اور مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی ترقی و بیداری کی تدبیروں میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ قانون میں ان کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ ان کی بعض قانونی کتب اب تک وکلا اور ججوں کے نزدیک درجۂ استناد رکھتی ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ''سپرٹ آف اسلام'' اسلام اور اس کی تاریخ پر ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ وہ شیعہ تھے۔ لیکن ان کی تصانیف میں اس رجحان مذہبی کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ وہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی عظمت کا ذکر بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف کے برابر ہی کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسلام کے اصول وعقائد کی حمایت میں وہ زورِ قلم صَرف کیا کہ بڑے بڑے مغربی مصنفین عش عش کر گئے۔ اور اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں متعصب مغربیوں نے پھیلا رکھی تھیں۔ ان سب کا مدلل طور پر قلع قمع ہوگیا۔ یہ آغا خان، قائداعظم محمد علی جناح، راجا صاحب محمود آباد اور سید امیر علی جیسے شیعہ بزرگوں کی روشن خیالی اور بے تعصبی ہی تھی۔ جس نے شیعہ اور سنی فرقوں کو ایک دوسرے سے بے حد قریب کردیا۔ اور سنی اکثریت کو بھی ان

حضرات کی اسلامی ہمدردی اور قومی رہنمائی سے انکار کی گنجائش پیدا نہیں ہوئی۔

جب ترکوں نے خلافت کا خاتمہ کردیا تو سر آغا خاں اور سید امیر علی نے عصمت پاشا کے نام ایک مؤدبانہ مراسلہ لکھا۔ جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات ظاہر کیے۔ اس پر عصمت پاشا نے ان دونوں بزرگوں کو ڈانٹ دیا۔ کہ تم دونوں تو شیعہ ہو۔ تم سنّیوں کی ترجمانی اور خلافت کی حمایت کا کیا حق رکھتے ہو۔ سید صاحب کو اس ڈانٹ پر رنج تو ہوا لیکن انھوں نے کہا کہ ''مجھے خوشی ہے کہ میں نے شیعہ ہونے کے باوجود سنّی بھائیوں کی ترجمانی کے لیے ڈانٹ کھائی ہے۔''

اگرچہ سید امیر علی کو سرسید کی تحریک سے کبھی تعلق نہیں رہا لیکن چونکہ انھوں نے اسلام کی مدافعت اور مسلمانوں کی خدمت بالکل انھی اصول و اساسات پر کی جو سرسید نے پیش نظر رکھے تھے۔ اس لیے ہم سید امیر علی کو بھی اسی حلقۂ رجال میں شامل سمجھتے ہیں جس نے گزشتہ صدی کے اواخر میں مسلمانان ہند کو بیدار کیا۔ اور ان کی ذہنی، اخلاقی، دینی اور معاشرتی ترقی و اصلاح کے لیے سرگرم کار رہے۔

چوتھی فصل: مسلم ثقافت کے محافظ گزشتہ تین صدیوں میں

مسلمانوں کی ثقافت کی بنیادیں اسلام کی مستقل تہذیبی و اخلاقی اقدار پر استوار ہوئی ہیں۔ جب تک معاشرہ ان اقدار کا پابند رہتا ہے۔ ثقافت پھولتی پھلتی رہتی ہے۔ اور اس کے عقلی اور حیاتی پہلو سکون و جمود کا شکار نہیں ہونے پاتے۔ لیکن جب ان قدروں کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے تو پورا نظام معاشرت متزلزل ہونے لگتا ہے۔ اخلاق، اقتصاد، ادب، ذہنی نشو و نما اور روحانی ارتقا کے سوتے خشک ہوجاتے ہیں۔ اور ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آنے لگتی ہے۔ یاس و نومیدی کے اس عالم میں یکایک کسی گوشے سے ایک نئی آواز بلند ہوتی ہے۔ جس کا نغمہ ملت کے بہی خواہوں کے لیے بہشت گوش بن جاتا ہے۔ دینی و اخلاقی، ذہنی و تہذیبی اقدار از سر نو زندہ ہوجاتی ہیں۔ نئی آواز چونکہ نئے تقاضوں اور نئے ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لیے سب اس کی دل کشی اور افادیت سے مسحور ہوجاتے ہیں۔ اور قلوب و اذہانِ انسانی میں ''دین پھر زندہ ہوجاتا ہے۔'' اسلام میں سلسلۂ مجدّدین کا وجود اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ دین ہمیشہ تجدید و احیا کی زندگی بخش تحریکوں سے حیات تازہ حاصل کرتا رہا ہے۔ اور اس کی ازلی ابدی چمک دمک اور

پاکیزگی کا راز بھی یہی ہے۔

ہندوستان میں جب تک مغل نہ آئے تھے۔ سلاطین و امراء اور ان کے لگے بندے سیدھے سادے مسلمان تھے۔ ان کے علما و مشائخ کو حیات ملی پر پورا قابو حاصل تھا۔ ایک خاصی مدت تک ہندوستان کی سلطنت خلافت اسلامی کی مرکزیت کے آگے سرنجم رہی۔ عقائد کی پختگی نے ہر قسم کے فتن کی رفتار کو روکے رکھا۔ زندگی ایک رواں دواں آبجو کی طرح اپنے کناروں کے اندر چلی جارہی تھی۔ بابر اور رہمایوں بھی چونکہ جفاکش اور سپاہی تھے۔ ان کے رفقا و احباب کی کیفیت بھی یہی تھی۔ اس لیے اسلام اور اس کے علما و مشائخ کا بول بالا تھا۔ ملک بھر میں عالی شان درسگاہیں قائم تھیں اور بڑے بڑے جلیل القدر معلمین دنیا بھر کے علوم وفنون کی تعلیم دے رہے تھے۔

جلال الدین اکبر کے عہد کی ابتدا بھی غنیمت تھی۔ لیکن بعد میں دنیا پرست مولویوں کی کشمکش اور دوسرے مختلف عوامل کے ماتحت بادشاہ ملحد و زندیق ہوگیا اور اس کے بڑے بڑے فاضل درباریوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اسلام کے استخفاف کا ذوق عام کردیا۔ بلاشبہ مسلم ثقافت کی بہت سی شاخیں اکبر کے عہد میں برگ و بار لاکر اس برصغیر کی زینت کو بڑھا رہی تھیں لیکن یہ سرسبزی و شادابی چند روزہ معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ جڑوں میں الحاد اور بے یقینی کی دیمک لگ چکی تھی۔ بعض علما نے اس زمانے میں بھی اپنے معاشی و معاشرتی مستقبل کو پھونک کر ماحول کے خلاف آواز بلند کی لیکن دربار شہنشاہی کے اثر و اقتدار کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلی۔ اور وہ اپنے زاویوں ہی میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ آخر جہانگیر کے زمانے میں وہ جلیل القدر پیکر عزیمت پیدا ہوا جس کو دنیا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نام سے جانتی ہے۔ اس بزرگ نے نہایت جرأت و جسارت سے کام لے کر شریعت اسلامی کی عزت آبرو کا علَم بلند کیا۔ خلاف شرع اور کافرانہ اعمال کے خلاف سختی سے احتجاج کیا۔ وحدت الوجودی تصوف اور اس کے متعلقات کی تردید کی۔ اور طریقت کو ایک نئے راستے پر گامزن کیا۔ جو حقیقت میں شریعت ہی کا راستہ تھا۔ غیر مسلموں کی ناواجب حوصلہ افزائی کو جس سے اسلام کی تذلیل ہو بے غیرتی قرار دیا۔ یہاں تک کہ ارباب اقتدار تجدید کے اس کوہ شکن نعرے کی تاب نہ لاسکے۔ اور حضرت مجدد کو قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ مسلم معاشرے پر اس کا کوئی دوررس اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ لیکن کچھ عرصے ہی میں دربار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ حضرت مجدّد صاحب کی رہائی اور ان کی

شریعت پرور شرائط کی منظوری سے اسلام کا وہ وقار از سرِ نو بحال ہوگیا۔ جو جہانگیر کے والد کے زمانے میں پیوندِ خاک ہو چکا تھا اور ملک میں زعمائے فکر اور اہل علم کو اپنی مساعی میں ''سرکارِ تجدید'' کی حمایت حاصل ہوگئی۔

شریعت کی آبرو کو بحال کرنے کے لیے صرف درس و وعظ کا حربہ ہی کافی نہ تھا۔ بلکہ زیادہ مؤثر قوت درکار تھی۔ چنانچہ قدرت نے اس کا انتظام بھی کر دیا کہ ۱۶۲۴ء میں حضرت مجدد صاحب کا وصال ہوا اور ۱۶۵۷ء میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔ جنھوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے احیائے شریعت کا فرض بوجہ احسن انجام دیا۔ اس سلسلے میں ان کے کارناموں سے تاریخ معمور ہے۔ بیان کی حاجت نہیں اور ابھی اس شاہ شریعت پناہ کی وفات میں چار سال باقی تھے کہ حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوگئے جنھوں نے اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھ لیا کہ مسلم معاشرہ کس طرف گامزن ہے۔ سلطنت اسلامی کس گڑھے کی طرف اندھا دھند بڑھی چلی جارہی ہے۔ اور فکر اسلامی کو آئندہ کس قسم کی رہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پوری زندگی کو کورانہ تقلید کی مخالفت، مجتہدانہ نقطۂ نگاہ کی حمایت، فقہ اور تصوف کی اصلاح اور ملت کی مجلسی و اقتصادی بہبود کے وسائل بتانے میں صرف کر دی اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ مسلمان قوم اپنے زمانۂ انحطاط میں بھی ایک مفکرِ اعظم کو جنم دے سکتی ہی۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان نے مسلمانوں کے اذہان کی صفائی اور تربیت میں جو کام کیا اس کا ذکر کسی گزشتہ فصل میں کیا جا چکا ہے۔ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے روحِ جہاد تازہ کی۔ ملت کو سخت کوشی کا سبق دیا۔ جس کو وہ صدیوں سے فراموش کر چکی تھی۔ ملت کے سیاسی اقتدار کو واپس لانے کی جدوجہد میں اپنی جانیں ہنسی خوشی نثار کر دیں۔ غرض ان بزرگوں نے اس صنم خانۂ ہند میں اسلام کے عقائد، اعمال، افکار اور ثقافتی اقدار کو محفوظ کر دینے میں جس ہمت و عزیمت کا ثبوت دیا۔ اس کی مثالیں دور دور تک نایاب ہیں۔ یہی وہ سلسلۂ ولی اللّٰہی تھا جو شاہ عبدالعزیز و شاہ اسحاق کے بعد حاجی امداد اللہ مکی، مولانا مملوک علی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا محمود الحسن شیخ الہند کی برکات سے دارالعلوم دیوبند کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس میں برصغیر کے بیسیوں جلیل القدر اور روشن دماغ علماء نے تعلیم پائی اور جو ''کورانہ تقلید'' اور ''کھلے اجتہاد'' کے درمیان ایک مسلک اوسط کا علمبردار بنا۔

انگریزوں کے ورود کے بعد مسلمان نوجوانوں کا ایک نیا طبقہ معرضِ وجود میں آیا جو انگریزی کے چار لفظ پڑھ کر اسلام کے اکثر مسلمات و عقائد سے بدعقیدہ ہو رہا تھا۔ انگریز اپنے مصنفوں کی کتابیں دھڑا دھڑ پھیلا رہے تھے۔ ان کے مشنری جابجا اپنے لیکچروں سے بے خبر اور جاہل مسلمانوں کو دین اسلام سے بدظن کرنے میں مصروف تھے۔ یہ ایک نیا خطرہ تھا اور سب سے بڑا خطرہ۔ کیوں کہ مسلم سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ کفر برسر اقتدار ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آنے لگیں۔ اس زمانے میں سرسید احمد خاں اور ان کے ہم خیالوں نے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی۔ یہ معلوم ہے کہ فلسفۂ یونان کی کتابوں کے تراجم شائع ہونے کے بعد مسلمانوں کے اذہان اسلام کے عقائد کی طرف سے سوِظن اور تشکک میں مبتلا ہو گئے تھے اور علما نے اس کے توڑ کے لیے علم الکلام ایجاد کر کے بعض عقائد یونانی کو فلسفہ یونانی کے مطابق ثابت کر دیا۔ اور بعض عقائد یونانی کو جو اسلام کے صریحاً خلاف تھے۔ اپنے زور استدلال سے باطل ثابت کر کے تارِ عنکبوت کی طرح ہوا میں اڑا دیا۔ اسی طرح اب سرسید اور ان کے رفقا مغرب کے نئے فلسفے کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اگرچہ یہ لوگ نہ تو اس تبحر علمی کے سرمایہ دار تھے جو متکلمین اسلام کو حاصل تھا۔ اور نہ اس جرأت کے مالک تھے کہ فلسفۂ مغرب کے بعض اباطیل سے ٹکرا کر انھیں لاشئے محض ثابت کر دیں۔ لیکن بہرحال سرسید احمد خاں، سید امیر علی، مولوی چراغ علی وغیرہم نے اپنی بساط بھر خوب کام کیا۔ اسلام کے بعض عقائد و مسلمات کی تاویل سائنس سے کی۔ اسلام کے خلاف جو کتابیں یورپ کے متعصب مصنفوں نے لکھی تھیں۔ ان کے دندان شکن جواب لکھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان بزرگوں کی مساعی سے ہزاروں تشکک اور آمادۂ ارتداد نوجوان متنبہ ہو گئے جن کو مولویوں کی غیر معقول باتوں نے اسلام سے بدظن کر دیا تھا۔ لیکن سرسید احمد خاں کی تصانیف نے انھیں دوبارہ اسلام پر قائم کر دیا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے نہایت شدومد سے ثابت کیا کہ اسلام سائنس کا حامی ہے اور انسان کو قوائے کائنات کی تسخیر کی تلقین کرتا ہے۔ اور اس سے بھی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو بڑا اطمینان ہوا۔ اور ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جو جدید فلسفۂ حکمت کی زبان میں اسلام اور اس کے حقائق کی تبلیغ کرنے لگی۔ سرسید اور ان کے معتقدین و مقلدین نے ملک کے گوشے گوشے میں تعلیم و تہذیب پھیلانے کا کام جس دردمندی اور سرعت کے ساتھ کیا۔ اس کی مثال نہیں۔ گویا انھوں نے صرف متشکک مسلمان نوجوانوں کے عقائد ہی درست نہیں کیے بلکہ ان

کی مجلسی و معاشی حالت کو بھی بہتر بنایا۔ اور ان کے اور ارباب حکومت کے درمیان شکوک و شبہات کا سدِّ باب بھی کر دیا۔

شمس العلماء مولوی ممتاز علی نے ''تہذیب نسواں'' جاری کر کے اور تعلیم نسواں کے لیے بے شمار کتابیں چھاپ کر اپنی پوری زندگی بچیوں کی تعلیم میں بسر کر دی اور حقیقت میں مسلم ثقافت کے بہت بڑے خدمت گزار ثابت ہوئے۔ مولوی صاحب کے کام کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عالم ہونے کی وجہ سے علی العموم مسائلِ نسوانی میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے تجاوز نہ کرتے تھے اور آج کل کی سی ''مادر پدر آزادی'' کے روادار نہ تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانانِ ہند کی وہ حسیّات بطورِ خاص بیدار ہوئیں جو ''اتحاد عالم اسلامی'' سے متعلق تھیں۔ چوں کہ مسلمانانِ ہند خود محکوم ہو چکے تھے۔ اس لیے اپنے ان بھائیوں کے بے حد خیر خواہ اور دعا گو رہتے تھے۔ جو نسبتاً آزاد تھے۔ مثلاً ترک، ایرانی، افغان وغیرہ۔ طرابلس و بلقان اور جنگ عظیم اول میں چونکہ سلطنت عثمانیہ (جو خلافت عثمانیہ بھی تھی) شامل تھی اور برطانیہ اس سلطنت کا مخالف تھا۔ اس لیے یہاں کے مسلمانوں میں اخوت اسلامی کا جذبہ بے حد تیز ہو رہا تھا۔ اسی فضا میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر انصاری اور بعض دوسرے بزرگ قید و بند سے بے پروا ہو کر مسلمانوں کو اخوت و اتحاد اسلامی کے جذبات سے سرشار کر رہے تھے۔ اور اسلام کی بین الاقوامی سیاست بروئے کار آ رہی تھی۔ انگریزوں نے اس تحریک کو جس قدر شدت سے دبایا۔ یہ اسی شدت سے ابھری۔ مولانا محمد علی کا انگریزی ہفتہ وار ''کامریڈ'' انگریزی دان مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بے نظیر ہفتہ وار ''الہلال'' عربی و فارسی جاننے والوں کے نزدیک صحیفۂ آسمانی سے کم محترم نہ تھا۔ اور مولانا ظفر علی خاں کا روزنامہ ''زمیندار'' عامہ مسلمین کی پر جوش رہنمائی کر رہا تھا۔

غرض اس گفتگو سے یہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے آغاز سے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک یعنی حضرت مجدد الف ثانی کے ظہور سے جنگ عظیم اول تک اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں مسلم معاشرے کی اصلاح، مسلم ثقافت کی تحسین وتہذیب، عقائد اسلامی کی تاویل و تفسیر اور جذبات و حسیّاتِ اسلامی کی تقویت کے لیے ایسے اکابر کو پیدا کرتا رہا ہے جنھوں نے اپنے اپنے زمانے کے احوال و ظروف کے پیش نظر احیائے اسلام اور تجدید معاشرہ کے فرائض انجام دیے اور

ملت کی ظاہری و باطنی شان کو قائم رکھا۔ یہی ایک امر اس حقیقت کا مظہر ہے کہ اسلام اور اس کی ثقافت آئندہ بھی روز افزوں درخشانی و تابانی کے ساتھ جلوہ گر رہے گی۔ اور ہر زمانے میں اس کے موزوں و مناسب خدمت گزار پیدا ہوتے رہیں گے۔

ہمارے زمانے میں ایک اور نابغۂ روزگار پیدا ہوا جس کو حکیم الامۃ، ترجمان حقیقت علامہ اقبال کہتے ہیں۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ اسلام کی فکری و ذہنی حمایت کرنے والے دو صفوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک وہ جو پرانے معیاروں پر علوم دین کی اشاعت کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو فرنگی دور کے تشکک کا مقابلہ کرنے کے لیے عقائد اسلامی کی تاویلات مغربی فلسفہ و سائنس کی روشنی میں کرتے تھے۔ اقبال اس زمانے میں ''مجمع بحرین'' تھا۔ وہ ایک طرف ''پیران مشرق'' کی نگاہ کا فیض یافتہ اسلام اور شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق صادق اور علوم دین پر گہری نگاہ رکھنے والا تھا اور دوسری طرف مغربی علم و حکمت سے پوری طرح مستفید۔ متعدد یورپی زبانوں کا ماہر۔ اور مغرب کی ذہنی تحریکات سے پوری طرح واقف تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا قلب سوز و گداز سے منور۔ مسلمانوں کے درد سے معمور اور عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متاع سے بہرہ ور تھا۔ اور ملت کے تمام قومی، بین الاقوامی، ذہنی، فکری، سیاسی، ادبی مسائل اس کے سامنے تھے۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس دور الحاد میں جو ہزاروں مسلمان نوجوان اسلام اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے لیے غیرت و حمیت رکھتے تھے۔ وہ سب اقبال ہی کے ''حلقۂ سخن'' میں زیر تربیت رہے ہیں۔ اقبال کسی الحاد زدہ متشکک نوجوان کو چند کلمات میں مطمئن کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے افکار اور حسیات دونوں پہلوؤں سے اسلام کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ ایک عالم دین اور فلسفی کی حیثیت سے وہ مسلمانوں کے افکار کی رہنمائی بوجہ احسن کرسکتا تھا اور ایک شاعر عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، صوفی منش، صاحبِ وجدان ہونے کے اعتبار سے اس کے کلمات دلوں پر بجلی کی طرح گرتے تھے۔ اور آنکھیں بادل کی طرح پانی برساتی تھیں۔

علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی اور ان کے دوسرے افکار و خیالات پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ان کی اردو اور فارسی کی شاعری ہندو پاک اور بیرونی ممالک سے ہزار دفعہ خراج تحسین وصول کرچکی ہے۔ ان کے چھ لیکچر جو ''تشکیل الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے موسوم ہیں۔ اور جن کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوکر غالباً زیر طبع ہے۔ یہ ترجمہ دینیات اسلامی اور مابعد الطبیعیات کی نہایت ... معارف و غوامض اردو خوانوں کے سامنے بے نقاب کر دے گا۔

اس کتاب میں علامہ اقبال کی تصنیفات پر کوئی تفصیلی باب لکھنا مقصود نہیں کیونکہ:

۱۔ کسی مصنف پر تفصیلی تنقید لکھنا اس کتاب کے دائرے سے باہر ہے۔

۲۔ علامہ کے افکار پر بے شمار مقالات اور بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

۳۔ راقم الحروف بھی علامہ کی سوانح عمری ''ذکر اقبال'' کے نام سے لکھ چکا ہے۔

جن حضرات کو اس عظیم الشان ثقافتی خدمت کا اندازہ کرنا ہو۔ جو اس برصغیر میں علامہ اقبال سے ظہور میں آئی۔ انھیں چاہیے کہ تصانیف اقبال کو ان کی اشاعت کی ترتیب کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ایسا عالی پایہ حکیم، شیوا بیان شاعر اور مخلص خادم اسلام ہمارے زمانے میں بالکل مفقود ہے۔ اقبال حقیقت میں صرف دنیائے اسلام ہی کی نہیں پوری دنیا کی ایک ثقافتی متاع ہے اور پاکستان اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

پانچویں فصل: مسلمانوں میں سیاسی بیداری

خدا کی شان دیکھو۔ جس قوم نے ہندو قوم پر ایک ہزار سال تک نہایت جاہ و جلال سے حکومت کی۔ آخر ایسی منزل پر پہنچ گئی کہ اس کو خود اپنے وجود کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔ وہ ہندو جاتی جس کو مسلمانوں نے تہذیب و ثقافت سے مالا مال کر کے مہذب قوموں کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا۔ اب شب و روز اس فکر میں رہنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح انگریزوں کو اپنا سرپرست بنا کر ہندوستان کے اندرونی کاروبار حکومت پر قابض ہو جائے اور مسلمانوں کو انگریز اور ہندو کی دوگونہ غلامی کی چکی میں پیس کر بالکل بے نشان کر دے۔ ہندو سلطنت مغلیہ کے دور آخر ہی سے اپنے راج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ شاہجہان کے عہد میں دکن کی چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتیں بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ ان میں سے بیجاپور کے ایک مرہٹہ رئیس کے بیٹے شیوا جی نے حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ادھر ادھر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔ جب مختلف حیلوں بہانوں سے اسے کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی تو وہ ہندو دھرم اور گائے کی حفاظت کا علم بردار بن کر ایک ہندو سلطنت قائم کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ اور جب اس نیت سے مغل علاقوں کی طرف پیش قدمی کرنے لگا تو حکومت کے ایک منظم لشکر نے اس کی بغاوت کا استیصال کر دیا۔ شیوا جی بے دست و پا ہو کر مغل بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے معافی دے کر اس کی جاگیر بحال کر دی۔ آخر میں اس نے مہاراجا کا لقب اختیار کر لیا۔ اور ہندوؤں کا بڑا ہیرو قرار پایا۔

یہاں تک کہ نیشنل کانگریس کے ایک بہت بڑے لیڈر بال گنگا دھر تلک نے اس کو ہندو جاتی کا بہت بڑا ممتاز ہیرو بنا کر مہاراشٹر میں اس کی تصویر کی پوجا شروع کرادی۔ حالاں کہ اس کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار رہا تھا۔ اسی ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کی قوم پرستی کا طول وعرض کیا تھا۔ اور تحریک آزادی وطن کے پردے میں وہ متحدہ قومیت کا نہیں بلکہ ہندوؤں کا راج قائم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ لیکن جب یہ ہنگامہ ناکام ہوا تو انگریزوں کا سارا عتاب مسلمانوں پر نازل ہوگیا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے سلطنت مسلمانوں ہی سے چھینی ہے۔ اور انھیں اسی قوم کی جہاد آرائی اور نبرد آزمائی سے خطرہ ہے۔ ہندوؤں نے انتہائی ہوشیاری سے کام لے کر مسلمانوں کو تعزیر کا نشانہ بنانے میں انگریزوں کی طرفداری کی۔ مسلمانوں کے عہدے، ان کی جاگیریں، ان کے مناصب سب چھن گئے۔ ان کے شہزادے قتل کیے گئے۔ بے شمار مسلمانوں کو موت اور عبور دریائے شور کی سزائیں دی گئیں۔ ان کا آخری بادشاہ جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ سلطنت تو مٹی ہی تھی مسلمان معاشرہ بھی خستہ حال اور بے دست و پا ہوگیا اور ہندو روز بروز حکمرانوں کے محبوب بنتے گئے۔ اب گویا یہ صورت پیدا ہوئی کہ مسلمان انگریزوں سے عدم تعاون پر کاربند ہوگئے۔ اور ہندو انگریز کے دست و بازو بن گئے۔ انگریزی تعلیم حاصل کر کے تمام ملازمتوں پر قبضہ جمالیا۔ اور انگریزی اقتدار کی بنیادوں کو استوار کرنے اور مسلمانوں کے اقتدار کو بے نشان کردینے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

ہندوؤں کی اقتصادی حالت مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بھی بہت اچھی تھی۔ کیونکہ مسلمان ہمیشہ فوجی اور دیگر سرکاری ملازمتوں اور زراعت وغیرہ کے مشاغل میں مصروف رہے۔ اور تجارت تمام تر ہندوؤں کے قبضے میں رہی۔ انگریزی راج میں ہندوؤں کا اقتصادی تسلط اور بھی بڑھ گیا۔ سودی کاروبار پر کوئی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے مہاجنی کا جال سارے ملک میں پھیلا دیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کے پاس جو بچی کھچی جائیدادیں موجود تھیں وہ ہندوؤں کی سودخواری کی نذر ہوگئیں۔ بنگال، سندھ، یوپی، پنجاب کی زمینداریوں اور جاگیروں کا بہت بڑا حصہ ہندو مہاجنوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اور مسلمانوں کی بدحالی انتہا کو پہنچ گئی۔

سرسید احمد خاں نے اسی تباہی سے متاثر ہوکر اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اور غیروں سے زیادہ اپنوں کی مخالفت نے قدم قدم پر ان کا راستہ روکا۔ لیکن یہ بندۂ خدا اپنے عزم پر مضبوطی سے

قائم رہا۔ اور مسلمانوں کی ذہنی تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی اصلاح میں مصروف ہوگیا۔ تاکہ مسلمان ملکی حقوق میں اپنا حصہ سنبھالنے کے اہل ہوجائیں۔ جب مسلمانوں نے تعلیم کے حصول پر اپنی توجہ مرتکز کردی۔ اور ہندوؤں کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا تو انھوں نے نیابتی اور نمائندہ میں جو اس وقت تک منصۂ شہود پر آچکے تھے۔ مخلوط انتخاب منظور کرایا۔ جس کی وجہ سے ان اداروں کے دروازے مسلمانوں پر عملاً بند ہوگئے۔ کیوں کہ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اور ان سے یہ توقع نہ کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے ووٹوں سے کسی مسلمان کو منتخب کرائیں گے۔

۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس قائم کی گئی۔ اس کے بانی انگریز تھے۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت بھی ایک انگریز ہی نے کی۔ اور ہندو اس میں جوق در جوق شامل ہوئے کہنے کو یہ جماعت ہندوستانیوں کی تھی لیکن اس پر قبضہ ہندوؤں کا تھا۔ جو مسلمانوں کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں بے انصافی کر رہے تھے۔ ان حالات سے متاثر ہوکر سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کانگریس میں کتنے ہی مسلمان شامل ہوجائیں وہ ہندو اکثریت کے مقابلے میں کوئی حیثیت حاصل نہیں کرسکتے۔ آخر ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک نے سر آغا خاں کی سرکردگی میں اکابر اہل اسلام کا ایک وفد مرتب کیا۔ جس نے لارڈ منٹو وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوکر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ تاکہ مسلمان اپنے ووٹوں سے منتخب ہوکر نیابتی ادارت میں جاسکیں۔ اسی سال ڈھاکا میں ایک جلسے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ اگرچہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں کوئی بیس سال بعد سیاسی میدان میں آئے لیکن انھوں نے بہت جلد اپنے جوشِ عمل سے فرائضِ اسلامی اور فرائضِ وطنی کی بجا آوری کا بہترین ثبوت مہیا کردیا۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن وائسرائے نے نظم ونسق کی سہولت کے لیے صوبہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ جس سے مشرقی بنگال کی مسلم اکثریت کی حالت بہتر ہوجانے کی توقع ہوگئی۔ لیکن اس امکان کو صرف چند روشن خیال اور دانشمند مسلمان ہی محسوس کرتے تھے۔ عوام کو اس امر کا کوئی احساس نہ تھا۔ ہندو اس تقسیم پر بے حد جوش میں بھر گئے۔ کیوں کہ وہ ملک کے کسی گوشے میں مسلمانوں کی حالت بہتر ہوجانے کے روادار نہ تھے۔ انھوں نے بے حد پرزور شورش برپا کی اور کانگرس کے رہنماؤں نے بھی اس شورش میں حصہ لیا۔ آخر حکومت نے گھبرا کر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کردیا۔ اس وقت مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ نواب سر سلیم اللہ خاں

(ڈھاکا) نواب وقار الملک نے اس فیصلہ تنسیخ پر نہایت شدت سے احتجاج کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور مسلمانوں کے قلوب میں حکمرانوں کے خلاف بے حد نفرت اور تلخی پیدا ہوگئی۔

اسی زمانے میں طرابلس اور بلقان کی جنگیں پیش آئیں۔ خلافت عثمانیہ کو جو دنیا بھر میں مسلمانوں کا واحد سیاسی مرکز تھی۔ اٹلی، ریاست ہائے بلقان اور یورپ کی حکومتوں نے بے حد تنگ کیا۔ حکومت برطانیہ واضح طور پر دشمنانِ ترکی کی ہمدرد تھی۔ لیکن اب مسلمان وہ پرانے دہشت زدہ اور حواس باختہ مسلمان نہ رہے تھے۔ انھوں نے نہایت بے باکی سے حکومت برطانیہ کے اس رویّے کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ ترکوں کی مالی، قلمی، لسانی امداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اسی دور میں انھوں نے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد ترکی بھیجا۔ جس سے مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ ترکی کے درمیان برادرانہ تعلقات از سرِ نو قائم ہوئے۔

۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی ایک مسجد کا ایک حصہ وہاں کی میونسپل کمیٹی نے گرا دیا۔ کیوں کہ ایک سڑک سیدھی کرنا مقصود تھا۔ مسلمان خانہ خدا کی اس بے حرمتی پر آپے سے باہر ہوگئے۔ انھوں نے منہدم شدہ حصے کا ملبہ اٹھانا شروع کیا۔ پولیس نے روکا۔ لیکن وہ نہ رکے۔ آخر فوج طلب کی گئی۔ اور نہتے ہجوم پر گولی چلا دی گئی۔ جس سے بے شمار فرزندانِ اسلام شہید اور مجروح ہوئے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان اس حادثہ سے بے حد متالّم ہوئے۔ لیکن کانگریس نے جسے ہندوستانیوں کی قومی جماعت ہونے کا دعویٰ تھا۔ مسلمانوں کی اس مظلومی کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ حالاں کہ طرابلس و بلقان اور مسجد کے معاملات کا کوئی مضر اثر ہندوؤں پر نہیں پڑتا تھا۔ لیکن چونکہ ہندو مسلمانوں کے جوشِ ایمان کے روادار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے ان سے ہمدردی کا اظہار تک نہ کیا۔

اس زمانے میں ذبح گاؤ پر ملک کے متعدد مقامات پر بلوے ہوئے۔ جن میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے انتہائی وحشت و بربریّت کا برتاؤ کیا۔ ہردوار کے قریب کٹارپور میں بیس مسلمان زندہ جلا دیے گئے۔ اور اعظم گڑھ (یوپی) اور بہار میں بھی ایسے ہی افسوسناک حالات پیش آئے۔ کانگریس کے رہنماؤں اور دوسرے ہندوؤں نے ہندو غنڈوں کی ان حرکات کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی جس میں حکومت ترکی برطانیہ کے خلاف صف آرا تھی۔ چوں کہ مسلمان سلطان ترکی کو مسند رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث اور دنیا بھر کے

مسلمانوں کا خلیفہ مانتے تھے۔ اس لیے برطانیہ کے خلاف ان کے قلوب میں انتہائی عناد پیدا ہوگیا۔ مولانا محمد علی نے ''ترکوں کی پسند'' کے عنوان سے اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا جو ''لندن ٹائمز'' کے ایک مقالے کا جواب تھا۔ حکومت ہند نے مولانا محمد علی کو پہلے مہرولی میں پھر چھندواڑہ اور بیتول (سی پی) میں نظر بند کردیا۔ اور ان کے اخبار بند ہوگئے۔ مولانا ظفر علی خاں کرم آباد میں نظر بند کردیے گئے۔ اور ''زمیندار'' بھی بند ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' بھی بند ہوگیا۔ اور مولانا بھی نظر بند کردیے گئے۔ ان کے علاوہ متعدد دیگر غیور مسلم خادمانِ قوم بھی نشانۂ تشدّد بنائے گئے۔

دورانِ جنگ میں ہندوستان کو مزید سیاسی اصلاحات دینے کا سروسامان شروع ہوا۔ تو لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں کے موقع پر ''میثاق لکھنؤ'' مرتب ہوا۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔ پرجوش اور سیاست فہم لیڈر تو نظر بند تھے۔ لیکن دوسرے حضرات نے یہ سمجھ کر کہ ہندو لیڈر کسی مفاہمت پر آمادہ ہیں۔ اس میثاق پر دستخط کردیے۔ اس میثاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم اقلیت کے صوبوں کو زائد از استحقاق کچھ نشستیں مل گئیں۔ جو بالکل بے سود تھیں۔ اور پنجاب اور بنگال کی اکثریت زائل ہوگئی۔ یعنی جب ۱۹۲۱ء میں اصلاح شدہ کونسلیں قائم ہوئیں تو انگریزوں اور سرکاری افسروں کا حصہ علیحدہ ہوجانے سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کا تناسب ۴۲ فیصد اور بنگال کونسل میں صرف ۲۲ فیصدی تھا۔ حالاں کہ دونوں صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی ۵۶۔ اور ۵۴ فیصدی تھا۔

۱۹۱۸ء کے اواخر میں جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ ترکی شکست کھا کر بدحال ہوگیا۔ خلیفۃ المسلمین انگریزوں کی قید میں تھے۔ ترکی پر اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ مصالحت کی گفت وشنید کے بعد معاہدۂ سیورے ہوا۔ جو ترکوں کے لیے پیامِ اجل تھا۔ ادھر ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ہڑتالیں کرائیں۔ جابجا فسادات ہوئے۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کی گولیوں نے کم وبیش دو ہزار ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کو ہلاک و زخمی کیا۔ پنجاب کے متعدد شہروں میں مارشل لا نافذ کردیا گیا۔ اور عوام کی مظلومی انتہا کو پہنچ گئی۔ ۱۹۱۹ء کے آخر میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس ہوئے اس وقت مسئلہ خلافت اور مظالم پنجاب کی وجہ سے بظاہر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بے حد خوشگوار ہوگئے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، اور مولانا ظفر علی خاں نظر بندی سے رہا ہوکر امرتسر پہنچ گئے۔ گاندھی جی کو سب

قوموں نے اپنا رہنما تسلیم کیا۔ اور گاندھی جی نے کانگریس میں خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کے جذبات کی تائید کا ریزولیوشن پاس کرایا۔ ۱۹۲۰ء کے اگست میں ملک کے لیڈروں نے جن میں ہندو مسلمان اور علمائے کرام بھی شامل تھے۔ ترک موالات یا عدم تعاون کا فیصلہ کیا اور پورا ملک تحریک حریت وطن کے غلغلے سے گونج اٹھا۔

ترکِ موالات کے پروگرام میں انگریزی درسگاہوں، انگریزی عدالتوں، انگریزی کونسلوں اور انگریزی ملازمتوں کے مقاطعہ پر زور دیا گیا۔ تقریباً ایک لاکھ ہندوستانی جن میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جیل خانوں میں چلی گئی۔ مسلم رہنما بھی جو ۱۹۱۹ء کے آخر میں نظر بندی سے رہا ہوئے تھے۔ دوبارہ جیل خانوں میں بھیج دیے گئے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ کانگرس کو اس دور میں جو قوت و اہمیت حاصل ہوئی۔ وہ سب محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حسین احمد اور دوسرے بے شمار اکابر ملت کی قوت عمل کی ممنون احسان تھی۔ جن کو آج کل کا ہندوستان بالکل فراموش کر چکا ہے۔ اور ایک آدھ زندہ لیڈروں کے سوا (مولانا ابوالکلام اور مولانا حسین احمد) باقی سب کی یاد کو ہمیشہ کے لیے دفن کیے بیٹھا ہے کیونکہ ''بدقسمتی'' سے وہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے علمبردار تھے۔ اور یہ زندگی ہندوؤں کے نزدیک سخت ناپسندیدہ چیز تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مسئلہ خلافت میں ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کی جو تائید کی تھی وہ اس احساس کے ماتحت تھی کہ مسلمانوں کا آخری سیاسی سہارا یعنی ترکی تو ختم ہو چکا ہے اب وہ دوبارہ کیا زندہ ہوگا۔ اس لیے اس وقت مسلمانوں کی تائید ''مفت کرم داشتن'' کی مترادف ہوگی۔ لیکن جب غازی اتاترک کی شمشیر خار اشگاف نے چند ہی مہینے کے اندر فتح مند اتحادیوں کی تمام کامرانیوں کو خاک میں ملا کر ترکوں کو حیات تازہ بخش دی۔ تو پنڈت مالوی جیسے اکابر ہنود چونک اٹھے۔ اور انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو جسے وہ ہندو راج کے منصوبے میں حائل سمجھتے تھے ختم کر دینے کا عزم کر لیا۔ اور سنگھٹن اور شدھی کے فتنے کھڑے کر دیئے۔ سنگھٹن کا مقصد یہ تھا کہ ہندو قوم مضبوط اور متحد ہو جائے۔ اور شدھی کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندو بنایا جائے۔ سوامی شردھانند نے آگرہ کے آس پاس ملکانہ راجپوتوں کو وسیع پیمانے پر آریہ بنانے کی مہم شروع کر دی۔ پس پھر کیا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد خواب و خیال ہو گیا۔ فرقہ وار فسادات کے شعلے ملک بھر میں بلند ہونے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظیم الشان اور مقدس شخصیت کے خلاف گالیوں

سے بھری ہوئی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ غرض مسلمانوں کی دل آزاری اور اشتعال انگیزی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔

گاندھی جی جیل میں تھے۔ جب رہا ہوئی اور ان سے سنگھٹن اور شدھی کی شکایت کی گئی تو انھوں نے کہا ''مسلمان دنگئی اور ہندو بزدل ہے۔ میں ان میں کیونکر مفاہمت کرا سکتا ہوں۔ اب تو کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں۔'' مولانا محمد علی اور دوسرے مسلمان رہنما بے حد کوشش کرتے رہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح حالات درست ہو جائیں۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اتنے میں مزید اصلاحات کے لیے ''سائمن کمیشن'' مقرر ہوا۔ تو پھر تصفیۂ حقوق کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی خاصی تعداد نے کمیشن سے مقاطعہ کیا اور کوششیں ہونے لگیں۔ کہ ایک متحدہ دستور وضع کر کے حکومت برطانیہ کو بھیج دیا جائے۔ سیاسی جماعتوں کی ایک کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔ لیکن کئی روز کے بحث مباحثہ کے بعد لیڈر کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔

گاندھی جی نے دستور وضع کرنے کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کر دی۔ اس کمیٹی نے جو مسودہ مرتب کیا اس کو نہرو رپورٹ کہتے ہیں۔ اس میں آزادئ کامل کی بجائے درجۂ نوآبادیات نصب العین مقرر کیا گیا۔ مرکز میں حکومت کو قوی اور مسلط رکھا گیا۔ تجارت میں انگریزوں کے حقوق کی حفاظت کی گئی۔ لیکن مسلمانوں کے تقریباً تمام مطالبات غارت کر دیئے گئے۔ جن میں بعض پر نہایت کڑی شرطیں لگا دی گئیں۔

ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اس مسودۂ دستور کی مخالفت کی۔ مسلم لیگ اور مجلس خلافت اور جمعیۃ العلما جو اب تک کانگریس کا دم چھلا بنی ہوئی تھیں۔ کانگرس سے بالکل باغی ہو گئیں اور نہرو رپورٹ کے خلاف پورا اسلامی ہند متفق ہو گیا۔ مولانا محمد علی بیمار ہو کر علاج کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر انھوں نے نہرو رپورٹ کو پڑھا تو فرمایا کہ اس دستاویز کا مفاد یہ ہے:

''خلقت خدا کی۔ ملک انگریز کا۔ حکم ہندو سبھا بہادر کا۔''

لکھنؤ میں مسلم جماعتوں کا جو اجلاس ہوا۔ اس نے بھی نہرو رپورٹ کی پرزور مخالفت کی۔ لیکن گاندھی جی اور کانگریسی لیڈر اس میں ذرہ برابر ترمیم کرنے پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوئی۔ اس وقت مسلم لیگ دو جماعتوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک میاں شفیع کی لیگ کہلاتی تھی۔ دوسری جناح لیگ۔ اس کنونشن میں جناح صاحب کی لیگ شامل

ہوئی۔ مولانا محمد علی بھی شامل ہوئے اور صرف چند ضروری ترمیمیں پیش کیں۔ لیکن وہ بھی ہندو لیڈروں نے تسلیم نہ کیں۔ عین اس وقت یعنی ۱۹۲۹ء کے آخری دن اور ۱۹۳۰ء کے روز اول کو دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں جمعیۃ العلما، مجلس خلافت، شفیع لیگ، اور ملک بھر کی مجالسِ قانون ساز کے مسلم نمائندے زیر صدارت سر آغا خاں جمع ہوئے۔ اور اتفاق آرا سے قرار پایا کہ مسلمانوں کے مطالبات یہ ہیں۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو تناسب آبادی کے اعتبار سے اکثریت دی جائی۔ اقلیت کے صوبوں میں زائد از استحقاق نشستیں دی جائیں۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے مستقل صوبہ بنایا جائے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو پوری اصلاحات دی جائیں۔ مرکز میں مسلمانوں کا حصہ ایک تہائی ہو۔ اختیارات باقی صوبوں کو دیئے جائیں۔ اس اجتماع نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کو مستقل صورت دے دی۔ مولوی شفیع داؤدی اس کے سیکرٹری قرار پائے جنھوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں کانفرنس کے زیر اہتمام جلسے کرائے۔ جن میں مسلمانوں کی تائید بدرجہ اتم کی گئی۔

مسٹر محمد علی جناح چونکہ آل پارٹیز کنونشن کو ہندو لیڈروں کے تعصب سے سخت بیزار ہو کر چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے متعلق چودہ نکات مرتب کیے جو بالکل وہی تھے جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار داد میں شامل تھے۔ اس پر شفیع لیگ اور جناح لیگ دونوں ایک ہوگئیں۔ اور مطالبات پر پورا اسلامی ہندوستان متفق ہوگیا۔ اب گویا ہندوستان کے ہندو اور مسلمان لیڈروں کا موقف بالکل الگ الگ تھا۔ ہندو لیڈروں کا دعویٰ یہ تھا کہ کانگریس تمام اہل ملک کی نمائندہ ہے۔ اور نہرو رپورٹ سارے ملک کا متفقہ دستور ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ دس کروڑ مسلمانوں کی تمام مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور ان کے ممتاز رہنما اس مسودہ دستور سے سخت بیزار تھے اور اپنے مطالبات متفقہ طور پر پیش کر چکے تھے۔ ہندو لیڈروں کے دماغوں میں ہندو راج کے سوا کوئی بات نہ تھی۔ اور وہ دن رات اس کوشش میں منہمک تھے کہ کسی نہ کسی طرح حکومت برطانیہ نہرو رپورٹ کو آئندہ دستور کے طور پر منظور کر لے۔ اسی دوران میں انگریزوں نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ گاندھی جی نے مطالبہ کیا کہ گول میز کانفرنس میں کانگرس کو سب سے زیادہ نمائندگی دی جائے اور یہ یقین دلایا جائے کہ لندن میں فرقہ وار معاملات پر کوئی بحث نہ چھیڑی جائے گی۔ جب یہ مطالبہ پورا نہ ہوا تو گاندھی جی نے بھتا کر سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر انگریز ہندو راج کے قیام میں معاون نہیں

ہوتے تو ان کو قوت سے دبانے کی کوشش کی جائے۔ سال بھر سول نافرمانی ہوتی رہی۔ مسلمان اس سے بالکل الگ رہے۔ آخر گاندھی جی نے حکومت سے صلح کرلی۔ حالانکہ ان کا کوئی بھی مطالبہ پورا نہ ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی گول میز کانفرنس کے بعض ہندو ممبروں نے گاندھی جی کو یقین دلا دیا تھا کہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ اور بعض دوسرے وزرا مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی طرف مائل ہیں۔ اس لیے آپ فکر نہ کیجیے۔ گاندھی جی لندن جانے پر رضامند ہوگئے۔ وہاں پہنچتے ہی فرقہ وار مسائل سامنے آئے۔ گاندھی جی نے تصفیہ کے لیے جو تجویزیں پیش کیں وہ ہندوؤں اور سکھوں نے رد کردیں۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ اگر اچھوت ہندوؤں سے علیحدگی کا مطالبہ کریں تو مسلمان ان کی تائید نہ کریں ایسی صورت میں ہم مسلمانوں کے مطالبات منظور کرلیں گے۔ مطلب یہ تھا کہ اچھوتوں کی کثیر تعداد سے ہندو بدستور فائدہ اٹھاتے رہیں۔ اور ہندو اکثریت کے قیام کی خاطر اچھوتوں کو بدستور ہر قسم کے جداگانہ حقوق سے محروم رکھا جائے۔ مسلمان اس معاملے میں ہندوؤں کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے گاندھی جی کی پیشکش ماننے سے صاف انکار کردیا۔

ادھر گاندھی جی کو فرقہ وار مسائل کے حل میں پے در پے ناکامیاں ہورہی تھیں۔ اور ادھر مالوی جی مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سے ملاقاتیں کررہے تھے۔ آخر انھوں نے گاندھی جی کو یقین دلا دیا کہ اگر فرقہ وار تصفیہ کا معاملہ وزیر اعظم کی ثالثی پر چھوڑ دیا جائے تو ان کا فیصلہ ہندوؤں کے خلاف نہ ہوگا۔ مالوی جی نے دوسرے ہندو لیڈروں کو ساتھ ملا کر وزیر اعظم کی خدمت میں ثالثی کی درخواست پیش کردی۔ لیکن مسلمانوں نے ثالثی پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ اور کہا کہ وہ کسی کو ثالث مطلق ماننے کو تیار نہیں ہیں جو فیصلہ ہوگا اس کو دیکھ کر منظوری یا نامنظوری کا اعلان کریں گے۔ گاندھی جی نے وزیر اعظم اور مالوی جی کی یقین دہانیوں کے چکر میں آکر خود بھی وزیر اعظم کو ایک خط لکھ دیا اور ان کی ثالثی کی تائید کردی۔ لیکن جب اگست ۱۹۳۲ء میں فرقہ وار فیصلے کا اعلان ہوا تو وہ خاصی حد تک مسلمانوں کے حق میں تھا۔ اور اچھوتوں کو بھی علیحدہ نمائندگی دے دی گئی تھی۔ اس پر ہندوؤں میں سخت اضطراب پھیل گیا۔ گاندھی جی نے جب دیکھا کہ ہندو اکثریت کے راج کا منصوبہ خاک میں ملا جارہا ہے۔ تو انھوں نے ''مرن برت'' کا اعلان کردیا۔ اور کہا کہ وہ جان دے دیں گے لیکن اچھوتوں کو سیاسی اعتبار سے ہندوؤں سے الگ نہ ہونے دیں گے۔ آخر اکابر ہنود نے اچھوتوں کو کچھ دے دلا کر راضی کرلیا۔ اور گاندھی جی کا ''مرن برت'' ختم ہوا۔

اب پھر اتحاد کانفرنسیں شروع ہوئیں۔ لیکن جس صورت میں حکومت برطانیہ مسلمانوں کے بعض مطالبات منظور کر چکی تھی۔ تو مسلمان ہندوؤں کے ساتھ اسی حالت میں تصفیہ کر سکتے تھے کہ ہندو انھیں برطانیہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ مراعات پیش کریں اور یہ ممکن نہ تھا۔ لہٰذا کانفرنسیں ناکام ہوئیں۔ اور دنیا نے سمجھ لیا کہ یہ ہندو لیڈروں کی طرف سے اپنی اکثریت کو مؤثر رکھنے کی آخری کوشش تھی۔ اچھوتوں سے معاملے میں ہندوؤں نے جو رویہ اختیار کیا۔ اس کی وجہ سے ان کی خاصی بدنامی ہوئی۔ مولانا محمد علی جیسے مجاہد حریت اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی نے ایک تقریر میں ارشاد فرمایا:

''یقیناً ہندو جاتی ساری دنیا میں اپنی تنگ نظری کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ کسی ملت نے اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا۔ کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا ہو۔ صدیوں سے سب ہندو نہ ایک دوسرے کو بیٹی دے سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سب مندر ایک ہندو میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ نہ سب جگہ سب کے لیے عام سڑکیں ہی کھلی ہوئی ہیں۔ جو جاتی اس درجہ خود غرضی کا شکار ہو۔ اس پر دوسری ملتیں کس طرح اعتبار کر سکتی ہیں۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اس قدر فرقہ بندی کا باعث نہیں بنے۔ جس قدر ہندوؤں کی فرقہ بندی اس کا سبب بنی۔

علامہ اقبال ۱۹۲۹ء سے مسلم لیگ میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کام کر رہے تھے۔ وہ پہلے شفیع لیگ کے سیکرٹری بنے پھر آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں اسی مقصد کے لیے کام کیا۔ گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے ۱۹۳۰ء میں بمقام الہ آباد مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس ہوا۔ اس کی صدارت علامہ نے فرمائی۔ اور خطبۂ صدارت میں ایک تاریخی اعلان فرما دیا جس میں پاکستان کا ذکر کیے بغیر وہ تجویز بیان کردی جو قیام پاکستان کی پہلی بنیادی اینٹ ثابت ہوئی۔ آپ نے فرمایا:

''مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی نہایت شدّ و مد سے تائید کرے گا جو اس قرار داد میں موجود ہیں۔ (آل مسلم پارٹیز کانفرنس کی قرار داد) ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا باہر رہ کر۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے

مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔“

یہی وہ پیر مشرق کا خواب تھا۔ جس کی تعبیر بعد میں قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں نکلی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوگیا۔

۱۹۳۰ء کے بعد ملک کی سیاسی کیفیت یہ تھی کہ ہندو لیڈر فرقہ وار فیصلے پر بہت مضطرب تھے۔ اور کانفرنسیں منعقد کر کے کوشش کر رہے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمان مخلوط انتخاب ہی کو تسلیم کرلیں۔ تاکہ فرقہ وار فیصلے سے انھیں جو طاقت حاصل ہوئی ہے۔ وہ غیر مؤثر ہو جائے۔ علامہ اقبال آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے تمام مسلمانان ہند کے سیاسی جہاز کے ناخدا بنے ہوئے تھے۔ انہی دنوں کشمیر اور الور میں مسلمانوں پر مظالم ہوئے جن کے خلاف ملک بھر کی مسلم رائے عامہ کو بیدار اور منظم کیا گیا۔ مسلم لیگ بالکل بے روح اور بے کار ہو رہی تھی۔ مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے انتشار سے تنگ آ کر انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ مخلوط انتخاب کے حامی اور نیشنلسٹ مسلمان بھی ہندوؤں کی احسان فراموشی کی نوحہ خوانی میں مصروف تھے۔ اگر ملک کی فضا میں اسلامی سیاست کا کچھ غلغلہ باقی تھا تو وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس (اب آل پارٹیز مسلم کانفرنس اسی نام سے موسوم تھی) اور اس کے صدر علامہ اقبال کی وجہ سے تھا۔ آخر ۱۹۳۴ء میں مسٹر محمد علی جناح انگلستان سے واپس آ گئے۔ اور مسلم لیگ میں نئی زندگی کی روح پھونکنے میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں جدید اصلاحات نافذ ہوگئیں اور انتخابات سر پر آ گئے۔ اب مسلم لیگ کی تنظیم و تقویت ضروری ہوگئی۔ چنانچہ جناح صاحب نے ملک بھر کا دورہ شروع کر دیا۔

انہی دنوں ملت نے جناح صاحب کو اپنا قائداعظم تسلیم کیا۔ علامہ اقبال علالت کی وجہ سے سیاست کے عملی حصے سے دست بردار ہو چکے تھے۔ لیکن قائداعظم کو وہ خطوط لکھ رہے تھے جو ”لیٹرز ٹو جناح“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ قائداعظم نے ان خطوط کے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ لیگ کی مرکزی پارلیمنٹری پارٹی کے قیام اور عوام کو ایک پرچم تلے متحد کر کے انتخابات کے لیے تیار کرنے کا کام صرف اس وقت تکمیل کو پہنچا جب مجھے سر محمد اقبال جیسے مخلص دوستوں کی بیش قیمت امداد حاصل ہوئی۔

جنگ عظیم دوم ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی۔ اس وقت کانگرس جدید آئین کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تھی۔ لیکن تھوڑی سی حیص بیص کے بعد آمادہ ہوگئی اور بہت سے صوبوں میں کانگرسی

وزارتیں قائم ہوگئیں۔ ڈھائی سال تک ان لوگوں نے نظم ونسق کو اس انداز سے چلایا کہ ملک بھر کے مسلمان چیخ اٹھے اور انھیں ہندو راج کا جلوہ نظر آ گیا۔ آخر جب کانگریس نے کونسلوں سے پھر علیحدگی اختیار کی۔ تو قائداعظم نے مسلمانوں کو ''یوم نجات'' منانے کا حکم دیا۔ اب حالات بالکل واضح ہو چکے تھے۔ ملک کے بعض حصوں میں فرقہ وار بلووں نے خاصی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اب قائداعظم محمد علی جناح بھی مسلمانوں کی علیحدگی کے قائل ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء کے ماہ مارچ میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں اسلامی ہند نے سب سے پہلے پاکستان کی قرارداد منظور کی۔

چھ سال کی جدوجہد کے بعد کانگریس اور حکومت برطانیہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ مطالبۂ پاکستان کو منظور کرلیں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ تبادلۂ آبادی بہت زور شور سے شروع ہوا۔ اور لاکھوں ہندو اور سکھ مشرق کو اور لاکھوں مسلمان مغرب کو منتقل ہو گئے۔ اس ہنگامے میں دونوں طرف جان و مال کے عظیم نقصانات ہوئے۔ لیکن مسلمانان ہند نے اپنی جدوجہد سے ہندوستان کے شمالی اور مشرقی حصوں میں اپنے لیے ایک آزاد مملکت قائم کر لی تھی۔ اور دنیا کے معزز اسلامی ممالک میں آزاد پاکستان کا اضافہ ہو گیا تھا۔

دسواں باب

تتمہ: عوامی زندگی

اس میں شک نہیں کہ زمانۂ قدیم میں ثقافت کا سب سے بڑا سرچشمہ دربار شاہی تھا جس میں علوم وفنون اور تہذیب و شائستگی کے اقدار و معیارات قائم ہوتے تھے۔ پھر ان کی پابندی ملک بھر کے امرا کرتے تھے۔ اور امرا کے درباروں سے یہ تمام معیار عوامی زندگی کے مختلف شعبوں میں رچ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں بادشاہوں کے روابط اپنی رعایا سے شفیقانہ و سرپرستانہ انداز رکھتے تھے۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود عوامی زندگی اور بالائی طبقات کے درمیان طبعی فرق و تفاوت موجود تھا۔ ہم نے اس کتاب میں اب تک ثقافت کے جن پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ زیادہ تر بادشاہوں اور درباروں سرکاروں سے متعلق تھے۔ اس تتمہ میں ہمارا ارادہ ہے کہ اس عوامی زندگی کی ایک جھلک بھی دکھائیں جو مسلمان سلاطین اور تاجداران مغل کے زمانے میں ہندوستان کے اندر جلوہ گر تھی۔ ہم بتائیں گے کہ عوام کی زندگیوں کا عام اسلوب کیا تھا۔ ان کے اوضاع و اطوار، ان کی معاشرت، ان کے اقتصاد، ان کی صنعت، زراعت اور تجارت۔ ان کی تعلیم کی کیفیت کیا تھی۔ ان کے معیار زیست کو بلند کرنے اور انھیں قحط و بے روزگاری کی مصیبتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے حکومت کیا تدابیر اختیار کرتی تھی۔

زمانۂ قدیم میں ہر کام بادشاہوں ہی کے ذمے تھا۔ علوم وفنون کی سرپرستی بھی وہی کرتے تھے۔ اور غریبوں اور ضرورت مندوں کو اپنی جود و سخا سے مالا مال کرنا بھی انھی کا کام تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایک شخص سارے ملک کی حاجات کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا آج بھی وہی کیفیت نہیں؟ آج بھی ذات وعوامی ضروریات کا قبلہ حکومت ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ ادب و شعر کی سرپرستی کرے تو حکومت۔ ثقافتی سرگرمیوں کی تقویت کے لیے روپیہ دے تو حکومت۔ اچھی کتابوں کی اشاعت کے لیے زر امداد مہیا کرے تو حکومت۔ لیکن اس تمام شوروغوغا کے باوجود آج

کل کی حکومتیں زمانۂ قدیم کے بادشاہوں کے مقابلہ میں عشر عشیر بھی نہیں کرسکتیں۔ ابھی وہ زمانہ بہت دور ہے جب عوام اپنی ان تمام سرگرمیوں کے کفیل خود ہوں گے۔ اور تعلیم و ثقافت اور ضرورت مندوں کی امداد کے لیے حکومت کے دست نگر ہونا اپنے لیے باعث ذلت سمجھیں گے۔

مسلمانوں کی حکومت کے متعلق یہ واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے بادشاہ ان کے امرا۔ جاگیردار، صوبیدار اور ملک کی دوسری حکومتوں کے رئیس اور کارکن سب کے سب عوام کی شخصی اور اجتماعی ضروریات کی کفالت میں مصروف رہتے تھے۔ اور جہاں غربت و افلاس دیکھتے اپنے پورے وسائل کو اس کی تلافی پر لگا دیتے۔ اور حتی الوسع کوشش کرتے کہ ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کی کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھیں۔ اور بندگان خدا کی کفالت کا جو فرض ان پر عائد ہوا ہے اس سے عہدہ برآ ہونے میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

عوامی زندگی کے اسلوب

عوام اس زمانے کی اقتصادیات کے مطابق سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے اپنے دینی یا معاشرتی رسوم و عوائد کے پابند تھے۔ بچے کی پیدائش پر ہندو اور مسلمان دونوں بے حد خوش ہوتے۔ ہندو پنڈت کو بلا کر اس کی جنم پتری تیار کراتے۔ مسلمان نومولود کے کان میں اذان دیتے۔ پھر عقیقہ و ختنہ کی رسوم مبارک سلامت کے غوغا میں انجام دی جاتیں۔ ہندو بچہ پانچ سال کا ہو جاتا تو اس کو گرو کے حوالے کردیا جاتا۔ اور مسلمان بچہ چار سال چار ماہ چار دن کا ہوجاتا تو اس کی رسم ''بسم اللہ خوانی'' ادا کی جاتی۔ اور اس کو مکتب میں بٹھا دیا جاتا جوان ہونے پر بچوں کی شادیاں کی جاتیں۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ ہر حالت میں دامادوں اور بہوؤں کے انتخاب کا کام بزرگوں کے سپرد ہوتا۔ جب وہ پورے حزم و احتیاط کے بعد رشتہ تجویز کردیتے۔ تو ''منگنی'' کردی جاتی۔ ہندو اس رسم کو ''تلک'' کہتے تھے۔ شادی کے وقت دلہن کی رخصتی عمل میں آتی۔ اسی طرح غمی کی رسمیں تھیں۔ مسلمان مُردوں کو دفن کرتے۔ ہندو ان کو جلا دیتے۔ پھر موت کے بعد کی رسوم شروع ہوتیں۔ سوم اور چہلم پر قرآن کی تلاوت کی جاتی۔ اور ہندو بھی قریب قریب اسی قسم کی رسموں کے پابند تھے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسوم مسلمانوں میں ہندوؤں ہی کی طرف سے آئی تھیں۔ کیونکہ ابتدائے اسلام میں ان رسوم کا سراغ نہیں ملتا۔

مسلمان اپنے تیوہار عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، شب برات، عاشورۂ محرم مناتے، اور ہندو

شوراتری، دیوالی، دسہرہ، ہولی اور بسنت پنچمی پر بعض رسوم اور تماشوں کو ادا کرتے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے مخصوص تیوہاروں کی پرانی شکل صورت کو آج تک قریب قریب قائم رکھا ہے۔ ہندوؤں کی ہولی تو تھی ہی لیکن ایرانی تیوہار ''نوروز'' بھی موسم بہار میں زور شور سے منایا جاتا۔

اخلاق و اطوار کی کیفیت بالکل وہی تھی۔ جو آج سے تقریباً پچاس سال قبل ہمارے عوام کا طرۂ امتیاز تھی۔ بلکہ آج بھی بعض دور دست دیہات و قصبات میں جو زمانہ حاضر کی ''تہذیب'' سے متاثر نہیں ہوئے۔ پائی جاتی ہے۔ آج کل تو معاشرتی اعتبار سے بے شمار نئے عیب راہ پاگئے ہیں۔ کیونکہ جدید حالات کی پیچیدگیاں ان کی متقاضی ہیں۔ پرانے زمانے میں عیب و صواب کا تصور محدود تھا۔ مثلاً شراب اور عورت کے عیب علی العموم نہایت ناپسندیدہ سمجھے جاتے تھے۔ بلاشبہ بالائی طبقہ ان میں مستغرق تھا۔ لیکن عوام ان چیزوں سے بچتے تھے۔ بزرگوں کے طور طریقوں پر نہایت وفاداری سے قائم رہنا لازمۂ شرافت سمجھا جاتا تھا۔ اور ہر شخص اپنے باپ دادا کے راستے پر چلتا تھا۔ اور اپنے طرز عمل کی سب سے بڑی دلیل اسی کو سمجھتا تھا۔ ''نمک حلالی'' سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ اور بادشاہ کی ذات کے ساتھ امرا کی وابستگی اور امراء کے ساتھ ان کے ملازمین و متوسلین کی وفاداری کا سب سے بڑا محرک یہی جذبہ تھا اور جو شخص نمک حلالی کے راستے سے انحراف کرتا تھا۔ اس کے نامقبول ہونے کے لیے یہی ایک بات بس کرتی تھی۔ یاری یا دوستی کا رشتہ بھی بے حد استوار تھا۔ جس کو ایک دفعہ دوست کہہ دیتے اس کی رفاقت اور خیر خواہی کا دم تادم مرگ بھرتے تھے۔ ہندوؤں میں پُن دان اور مسلمانوں میں صدقات وخیرات و زکاۃ کا رتبہ بہت اونچا تھا۔ اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش ہمیشہ جاری رہتی تھی۔

دربار شاہی اور امرا کے درباروں میں اوضاع واطوار کا جو سانچا تیار ہوتا تھا اس کی تقلید عوام بھی کرتے تھے۔ وہ باہم ملنے جلنے میں انتہا درجے کے شائستہ، اٹھنے بیٹھنے اور بزرگوں کے سامنے حرکات وسکنات میں نہایت محتاط اور پرلے درجے کے مہمان نواز تھے۔ عورتوں کا درجہ مسلم معاشرے میں ہمیشہ سے نہایت معزز رہا ہے۔ خود لفظ ''حرم'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان گھر میں عورتوں کو مقام تقدس حاصل ہے۔ بلاشبہ وہ پردے میں رہتی تھیں اور ان کو نامحرموں سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن پردے کے مسئلے میں بھی اصل مقصد حفظ حیا تھا۔ دیہات کی عورتیں کسی برقع یا چادر کے بغیر باہر نکلتی تھیں۔ کیونکہ ان کے فرائض انھیں بیرونی زندگی پر مجبور کیا کرتے

تھے۔ لیکن وہ بھی مردوں کے سامنے آنے میں گھونگھٹ نکال لیا کرتی تھیں۔ درمیانی درجہ کی عورتیں برقع اوڑھتی تھیں۔ اور زیادہ معزز خواتین ڈولیوں میں نکلتی تھیں۔ جن کو چار کہار اٹھاتے تھے۔ لیکن ڈولیوں کے ساتھ بھی ان کے اعزہ یا ملازم یا خواجہ سرا ضرور ہوتے تھے۔

معاشرتی حیثیت سے اسلام ہر قسم کی عدم مساوات کا مخالف تھا۔ چنانچہ اس نے ذات پات کے فرق کو مٹانا چاہا۔ اور غلامی، ستی اور بچہ کشی پر سخت پابندیاں عائد کیں۔ مسلمان بیواؤں کی شادیاں کر دیتے تھے۔ ہندو اس معاملے میں بہت سخت مخالف تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تعصب بھی مٹ گیا۔ اور عورتوں کی حیثیت معاشرے میں بلند ہوتی گئی۔ زمانے کے اثر سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں غلامی کا رواج عام تھا لیکن جب مسلمان بادشاہوں نے غلاموں کی پرورش اور تربیت پر بہت زیادہ توجہ مبذول کی اور ان کے لیے حکومت کے بڑے بڑے مناصب کے دروازے کھول دیئے تو ہندو بھی لامحالہ اپنے غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے لگے۔

تعلیم

اس کتاب میں کسی دوسری جگہ ان بے شمار مدارس کا ذکر آچکا ہے جو مسلمان سلاطین و امرا کی جود و سخا سے قائم ہوئے۔ جن میں عوام کے لیے بہترین تعلیم کا بندوبست کیا گیا تھا۔ لیکن یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہندوستان بھر میں تعلیم مفت دی جاتی تھی اور طلبا سے کسی قسم کی فیس یا اجرت وصول نہ کی جاتی تھی۔

مسلمانوں کے نظام تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ مغلوں کے عہد کی ثقافتی ترقی کے بیان کے بعد رالنسن لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں ثقافت کا بلند معیار زیادہ تر ملک کے اعلیٰ طریقۂ تعلیم ہی کا نتیجہ تھا۔ اور تعلیم ملک میں مذہبی فریضہ کا سا درجہ رکھتی تھی۔" انگریزوں کے آنے کے بعد دو یورپین ماہرین تعلیم نے جن میں سے ایک ڈاکٹر لائیٹز اور دوسرے مسٹر ایڈم تھے۔ پنجاب اور بنگال میں تعلیم کا جائزہ لیا۔ اور اپنی رودادیں مرتب کیں۔ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے آخری دنوں میں جب وہ زوال و انحطاط کی گہرائیوں میں غرق ہو چکے تھے۔ تعلیم کا نہایت عمدہ نظام قائم تھا۔ اور انیسویں صدی کے آغاز میں تعلیم کو موجودہ زمانے سے بھی زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ایڈم لکھتا ہے کہ اس وقت بنگال میں ایک لاکھ مدرسے قائم تھے اور لائیٹز کا اندازہ پنجاب کے متعلق یہ ہے کہ اس وقت

پنجاب کے اکثر اضلاع میں تعلیمی نظام برطانوی عہد سے بھی زیادہ بہتر تھا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت کا ذکر ایک اور انگریز جنرل سلیمن نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''دنیا میں شاید ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ تعلیم کا رواج ہو۔ ہر بیس روپے ماہانہ پانے والا شخص اپنے بیٹوں کو وزیراعظم کے برابر تعلیم دلاتا ہے۔ ہمارے لڑکے جو علوم یونانی اور لاطینی زبانوں سے سیکھتے ہیں۔ یہاں کے نوجوان وہی کچھ یعنی گرامر، بلاغت اور منطق وغیرہ عربی و فارسی کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں۔ سات سال کے مطالعہ کے بعد مسلمان نوجوان علم کی ان مختلف شاخوں سے قریب قریب اتنا ہی واقف ہو جاتا ہے۔ جتنا کوئی آکسفرڈ کا تعلیم یافتہ نوجوان۔ یہ بھی اسی طرح سقراط، ارسطو، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا کے متعلق بڑی روانی سے گفتگو کرسکتا ہے۔''

ایک اور مقام پر یہی جنرل سلیمن لکھتا ہے ''اہل یورپ میں سے بہترین لوگ جب بھی ہندوستان کے اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے روزانہ زندگی کے واقعات کے سوا کسی اور موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان بوعلی سینا کی تصانیف کے طفیل سے بطلیموس کے نظام ہیئت، ارسطو کی منطق اور اخلاقیات اور جالینوس کے افادات سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرلیتے ہیں۔ انھیں فلسفے، ادب، سائنس اور فنون لطیفہ کے متعلق گفتگو کرنے کی قابلیت بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس گفتگو پر آمادہ بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان علوم و فنون کے متعلق عہد حاضر کی نئی تحقیقات کے نتائج کو سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔''

تعلیم کا وسیع نظام

اس اعلیٰ معیار تعلیم تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ طلباء کو ابتدائی تعلیم بھی خاص اہتمام سے دی جاتی۔ چنانچہ کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جس میں مسجد نہ ہو اور ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب ضروری تھا جس میں ایک خاص حد تک لڑکے اور لڑکیاں یکجا ابتدائی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اس کے بعد چھوٹے قصبوں میں بھی مکتب اور مدرسے تھے۔ اور بڑے شہروں میں تو باقاعدہ یونیورسٹیاں تھیں۔ جو ہزاروں طلباء کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرتی تھیں۔ مساجد اور صوفیہ کرام کی خانقاہیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان کو صرف عبادت اور ریاضت کے لیے مخصوص نہ رکھا

جاتا تھا۔ بلکہ طلباء کی تعلیم (روحانی اور دنیاوی) مقصد اول قرار دی جاتی تھی۔

بڑے مدارس میں ذریعہ تعلیم فارسی اور عربی تھی۔ فارسی میں حساب، زراعت، مساحت، ہندسہ، تشریح اعضا، سیاسیات، تاریخ اور طبیعی، ریاضی اور الٰہی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اور مشہور و نامور ماہرین کی لکھی ہوئی کتابیں داخل درس ہوتی تھیں۔ ''طبیعی، ریاضی اور الٰہی'' علوم کی تین شاخیں تھیں:

''الٰہی'' ان تمام علوم پر مشتمل تھی جو دینیات اور معرفت الٰہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ''ریاضی'' علم مقادیر تھا جس میں ریاضیات، فلکیات، موسیقی اور آلیات شامل تھے۔ ''طبیعی'' تمام معلوم طبیعیات سے متعلق تھے۔[۱]

سنسکرت سیکھنے کے لیے ویاکرن، نیائے، ویدانت اور پاتنجل کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ عربی کی تعلیم تمام مدارس میں لازمی تھی۔ جس میں صرف، نحو، بلاغت، ادب، منطق، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، تصوف اور فلسفۂ دین پڑھائے جاتے تھے۔ اور زمانے کے بہترین مصنفین کی کتابیں درس میں شامل تھیں۔[۲]

مکتبوں اور مدرسوں میں ضبط و نظم بدرجۂ اتم ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ معلم کا فرض صرف یہی نہ تھا کہ علوم پڑھا دیئے۔ بلکہ ان سے پابندی نماز کرانا اور ان کو آداب اور خلق کی تعلیم دینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ معلم معاشرے میں نہایت عزّ و احترام رکھتا تھا۔ اور قاضیوں اور مفتیوں کا انتخاب بھی اکثر اعلیٰ درجے کے معلمین میں سے کیا جاتا تھا۔ چونکہ مدرسے تقریباً تمام سکونتی تھے اس لیے معلم اور متعلم ایک جگہ رہ کر ایک دوسرے کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ امتحانات باقاعدہ ہوتے تھے۔ لیکن ان کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ معلم خود ہی طلباء کا امتحان لیتا اور جو قابل پائے جاتے انھیں بالائی درجے میں ترقی دے دیتا۔ بدشوق اور نالائق اور شریر بچوں کو بیدزنی اور کوڑے کی سزا دی جاتی۔ جرمانہ بالکل خارج از بحث تھا۔

ہندوؤں کے عہد میں تعلیم صرف برہمنوں تک محدود تھی۔ جو دوسری جاتیوں کو پڑھانے کے حامی نہ تھے۔ لیکن مسلمان بادشاہوں نے تعلیم کو بھی ذات پات کے قصے سے پاک کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ ہندو لڑکے بھی حکمران قوم کے طلباء کے پہلو بہ پہلو بلا امتیاز مذہب و ملت چشمۂ تعلیم سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ ان کے لیے نہ صرف تمام تعلیمی اداروں کے دروازے کھول دیئے گئے بلکہ اکثر ان کے قومی اور دھارمک مضامین بھی نظام درسی میں شامل کر کے انھیں

مزید سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔

تعلیمی عطیات:

ان تمام تفصیلات کو پڑھ کر ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ جس حالت میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں تعلیم و تدریس کا بہترین نظام قائم تھا۔ صرف سلطنت دہلی ہی نہیں بلکہ ملک کے دوسرے بادشاہ بھی اس مشغلے میں مصروف تھے۔ اور پھر ملک بھر کے کسی بڑے سے بڑے طالب علم سے کوئی فیس وصول نہ کی جاتی تھی۔ تو یہ عظیم الشان مصارف کون پورے کرتا تھا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ ایک طرف بادشاہ۔ ان کی حکومتیں۔ امرا اور ان کی جاگیریں بے شمار مکاتب و مدارس کے مصارف کی کفیل تھیں۔ اور دوسری طرف ملک بھر میں تعلیمی اوقاف کی وہ بھرمار تھی کہ اگر وہ اوقاف آج بھی موجود ہوتے تو پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی تعلیم کے لیے کسی حکومت کا محتاج ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بنگال کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے پورے رقبے کا چوتھائی حصہ تعلیمی و مذہبی اوقاف پر مشتمل تھا۔ ان اوقاف کی آمدنی سے تمام تعلیمی ادارے چلتے رہتے اور جب کبھی کوئی بادشاہ ان اداروں کی افادی حیثیت کو دیکھ کر ان کو عطیات دے دیتا تو ان کی مالی بنیادیں اور بھی زیادہ استوار ہو جاتیں۔ اور ان کا تعلیمی دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ہر بادشاہ کے عہد میں سادات و مشائخ، علما اور طلباء کے لیے وظائف وعطیات برابر جاری رہے۔ قطب الدین ایبک ان کے لیے ایک سو یا دو سو تنکہ عطا کرتا تھا۔ یہ عطیات اس کے بعد بھی ایک زمانے تک ملتے رہے۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں یہ امداد بعض وجوہ سے بند ہوگئی۔ لیکن سلطان فیروز شاہ تغلق کا زمانہ ان لوگوں کے لیے بہت خوشحالی کا دور تھا۔ ایک یا دو سو تنکہ کے بجائے اب انھیں چار سو، پانسو، سات سو، ہزار تنکہ تک ملنے لگا۔ اور جو طلباء دس تنکے کو بھی بڑی چیز سمجھتے تھے۔ انھیں سو، دوسو، تین سو تنکہ ملنے لگا۔ ان کے علاوہ جو لوگ قرأت کے استاد، حفاظ، واعظ یا خطاط کی حیثیت سے مدرسوں اور اقامت گاہوں میں کام کرتے تھے۔ یا قاری، مؤذن، فراش اور مجاور تھے۔ ان کے لیے بھی حسب مدارج دو سو سے لے کر ہزار تنکہ تک وظائف مقرر ہوئے۔[۳]

فیروز شاہ تغلق نے اپنے خرچ سے بعض نہریں نکالی تھیں۔ ان سے جو آبیانہ ''حق شرب'' کے نام سے وصول ہوتا تھا۔ وہ بھی اس نے تعلیمی مقاصد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور علما،

مشائخ، صلحا، خطاطوں، ادیبوں اور استادوں کو کوئی چھتیس لاکھ ٹنکہ کی عظیم رقم بطور امداد اس کے خزانے سے جاتی تھی۔[۴]

یوں تو طلباء کو کھانا اور اوپر کے خرچ کے لیے روپیہ دینا ہمیشہ ہی سے اسلامی مدارس کا شعار رہا ہے۔ اور مدرسہ نظامیہ اور مستنصریہ بغداد میں یہ رسم عام تھی۔ لیکن یہاں بھی فیروز شاہ تغلق نے جو مدرسہ دہلی میں قائم کیا۔ اس میں طلباء کو ایسے پُرتکلف کھانے کھلائے جاتے تھے کہ مشہور شاعر بدر چاچ نے ایک قصیدے میں مزے لے لے کے ان کا ذکر کیا ہے۔

فیروز شاہ تغلق نے غلاموں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو کچھ کیا۔ اس کا ذکر اور جگہ آچکا ہے۔ اس بادشاہ کے پاس ایک لاکھ اسی ہزار غلام تھے۔ ان کی تعلیم کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا گیا۔ ایک گروہ کو صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں کی تربیت دی گئی۔ یہ گروہ کوئی بارہ ہزار غلاموں پر مشتمل تھا۔ چالیس ہزار غلام محکمۂ خاص اور سواری شاہانہ کے لیے منتخب کیے گئے۔ یہ سب شاہی کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ یعنی اچھے خاصے کاریگر واقع ہوئے تھے۔ بعض غلاموں کو حفظ قرآن اور تحصیلِ علوم دین پر لگایا گیا۔ ان غلاموں کو پچیس ٹنکہ سے لے کر ایک سو ٹنکہ تک تنخواہ سرکاری خزانے سے دی جاتی تھی۔ بہت سے غلام اس طرح روپیہ جمع کر کے اپنی آزادی خرید لیتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنی کتاب فتوحات فیروز شاہی میں بیان کیا ہے کہ اس نے مقبروں اور مدرسوں کے لیے اوقاف عطا کیے۔ مسجد معز الدین، مدرسہ التمش، مقبرہ جلال الدین خلجی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی مرمت کرائی۔ اور اس کے مصارف اوقاف سے ادا کیے گئے۔

غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ نے ان پندرہ ہزار عورتوں کے لیے تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جو شاہی محل میں مختلف خدمات بجا لاتی تھیں۔ انھیں دینی و دنیوی تعلیم، صنعت و حرفت کی تربیت اور فنون سپہ گری کی ٹریننگ دی گئی۔ ان عورتوں میں سے پان پان سو کے دو دستے تیار کیے گئے جنھیں شمشیر زنی اور تیر اندازی کی تربیت دی گئی۔[۵]

یتیموں کی پرورش ہمیشہ سے مسلمان حکومتوں کا شیوہ رہی ہے۔ چنانچہ بہمنی سلاطین نے گلبرگہ، بیدر، ایلچپور، برار اور دولت آباد میں خالص یتامیٰ کے لیے مدرسے تعمیر کرائے۔

"مراۃ احمدی" کے مصنف کا بیان ہے کہ ہر طالب علم کو اس کے استاد کی سفارش پر امداد دی جاتی ... اور پھر

صوبائی خزانے ہی سے امداد تقسیم کی جاتی۔ یہ کتاب مغلیہ سلطنت کے آخری ایام میں لکھی گئی اور اس کا مصنف گجرات کا رہنے والا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ تعلیم کے لیے بعض جاگیریں دی جاتی تھیں۔ جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس مدّ میں حکومت کی طرف سے ذیل کی امداد دی جاتی تھی: ۱۔ایک کروڑ بیس لاکھ دام زمین کے محاصل سے۔

۲۔ پچاس ہزار بیگھہ زمین۔

۳۔ایک سو تین دیہات۔

۴۔ایک لاکھ چالیس ہزار روپے نقدی خزانۂ عامرہ سے۔

جو امداد منصب دار خود اپنے خزانے سے دیتے تھے وہ اس کے علاوہ تھی۔

بیجاپور کی مسجد آثار شریف کے مدرسے میں طلباء کو صبح بریانی اور مزعفر اور شام کو نان گندم اور کھچڑی دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جیب خرچ اور کتابوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ مثلاً آثار شریف بیجاپور کے مدرسے میں فی طالب علم ایک ہُون ماہانہ دیا جاتا تھا۔ فارسی اور عربی کتابوں کی امداد اس کے علاوہ تھی۔[٦]

مغلوں کے عہد میں تو تعلیمی وظیفوں اور جاگیروں کا کوئی شمار نہ تھا۔ مدارس میں تمام طالب علموں کو شاہی خزانے سے روزانہ خرچ ملتا تھا۔ مثلاً اس سے پیشتر ہم بیان کر چکے ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں منشعب پڑھنے والوں کو دو آنے روزانہ اور شرح وقایہ پڑھنے والوں کو آٹھ آنے روزانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض مستحق طلباء کو مستقل مدد معاش بھی دی جاتی تھی۔

غرض ہندوستان بھر کے بادشاہ، امراء، منصب دار اور دوسرے اہلِ خیر نے کروڑوں روپے کے اوقاف صرف عوام کی تعلیم کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔ اور اس پر خزانۂ عامرہ شاہی سے بھی باقاعدہ مشاہرات و وظائف دیئے جاتے تھے۔ مقصود صرف یہ تھا کہ تعلیم زیادہ سے زیادہ عام ہو۔ اور پھر اس تعلیم سے صرف ملازمت ہی مقصود نہ تھی۔ بلکہ نوجوانوں کو زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ہر اعتبار سے تیار کر دینا ان سلاطین کا روادارنہ اور محسنانہ نصب العین تھا۔

کاشت کاروں کی زندگی:

ہندوستان ہمیشہ سے ایک زراعتی ملک رہا ہے۔ اور اس کی آبادی کی عظیم اکثریت کی

اقتصادی زندگی صرف کھیتی باڑی سے وابستہ رہی ہے۔ اس ملک میں زمین انتہا درجے کی زرخیز اور پیداوار کے اعتبار سے بہت سیر حاصل ہے۔ آج کل آبادی کی کثرت کے باعث اس میں زراعت کی توسیع بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ لیکن جب آبادی کم تھی۔ اور وسائل زیادہ تھے۔ تو زمین کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوتی تھی۔ اور دہلی کے سلاطین اور ان کے صوبیدار جو کاشتکار کو اپنی سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھتے تھے زراعت کو بہتر بنانے میں برابر مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے لیے ایک علیحدہ محکمہ ''دیوانِ کوہی'' [۷] کے نام سے قائم کر رکھا تھا۔ بنجر زمینیں قابل کاشت بنائی جاتیں۔ اور جس جگہ آبپاشی کا انتظام نہ ہوتا، وہاں کنوئیں کھودے جاتے، نہریں نکالی جاتیں۔ اور رہٹ کو رواج دیا جاتا۔ جس کو اب تک انگریزی زبان میں ''پرشئن ویل'' کہا جاتا ہے۔ یعنی آبپاشی کا یہ ذریعہ بھی ایران سے ماخوذ تھا۔ زمین کی پوری پیداوار میں سے علی العموم ایک چوتھائی یا ایک تہائی حکومت لے لیتی اور باقی کاشتکار اپنے کنبے اور اپنے کمیوں اور نوکروں کے صَرف میں لاتے تھے۔

کاشتکار زیادہ تر ہندو تھے۔ ان کا معیار زیست بلاشبہ پست تھا۔ اگر بارش بروقت ہو جاتی، آبپاشی کے انتظامات ٹھیک ہوتے اور حکومت ہمدرد ہوتی۔ تو کاشت کاروں کی مسرت اور خوشحالی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ لیکن اگر بارش نہ ہوتی اور دوسرے وسائل بھی مفقود ہوتے تو غریب کسان دعائیں مانگتے۔ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے اور اگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلتا تو قسمت پر شاکر ہو جاتے۔ ان کے گھروں میں چند چارپائیوں اور مٹی کے برتنوں کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی۔ اور وہ خود بھی لنگوٹیاں باندھے پھرتے۔ لیکن مسلمان بادشاہوں کے زمانوں میں ان کا معیار زیست یقیناً بہتر ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنے مکھیاؤں اور چودھریوں کی ریس کرنے لگے تھے۔[۸]

کاشتکار اجناس خوردنی کے ساتھ ہی ساتھ بعض گھریلو چیزیں بھی پیدا کر لیتے تھے۔ مثلاً گڑ، شکر مختلف قسم کے تیل، ٹوکریاں، رسیاں وغیرہ۔ یہ چیزیں ان کے لیے مزید یافت کا ذریعہ بن جاتیں۔

شہروں میں صنعت و حرفت:

قصبوں اور شہروں میں کمہار، لوہار، بڑھئی، موچی وغیرہ بے شمار تھے لیکن سب سے

نمایاں صنعتیں جن کا ذکر تقریباً ہر مورخ نے کیا ہے۔ ایسی تھیں جن سے ملک کا شہرہ بیرونی ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ مثلاً سوتی، ریشمی اور اونی کپڑا نہایت نفاست اور عمدگی سے بنایا جاتا تھا۔ دہلی کے بادشاہوں کی زیر سرپرستی جو عظیم الشان کارخانے قائم تھے ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان کارخانوں میں بادشاہ اس کے حرم، امرا، جاگیرداروں اور فوج کی وردیوں کے لیے ہر قسم کے کپڑے بُنے جاتے تھے۔ بعض بادشاہوں کے کارخانوں میں تو چار چار پانچ پانچ ہزار کاریگر بیک وقت گوناگوں ریشمی پارچات، زربفت، کمخواب اور اطلس تیار کرنے پر مامور تھے۔ ڈھاکا اور بعض دوسرے مقامات پر ململ ایسی نفیس بنائی جاتی تھی کہ یورپ کے ملکوں کے بڑے بڑے دولتمند لوگ اس کے عاشق تھے۔ جیمز ٹیلر اپنی کتاب ''سکیچ آف دی ٹوپوگرافی ڈھاکا'' میں لکھتا ہے کہ ڈھاکا میں سوتی کپڑے کی ۳۶ مختلف قسمیں تیار کی جاتی تھیں۔ جہانگیر کے عہد میں ڈھاکے کی جو ململ تیار ہوئی تھی، اس کا ایک گز عرض کا پندرہ گز کا تھان صرف نو سو گرین وزنی ہوتا تھا۔ ایک ململ کا نام ''آب رواں'' تھا۔ اگر اس کو بہتے پانی پر پھیلا دیا جاتا تو وہ نظر نہ آتی تھی۔ اگرچہ یورپ کی گھٹیا مشینی کپڑوں نے ڈھاکا کی ململ کا گلا گھونٹ دیا۔ لیکن آج کل ڈھاکا میں دستی کتائی کے تاگے اور کرگھے سے جو ململ تیار کی جاتی ہے۔ اس کا چھ گز کا ٹکڑا تہ کر کے دیا سلائی کی ڈبیا میں رکھا جاسکتا ہے۔ اور پھر اس کپڑے کی خصوصیت یہ ہے کہ دُھل کر زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور مشینی عمل سے زیادہ چلتا ہے۔

ڈھاکا کا ایک اور بے نظیر کپڑا ''جامدانی'' کہلاتا ہے۔ اس پر سفید پھول پتیاں کاڑھی یا ٹانکی نہیں جاتیں بلکہ کپڑے کے ساتھ ہی بُنی جاتی ہیں۔ ان کپڑوں کی قیمت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے لیے جامدانی کا ایک تھان ۱۲۵۰ روپے میں تیار ہوا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ڈھاکا کی جامدانی کا تھان ساڑھے چار سو روپے قیمت پاتا تھا۔ یعنی اعلیٰ درجے کے کاریگروں کے لیے صرف شاہی کارخانوں ہی میں کام کرنے کی گنجائش نہ تھی بلکہ ملک کے اکثر حصوں میں بڑے بڑے کاروباری لوگوں نے اپنے کارخانے قائم کر رکھے تھے۔ اور وہ ہر قسم کی صنعتوں اور حرفتوں کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ بنگال اور گجرات کے علاقے خاص طور پر پارچہ بافی کے لیے مشہور تھے اور اس معاملے میں انھیں ملک بھر کی قیادت کا درجہ حاصل تھا۔ چونکہ یہ دونوں علاقے سمندر کے کنارے واقع تھے اور انھیں بندرگاہی سہولتیں حاصل تھیں۔ اس لیے یہاں سے ... مقدار ... کپڑا بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا۔ بنگال میں ململ، طلا کار ٹوپیاں، ریشمی رومال

اور دوسرے سوتی اور ریشمی کپڑے۔ گجرات کے علاقہ کھمبایت اور دوسرے حصوں میں مخمل، قالین، چھینٹ اس قدر عمدگی سے بنائی جاتی تھیں [۹] کہ دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی تھی۔ غالباً بنگال کی ململ ہی کو دیکھ کر امیر خسرو نے لکھا تھا۔

به چشم سوزن صد گز بگنجد از بس لطف

درو به حیله خزد نوک سوزن پولاد (غرۃ الکمال)

قران السعدین (صفحہ ۱۳۲) پر لکھتا ہے

جامۂ ہندی کہ ند انند نام

کز تنکی تن بنماید تمام

مانده به پیچیده به ناخن نهاں

باز کشائش بپوشد جہاں

مغلوں کے زمانے میں جہاں دوسری سرگرمیوں کو بے انتہا تقویت پہنچی۔ وہاں صنعت و حرفت میں بھی نئی جان پڑ گئی۔ بابر اور ہمایوں اگرچہ سلطنت کے استحکام اور سیاسی مصروفیتوں میں بے حد الجھے رہے لیکن انھوں نے بھی اس معاملے میں غفلت سے کام نہیں لیا۔ مثلاً ہمایوں نے قصرِ رواں، باغِ رواں اور بازارِ رواں کشتیوں میں بنائے۔ اور یہ کشتیاں دریائے جمنا میں چھوڑ دی گئیں۔ ان میں صنعت و تجارت کی چیزیں رکھی جاتیں۔ اکبر کے زمانے میں آگرہ، فتح پور سیکری، گجرات میں پٹن، خاندیش میں برہان پور اور بنگال میں سونار گاؤں کے مقامات اعلیٰ درجے کا سوتی کپڑا تیار کرنے میں مشہور تھے۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانوں میں صنعت و حرفت نے جو عظیم ترقی کی۔ اس کی شہادت ان تمام سیاحوں کے بیانات سے ملتی ہے جو اس وقت ہندوستان میں آئے۔ سر ٹامس رو، برنیئر، ٹریونیئر سب رطب اللسان ہیں۔ خصوصاً برنیئر نے تو کشمیر، آگرہ، پٹنہ، لاہور کی شالوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اور مسولی پٹم کے کپڑوں کی بہت تعریف کی ہے۔[۱۰]

مسلمان دھات، لکڑی، مٹی، سنگ مرمر، شیشے یا کپڑے کی بنی ہوئی چیزوں پر آرائش کرنا ہمیشہ ہی سے خوب جانتے تھے۔ سونے اور چاندی کی دلفریب چیزیں کشمیر اور پنجاب میں کثرت سے بنتی تھیں۔ آج کل بھی تانبے کے برتنوں، لوٹوں، کشتیوں، گلاسوں، پیالوں اور خاصدانوں پر نقش و نگار کا کام کیا جاتا ہے۔ ایک اور کام دمشقی کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس کی ابتدا دمشق

ں ہوئی تھی۔ اس میں ایک دھات میں سونے یا چاندی کے تاروں کو پچی کر کے جما دیتے ہیں۔ س قسم کا کام گجرات اور سیالکوٹ میں اکثر ہوتا ہے۔ اور اسے ''کوفت گری'' کہتے ہیں۔ چاندی ی پچی کاری کے کام کو بدری کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی ابتدا بیدر (ریاست حیدرآباد دکن) میں وئی تھی۔ تانبے، سیسے اور ٹین کی ایک مرکب دھات تیار کر کے اس کو تیزاب اور شورے وغیرہ یں غوطہ دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔ پھر اسے پگھلا کر ڈھال لیتے ہیں۔ اور خراد پر بڑھا کر گلاس۔ اگالدان۔ کشتیاں۔ حقے کی فرشیاں تیار کرتے ہیں۔ ان پر نقش و نگار بنا کر ان یں چاندی کے تار پیٹ کر پیوست کر دیتے ہیں۔ چاٹگام ڈھاکا اور نواکھلی میں یہ کام بہت ہوتا ہے۔

مینا کاری کا کام جے پور، بنارس، لکھنؤ، لاہور، ملتان میں؛ تلواریں اور شکاری چاقو سرحد ور بلوچستان میں؛ تانبے کے اعلیٰ درجے کے برتن پشاور میں؛ مٹی کے روغنی برتن پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد میں؛ نمدے، گبے، قالین اور روغنی لکڑی یا لبدی کے بکس کشمیر میں؛ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی قسم قسم کی چیزیں بنگال میں اور گھونگے اور سیپ کا کام ڈھاکا میں صدیوں سے ہو رہا ہے۔

غرض سلاطینِ اسلام کے عہد میں صنعت و حرفت منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ لاکھوں نسان اس کے ذریعے سے معاش حاصل کرتے تھے۔ اور چونکہ خوشحالی کا زمانہ تھا اس لیے ان کے کمال کی قدر ہوتی تھی۔ اور ان کی مصنوعات کی منہ مانگی قیمت مل جاتی تھی۔ اس لیے کہ ان کی مصنوعات صرف اندرون ملک ہی صَرف نہ ہوتی تھیں۔ بلکہ دساور بھی بھیجی جاتی تھیں۔ غرض جس طرح مسلمان بادشاہ اور امرا ہمیشہ کاشت کاروں کی فلاح و بہبود کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ سلطنت انہی کی خوشحالی سے قائم ہے۔ اسی طرح وہ صنعت و حرفت کی ترقی میں بھی ات دن کوشاں رہتے تھے۔ اور اعلیٰ درجے کی گراں قیمت مصنوعات کو نہ صرف خریدتے تھے بلکہ چھے اور باکمال کاریگروں کو انعام اکرام سے بھی نوازتے تھے۔ یہی شیوہ صوبائی آزاد حکومتوں کا ما۔ وہ بھی اپنے درباروں میں دربارِ دہلی کے جود و سخا کی تقلید کر کے اپنے علاقوں کے باکمالوں کی رر کرتیں۔

ملکہ شاہی اور نرخ اشیاء:

چونکہ مسلمان بادشاہ تقریباً ہزار سال تک اس ملک پر حکومت کرتے رہے۔ اور ان

میں سے بعض نے نظم و نسق میں نئی نئی راہیں نکالیں۔ اس لیے سکّے کے متعلق کوئی ایک معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے ملک میں ''دہلی وال'' سکے کا رواج تھا۔ مسلمانوں کے زمانے میں ''جیتل'' مروج ہوا۔ جس کو اس زمانے کا پیسہ کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ بڑا سکہ نقرئی ٹنکہ تھا جو قریب قریب ایک تولے کا تھا۔ اور اس کے چونسٹھ جیتل ہوتے تھے۔ یہ ٹنکہ سب سے پہلے سلطان شمس الدین التمش نے رائج کیا تھا۔ ''ہشت کنی'' آٹھ جیتل کی تھی۔ گویا دونی ''بھلولی'' جو بہلول لودھی نے رائج کی تھی۔ ٹنکہ کی ایک چوتھائی تھی یعنی چونّی۔ سلطان سکندر لودھی نے تانبے کا ٹنکہ چلایا۔ تانبے کے بیس ٹنکے ایک نقرئی ٹنکے کے برابر ہوتے تھے۔ طلائی مہریں بھی تھیں لیکن عام طور پر نہ چلتی تھیں۔

مغلوں کے زمانے میں یہی ٹنکہ روپیہ ہوگیا۔ اور اس روپے کے چالیس دام ہوتے تھے۔ یہ دام تانبے کا سکہ تھا۔ جس میں ۵ء۳۲۳ گرین تانبا ہوتا تھا۔ سمتھ اور مورلینڈ لکھتے ہیں کہ مغل روپے کی قیمت انگریزی سکہ کے حساب سے دو شلنگ اور نو پنس کے درمیان، لیکن عام طور پر دو شلنگ تین پنس ہوتی تھی۔ (یعنی قریب قریب پونے دو روپے)۔ منوں اور سیروں کا بھی کچھ واضح طور پر پتا نہیں چلتا۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ اکبر کے زمانے میں من کوئی اٹھائیس سیر کا تھا۔

اس زمانے کے لوگوں کی اقتصادی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف کم سے کم مشاہرہ پانے والوں کی تنخواہ سامنے رکھی جائے اور دوسری طرف اجناس ضروری کے نرخ پیش نظر رکھے جائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ سب سے کم تنخواہ محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے غلاموں کو ملتی تھی۔ یعنی کم سے کم دس ٹنکہ اور زیادہ سے زیادہ پچیس ٹنکہ ماہانہ۔ اب ملاحظہ ہو۔ کہ علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے زمانوں میں اشیائے خوردنی کے نرخ کیا تھے:

علاء الدین خلجی:

گندم ساڑھے سات جیتل فی من (یعنی ساڑھے سات پیسے کے ۲۸ سیر) جَو چار جیتل فی من، دھان پانچ جیتل فی من، دالیں پانچ جیتل فی من، شکر سفید ایک سو جیتل فی من، شکر سرخ ساٹھ جیتل فی من، بھیڑ بکری کا گوشت دس جیتل فی من، گھی سولہ جیتل فی من۔

محمد بن تغلق:

گیہوں بارہ جیتل، جَو آٹھ جیتل، دھان چودہ جیتل، دالیں چار جیتل، شکر سفید اسّی جیتل، شکر سرخ چونسٹھ جیتل، گوشت بکری چونسٹھ جیتل فی من۔

فیروز شاہ تغلق:

گیہوں ۸ جیتل، جَو چار جیتل، دھان چودہ جیتل، دالیں چار جیتل، شکر سرخ ۱۲۰-۱۴۰ جیتل، گھی ایک سو جیتل فی من۔

یہ نرخ تو اجناس خوردنی کے تھی۔ اب اشیائے پوشیدنی کو لیجیے:

دہلی کی ململ ۱۷ ٹنکہ فی تھان

کول (علی گڑھ) کی ململ ۶ ٹنکہ فی تھان

اعلیٰ درجے کی ریشمی ململ .... دو ٹنکہ فی تھان

ادنیٰ درجے کی مشروع .... تین ٹنکہ فی تھان

اعلیٰ درجے کا کمبل .... چھتیس جیتل

ادنیٰ درجے کا کمبل .... چھ جیتل

اعلیٰ درجے کا سوتی کپڑا .... ایک ٹنکہ کا تیس گز

ادنیٰ درجے کا سوتی کپڑا .... ایک ٹنکہ کا چالیس گز

تین درجے کی شیریں .... ۵-۳-۲ ٹنکہ کا تھان

چادر دس جیتل

غلام اور لونڈیاں .... ۸ ٹنکہ سے ۱۲۰ ٹنکہ تک یا زیادہ۔

بنگال میں نرخ بے حد ارزاں تھے۔ مثلاً ابن بطوطہ نے بتایا ہے کہ جب وہ بنگال گیا تو ضروری اشیاء کی قیمتیں حسب ذیل تھیں:

ایک چوزہ .... ایک جیتل

پندرہ کبوتر .... ۸ جیتل

ایک بھیڑا .... ۱۶ جیتل

اعلیٰ درجے کا کپڑا (۳۰ گز کا تھان) .... دو ٹنکہ

چاول .... ۸جیتل فی من

بکری .... ۳ٹنکہ فی شاخ

شکر .... ۳۲جیتل فی من

صاف شدہ شکر .... ایک ٹنکہ فی من

ناصاف شکر .... ۱۶جیتل فی من

غلام ۸ٹنکہ

گلبدن بانو بیگم کا بیان ہے کہ امرکوٹ (راجپوتانہ) میں چار بکریاں صرف ایک ٹنکہ میں مل جاتی تھیں (ہمایوں نامہ ۵۸) العمری مظہر ہے۔ کہ ایک شخص خجندی نے اپنے تین دوستوں کے ساتھ بازار میں کھانا کھایا۔ جس میں گائے کا گوشت، روٹی اور مکھن تھا۔ چاروں کے کھانے پر صرف ایک جیتل صَرف ہوا۔[۱۱] اسی سے اندازہ لگالو کہ ایک شخص جس کا کنبہ ایک بیوی اور تین چار بچوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ دس ٹنکہ ماہوار کی تنخواہ میں نہایت فارغ البالی سے بسر کرسکتا تھا۔

مغلوں کے زمانے میں اشیائے خوردنی کے نرخ حسب ذیل تھے۔ یاد رہے کہ من ۲۸ سیر کا تھا۔ اور روپے کے چالیس دام تھے:

گیہوں .... بارہ دام فی من

جو .... آٹھ دام فی من

بہترین چاول .... ۱۱۰دام فی من

ادنیٰ درجے کے چاول .... ۲۰۔ دام فی من

مونگ .... ۱۸۔ دام فی من

ماش .... ۱۶۔ دام فی من

موٹھ .... ۱۲۔ دام فی من

چنا .... ساڑھے سولہ دام فی من

جوار .... ۱۰۔ دام فی من

شکر سفید .... ۱۲۸۔ دام فی من

شکر سرخ .... ۵۶۔ دام فی من

گھی .... ۱۰۵۔ دام فی من

تلوں کا تیل .... ۸۰۔ دام فی من

نمک .... ۱۶۔ دام فی من

مختلف کاریگروں مثلاً عمارتی کارکنوں کو جو اجرت ملتی تھی وہ حسب ذیل تھی:

گلکار (معمار) درجہ اول .... ۷۔ دام روزانہ

گلکار (معمار) درجہ دوم .... ۶۔ دام روزانہ

گلکار (معمار) درجہ سوم .... ۵۔ دام روزانہ

بڑھئی۔ درجہ اول .... ۷۔ دام روزانہ

بڑھئی۔ درجہ دوم .... ۶۔ دام روزانہ

بڑھئی۔ درجہ سوم .... ۴۔ دام روزانہ

بڑھئی۔ درجہ چہارم .... ۳۔ دام روزانہ

بڑھئی۔ درجہ پنجم .... ۲۔ دام روزانہ

بیلدار۔ اینٹ لگانے والا درجہ اول ..... ساڑھے تین دام روزانہ

بیلدار۔ اینٹ لگانے والا درجہ دوم ..... ۳۔ دام روزانہ

آب کش (یعنی بہشتی) درجہ اول .... ۳۔ دام روزانہ

آب کش (یعنی بہشتی) درجہ دوم .... ۲۔ دام روزانہ

چاہ کن (کنواں کھودنے والا) درجہ اول . ۳۔ دام فی گز

چاہ کن (کنواں کھودنے والا) درجہ دوم . اڑھائی دام فی گز

چاہ کن (کنواں کھودنے والا) درجہ سوم . ڈیڑھ دام فی گز

اخلاق عامہ کی حفاظت

بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں التمش، بلبن، علاء الدین خلجی، محمد تغلق، فیروز شاہ تغلق جیسے بادشاہ شراب نوشی اور قمار بازی کے خلاف قوانین نافذ کرتے تھے۔ بلبن اور اس کے لڑکے شہزادہ محمد کی مثال نے معاشرے پر نہایت صحت مند اثر کیا۔ علاء الدین خلجی نے اپنے امرا کو شراب خواری اور قمار بازی سے سختی کے ساتھ منع کیا۔ اور اس کے عہد میں یہ خرابیاں بڑی حد تک نابود رہیں۔ لیکن اس کے انتقال کے بعد حالات پھر بگڑ گئے۔ تغلق شاہ اور اس کے

نامور لڑکے محمد بن تغلق کی نیکی نے پھر معاشرے کی حالت پر اچھا اثر ڈالا۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں جب اس بادشاہ نے دیکھا کہ مذہب کی گرفت نرم پڑ رہی ہے۔ اور طرح طرح کے ملحدانہ عقائد رواج پا رہے ہیں تو اس نے ان باطل فرقوں کو سختی سے دبایا۔ اور ان کے سرغنوں کو موت کی سزائیں دیں۔ ابن بطوطہ نے چودھویں صدی کے ہندوستان کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق غلط عقائد رکھنے والے علما و مشائخ کو عبرت انداز سزائیں دینے میں بالکل تامل نہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں خلاف شریعت افعال پر تشدد کیا جاتا تھا۔

مسالک الابصار کا مصنف لکھتا ہے کہ شہزادہ مسعود کی والدہ کو الزام زنا میں سنگسار کر دیا گیا۔ شراب خواری ممنوع قرار دی گئی۔ اہل ہند شراب کے عادی تھے اور محض پان کھانے پر اکتفا کرتے تھے۔ ہندوؤں میں روپیہ جمع کرنے کا ذوق عام تھا۔ جب کسی ہندو سے اس کی دولت کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ یہ جواب دیتا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنے خاندان میں دوسرا یا تیسرا آدمی ہوں جس نے اس خزانے کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ جو میرے آباء و اجداد ایک خاص مقام پر جمع کیا کرتے تھے۔ مجھے اس خزانے کی کل مقدار کا علم نہیں۔[۱۲] لوگ اپنی دولت کو زمین میں دفن کرتے تھے۔ جیسے آج کل بھی بعض لوگوں کا شیوہ ہے اور لین دین میں صرف سونے چاندی کے سکے قبول کرتے تھے۔

ساہو کاروں کی سود خواری:

ہندو ساہو کار مسلمانوں کے پورے عہد میں خوشحال اور دولتمند رہے۔ وہ جونہی سنتے کہ فلاں امیر کو بادشاہ نے اقطاع یا جاگیر سے نوازا ہے۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچ جاتے۔ اور قرض پیش کرتے۔ امیر ان سے روپیہ لے کر اپنے آس پاس کے متوسلین میں تقسیم کرتا، اور اپنی امارت کا سکہ جماتا۔ یہ قرض مدت دراز تک نہ اتر سکتا۔ ابنِ بطوطہ اور مارکو پولو نے بھی چودھویں صدی عیسوی کے قرضوں کے متعلق ایک قصہ لکھا ہے۔ قرض خواہ اپنا روپیہ وصول کرنے کے لیے بادشاہ کی عدالت کی طرف رجوع کرتے۔ جب کوئی بڑا امیر مقروض ہو جاتا تو ساہو کار قصر شاہی کے پاس اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔ اور چلّا چلّا کر اپنے قرض کا مطالبہ کرتا۔ تاکہ اس کی آواز سلطان کے کانوں تک پہنچ جائے۔ اس پر وہ امیر سخت پریشان ہو کر اس کا قرضہ ادا کر دیتا۔ یا آئندہ ادا کرنے کا حتمی وعدہ کرتا۔ بعض اوقات سلطان خود مداخلت کر کے قرض کی رقم ساہو کار کو

دلواتا۔[۱۳]

دکن کے لوگوں کے رسم و رواج شمال کے مقابلے میں بہت مختلف تھے۔ خودکشی اور ستی کا رواج عام تھا۔ برہمنوں اور گروؤں کا احترام بے حد کیا جاتا۔ برہمنوں کے ذمے جو مواجب ہوتے وہ صرف چھوکر واپس کر دیئے جاتے۔ ملیبار کی نائر قوم میں ایک ایک عورت کے متعدد شوہر ہوتے۔ اور یہ رسم معاشرے میں بالکل جائز تصور کی جاتی۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ملیبار میں چھوٹے چھوٹے جرائم کی سزا بھی شدید ہوتی۔ بعض اوقات ایک ناریل چرانے پر موت کی سزا دے دی جاتی۔[۱۴]

علاء الدین خلجی کا کنٹرول:

بلبن نے ملک میں اندرونی امن و نظام قائم کرنے کا کماحقہ اہتمام کیا۔ اس نے کمپیلا اور پٹیالی کے علاقوں کو رہزنوں اور ڈاکوؤں سے پاک کیا۔ چنانچہ زراعت کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔ اور سوداگر بھی اپنا مالِ تجارت بے فکری کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے لگے۔ خلجیوں کے زمانے میں ملک کی اقتصادی حالت میں بہت بڑا تغیر رونما ہوا۔ مثلاً علاء الدین خلجی نے اشیاء کے نرخ مقرر کرنے اور منڈیوں کو باقاعدہ بنانے میں جو کارنامہ دکھایا وہ اس زمانے میں مثال نہیں رکھتا۔ دہلی میں اس نے اپنے داخلہ کے وقت لوگوں میں بے شمار تحائف تقسیم کیے۔ پانچ من سونے کے ستارے ایک منجنیق میں رکھ کر ان تماشائیوں پر پھینکے جو شامیانہ شاہی کے سامنے جمع ہوگئے تھے۔[۱۵] مالگزاری کا نظام پوری طرح منظم کیا گیا۔ اور قلمرو کے دُور دست صوبوں میں بھی زمین کی پیمائش اور مالیہ کی تجویز صحیح طور سے کی گئی۔ اشیا کے نرخ اس قدر ارزاں تھے کہ ایک سپاہی جس کے پاس ایک گھوڑا بھی ہوتا تھا۔ صرف بیس ٹنکہ ماہوار میں اپنا گزارہ بخوبی کر لیتا تھا۔ شاہی ذخیروں میں غلہ محفوظ رکھا جاتا تاکہ قحط اور خشک سالی کے وقت کام آئے۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے دہلی میں وہ چاول خود دیکھے اور کھائے جو علاء الدین کے کھتوں میں ذخیرہ کیے گئے تھے۔ لیکن یہ ارزانی صرف علاء الدین کے عہد تک رہی۔ اس کے بعد برنی کے بیان کے مطابق کسی قدر گرانی شروع ہوگئی۔ لیکن چونکہ فصلیں اچھی ہوجاتی تھیں۔ اس لیے گرانی سے کوئی خاص دِقت نہیں ہوئی۔

ناصر الدین خسرو نے امراء کو اپنے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے بے شمار روپیہ صَرف

کیا۔ لیکن پھر بھی محمد تغلق کو اپنے عجیب وغریب منصوبوں کے لیے روپے کی کوئی قلت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کی اقتصادی تدابیر ناکام رہیں لیکن اس کی مالی حالت میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا۔ اس نے سکّے کی حقیقی قیمت گرائی۔ لیکن اس کے باوجود مملکت کے استحکام اور ساکھ پر کوئی مضر اثر نہ پڑا۔ کیونکہ سلطان نے فوراً اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اور لوگوں کو اجازت دے دی کہ تانبے کے بجائے سونے اور چاندی کے سکوں کا تبادلہ کرلیں۔[۱۶]

اس حالت میں کوئی دس سال تک قحط کی سی کیفیت رہی۔ لیکن حکومت نے قحط کے اثرات کو کم کرنے کے لیے نہایت زوردار تدابیر اختیار کیں۔ برنی لکھتا ہے کہ صرف دو سال کے اندر ستّر لاکھ ٹنکے کاشتکاروں کو بطور تقاوی عطا کیے گئے۔ برنی تدابیر قحط کی تفصیل میں لکھتا ہے کہ شاہی کھتوں سے اناج تقسیم کیا جاتا تھا۔ فقیہوں اور قاضیوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے اپنے علاقوں کے حاجتمند لوگوں کی فہرستیں تیار کریں۔ ایک اور موقع پر اسی قسم کی مصیبت پیش آئی تو قاضی، متصدی اور امیر ہر علاقے میں گھومتے پھرتے۔ اور قحط زدہ لوگوں کو روزانہ ڈیڑھ رطل اناج کی امداد دی جاتی۔ بڑی بڑی خانقاہوں میں لنگر کھلے ہوئے تھے اور ہزاروں انسانوں کو مفت خوراک تقسیم کی جاتی تھی۔

گجرات کی خوش حالی:

تیرھویں اور چودھویں صدی میں تجارتی حالات بے حد خوشگوار تھے۔ وصاف کا بیان ہے کہ گجرات کا علاقہ نہایت خوشحال اور آباد تھا۔ اس میں سات ہزار دیہات تھے۔ اور لوگ نہایت دولت مند تھے۔ کاشتکاری بہت فائدہ مند تھی۔ نیلے انگوروں کی فصل سال میں دو دفعہ ہوتی تھی۔ زمین اس قدر زرخیز تھی کہ کپاس کے پودے اپنے پھیلاؤ میں بید مجنوں کو مات کرتے تھے۔ مارکوپولو بھی شاہد ہے کہ یہاں کپاس کی کاشت زیادہ ہوتی تھی۔ اور کپاس کے پودے چھ چھ فٹ اونچے تھے۔ اور بیس برس کی عمر تک پہنچتے تھے۔ مرچ، ادرک اور نیل بے اندازہ پیدا ہوتے۔ مقامی کاریگر سرخ اور نیلے چمڑے سے ایک فرش تیار کرتے جس میں چرند و پرند کی تصویریں ہوتیں۔ اور سونے اور چاندی کے تاروں سے زر دوزی کی جاتی۔ کھمبایت بھی بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ جہاں نیل کا کاروبار ہوتا تھا۔ مارکوپولو لکھتا ہے۔ کہ لوگ نیک ہیں۔ اور اپنی تجارت و صنعت سے معاش پیدا کرتے ہیں۔ معبر (کارومنڈل) بھی دولت سے بھرپور تھا اور زیادہ تر

گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ بنگال نہایت خوشحال و زرخیز صوبہ تھا۔ اشیا کے نرخ ارزاں تھے۔ اور قلیل آمدنی والے لوگ بھی اطمینان سے گزران کرتے تھے۔

چودھویں صدی عیسوی میں اقتصادی خوشحالی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ فیروز شاہ تغلق کی نہروں نے کاشتکاری کو بے حد ترقی دے دی۔ اور مالگزاری کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ دہلی اور اس کے علاقوں کی مالگزاری چھ کروڑ پچاس لاکھ ٹنکہ تک پہنچ گئی۔ اور صرف دو آب کا مالیہ ۸۵ لاکھ ٹنکہ ہوگیا۔ اشیا کی ارزانی کی وجہ سے عوام بے حد مطمئن تھے۔ اور امرا کے پاس دولت کی اندھا دھند فراوانی تھی۔ لیکن چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں حالات بگڑ گئے۔ ۱۳۹۹ء میں تیمور کا حملہ ہوا۔ جس نے ہر طرف ابتری پھیلا دی۔ اور دولت۔ تجارت۔ صنعت کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن یہ کیفیت سلطنت دہلی ہی کی تھی۔ صوبہ جاتی بادشاہیاں برابر دولتمندی فوجی وسائل اور عمارتی کارناموں میں مشہور و نامور تھیں۔

مغل اور معیارِ زندگی:

یہ کیفیت سلاطین کے عہد کی تھی۔ اب مغل بادشاہوں کا قصہ سنیے۔ مغلوں کے منصب دار بلاشبہ بڑے بڑے امرا تھے۔ لیکن شاہی حکم یہ تھا کہ جس منصب دار کی موت ہو جائے اس کی تمامتر جائیداد اور روپیہ پیسہ ضبط ہو کر شاہی خزانے میں داخل کر دیا جائے۔ تاکہ اس کے لڑکے از سرِ نو زندگیاں شروع کریں۔ اور اپنی اہلیت ثابت کریں تو انھیں منصب سے سرفراز کیا جائے۔ ورنہ خاندان میں منصب ختم کر دیا جائے۔ اس لیے یہ تمام امرا اپنی دولت کو عطایا و وظائف پر اپنے ملازموں اور لگے بندھوں اور اپنی دعوتوں اور ضیافتوں پر اندھا دھند صَرف کرتے تھے۔ اس زمانے میں گوشت خوراک کی عام چیز تھی۔ لیکن گائے کا احترام کیا جاتا ''کیونکہ اسی جانور سے زمین کی کاشت ہوتی ہے۔ انسانوں کو اجناس خوردنی حاصل ہوتی ہے۔ اور اہل ملک کو دودھ اور مکھن جیسی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔'' [۱۷] بخارا اور سمرقند سے تازہ پھل درآمد کیے جاتے تھے اور برف بھی استعمال کی جاتی۔ آئین ۲۲ میں بتایا گیا ہے کہ تمام لوگ گرمی کے موسم میں اور امراء سال بھر برف استعمال کرتے ہیں۔ برف اس زمانے میں دس دام فی سیر (یعنی چار آنے سیر) ملتی تھی۔ اور غریبوں کی رسائی سے باہر تھی۔ امراء کو تو چھوڑ دیجیے۔ ان کی زندگی عیش و عشرت کی زندگی تھی۔ لیکن متوسط الحال طبقہ اپنی آمدنی کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ مسٹر مورلینڈ کا بیان ہے

کہ ادنیٰ درجے کے منشی و متصدی بھی کوئی تکلیف محسوس نہ کرتے تھے۔ اور اورنگ زیب کے زمانے کے اواخر میں بھی جب ملک اقتصادی دشواری میں مبتلا تھا۔ یہ لوگ نہایت مزے سے گزران کرتے تھے۔ تاجر لوگ اپنے منافع کو از سر نو تجارت میں لگا دیتے۔ اپنا بچا ہوا روپیہ حسب دستور دفن کر دیتے اور خود سیدھی سادی زندگی بسر کرتے۔ البتہ مغربی ساحل کے وہ سوداگر جو بڑے پیمانے پر درآمد و برآمد کرتے تھے، اپنے لیے نہایت وسیع پیمانے پر سامانِ آسائش مہیا کرتے اور بادشاہوں کی طرح رہتے۔ اس حقیقت کا اعتراف اکثر یورپی سیاحوں نے بھی کیا ہے۔[۱۸]

ادنیٰ طبقات کی حالت یہ تھی کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں دیہاتی لوگ جوتا نہیں پہنتے تھے۔ سردی کے موسم میں اونی کپڑا پہننے کا رواج نہ تھا جیسے مثلاً آج کل بھی اکثر دیہاتی لوگ کمل اور لوئی پر دوھر ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ عام طور پر قحط اور خشک سالی کے زمانے کے سوا باقی اوقات میں یہ لوگ بے فکری اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے۔ اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ اکبر کے زمانے میں کاشتکاروں کی زندگی مشکلات کی زندگی تھی۔ مملکت کے واجبات مقرر تھے۔ اور بادشاہ کے بڑے افسر نیک نیت اور عوام کے خیر خواہ تھے۔ شراب، افیم، بھنگ وغیرہ پر پابندی تو تھی لیکن زیادہ شدت سے اس پر عمل نہ ہوتا تھا۔

ہندوؤں میں ستّی، بچپن کی شادی، تیرتھوں کی پوجا برابر جاری تھی۔ ستّی کے متعلق تو حکومت نے قوانین نافذ کر دیے تھے، لیکن باقی اوہام پرستیوں کا کوئی علاج نہ تھا۔ شاہ جہان کے زمانے میں بے شمار عمارتیں بنائی گئیں۔ اور سالہا سال تک ہزارہا ہنرمند اور غیر ہنرمند اشخاص روزگار سے لگے رہے۔ بلکہ دگنی تگنی اجرتیں حاصل کرتے رہے۔

ہُنڈی اور بیمہ

خلاصۃ التواریخ میں منشی سجان رائے نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کا عہد بھی عام لوگوں کے لیے مرفہ الحال کا عہد تھا۔ تجارت کے سلسلے میں اس کا بیان ہے کہ اس ملک کے مہاجن اس قدر دیانت دار ہیں کہ اجنبی لوگ بھی لاکھوں روپے کی رقوم کسی دستاویز یا شہادت کے بغیر ان کے پاس بطور امانت رکھوا دیتے ہیں۔ اور یہ لوگ عندالطلب اس امانت کو ادا کرتے ہیں۔ جو ہنڈیاں یہ جاری کرتے ہیں۔ وہ ملک میں ہر جگہ کھری سمجھی جاتی ہیں اور تھوڑی سی متی کاٹ کر ان کا روپیہ

ادا کر دیا جاتا ہے۔ سوداگر سڑکوں اور راستوں کی خطرناکی کے باعث اپنا مال ان مہاجنوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور دوسرے مقام پر پہنچ کر بعینہٖ وصول کر لیتے ہیں۔ اس خدمت کی کچھ اجرت ادا کر دی جاتی ہے اور اس کو بیمہ کہتے ہیں۔ (یعنی موجودہ انشورنس اورنگ زیب کے زمانے میں بھی موجود تھا)۔[۱۹]

بلاشبہ مغلوں کے دور میں بھی بعض اوقات بڑے بڑے قحط پڑے۔ اور اس زمانے میں جب رسل و رسائل کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ قحط کے اثرات کا مقابلہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں نے اپنے اپنے دور حکومت میں قحط زدوں کی امداد کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ اور جس حد تک انسانی جدوجہد کا امکان تھا۔ بندگان خدا کو بچانے کی کوشش کی۔

اسلامی ہند کے عوام کے اقتصادی، تجارتی و صنعتی حالات بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے پڑھنے والے مختصراً یہ سمجھ لیں کہ اہل ہند کے تمام طبقات یعنی کاشت کار، اہل حرفہ، صناع، معمار، مزدور، علما، مشائخ، صلحا، مدرس، حفاظ، شعرا، خطاط اور طلباء مسلمان بادشاہوں کے زمانوں میں علی العموم نہایت مطمئن زندگی بسر کرتے تھے۔ بلاشبہ غریبی و ناداری بھی موجود تھی۔ کہیں کہیں ظلم اور بیگار وغیرہ کی خرابیاں ہوں گی۔ بعض حالات میں مستحق محروم بھی رہ جاتے ہوں گے۔ اور غیر مستحق مزے کرتے ہوں گے۔ لیکن ہر انسانی معاشرہ ایسا ہی ہوسکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانے کے سلاطین اور تاجدار اپنی ان ذمہ داریوں کو جو کفالتِ جمہور اور پرورشِ عوام کے سلسلے میں اُن پر عائد ہوتی تھیں، کماحقہٗ پورا کرتے تھے یا نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان بادشاہوں نے علی العموم اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ اور اپنی رعایا کو خوشحال رکھنے میں شبانہ روز محنت کی۔

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان تمام ملازمتوں، تجارتوں، صنعتوں وغیرہ کے بعد بھی جو غریب اور محتاج لوگ کسمپرسی کے عالم میں باقی رہ جاتے تھے۔ ان کی امداد اور سرپرستی کا کیا انتظام تھا۔ اور سلاطین، امرا اور دوسرے اہل ثروت کس کس طریقے سے انھیں مدد بہم پہنچاتے تھے۔ ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ بندگانِ خدا میں سے حتی الامکان کوئی ایسا باقی نہ رہے۔ جو ضروری امداد سے محروم رہ جائے۔

خیرات وصدقات:

خیرات وصدقات کا سلسلہ پہلے مسلمان حکمران ہی کے عہد سے شروع ہوگیا تھا۔ خاندان غلاماں کے پہلے بادشاہ قطب الدین ایبک لو اس کی جودوسخا کی وجہ سے ''لک بخش'' کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد بھی جب کبھی کسی کی سخاوت کا ذکر کیا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ وہ تو اپنے زمانے کا قطب الدین ہے۔[۲۰] اس بادشاہ کا دوسرا لقب ''فیل بخش'' تھا۔ یعنی بعض اوقات وہ ایک ''پیل بار'' رقم لوگوں کو بخش دیتا تھا۔ اہل علم، اہل فقہ، اصحاب قرأت اور زہاد و مصلحین کو برابر مشاہرے ملتے تھے۔ اور لفظ مشاہرے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خالص خیرات نہ تھی۔ بلکہ ان لوگوں کو معاشرے کی خدمات بجالانے کے عوض میں تنخواہیں ملتی تھیں۔ ایک اور بنیادی اصول یہ تھا کہ سلطان کے ذاتی اخراجات خزانۂ عامرہ سے الگ رکھے جاتے تھے۔ مشاہرے وغیرہ خزانۂ عامرہ سے دیئے جاتے تھے۔ لیکن سلطان اپنے ذاتی مصارف میں سے درویشوں، مستحقوں، بیواؤں اور یتیموں کو صدقات دیتا تھا اور روپے اور اناج کی شکل میں بھی خطیر رقوم خرچ کرتا تھا۔[۲۱]

تمام حاجت مند طبقے

علاء الدین خلجی نے اشیاء کے نرخوں پر جو کنٹرول قائم کیا تھا۔ اس سے غریب طبقے کی خوراک کا مسئلہ حل ہوگیا۔ محمد تغلق نے ناداروں اور مسکینوں کے نام ایک رجسٹر میں درج کرنے کے لیے نیک اور دیانت دار افسروں کا ایک دفتر قائم کیا۔ تاکہ غریب اور محتاج لوگوں کو حکومت کی طرف سے ضروریات زندگی مہیا کی جاسکیں۔ فیروز تغلق نے بھی دیوان خیرات قائم کیا۔ اور بے روزگاروں کے لیے روزگار مہیا کرنے پر خاص توجہ مبذول کی۔ اسلامی ہند کے پورے دور میں علما وطلباء، فقراء وغربا کے لیے خاص انتظامات کیے جاتے تھے۔ مشائخ وفقرا کے لیے ان کی خانقاہوں میں مہمان خانے اور طعام خانے قائم تھے۔ سراؤں میں مسافروں کے لیے خوراک کی پوری آسانیاں مہیا تھیں۔ سلاطین دہلی کے عہد میں دیوان رسالت خیرات وصدقات کا محکمہ تھا اور اس پر صدر یا شیخ الاسلام کا اقتدار ہوتا تھا۔ اس محکمے سے جن لوگوں کو امداد ملتی تھی ان کی طویل فہرست برنی نے دی ہے۔ مثلاً یہ طبقے اس محکمے سے فیض یاب ہوتے تھے۔ سادات، مشائخ، علما،

مفروزیان، نقیران، مستحقان، معیوبان، زالان، جائے ماندگان۔[۲۲]

سلطان کے ہاں سے امداد کے لیے فرمان جاری ہوتے۔ اور مشائخ کے پاس خود صدر یا کوئی امیران فرامین کو لے کر حاضر ہوتا۔ مثلاً ناصر الدین محمود نے حضرت بابا فرید شکر گنج کی خدمت میں چار دیہات پیش کیے جن کو انھوں نے قبول نہ کیا۔ سلطان محمد تغلق نے قاضی کمال الدین صدر جہاں کو حضرت قطب الدین ہانسوی کے پاس چند دیہات کا فرمان بھیج کر کوشش کی کہ وہ اس نذر کو قبول کر لیں۔

سکندر لودھی روزانہ مختلف مرکزوں سے پختہ و خام کھانا مستحقین کو تقسیم کراتا۔ ہفتہ وار خیرات کے لیے جمعہ کا دن مقرر تھا۔ اور ایک شش ماہی تقسیم بھی رائج تھی۔ سلطان اپنی مملکت کے فقرا کو سال میں دوبار حکم دیتا تھا کہ اپنی ضروریات تفصیلی طور پر لکھ کر پیش کریں۔ چنانچہ ہر ایک کو چھ ماہ کے مصارف مہیا کر دیئے جاتے اور وہ اس مقصد کے لیے دربار میں حاضر ہونے کی زحمت سے بچ جاتے۔ غیاث الدین والی مالوہ کا حکم تھا کہ جس وقت اس کی زبان سے شکر کا کلمہ نکلے فوراً پچاس ٹنکے خیرات کیے جائیں۔ اور جب بادشاہ کسی امیر یا رکن سلطنت پر شفقت و عنایت کا اظہار کرے تو ایک ہزار ٹنکے دے دیئے جائیں۔ فیروز تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی دو کروڑ روپیہ جو محمد تغلق نے زمانۂ قحط میں بطور تقاوی کسانوں کو دیا تھا، سربسر معاف کر دیا۔

دورانِ سفر میں عطیّات و مشاہرات

محمد تغلق نے سندھ میں وفات پائی اور فیروز شاہ کو سیوستان سے دہلی آنا پڑا۔ اس سفر میں بادشاہ نے خیرات کی حد کر دی۔ تمام پرانی درگاہوں اور خانقاہوں کے متوسلین کو خلعت اور انعامات دیئے۔ پرانے اوقاف کی تجدید کی۔ نئی جاگیریں عطا کیں۔ ہر شہر کے مشاہیر علما و مشائخ کے لیے نان و وظیفہ کا اعلان کیا۔ ہر قصبے کے فقیروں اور مسکینوں کو صدقات دیئے۔ اُچھ میں خانقاہ شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے گاؤں اور ان کے باغ ان کے لڑکوں کو عطا فرمائے۔ اسی طرح اجودھن میں شیخ علاء الدین کے پوتوں کو زمین۔ مواضع اور املاک بخشے۔ گزشتہ ایک سو ستّر سال کی مدت میں سلاطین ماضیہ کے جو مشاہرے، انعام اور دیہات کی اسناد ضبط ہوگئی تھیں۔ وہ ان کو اولاد ۔۔۔ کو ۔۔۔ جاری کی گئیں اور منئے وظائف بھی عطا کیے گئے۔[۲۳]

قبّے اور نچھاور اور دسترخوان

جب فیروز شاہ تغلق شہر دہلی میں داخل ہوئے تو شہر میں قبّے باندھے گئے۔ یہ قبّے لکڑی کے بڑے بڑے ہال تھے۔ جن میں حکومت کی طرف سے خورونوش کی اشیا اور راگ رنگ کی محفلوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور طعام، شربت اور تنبول مہیا کیے جاتے تھے۔ ان قبّوں میں ہر ایک پر ایک لاکھ ٹنکہ خرچ ہوا کیونکہ یہ دعوت خانے اکیس روز تک کھلے رہے۔ فیروز شاہ دوسرے موقعوں پر بھی ان قبوں کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب جاج نگر کے سفر سے واپس آیا تو اسی قسم کے قبے پھر دہلی میں قائم کیے گئے۔[۲۴] عام طور پر بادشاہ جن اطراف سے گزرتا ان کے مشائخ، فقرا، علما اور دوسرے اشخاص کو برابر اپنی سخاوت سے نوازتا۔

جب کبھی کوئی بادشاہ یا امیر محل سے نکلتا۔ یا سفر کی حالت میں کسی شہر کے اندر داخل ہوتا تو ''نثار'' کی رسم ادا کی جاتی۔ اگر ایک امیر گھوڑے پر سوار ہوتے وقت ایک سو ٹنکہ نثار کرتا تو دوسرا امیر دو سو ٹنکہ خرچ کرتا۔ جب علاء الدین خلجی تخت نشینی کے لیے دہلی کو روانہ ہوا تو پورے راستے میں ہر منزل پر پانچ من سکّے منجنیق کے ذریعے نچھاور کرتا تھا۔ محمد تغلق نے بھی تخت نشینی کے موقع پر زر و جواہر کی اتنی مقدار نثار کی کہ دہلی بھر میں چاندی اور سونے کے پھول بکھر گئے۔

سلاطین کے زمانے میں کوئی امیر کبھی اکیلا کھانا نہ کھاتا تھا۔ بلکہ اس کے دسترخوان پر ضرورت مندوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ انفاق، صدقات اور بخشش تین مدیں تھیں۔ بخشش تو ہر امیر کے ملازم اور لواحق وصول کرتے تھے۔ لیکن انفاق اور صدقات زیادہ تر غریب طبقے کے حصے میں آتے تھے۔ اگر کوئی خان یا ملک یہ سن پاتا کہ فلاں خان کے ہاں پانسو آدمی کھانا کھاتے ہیں تو وہ اپنے دسترخوان کو ہزار حاجت مندوں پر پھیلا دیتا۔ اگر ایک امیر اپنی مجلس میں پچاس گھوڑے اور دو سو خلعت عطا کرتا تو دوسرا سو گھوڑے اور پان سو خلعت دینے کی کوشش کرتا۔ غرض یہ تمام مسابقت غریبوں اور مستحقوں کے لیے باعث رحمت ہو جاتی۔

بعض امرا اپنے محکموں کے پورے عملے کو روزانہ اپنے دسترخوان پر کھانا کھلاتے تھے۔ مثلاً بلبن کے دیوان عرض میں عماد الملک راوت عرض کی طرف سے پچاس ساٹھ خوان آتے تھے جن میں میدے کے نان۔ گوشت گوسفند وحلوان۔ کبوتر اور چوزے کا گوشت ہوتا۔ روٹی، بھنا ہوا گوشت، شربت اور تنبول بھی مہیا کیا جاتا۔ اس کھانے سے جو کچھ بچ رہتا وہ درویشوں میں بانٹ

دیا جاتا۔ عماد الملک کے ہاں پان کثرت سے ہوتے تھے۔ چنانچہ پچاس ساٹھ غلام تنبول ہی پیش کرنے پر مامور تھے۔[۲۵]

خیرات کے مختلف طریقے:

سلطان محمد عادل شاہ کے ہاں ایک رسم یہ تھی کہ ہر رات بادشاہ کے سرہانے ہُون کی بھری ہوئی دو تھیلیاں رکھی جاتیں جو علی الصباح فقرا اور درویشوں میں تقسیم کردی جاتیں۔ خیرات و صدقات کی کثرت کا یہ حال تھا کہ لوگ انھیں قبول نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی ملازم مجبور ہوکر یہ خیرات تکیہ داروں میں دینے لگے۔ لیکن دس سو چودہ تکیوں میں سے صرف چودہ تکیوں نے یہ امداد قبول کی۔ باقی نے انکار کردیا۔ اور جو تکیہ دار یہ خیرات لیتے بھی تھے وہ بھی صدقہ لینے کے لیے بارگاہ شاہی میں حاضر نہ ہوتے تھے۔ بلکہ یہ رقم ان کو تکیوں میں پہنچا دی جاتی۔[۲۶]

سلاطین کے زمانوں میں کیفیت یہ تھی کہ بادشاہ کی سرکار تو خیر بڑی سرکار تھی۔ لیکن امیروں، وزیروں اور شہزادوں کے دربار الگ ہوتے تھے۔ اور ہر دربار کے ساتھ صدہا لواحقین و مستحقین لگے ہوئے تھے جو اپنی اپنی سرکاروں سے امداد پاتے تھے۔ اور نہایت بے فکری سے زندگی بسر کرتے تھے۔

بزرگوں کی نذر نیاز:

حضرات صوفیہ کرام کی خانقاہوں میں لنگر برابر جاری رہتے اور ان کے مصارف ان کے عقیدت مندوں کی طرف سے پورے کیے جاتے تھے۔ بڑی درگاہوں میں نذر نیاز کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ایک لٹا ہوا سوداگر حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ اس دن چاشت کے وقت تک جو نذریں آئیں وہ اس سوداگر کو دے دی جائیں چاشت کے وقت تک یہ رقم بارہ ہزار تنکہ ہوئی۔[۲۷]

بدایوں میں ایک دہی بیچنے والا ہندو شیخ جلال تبریزی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ تو اپنی کل جمع جتھا جو ایک لاکھ جیتل تھی آپ کی خدمت میں نذر کے لیے لے آیا۔ جب اُدچھ کے مُلا عارف حضرت بابا فرید کے ہاتھ پر تائب ہوئے تو اپنا سارا اثاث البیت لاکر آپ کی خدمت میں پیش کردیا۔ ان کا تمام مال فقرا و مساکین کے حصے میں آتا تھا۔

مکانات کا کرایہ موقوف:

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں دہلی کے اندر زمینوں اور مکانوں کا کرایہ لینے کا رواج تھا۔ جس سے حکومت کو ایک لاکھ پچاس ہزار ٹنکہ آمدنی ہوتی تھی۔ جب فیروز شاہ کو معلوم ہوا کہ یہ کرایہ زیادہ تر عورتوں، بیواؤں، مسکینوں اور بے نواؤں سے وصول ہوتا ہے تو اس نے علما سے دریافت کیا۔ اس پر علما نے اس کرائے کو خلاف شریعت قرار دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے یہ کرایہ معاف کر دیا۔ اور قاضی لشکر نے خود ہاتھی پر چڑھ کر دہلی کے بازاروں میں اس فرمان کی منادی کی۔ [۲۸] حکومت کی اس پالیسی کے علاوہ امراء بھی انفرادی طور پر غریبوں کی امداد کرتے تھے۔ شیر شاہ کے عہد میں ایک امیر خواص خاں نے غریبوں کو تین ہزار مکان اپنے خرچ سے بنوا کر دیئے تھے۔ اور دوسرے امراء نے بھی اس کی تقلید کی۔

غریب لڑکیوں کا جہیز:

فیروز شاہ نے ایک محکمہ قائم کیا جس کا کام یہ تھا کہ غریب و نادار بچیوں کے لیے جہیز کا سامان مہیا کرے۔ اس محکمے کے افسر بے حد متدیّن تھے۔ وہ امداد طلب کرنے والوں کے حالات کی تحقیق کر کے ان کے تین درجے قائم کرتے۔ درجہ اول کو پچاس ٹنکہ۔ درجہ دوم کو تیس ٹنکہ اور درجہ سوم کو پچیس ٹنکہ کی امداد دی جاتی۔ اس طرح حکومت کی امداد سے ہزاروں نادار اور غریب بچیوں کی شادیاں ہو جاتیں۔ [۲۹]

فخر الدین کوتوال امیر الامراء (دربار بلبنؔ) ہر سال ایک ہزار لڑکیوں کے جہیز کا انتظام کرتا تھا۔ ہر روز نئی پوشاک پہنتا۔ ایک دفعہ پہن کر پھر اس کو ہاتھ نہ لگاتا۔ لباس کے علاوہ روزانہ نیا بستر اور نیا پلنگ بھی استعمال کرتا۔ یہ سال بھر کی پوشاکیں، بستر اور پلنگ مستحقوں کو دے دیئے جاتے۔ اور نادار اور یتیم بچیوں کا جہیز بھی اسی سے تیار کیا جاتا۔ [۳۰]

صدر کا محکمہ خیرات:

تاجداران مغل بھی خیرات و صدقات میں سلاطین سے کسی طرح کم نہ تھے۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے ان کی داد و دہش زیادہ وسیع الاثر ہوتی تھی۔ علما، مشائخ، فقرا، طلباء اور مساکین کی ضروریات ہر وقت مدنظر رہتی تھیں۔ اور ان کے مشاہرے باقاعدگی سے ادا ہوتے تھے۔ خیرات و

حسنات کا محکمہ صدر کے ماتحت ہوتا تھا۔ یہ عہدے دار کبھی صدر الصدور، کبھی صدر جہاں اور کبھی قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔ بطور صدر اس کا کام یہ تھا کہ علما و طلباء کو سرکاری امداد تقسیم کرے۔ اور خیرات وصدقات کا انتظام بھی اپنے ذمے لے۔ اکبر کے زمانے میں صدر کا عہدہ صرف علما کے لیے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ منصب داروں میں سے بادشاہ جس کو اس کام کا اہل اور تجربہ کار سمجھتا۔ اس کو مرکز اور صوبوں میں صدر مقرر کر دیتا۔ مثلاً حکیم ابوالفتح شیرازی، شیخ فیضی، حکیم علی، حکیم عین الملک وغیرہ۔[۳۱]

ایک جاگیر ہوتی تھی۔ جسے سیور غال کہتے تھے۔ اکبر نے سیور غال اور عطیات کے چار طبقے قائم کیے۔ ابوالفضل کے قول کے مطابق پہلا طبقہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے دنیوی معاملات سے منہ موڑ کر اپنا تمام تر وقت حصول علم کے لیے وقف کر دیا ہے۔ دوم زاہد و پرہیز گار گروہ جو توکل اور تجرد کی زندگی بسر کرتا ہے۔ سوم وہ غریب و ناتواں جو اپنے لیے روزی نہیں کما سکتے۔ چہارم وہ طبقہ شرفاء کے لوگ جو بے علمی کی وجہ سے ذریعۂ معاش نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کو زمین یا وظیفے کی شکل میں امداد دی جاتی۔[۳۲]

وظیفہ اور مدد معاش کے سلسلے میں اکبر نے جو عطیات دیئے۔ ان کی مقدار کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ صدر اپنے فرائض مذکورہ کے علاوہ قحط زدگان کو روپیہ اور پختہ و خام کھانا تقسیم کرنے کا اہتمام بھی کرتا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں مشاہروں اور وظیفوں کا سلسلہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا۔ اور مدد معاش اس کثرت سے دی گئی کہ جہانگیر کو یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ کیونکہ بقول اس کے میراں صدر جہاں نے پانچ سال کے عرصے میں اتنی مدد معاش دی جو اکبر نے پچاس سال میں بھی نہ دی ہوگی۔ عورتوں کو بھی مدد معاش دی جاتی۔ جہانگیر نے یہ کام حاجی کوکہ کے سپرد کیا۔ جو اس کی رضاعی بہن تھی۔ اس کے بعد نور جہاں کی دایہ اس کی انچارج ہوگئی۔

ان باقاعدہ جاگیروں، سیور غالوں، مدد معاشوں اور وظیفوں کے علاوہ خود بادشاہ اپنے ہاتھ سے جو خیرات کرتا اس کا کچھ شمار نہ تھا۔ اس خیرات کا حساب الگ رکھا جاتا تھا اور دربار میں ایک خزانچی ہر وقت حاضر رہتا۔ تاکہ جو ضرورت مند بادشاہ کے سامنے آئے۔ وہ خالی ہاتھ نہ جائے۔ محل سرا میں ایک کروڑ دام کی نقدی ہزار ہزار کی تھیلیوں میں رکھی جاتی۔ سفر کی حالت میں ایک ملازم تھیلی میں سکے لیے بادشاہ کے ساتھ ساتھ رہتا۔ اکبر نے ایک اور طریقہ نکالا۔ ہر شام ہندو [illegible] جمع [illegible] بادشاہ کے سامنے سکوں کا ڈھیر پڑا رہتا اور ۱۰۰ اس میں

سے مٹھیاں بھر بھر کر دیتا۔ اس موقع پر خود مولانا بدایونی کو ایک دفعہ ۵۶ اور دوسری مرتبہ ۹۶ اشرفیاں ہاتھ آئیں۔[۳۴]

جب بادشاہ کسی صوبے کا دورہ کرتا۔ تو وہاں کے غریبوں کو بھی روپیہ تقسیم کیا جاتا۔ کھبایت کے متعلق جہانگیر نے خود لکھا ہے کہ اس شہر میں اس قدر روپیہ بانٹا گیا کہ شہر کا کوئی آدمی اس سے محروم نہ رہا۔ ایک دفعہ سفر کابل میں جہانگیر نے ہر جمعرات کو ایک ہزار روپیہ تقسیم کرنے کے لیے بارہ آدمی مقرر کیے۔[۳۵]

جہانگیر کی بخشش:

جہانگیر نے اپنی توزک میں اپنی بخشش کا حال لکھا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ''احمد آباد میں دن رات غریبوں کو شرف حضوری بخشنے یا روپیہ اور زمین عطا کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اور خدا گواہ ہے کہ میں نے اس کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔'' بعض سالوں میں اس نے جو خیرات کی اس سے اس کی جود و سخا کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سال نہم میں اس نے اپنے ہاتھ سے ۴۵ ہزار روپیہ۔ ایک لاکھ نوے ہزار بیگھہ زمین، ۱۴ گاؤں، ۲۶ قلبہ اور گیارہ ہزار خروار چاول عطا کیے۔ سال چاردہم میں ۸۰۷۴۴ بیگھہ زمین، دو گاؤں، ۳۲۰ خروار کشمیر، سات قلبہ کابلی بطور مدد معاش دیے گئے۔ سال پانزدہم میں حکم دیا کہ کشمیر کے حاجت مندوں اور مستحقوں کو حاضر کیا جائے۔ سال شانزدہم میں پچاسی ہزار بیگھہ زمین، ۳۳۲۵ خروار غلہ، چار گاؤں، ۲ قلبہ، ایک باغ، اس کے علاوہ نقد روپیہ بھی، سال ہفدھم میں کشمیر کے لیک گاؤں کی آمدنی جو تیس ہزار روپیہ تھی، غربا کے لیے گرم کپڑے اور مساجد کے لیے گرم پانی مہیا کرنے کے لیے وقف کی گئی۔ شاہ جہاں کے عہد میں پہلے سال چار لاکھ بیگھہ زمین ۱۲۰ گاؤں اور نقد رقم ادا کی گئی۔

تُلا دان کی خیرات:

مسلمان بادشاہ عیدین کے موقعوں پر تو مائدہ عام بچھا دیتے تھے جس پر ہزارہا انسان کھانا کھاتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ نوروز کا جشن۔ اور وزن شمسی اور وزن قمری کے تیوہار بھی منائے جاتے۔ اور یہ صرف بادشاہ تک موقوف نہ تھے۔ بلکہ خاندان شاہی کے تمام مردوں بلکہ مرحومین کے وزن کی تقریبیں بھی منائی جاتی تھیں۔ اس کو ''تُلا دان'' کہتے تھے۔ اکبر کو وزن شمسی کے موقع پر بارہ چیزوں اور وزن قمری کے وقت آٹھ چیزوں میں تولا جاتا۔ اس موقع پر سالگرہ کا

جشن منایا جاتا۔ یہ تمام چیزیں خیرات کردی جاتیں اور انعامات اور معافیاں عطا کی جاتیں۔

اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر نے حکم دیا کہ میرے والد کے "تلا دانوں" میں جتنی چیزیں شامل ہوتی تھیں، ان کا حساب لگایا جائے۔ اور اس رقم کو مختلف شہروں کے غریبوں میں تقسیم کیا جائے۔ یہ رقم تین لاکھ سکہ ماوراءالنہر کے برابر ہوئی۔ اس کو دیانت دار لوگوں کے سپرد کیا گیا۔ کہ آگرہ۔ دہلی۔ گجرات۔ احمد آباد وغیرہ جیسے شہروں میں تقسیم کیا جائے۔[۳۵]

جہانگیر کے زمانے میں تلا دان کا جشن بہت شان وشوکت سے ہوتا۔ سرٹامس رو لکھتا ہے کہ تلا دان میں بادشاہ کو جواہرات، سونا، چاندی، زرّیں اور نقرئی پارچات، چاندی، ریشم، گھی، چاول اور بہت سی اور اشیاء میں وزن کیا گیا۔ اور یہ تمام اجناس برہمنوں کو دان کردی گئیں۔ اس کے ایک سال بعد دوسرے تلا دان کے متعلق یہی سیّاح لکھتا ہے کہ اس مرتبہ بادشاہ کو چھ دفعہ چاندی میں تولا گیا۔ میری اطلاع کے مطابق بادشاہ کا وزن دو ہزار روپیہ رہا۔ اس کے بعد پلڑے میں سونا۔ جواہرات اور دوسرے قیمتی پتھر رکھے گئے۔[۳۶]

شاہ جہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں بھی یہ رسم برابر جاری رہی۔ اگرچہ اورنگ زیب نہایت متشرع بادشاہ تھا۔ اور ایسی رسوم کو لازماً پسند نہ کرتا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس میں خیرات کی صورت تھی۔ اور بہت سے بندگان خدا کا بھلا ہوتا تھا۔ اس لیے اس نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ شاہ جہاں اسلامی تیوہاروں پر بہت خیرات کرتا تھا۔ مثلاً ۱۲۔ ربیع الاول کو بارہ ہزار، ۲۷ رجب کو دس ہزار، ۱۵ شعبان کو دس ہزار، ۱۶۔ رمضان کو تیس ہزار اور عاشورہ کے دن دس ہزار روپیہ تقسیم کرتا۔ عید قربان کے موقع پر عیدگاہ آنے جانے میں زر نچھاور کیا جاتا تھا۔ بیالیسویں سال میں دوازدہم شریف پر بارہ ہزار روپیہ فقراء کو تقسیم کیا گیا۔ دوسرے دن بادشاہ نے مزاروں کی زیارت کی۔ ہمایوں کے مقبرے پر پانچ ہزار۔ حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے روضے پر دو ہزار اور حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے روضے پر ایک ہزار دیا۔ اورنگ زیب ہر رمضان میں ساٹھ ہزار روپیہ صَرف کرتا تھا۔

دن عید رات شب برات:

اسی طرح امراو وزراء، شہزادوں اور شہزادیوں کے ہاں یہ خیرات کا سلسلہ جاری رہتا۔ اور سال بھر میں شاید ہی کوئی ایسا ہفتہ گزرتا ہو۔ جب دہلی میں کوئی نہ کوئی شاہی تقریب نہ ہوتی ہو

اور حاجتمندوں کو دل کھول کر روپیہ نہ دیا جاتا ہو۔ پھر بادشاہ اور اس کے اعزہ و اقارب کے غسل، صحت، پیدائش، شادی وغیرہ کے موقعوں پر بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ بہرحال یہ لوگ اپنی طرف سے انتہائی کوشش کرتے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ مملکت میں کوئی بھوکا ننگا نہ رہ جائے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل کے زمانے میں امداد جمہور کے جو منظم ضابطے اور قاعدے نکل آئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ امداد کم مؤثر ہوتی تھی لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد کا کام پرانے زمانے میں زیادہ تر پرائیویٹ خیرات اور انفرادی سخاوت پر مبنی تھا۔ اور چونکہ مذہب، تصوّف اور اخلاق نے طبائع میں نرمی، رقّت اور مرحمت پیدا کر دی تھی۔ اس لیے ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق خیرات دینے میں سبقت کرتا تھا۔ اور ہزاروں لاکھوں غریب و نادار لوگ جو کسی وجہ سے حصول معاش سے محروم تھے۔ دونوں وقت کی روٹی ضرور کھاتے تھے۔ اور کپڑے اور جائے پناہ کی فکر سے بھی آزاد تھے۔[۴۷]

حواشی

[۱] ملاحظہ ہو آئین ۲۵، آئینِ اکبری، ''ایجوکیشن ان مسلم انڈیا، ص ۲۰، ۹۰، ۹۱۔

[۲] ملاحظہ ہو المنہاج، ص ۱۶، ۶۸۔

[۳] برنی، ۵۵۸، ۵۵۹۔

[۴] عفیف، ۱۸۱۔

[۵] فرشتہ، حالاتِ مالوہ۔

[۶] مراۃ احمدی، اوّل، ص ۱۵۔

[۷] طبقاتِ ناصری، ص ۱۷۷، تاریخِ فیروز شاہی، برنی، ص ۲۸۱، ۴۹۸، ۴۹۹۔

[۸] جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ۱۹۳۵ء، ص ۱۶۶۔

[۹] باربوسہ، جلد اوّل، ص ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۵۴، ۱۵۵، جلد دوم، ۱۵۴۔

[۱۰] برنیئر کا سفرنامہ، ۲۵۸، ۲۵۹، ۴۰۲، ۴۰۴۔

[۱۱] مسالک الابصار، ۵۵، ۵۶۔

[۱۲] مسالک الابصار، ایلیٹ ۳، ص ۵۸۴۔

[۱۳] ابنِ بطوطہ، سوم، ۴۱۱۔

[۱۴] ایشوری پرشاد، ۱۸۷۔

[۱۵] برنی، ۲۴۵۔

[۱۶] ایشوری پرشاد، ۱۸۹۔

[۱۷] آئینِ اکبری، آئین نمبر ۶۶۔

[۱۸] ایشوری پرشاد۔

[۱۹] خلاصۃ التواریخ، منشی سوجان رائے۔

[۲۰] اکبرنامہ، جلد اوّل، تذکرہ قطب الدین ایبک۔

[۲۱] فخر الدین مبارک شاہی، ۳۵۔

[۲۲] برنی، ۵۵۸، ۵۵۹۔

[۲۳] برنی، ۵۴۳۔

[۲۴] عفیف، ۸۸۔

[۲۵] برنی، ۱۶۶۔

[۲۶] بساتین السلاطین، ۳۳۶۔

[۲۷] فرشتہ، ۳۹۵۔

[۲۸] عفیف، ۳۷۵۔

[۲۹] سراج عفیف، ۳۴۹، ۳۵۱۔

[۳۰] برنی، ۱۱۷۔

[۳۱] اکبرنامہ سوم، ص ۱۲۔

[۳۲] آئینِ اکبری، ۱۹۸۔

[۳۳] بدایونی۔

[۳۴] توزک جہانگیری۔

[۳۵] توزک جہانگیری اوّل۔

[۳۶] سفرنامہ سرٹامس رو، ۳۷۹۔

[۳۷] اس باب کے بعض حصوں کے لیے عبدالغفور چودھری مضمون نگار رسالہ ''اقبال'' لاہور کا ممنون ہوں۔
(مصنف)

Institute of Islamic Culture

2- Club Road, Lahore.

The Institute of Islamic Culture was founded in 1950 with a view to presenting the ideology of Islam to the modern mind and bringing to Muslim youth a consciousness of their intellectual, cultural and spiritual heritage. Since the modern secular system of education started functioning in the Indo-Pakistan subcontinent and elsewhere in the Muslim world, it has brought about two notable consequences for Muslim youth. Firstly, a progressive decline in their self-consciousness as heirs to a great spiritual civilization with its own distinct intellectual and moral outlook, and secondly a growing scepticism and a questioning attitude towards the validity of religious truth. While a passive acceptance of prevalent beliefs, such as marked the era of our intellectual decline, has been naturally followed by a questioning spirit and is so far a welcome change introduced by the modern system of education. It also calls for proper guidance on the part of the intellectual leaders of Islam, because in the absence of healthy guidance the immature younger generation is likely to lose its way and stumble on subversive doctrines. It is one of the aims of the Institute of Islamic Culture to cater to the spirit of inquiry and questioning among the Muslim youth to make them fully conscious of their intellectual, cultural and moral heritage.

The modern scientific spirit does not accept ready made truths or proceed deductively from simple given propositions. It has brought a spirit of inductive inquiry. The result has been a clash with the religious mode of thought which takes certain propositions for granted and then proceeds deductively. To resolve this conflict between the scientific [illegible] main [illegible] has [illegible] the [illegible] ple [illegible] the [illegible] its doctrinal side now as in its attitude to social problems and the way to which it proposes to tackle them. It is one of the aims of the Institute of Islamic Culture to demonstrate that the Islamic outlook and the fundamental principles of Islam are still capable of giving a lead in the solution of human problems. Thus the Institute has taken upon itself the task of giving a progressive, rational view of Islam to explain its attitude to current problems, and to show how the political, social and economic life of Muslims can be remodeled in accordance with the basic principles and abiding values of Islam, without injury to material prosperity and technical efficiency. With this object the Institute has published, in both the Urdu and English languages, a number of books, pamphlets and treatises written by distinguished scholars explaining the fundamental truths of Islam and their application to modern social, economic, political and intellectual problems. The Institute has also published books on the cultural and religious history of Muslims. It has further published a compendium of the Holy Prophet's (pbuh) traditions, selected from the vast Hadith literature in such a way as to give an idea of the broad, liberal and tolerant teachings of the Prophet. (pbuh) Besides, a few books have been published on the famous poets, mystics and thinkers of Islam like Rumi, Ghazali, Ibn Khaldun, Ibn Taimiyyah, Imam Abu Hanifah, Sayyid Ahmad Khan, Allama Shibli, Altaf Husain Hali, and Maulana Muhammad Ali Jauhar. The Institute includes within its sphere of work translations from Arabic and Persian classics and also modern Arabic and Persian literature on Islam in so far as they bear on our social and intellectual problems. The Institute also publishes a religious and literary monthly magazine in Urdu, Al-Ma'arif, in which contemporary problems are discussed from the Islamic viewpoint.

The Institute has no political or sectarian associations and eschews all controversies in these spheres. It invites the co-operation of all Muslim and non-Muslim intellectuals who are interested in Islam and desire to work for the intellectual regeneration of Muslims from a broad non-sectarian viewpoint.